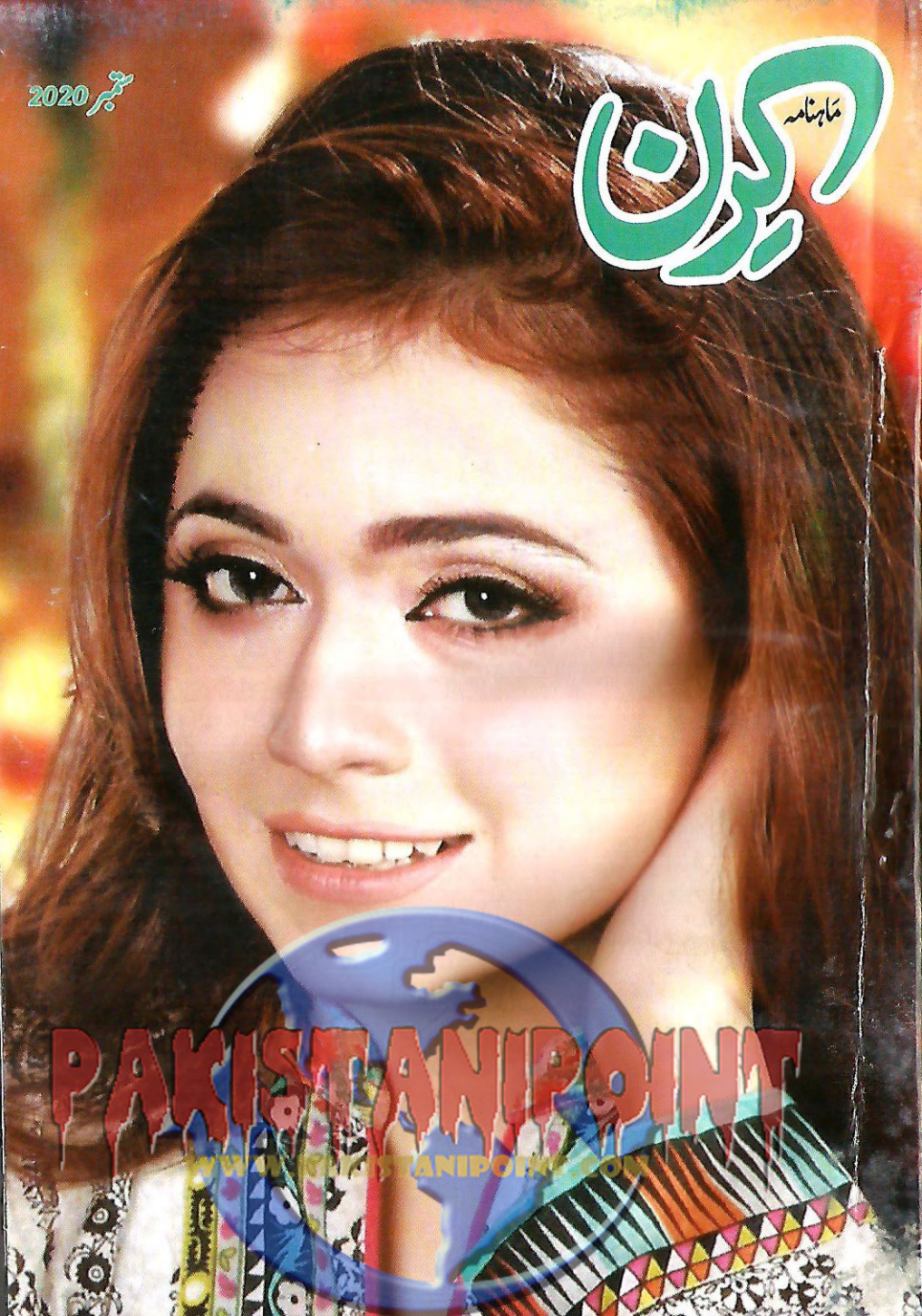

ستمبر 2020
ماہنامہ
کرن
PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

حمد — محمد یعقوب غزنوی — 9

نعت — علیم افضل — 9

انٹرویو

عرفان کھوسٹ سے ملاقات — شاہین رشید — 10

میری بھی سنیے — ماہ نور خان — 14

مقابل ہے آئینہ — شکیلہ سہیل حسن — 18

ناول

میرے ہم نفس میرے ہم نوا — آسیہ مرزا — 22

ہوائیں رخ بدل گئیں — نکہت عبداللہ — 212

مکمل ناول

کنارِ خواب جو — فرح بخاری — 118

ہجر اثاثہ رہ جاتا ہے — قرۃ العین سکندر — 52

الٹی ہو گئیں — فوزیہ احسان رانا — 176

ناولٹ

کانچ سے سائباں — مصباح علی سید — 88

جاہل — میمونہ صدف — 158

افسانے

بیسن کی روٹی — صدف آصف — 150

قبول ہے — عائشہ تنویر — 43

دو اور دو پانچ — مریم شہزاد — 84

بالٹی — صبا بہار — 110

غیر ضروری سچ — ام اقصیٰ — 209

کہاں پر آ کر لٹے تھے — تابندہ حیات — 229

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) .... 840/- روپے

ایشیاء، افریقہ، یورپ .... 7000/- روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا .. 8000/- روپے

سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں

subscriptions@khawateendigest.com

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

www.pakistanipoint.com

0317 2266944

کرن کتاب

بیوٹی باکس	ادارہ	4
فیشن اور اسٹائل	ادارہ	5
پیارا گھر	ادارہ	8
اس ماہ کا پھل	ادارہ	7
معاشرتی اور نفسیاتی مسائل	ادارہ	9
کچن اور آپ	زرتاشیہ نعمان	10
کرن کا دسترخوان	خالدہ جیلانی	11

مستقل سلسلے

کرن کرن خوشبو	شعاع عمیر	231
یادوں کے دریچے سے	بشریٰ محمود	234
موتی چنتے ہیں	ادارہ	236
نامے میرے نام	مدیرہ کرن	237

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

ستمبر 2020
جلد 42 شمارہ 6
قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔
پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی-91 بلاک W نارتھ ناظم آباد کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

اداریہ

نئے اسلامی سال کا آغاز ہو چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں یہ سال امن کا، محبتوں کا، خوشی کا اور خوش حالی کا سال ہو۔ سال گزشتہ میں جن پریشانیوں سے گزرے، اس سال ان کا سامنا نہ ہو۔ آمین۔

مئی، جون کی تپش، گرمی اور حبس کے بعد ساون کا مہینہ خوشگوار موسم کی نوید لے کر آتا ہے۔ پیاسی دھرتی سیراب ہوتی ہے اور گرمی کی شدت سے کملائے، دھوپ سے جھلسے، درختوں اور چرند پرند کو نئی زندگی ملتی ہے۔

پرانے زمانے میں تو ساون کو تہوار کی طرح منایا جاتا تھا۔ ساون کی جھڑی لگتے ہی باغوں میں جھولے پڑ جاتے۔ لڑکیاں جھولے جھولتیں اور بڑی عمر کی خواتین چولہے پر کڑاہی رکھ دیتیں۔ ساون کے خصوصی پکوان تیار کیے جاتے۔ ساون کے گیت گائے جاتے۔

مگر ساون کا یہ لطف، جھولے، پکوان، گیت اور شاعری اب صرف کتابوں میں ہی رہ گئی ہے۔ اب تو صورتِ حال وہ ہے جو حالیہ بارشوں میں اہلِ کراچی نے دیکھی اور بھگتی۔

پاکستان کا سب سے بڑا شہر، ملک کی معاشی شہ رگ اپنی تاریخ کی بدترین صورتِ حال سے دوچار ہے۔

بارش نے شہر کا پورا نظامِ زندگی معطل کر کے رکھ دیا۔ پورا شہر اندھیروں میں ڈوبا نظر آیا۔ پہلی بار چشمِ فلک نے یہ منظر بھی دیکھا کہ شہر کے پسماندہ علاقے اور ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کے مہنگے اور پرتعیش علاقے ایک جیسی صورتِ حال سے دوچار نظر آئے۔ ان علاقوں میں گٹر کا غلیظ پانی گھروں اور بازاروں میں داخل ہو گیا۔ جس سے ان کو بھاری نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سے لوگ اپنی عمر بھر کی کمائی سے محروم ہو گئے۔

کراچی کی حالیہ بارشوں نے اس حقیقت کو آشکار کر دیا کہ فطرت کے اصولوں سے انحراف کا نتیجہ بالآخر تباہی کی صورت سامنے آتا ہے۔

کراچی میں ماضی میں جو کچھ ہوا۔ اس کا سب کو علم ہے، جو اب ہو رہا ہے۔ وہ بھی سب جانتے ہیں۔ اس کے باوجود نہ عوام کھڑے ہوتے ہیں، نہ صاحبِ اختیار کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ سب خاموشی سے اس خوبصورت شہر کو تباہ ہوتے دیکھ رہے ہیں۔

اس شمارے میں،

- عرفان کھوسٹ سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ "ماہ نور خان"، کہتی ہیں "میری بھی سنیے"
- اس ماہ شکیلہ سہیل حسن کے "مقابل ہے آئینہ"،
- "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" آسیہ مرزا کا ناول،
- نگہت عبداللہ کا ناول "ہوائیں رخ بدل گئیں"،
- "کنارِ خواب جو"، فرح بخاری کا مکمل ناول،
- قرۃ العین سکندر کا مکمل ناول "بحر اثاثہ رہ جاتا ہے"،
- فوزیہ احسان رانا کا مکمل ناول "الٹی ہو گئیں سب تدبیریں"
- "کانچ سے سائبان"، مصباح علی سید کا ناولٹ،
- میمونہ صدف کا ناولٹ "جاہل"
- صدف آصف، عائشہ تنویر، صبا بہار، ام اقصیٰ اور تابندہ حیات کے افسانے اور مستقل سلسلے، کرن کتاب، معلوماتی، دلچسپ مضامین اور مزے دار ریسیپیز کے ساتھ۔

یہ زمین اُس کی ہے آسمان اُس کا ہے
سب کی حد مقرر ہے لامکان اُس کا ہے

ہر یقیں اُسی کا ہے ہر گمان اُس کا ہے
بے نشان ہو کر بھی ہر نشان اُس کا ہے

راستی کے سب منظر اُس کی حمد کرتے ہیں
ہر کلی اُسی کی ہے گلستان اُس کا ہے

بے خبر نہیں رہتا مشکلوں میں رستوں میں
ہر نفس کے سر پر ایک سائباں اُس کا ہے

پھول بھی ستارے بھی دشت بھی سمندر بھی
اک جہان یہ کیا ہے ہر جہان اُس کا ہے

خلق سب اُسی کی ہے وہ اکیلا خالق ہے
کام جس قدر بھی ہے بے تکان اُس کا ہے

محمد یعقوب غزنوی

معنی نام محمدؐ سمجھایا جائے
دل میں نام محمدؐ سجایا جائے

بھیجتے اللہ و ملائک درود و سلام
کیسے نام محمدؐ گھٹایا جائے

وقت موت معین ہے آئے جب بھی
زندگی کو نام محمدؐ پہ لٹایا جائے

آجائے سانس میں اُن کی مہک
ہر لمحہ نام محمدؐ دہرایا جائے

بتلایا عشق بلالؓ نے علیم کس طرح
جان و دل نام محمدؐ پہ ہرایا جائے

کربلا میں ابن زہرا نے سکھایا
سر کو نام محمدؐ پر کٹایا جائے

جب آوازِ صور سے اُٹھیں گے سب
علیم کو نام محمدؐ سے جگایا جائے

علیم افضل

عرفان کھوسٹ سے ملاقات

شاہین رشید

عرفان کھوسٹ ایک صدی، ایک تاریخ، ایک اکیڈمی ہیں اور پھر ان کا بیٹا ''سرمد کھوسٹ'' بھی اپنے والد کی طرح انتہائی باصلاحیت ہے۔ لیکن آج ذکر ''سرمد کھوسٹ'' کا نہیں ان کے والد ''عرفان کھوسٹ'' کا ہے جنہوں نے لاتعداد خوب صورت رول کر کے اپنے آپ کو ورسٹائل ثابت کیا۔ ان کے کردار ''حوالدار کرم داد'' نے جو مقبولیت حاصل کی شاید کسی کردار نے نہ کی ہوگی۔

9 جون 1953ء میں جنم لینے والے عرفان کھوسٹ نے بتایا کہ وہ ''رائل پارک'' کے علاقے میں پیدا ہوئے اور اسی علاقے میں تعلیم حاصل کی ..... عرفان کھوسٹ نے مزید بتایا کہ ''میرے نانا مغل بشیر بھی ایک فنکار تھے وہ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازمت کرتے تھے، اور انہوں نے فلموں میں بھی کام کیا، بہت ہی مشہور فلم ''چراغ جلتا رہا'' میں انہوں نے زیبا کے ساتھ کام کیا اور ان کے مقابل ''محمد علی'' بھی تھے۔ میرے والد بھی اسی فیلڈ سے وابستہ تھے اور جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ سلطان کھوسٹ ایک بہت ہی اچھے بلکہ فرشتہ صفت اور درویش صفت انسان تھے۔ ریڈیو پاکستان سے وابستہ تھے اور بہت کم سیلری کہہ لیں یا معاوضہ کہہ لیں ملا کرتا تھا جس کی وجہ سے گھر میں گزر اوقات مشکل سے ہوتی تھی مگر اس کے باوجود وہ خوش رہتے تھے کہ عزت کی روٹی اور پہننے کو صاف کپڑے مل جائیں تو انسان اپنے گھر میں بادشاہ ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو میرے والد ہر ہنر میں ماہر تھے وہ پہلوان بھی تھے۔ پینٹر بھی تھے بہت اچھے سیٹ ڈیزائنر بھی تھے۔ شاعر، رائٹر صداکار اور اداکار سب ہی کچھ تو تھے۔ وہ زندگی میں بہت کچھ کرنا چاہتے تھے مگر زندگی نے انہیں مہلت نہ دی۔

◈ ''اوہو..... آپ تو چھوٹے ہی ہوں گے اس وقت؟''

☆ ''جی..... 1965ء میں والد کا انتقال ہو گیا اس وقت میں صرف 12 سال کا تھا..... اور میرے لیے یہ صدمہ بہت بڑا تھا۔ مگر میری ماں نے ہمیں بہت سپورٹ کیا۔ اور احساس دلایا کہ اب تم نے ہی گھر کو سنبھالنا ہے، چلانا ہے۔ اس وقت ہم دو بھائی اور ہماری پانچ بہنیں تھیں اور ہم نے زندگی میں جو کچھ حاصل کیا ..... ہم نے گھر میں بہت غربت دیکھی ہے۔ مگر اس کے باوجود والد صاحب بلند حوصلہ انسان تھے اور ہمیشہ اس بات کی تلقین کرتے تھے کہ ہمیشہ رزق حلال کمانا۔ خواہ کتنی ہی مشکل کیوں نہ پیش آئے۔''

◈ ''آپ اس فیلڈ میں آئے۔ کیا سوچ کے، جبکہ آپ کے والد کو بھی اس فیلڈ سے کچھ نہیں ملا تھا؟''

☆ ''مجھے بچپن سے ہی شوق تھا اس فیلڈ میں آنے کا اور اس فیلڈ کو میں بطور پروفیشن اپنانا چاہتا تھا۔ شاید اس کی وجہ تھی کہ یہ پیشہ ہماری گھٹی میں تھا اور ہمیں ورثے میں ملا تھا اور میں بھی اپنے والد کی طرح رزق حلال کمانا چاہتا تھا۔ میرے والد بہت اچھے رائٹر تھے اور بہت سے فلم سے وابستہ لوگ ان سے فلم کے لیے کہانیاں لکھواتے تھے اور لکھوانا چاہتے تھے، مگر زندگی نے ہی انہیں مہلت نہ دی.....''

◈ ''آپ اس فیلڈ میں آئے دشواریاں تو پیش آتی ہوں گی؟''

☆ ''لازمی آتی ہیں اور آئی تھیں، ہر فیلڈ میں آتی ہیں صرف شوبز میں ہی نہیں آتیں۔ لیکن مجھے یہ خوشی تھی کہ میرا شوق ہی میرا پیشہ بن رہا تھا۔ مجھے بھی اپنے والد کی طرح کوئی لالچ نہیں تھا بس تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے اور پیٹ بھرنے کے لیے تین وقت کا کھانا چاہیے تھا والد صاحب کے انتقال کے بعد زندگی کا یہ سفر بہت دشوار گزار لگنے لگا تھا مگر میں نے اسے بہت ثابت قدمی سے اور بہت محنت سے طے کیا۔''

◈ ''والد کی طرح آپ پر بھی پورے گھر کی ذمہ داری تھی، گزر اوقات اچھی طرح ہو جاتی تھی؟''

☆ ''اس فیلڈ کو میں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا اور اس فیلڈ میں ثابت قدم رہا اور سب سے بڑھ کر کہ میری ماں میری ڈھال تھیں۔ ان کی دعائیں اور ان کی حوصلہ افزائی سے میں نے پھر اتنا کمالیا کہ اپنی پانچ بہنوں کی شادیاں کیں اور بڑے اچھے طریقے سے کیں۔ اپنی بساط سے بڑھ کر کیں۔''

◈ ''آپ نے اس فیلڈ کی تعریف کی کمائی کے حوالے سے اور جس زمانے کی آپ بات کر رہے ہیں اس زمانے میں تو لوگوں کو مطلب فنکاروں کو یہی

شکایت تھی کہ اس فیلڈ سے کچھ نہیں ملتا..... تو آپ ذرا مختلف نظر آرہے ہیں؟''

☆ ''جی..... میں لوگوں سے مختلف ہوں، میں دیگر فنکاروں سے مختلف ہوں۔ کیونکہ میں بہت صابر و شاکر اور قناعت پسند ہوں۔ میں نے بھی دیکھا ہے کہ لوگ اس فیلڈ میں خوش نہیں ہوتے، مطمئن بھی نہیں ہوتے مگر میں خوش بھی ہوں اور مطمئن بھی ہوں۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اس فیلڈ میں کچھ دیا ہے جس کے بارے میں میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ لوگ اس فیلڈ میں آکر پچھتاتے ہیں مگر مجھے کبھی بھی اس فیلڈ میں آکر پچھتاوا نہیں ہوا۔''

◈ ''شوبز کے علاوہ بھی تو آپ نے کچھ کیا ہے۔ اس کے بارے میں بھی بتایئے؟''

☆ ''میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بزنس کرتے ہوئے بھی گزارا ہے اور بزنس سے مراد ایڈورٹائزنگ کا بزنس، ٹھیکیداری بھی کی اور ہر وہ کام کیا جس سے حلال کی روزی حاصل ہو۔ اور اللہ نے میری نیت جو جانتے ہوئے میرے رزق حلال میں

برکت دی اور رزق حلال سے ہی میں نے ..... میں نے اپنے گھر کی ذمہ داریاں پوری کیں۔''

﴿''عموماً زندگی میں ایسے لوگ ضرور ہوتے ہیں جو دوسروں کی عزت و شہرت سے حسد کرتے ہیں۔ آپ کے ساتھ بھی ایسا کچھ ہوا؟''

☆''جی..... بالکل ایسا ہوا۔ ہر فیملی میں ایسے لوگ ضرور ہوتے ہیں جو دوسروں کی خوشیوں میں خوش نہیں ہوتے۔ تو میں بھی جب اس فیلڈ میں آیا تو میرے کانوں میں بھی آوازیں آئیں کہ میں ٹھیک نہیں کر رہا، مجھے اس فیلڈ میں نہیں آنا چاہیے تھا..... لیکن ایسے موقع پر میری ماں نے میرا ساتھ دیا اور کہا کہ اپنے والد کے کام کو زندہ رکھو۔ ان کے نام کو زندہ رکھو۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ شوبز وہ واحد شعبہ ہے جس میں اگر آپ کامیاب ہیں تو عزت، شہرت اور دولت سب کچھ مل جاتا ہے۔''

﴿''وہ کیا قصہ ہے کہ آپ نے اپنے بیٹے ''سرمد'' کے نام کے ساتھ اپنا نام نہیں لگایا بلکہ اپنے والد کا نام لگایا؟''

☆''میری خواہش تھی کہ میرا بیٹا بہت اچھے کالج میں تعلیم حاصل کرے جہاں امیروں کے بچے کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اسے ایچی سن کالج میں داخل کروایا..... اور اپنے نام کے بجائے اپنے والد کا نام لکھا۔ کیونکہ مجھے لوگ جانتے تھے۔ مگر میرے پاس کوئی اچھی سواری نہیں تھی اور میں اسے کالج کے پچھلے دروازے پر چھوڑ کر آتا تھا کیونکہ میرے پاس گاڑی نہیں بلکہ ''اسکوٹر'' تھا..... لیکن جب سرمد کو خود اس بات کا انکشاف ہوا تو پھر اس نے اپنے نام کے ساتھ ''کھوسٹ'' کا اضافہ کیا۔''

﴿''آپ کی خواہش تھی کہ آپ شوبز میں آئیں اور اپنے والد کا نام روشن کریں اور اس فیلڈ میں کچھ کر کے دکھائیں۔ آپ میں جراثیم تھے۔ کیا سرمد کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ اس فیلڈ کو اپنائے؟''

☆''سرمد کے لیے تو میری خواہش تھی کہ وہ اس فیلڈ میں آئے۔ جبکہ اس کی اپنی خواہش بھی کہ وہ ڈاکٹر بنے اور ڈاکٹر بننے کی خواہش اس لیے تھی کہ اس نے اپنی ماں کو کئی سال تک پیرالائز دیکھا تھا اس نے بڑے اچھے نمبر لیے میڈیکل میں اور ملتان کے نشتر میڈیکل کالج میں اس کا داخلہ بھی ہو گیا۔ مگر پھر اس نے اچانک ہی اپنا فیصلہ بدل لیا اور اس فیلڈ میں آ گیا.....''

﴿''شاید اداکاری کے جراثیم اسے اکسا رہے تھے کہ آ جاؤ اس فیلڈ میں؟''

☆''ہاں شاید..... پھر میری بھی خواہش تھی اور میں اس کا اظہار بھی کر چکا تھا۔ شاید اس بات کا بھی اسے احساس ہو کہ والد کی خواہش ہے تو کیوں نہ اسی طرف آ جاؤں۔ باصلاحیت تو ماشاءاللہ بہت ہے..... اور اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ اس فیلڈ میں میرے والد ہیں کوئی اونچ نیچ ہو گی تو وہی کام آئیں گے۔ اور سرمد نے جو مختصر عرصے میں کامیابیاں حاصل کیں اس میں اس کی صلاحیت، اعلا تعلیم اور میری حوصلہ افزائی کا بڑا ہاتھ ہے۔''

﴿''سرمد کے لیے آپ سمجھتے ہیں کہ اس میں وہ سب صلاحیتیں ہیں جو آپ میں ہیں؟''

☆''میں سمجھتا ہوں کہ سرمد میں مجھ سے زیادہ صلاحیتیں ہیں۔ وہ ہر فن مولا ہے اور اکثر لوگ مجھے کہتے ہیں کہ ''سرمد'' آپ سے آگے نکل گیا ہے تو میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ہاں واقعی ایسا ہے۔ مگر پھر ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ ''آپ یہ بھی یاد رکھیں کہ میں اس کا باپ ہوں۔''

﴿''آپ والد کی وفات کے بعد اس فیلڈ میں آئے۔ جبکہ سرمد آپ کی سرپرستی میں آیا..... تو فرق تو پڑتا ہے نا.....؟''

☆''بالکل ٹھیک فرمایا۔ اس وقت لوگ میرے کام کو پسند کرتے تھے مگر ساتھ یہ بھی کہتے تھے کہ آپ اپنے والد جیسے نہیں ہو سکتے اور میں یہی کہا کرتا تھا کہ ''ظاہر ہے وہ میرے والد تھے اور کوئی بھی بیٹا اپنے

باپ کی برابری کیسے کر سکتا ہے۔'' اور میرے والد حیات ہوتے تو میری عزت و شہرت دیکھ کر بہت خوش ہوتے جس طرح میں اپنے بیٹے کی عزت و شہرت دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔''

◆ ''انسان کو ہمیشہ اپنی پہچان، اپنی شناخت اپنے حوالے سے اچھی لگتی ہے۔ لیکن اگر کوئی کہے کہ ''آپ سرمد کے والد ہیں'' تو کیسا لگے گا؟''

☆ ''لگے گا کیا..... لوگ تو کہتے ہیں کہ آپ ''سرمد'' کے والد ہیں تب مجھے برا نہیں لگتا بلکہ خوشی ہوتی ہے کہ میرا بیٹا مجھ سے آگے نکل گیا ہے۔ اصل میں نئی نسل سرمد کو زیادہ جانتی ہے اور مجھے کم..... بس اس لیے عموماً نئی نسل ہی یہ سوال کرتی ہے۔ ورنہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو وسائل سرمد کو ملے ہیں اگر اس زمانے میں مجھے یا میرے جیسے دوسروں کو ملتے تو پھر صورت حال کچھ اور ہوتی۔''

◆ ''بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔ آپ کی بیٹی کنول اور سرمد نے بہت نام کمایا ہے۔ ایک دوسرے کی تعریف ہوتی ہے دل رکھنے کے لیے یا پھر مثبت تنقید ہوتی ہے؟''

☆ ''ہم تینوں جب بھی مل کر بیٹھتے ہیں تو ہمیشہ فیلڈ کے لیے مثبت گفتگو ہی کرتے ہیں۔ کوئی بھی کام کرنا ہو ایک دوسرے سے مشورہ کر کے اور ایک دوسرے کو قائل کر کے کرتے ہیں..... میرے بچے ہر کام شروع کرنے سے پہلے مجھ سے رائے ضرور لیتے ہیں۔ مشورہ ضرور لیتے ہیں۔ کوئی بات میری سمجھ میں نہ آ رہی ہو تو بڑے تحمل سے سمجھاتے ہیں۔''

◆ ''آپ نے اپنا فن اپنے بیٹے اور بیٹی میں منتقل کیا۔ بچوں کا ارادہ ہے کہ اس کو آگے لے کر چلیں؟''

☆ ''جی، بالکل سرمد اور میری بیٹی کنول مختلف تعلیمی اداروں میں میڈیا کے بارے میں لیکچر دیتے ہیں۔ مختلف یونیورسٹیوں میں لیکچر دیتے ہیں۔ تو بس ان شاء اللہ یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔''

◆ ''آپ اس بات کے قائل ہیں کہ بچوں کو والدین کی خواہش کے مطابق تعلیم حاصل کرنی چاہیے؟''

☆ ''میری خواہش تھی کہ سرمد میری فیلڈ میں آئے۔ مگر وہ ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ میں نے اسے روکا نہیں۔ بس پھر ایک دن خود ہی ارادہ بدل دیا۔ اور بندھا ہوا سامان کھول دیا کہ مجھے آپ کی فیلڈ میں آنا ہے..... اور یوں میری دلی مراد پوری ہوئی۔ ویسے بچوں کو وہی فیلڈ لینی چاہیے جس میں ان کی دلچسپی ہو۔''

◆ ''آپ نے ڈائریکٹ حوالدار کے کردار سے بہت زیادہ شہرت پائی۔ لوگوں نے آپ کو اس کردار سے باہر نہیں آنے دیا..... آپ خود کیا کہیں گے اس کردار کے بارے میں؟''

☆ ''یہ لوگوں کی محبت ہے کہ میرے اس کردار کو یاد رکھتے ہیں اور اس کردار کو انہوں نے میری پہچان بنائی ہوئی ہے اور آج بھی میں کہیں جاتا ہوں تو مجھ سے اس کردار کی ادائی کی فرمائش کی جاتی ہے..... اور مجھے بھی یہ پہچان اچھی لگتی ہے۔''

◆ ''باہر جاتے ہیں کبھی شہر سے یا ملک سے تو خریداری میں آپ کی پہلی ترجیح کیا ہوتی ہے؟''

☆ ''گو کہ آج پڑھنے کا رجحان کم ہو گیا ہے۔ لیکن میں ہوں یا سرمد شاپنگ میں ہماری پہلی ترجیح کتابیں ہوتی ہیں..... اور سرمد کے پاس تو دنیا جہاں کا لٹریچر موجود ہے اور پڑھنا ہمیشہ کی طرح آج بھی فائدہ مند ہے۔''

☆☆

میری بھی سنیئے

ماہ نور خان

شاہین رشید

1۔ ''اصلی نام؟''

''عالیہ خان۔''

2۔ ''شوبز کا نام؟''

''ماہ نور خان۔''

3۔ ''پیار کا نام؟''

''کوئی نہیں ہے۔ مطلب کوئی خاص نہیں، جس کا جو دل چاہتا ہے، پکار لیتا ہے۔''

4۔ ''مادری زبان؟''

''پنجابی۔''

5۔ ''دنیا میں آئی؟''

''6 جولائی 1994ء میں۔''

6۔ ''بہن، بھائی؟''

''ماشاء اللہ سے تین بھائی ہیں اور ہم دو بہنیں ہیں۔ بہنوں بھائیوں میں میرا نمبر دوسرا ہے۔''

7۔ ''تعلیمی معرکہ؟''

''ماشاء اللہ سے انگریزی ادب میں ماسٹرز کیا ہے۔''

8۔ ''پیا کا گھر؟''

ہنستے ہوئے..... ''ابھی نہیں۔ کچھ کام کرلوں۔''

9۔ ''بچپن کی کیا بات یاد آتی ہے؟''

''وہ یہ کہ اکثر اوقات میرے لہجے میں بہت روکھا پن اور تلخی آجاتی تھی جس کا احساس مجھے کافی کچھ کہہ دینے

کے بعد ہوتا تھا۔ ویسے ایک سنجیدہ اور سمجھ دار انسان ہوا کرتی تھی اور اب بھی ہوں اور شکر ہے کہ تلخ ہونے والی عادت بھی اب نہیں ہے۔''

10۔ ''ایک دن آئے گا جب؟''

''جب میرے سارے خواب پورے ہوں گے۔ مجھے اپنے اللہ پر بہت بھروسا ہے، وہ ضرور میرا ساتھ دے گا۔''

11۔ ''کب اپنے ہونے کا احساس ہوتا ہے؟''

''جب میں اپنے پرستاروں کے ساتھ ہوتی ہوں۔ ان کے ساتھ سیلفیاں بنواتی ہوں۔ ان سے اپنے لیے تعریفی الفاظ سنتی ہوں..... تب مجھے احساس ہوتا ہے کہ میری بھی کوئی حقیقت ہے۔''

12۔ ''اگر پاکستان میں نہ ہوتی تو؟''

''تو یقیناً یو کے یا فرانس میں ہوتی اور وہاں کی نیشنل ہوتی۔''

13۔ ''اچانک مہمان آجائیں تو؟''

''پہلے کسی زمانے میں بہت گھبراتی تھی اور چڑ بھی جاتی تھی۔ بس پھر اچانک ہی احساس ہوا کہ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں اور یہ رحمت اللہ اپنے خاص بندوں کے گھر ہی بھیجتا ہے۔''

14۔ ''بہت روتی ہوں؟''

''یہ سوچ کر کہ پتا نہیں اللہ نے ہمیں دنیا میں کیوں بھیجا۔ ہمارے آنے کا مقصد کیا تھا اور کیا ہم سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی دعا کرتی ہوں کہ ہم اتنے گناہ کرتے ہیں، اللہ ہمیں جلدی اپنے پاس بلالے۔ تاکہ مزید گناہوں سے بچ جاؤں۔''

15۔ ''بے ساختہ ایکسائٹڈ ہو جاتی ہوں؟''

''جب میرا ڈرامہ آن ایر آرہا ہوتا ہے۔''

16۔ ''انجوائے کرتی ہوں؟''

''عموماً لوگ تہواروں پر انجوائے کرتے ہیں مگر تہوار تو مخصوص ہی ہوتے ہیں اور زیادہ تر ان دنوں میں بوریت ہی ہوتی ہے۔ ہاں جب میں کہیں گھومنے پھرنے جاتی ہوں تو پھر بہت انجوائے کرتی ہوں۔ یہ چینج مجھے اچھا لگتا ہے۔''

17۔ ''انگریزی ادب میں ماسٹرز کرنے کے بعد اس فیلڈ میں آنے کی وجہ؟''

''مجھے یہ فیلڈ بچپن سے ہی بہت پسند ہے۔ بس اسی لیے اس فیلڈ میں آئی۔ ایک تو اس فیلڈ میں آنا ویسے ہی بہت مشکل ہے۔ اس پر میرے گھر والوں نے مجھے بہت ٹف ٹائم دیا۔ بس کیا بتاؤں، کس طرح اس فیلڈ میں آئی۔''

18۔ ''آمدنی کے ذرائع؟''

''یہی فیلڈ ہے اور ماشاء اللہ اچھی آمدنی ہو جاتی ہے۔ میں خوش ہوں اس فیلڈ میں آکر۔''

19۔ ''کیمرے سے دوستی کب ہوئی؟''

''جلدی ہوگئی کیونکہ اگر آپ کو کسی کام کا شوق ہو تو پھر وہ کام بندہ آسانی سے سیکھ لیتا ہے۔ تو شروع میں تھوڑی سی نروس ہوئی پھر سب کچھ سیٹ ہو گیا۔''

20۔ ''سوشل ہوں۔''

''نہیں۔ ہرگز نہیں..... حالانکہ یہ فیلڈ ایسی ہے کہ آپ کے لیے سوشل رہنا بہت ضروری ہے مگر مجھے اکیلے اور تنہا رہنا پسند ہے۔''

21۔ ''مجھے پیار ہے؟''

''اپنی شخصیت سے اور اپنے گھر والوں سے۔''

22۔''بیمار ہونے پر علاج کرواتی ہوں؟''

''ڈاکٹر سے۔ ویسے مجھے کسی کے بھی طریقۂ علاج سے اتفاق نہیں ہے۔ صرف اپنے رب پر بھروسا ہے۔''

23۔''میں اکثر خواب دیکھتی ہوں جاگتی آنکھوں سے؟''

''کہ میرا اپنا ایک چارٹرڈ جہاز ہے جس سے میں اتر رہی ہوں اور لوگ میرا استقبال کر رہے ہیں۔''

24۔''اکثر سوچتی ہوں؟''

''جب آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی ہوں تو اکثر سوچتی ہوں کہ جب میں بڑی ہو جاؤں گی، مطلب بزرگ ہو جاؤں گی تو کیسی لگوں گی۔ اس وقت تو آئینہ دیکھنے کا بالکل بھی دل نہیں کرے گا، بس یہی وقت اچھا ہے۔''

25۔''کنٹرول کرنا سیکھ لیا ہے؟''

''اپنے غصے کو..... اسٹوڈنٹ لائف میں مجھے بہت غصہ آتا تھا اور کنٹرول میں آتا ہی نہیں تھا۔ پھر مجھے کسی نے بتایا کہ جب آپ کو غصہ آئے آپ آعوذ باللہ پڑھ لیا کریں اور اب میں ایسا ہی کرتی ہوں۔''

26۔''سینما میں پہلی فلم دیکھی؟''

''باجی راؤ مستانی۔''

27۔''کچن سے دوستی؟''

''بالکل نہیں۔ کھانے سے بہت دلچسپی ہے۔''

28۔''حال میں زندہ رہتی ہوں یا آنے والے کل میں؟''

''حال میں..... مجھے تو سچ پوچھیں تو آج کی فکر زیادہ ہوتی ہے، بہ نسبت کل کے..... کیونکہ اگر آج آپ کا بہتر ہوگا تو کل خود بخود بہتر ہو جائے گا۔''

29۔''گھر میں غصہ تیز ہے؟''

''میرے بڑے بھائی کا..... اف۔''

30۔''بچوں کے ہاتھوں میں موبائل لمحۂ فکریہ یا وقت کا تقاضا؟''

''میں تو اپنی بات کروں گی۔ میں جب انٹر میں تھی اور کوچنگ جاتی تھی تو مجھے موبائل اس لیے دیا گیا کہ فارغ ہو کر بھائی کو فون کر دینا وہ لے جائے گا..... بس اس حد تک۔ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو موبائل ملا۔ میں تو یہی کہوں گی کہ کم عمری میں بچوں کو موبائل نہیں دینا چاہیے۔''

31۔''انتقام لیتی ہوں؟''

''ہرگز نہیں..... اللہ پہ سب کچھ چھوڑ دیتی ہوں۔''

32۔''بچت کرتی ہوں؟''

''گولڈ میں۔''

33۔''جیولری میں کیا پسند ہے؟''

''ڈائمنڈ۔ مگر نہیں لیتی کہ اس کی ری سیل ویلیو نہیں ہے۔''

34۔''کھانے میں کیا چیز روزانہ بھی ملے تو کم ہے؟''

''اخروٹ بہت پسند ہے۔ تمام فروٹس بہت پسند ہیں۔''

35۔''شادی میں رسمیں ہونی چاہئیں؟''

''نہیں..... نہیں بالکل نہیں۔ میں شادی بیاہ کی رسموں کے بہت خلاف ہوں۔ بہت خرچ ہو جاتا ہے، تھوڑی سی رونق دیکھنے اور دکھانے کے لیے۔''

36۔''جہیز کے بارے میں میرے خیالات؟''

''اگر تو لڑکی جوائنٹ فیملی میں جا رہی ہے تو پھر سوائے اس کے کمرے کی چیزوں کے کچھ نہ دیں بلکہ کیش دے دیں۔ ہاں اگر وہ الگ میاں کے ساتھ ہو تو پھر بھی ضرورت کی چیزیں دیں، بے جا اصراف نہ کریں۔''

37۔''اس فیلڈ میں پسندیدہ اداکارہ؟''

''صبا قمر۔ اور بہترین ایکٹر جگن کاظم ہیں۔''

38۔''شاپنگ میں پہلی ترجیح؟''

''شاپنگ کے لیے جب نکلتی ہوں تو یہ سوچ کر نکلتی ہوں کہ کس کے لیے کیا خریدنا ہے۔ پھر شاپنگ آسان ہو جاتی ہے۔''

39۔''میں سیکھتی ہوں؟''

''اپنے غلط فیصلوں سے اور اپنی غلطیوں کو دہراتی نہیں ہوں۔''

40۔ ''کیا اچھا پکا لیتی ہوں؟''
''بس کچھ پکا لیتی ہوں۔ مگر پکاتی نہیں کہ کچن سے کھانا پکا [illegible] لی اتا نہیں ہے۔''

41۔ ''بزرگوں کی کون سی بات فالو کرتی ہوں؟''
''کہ کوئی آپ کا نہیں۔ یہ دنیا اور یہاں کے لوگ سب دھوکا ہیں اور کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا۔ سب مطلب کے لوگ ہیں۔''

42۔ ''مطالعہ کا شوق؟''
''جی...... جی بہت ہے۔ انگریزی ادب میں ماسٹرز کیا ہے تاکہ انگریزی رائٹرز کو پڑھ سکوں۔ اردو اور انگریزی دونوں ''ادب'' سے لگاؤ ہے۔''

43۔ ''میرے نزدیک شادی کیوں ضروری ہے؟''
''ایک تو یہ سنت ہے۔ پھر انسان خواہ وہ مرد ہو یا عورت ساری زندگی اکیلے زندگی نہیں گزار سکتا۔ پھر یہ کہ بچوں کے ساتھ اور لائف پارٹنر کے ساتھ زندگی کا مقصد نظر آنے لگتا ہے۔''

44۔ ''رول جو ریجیکٹ کر دیتی ہوں؟''
''جو نگیٹو رول ہوتے ہیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے نگیٹو رول کرنا زیادہ پسند نہیں ہے۔''

45۔ ''کسی بھی لڑکی یا عورت کے لیے کیا ضروری ہے؟''
''لوگ کہتے ہیں کہ اگر لڑکی حسین ہو تو سب کچھ حاصل کر لیتی ہے۔ جبکہ میں کہتی ہوں کہ اگر عورت یا لڑکی ذہین ہو تو وہ سب کچھ حاصل کر لیتی ہے۔''

46۔ ''ملک سے باہر پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟''
''ٹیکسی اسکوائر جو کہ ترکی میں ہے۔ مجھے بہت پسند ہے۔ بہت اچھے اور مزے دار کھانے ملتے ہیں۔''

47 ''کس قسم کے کردار کرنے میں اچھا لگتا ہے؟''
''رومانٹک رول کرنے میں مزا آتا ہے۔''

48۔ ''پی ٹی آئی کی حکومت سے مطمئن ہوں؟''
''بالکل نہیں...... کچھ بھی اچھا نہیں ہو رہا۔''

49۔ ''خوش خوراک ہوں؟''
''بالکل بھی نہیں۔ بہت کم کھاتی ہوں، بھوک کم لگتی ہے۔''

50۔ ''گھر میں فیملی میں سب سے زیادہ کس نے پیار دیا؟''
''میرے ابو نے...... انہیں مجھ سے بہت پیار ہے۔ انہیں بیٹیوں سے بہت پیار ہے۔''

☆☆

شکیلہ سہیل حسن

ادارہ

س: ''اصلی نام کیا ہے؟ گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟''

ج: ''اصل نام شکیلہ شہزادی تھا مگر اب پچھلے چار سالوں سے شکیلہ سہیل حسن ہوگیا ہے۔ گھر والے پیار سے شکو، کزن اور دوست شالو کہتی ہیں۔ مگر..... مگر ان سب ناموں پہ بھاری نام ہے، وہ میرے پیا جی کہتے ہیں بیگم۔ جو بہت اچھا لگتا ہے۔''

س: ''آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟''

ج: ''ہوں..... آئینہ کہتا ہے۔
خوب صورت تو تم پہلے بھی تھیں لیکن.....
انہوں نے چاہا تو عجب ڈھنگ سے نکھر گئی ہو تم
(شرارتی کہیں کا)''

س: ''حسین صورتیں دیکھ کر دل میں کیا خیال آتا ہے؟''

ج: ''بہت ٹائم سے کوئی خاص حسین صورت دیکھی نہیں یا پھر پچھلے چار سالوں سے کوئی حسین لگا نہیں، مطلب جب سے ''انہیں'' دیکھا ہے۔ ہاں تو..... پیاری صورت جیسا کہ کسی لڑکی یا لڑکے پر نظر پڑے تو خیال آتا ہے کہ کتنا لکی ہوگا یا ہوگی۔ جس کو یہ خالص اور سچی محبت کرتے ہوں گے۔ جیسے کہ میری دوست ربیعہ گلزار۔''

س: ''اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو؟''

ج: ''پرس کی ضرورت نہیں پڑی کبھی۔ قدرتی بات ہے پچھلے کافی ٹائم سے کسی فوتگی پر ہی نکلنا ہوا ہے تو کبھی نہیں لیا۔ ہاں شادی کے بعد رکھوں گی پھر بتاؤں گی۔''

س: ''بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟''

ج: ''خوف تو دل میں ہوتا ہے۔ کوئی جنوں بھوتوں والی باتیں کرے تو پھر خوف محسوس ہوتا ہے۔ اگر باتیں یاد آجائیں تو..... خاص ڈر کبھی لگا نہیں۔ اللہ پاک جو ساتھ ہوتا ہے ہر پل۔''

س: ''مہمان کیسے اچھے لگتے ہیں؟''

ج: ''سارے مہمان ہی اچھے لگتے ہیں مگر رات نہ رکنے والے زیادہ اچھے۔ روٹین ڈسٹرب ہو جاتی ہے تو پھر مائنڈ بٹ جاتا ہے۔''

س: ''کھانے میں کیا پسند ہے؟''

ج: ''میٹھا بہت پسند ہے۔ چاکلیٹس، فروٹ چاٹ۔ خاص الخاص چکوال کی مشہور سوغات ریوڑی جو میرے شوہر میرے لیے بھجواتے ہیں اور سخت گرمی میں تیا سردی میں جب کیس نہ ہو اور لکڑیاں جلا کر کوئی کچھ بھی بنا دے، شکر یہ کے ساتھ کھا لیتی ہوں۔''

س: ''اگر آپ کو حکومت مل جائے تو کیا کریں گی؟''

ج: ''فرسٹ آف آل تو مہنگائی کا جن بوتل میں بند کر کے دریا برد کروں گی اور معصوم، ننھے فرشتوں جیسے بچوں کے ساتھ زیادتی کرنے والے سب لوگوں کے روپ میں شیطانوں کو سرعام کوڑے لگواؤں گی پھر پھانسی دوں گی سرعام تا کہ باقی سب عبرت حاصل کریں۔ (شیخ چلی کے خواب)''

س: ''پسندیدہ شاعرہ؟''

ج: ''ہر وہ شاعر جو سیڈ شاعری کرتا ہو۔ مجھے سیڈ شاعری امپریس کرتی ہے جو دل کو چھو جائے۔ خاص کر دو مصرعوں والے ویسے احمد فراز اور محسن نقوی بھی پسند ہیں۔''

س: ''مزاجاً لڑاکا ہیں؟''

ج: ''تو نیور کیپری کون۔ ٹھنڈے مزاج کے لوگ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار کوئی کچھ کہہ دے یا رتوڑ ہو جائے تو دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، بعد میں پچھتاوا رہتا ہے کہ یہ کیوں نہ کہا، وہ یوں نہ کہا۔ ایک چپ سو سکھ پہ یقین کرتی ہوں۔ مگر غصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد گلے شکوے کر کے سب کلیئر کر لیتی ہوں۔''

س: ''اللہ کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟''

ج: ''یاد ان کو کریں جن کو ہم بھول جائیں۔ پانچ وقت کی نماز، تلاوت قرآن کے علاوہ تب جب آپ خوش ہوں۔ ایسا کوئی کام کرنے لگیں جو اللہ پاک کو ناپسند ہو جو غلطی سے گناہ کی زمرے میں آتا ہو، ہر پل جب کوئی برا فعل سرزد ہونے لگے، بس وہ اللہ کو یاد کرنے کا بہترین وقت ہوتا ہے۔''

س: ''کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟''

ج: ''[illegible] اسپوکن۔ سوفٹ اینڈ [illegible] کے علاوہ لڑکیوں میں اپنی نسوانیت کی حفاظت کرنے والی، اپنے حجاب کا، اپنے پردے کا خیال رکھتی ہوں۔ محرم اور غیر محرم کا خیال رکھنے والی۔ مرد یا لڑکے ایسے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھتے ہوں، اپنی نگاہوں کو کنٹرول کرنے والے۔ باشعور، پڑھے لکھے لوگ انسپائر کرتے ہیں۔''

س: ''اگر لوڈشیڈنگ ہوتی تو......؟''

ج: ''اگر لوڈشیڈنگ نہ ہوتی تو گرمیوں میں ہمارے پنکھے، فریج، ایئر کولر، ٹی وی وغیرہ چل چل کر تباہ ہو چکے ہوتے۔ لوڈشیڈنگ سے الیکٹرونک چیزوں کو آرام ملتا ہے اور واپڈا والوں کو دعائیں۔''

س: ''آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟''

ج: ''میں کفایت شعار ہوں۔ مجھے فضول خرچی کر کے افسوس ہوتا ہے۔''

س: ''کیا نام شخصیت پر اثر کرتا ہے؟''

ج: ''کبھی غور نہیں کیا۔ مگر مجھے لگتا ہے خاص اثر نہیں ہوتا نام کا شخصیت پر۔ کوئی سو میں سے پانچ فیصد بس اپنے نام جیسے ہوتے ہیں۔''

س: ''کون سا کام کرتے ہوئے خیال آتا ہے کہ دنیا کیا کہے گی؟''

ج: ''جن کو ہم جانتے نہیں ان کی تو پروا نہیں ہوتی خاص کیونکہ وہ منہ پہ تھوڑی نہ کچھ کہتے ہیں۔ مگر دنیا میں اپنے گھر والے اگر آ جائیں تو وہ پہلے حوصلہ شکنی کرتے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے یہ نہ کرو وہ نہ کرو۔ مگر میں بہت سی جگہوں پہ اپنی مرضی کرتی ہوں، جب میں مطمئن ہوں تو پروا نہیں اس دنیا کی۔''

س: ''اگر آپ سنسان راستے سے گزر رہی ہوں اور کتا آپ کے پیچھے لگ جائے؟''

ج: ''لگ جائے گا کیا جی لگ گیا تھا۔ پچھلے سال گرمیوں میں ہم شادی سے واپس آ رہے تھے تو مجھے بائیک پر سفر کرنے کا شوق ہوا تو پیچھے تین چار کتے لگ گئے، دل کی دھڑکن بائیک کی رفتار سے زیادہ تیز تھی، دونوں چھوٹے بھائیوں کے ساتھ تھی۔ تو ان کا غصہ اللہ کی امان اور میری ہنسی قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ بعد میں ہم سب بہت ہنسے۔ وہ شوق مجھے کافی مہنگا پڑا تھا۔''

س: ''آپ کی نظر میں محبت کیا ہے؟''

ج: ''میرے لیے محبت آکسیجن ہے۔ مل گئی ہے تو

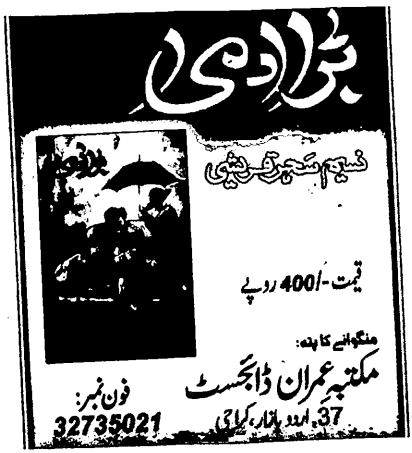

معجزہ ہے نہ ملتی تو موت تھی۔ نبیلہ عزیز صاحبہ کا ایک جملہ میرے دل کے ایوانوں میں ہر پل گونجتا ہے۔ جب علیزے دل آور سے پوچھتی ہے کہ ''زری کون ہے'' تو دل آور کہتا ہے ''میرے لیے زری محبت ہے اور محبت زری ہے۔'' تو ایسے ہی میرے لیے میرے خالہ زاد محبت ہیں اور محبت خالہ زاد ہے۔ یعنی کہ محبت اگر مجسم ہوتی تو میرے خالہ زاد ہز ہینڈ جی جیسی ہوتی۔''

س: ''کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟''

ج: ''اپنی چھوٹی خالہ اور خالو کی جن کی وجہ سے میں کرن سے متعارف ہوئی۔ چھوٹے بھائی کی جو مجھے سپورٹ کرتا ہے۔ میرے خط پوسٹ کرتا ہے۔ کرن والوں کی جو مجھ ناچیز کو کرن ڈائجسٹ میں جگہ دیتے ہیں۔ اپنی بیسٹ فرینڈ ربیعہ کی جو مجھے مورل سپورٹ کرتی ہے۔ جب میں اداس یا کنفیوز ہوں۔ اپنی امی اور بہنوں کی جو میرا اتنا خیال رکھتی ہیں اور ان کی جو مجھے دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں۔''

س: ''اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی ہے؟''

ج: ''کیوں نہیں جی۔ تعریف تو انرجی ٹانک کا کام کرتی ہے اور تعریف تو خاص وہ کرتے ہیں جن کے لیے ہم اہم اور خاص ہوں تو اہم ہونا خاص ہونا بہت خوب صورت لگتا ہے۔''

س: ''ڈرامے دیکھتی ہیں؟''

ج: ''جی بالکل۔ ہم ٹی وی، جیو، اے آر وائی کے جو مضبوط پلاٹ پر بنے ہوں، کلر فل ہوں۔''

س: ''اگر دوست ناراض ہو جائے تو کیسے مناتی ہیں؟''

ج: ''سنبل تحریم ہوا کرتی تھی تو خفا ہوتی تھی کبھی مگر خود ہی راضی ہو جاتی تھی۔ ربیعہ ہے تو کبھی خفا ہوئی ہی نہیں ہے۔ میرے ہز ہینڈ میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ کبھی خفا ہو جائیں تو جان پہ بن آتی ہے۔ ہر چیز زہر لگنے لگتی ہے، جب تک ان کا موڈ ٹھیک نہ ہو۔ ویسے وہ بھی خاص خفا ہوتے نہیں۔''

س: ''حقیقی خوشی کس وقت حاصل ہوتی ہے؟''

ج: ''جب میری پانچوں نمازیں مکمل ہو جائیں پابندی وقت کے ساتھ۔ خاص کر فجر اور عشاء۔ جب کرن میں اپنا نام دیکھتی ہوں۔ خاص کر جب میرے خالہ زاد کہتے ہیں کہ وہ بہت ہی لکی ہیں جو مجھ جیسی بیگم ملی ان کو۔ میری سسٹر نبیلہ کہتی ہے کہ تم گھر کی رونق ہو۔ جب نہیں ہوگی تو تمہاری کمی کیسے پوری کریں گے اور جب جب ایک دنیا میرے ہز ہینڈ اور ہماری جوڑی کی تعریف کرے تب دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔''

س: ''زندگی سے کیا سبق سیکھا؟''

ج: ''جب ہماری لگن سچی ہو تو سب مل جاتا ہے مگر تب جب وہ ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے اور ہم اگر اچھا کریں گے تو ہمارے ساتھ اچھا ہوگا کیونکہ دنیا مکافات عمل ہے۔''

س: ''ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟''

ج: ''ہوں..... ستر فصد تک مگر اس پہ نہیں کہ کل ہمارے ساتھ یہ ہوگا یا آج یہ ہوگا کیونکہ اس بات پہ واثق یقین ہے کہ غیب کا علم صرف عالمین کے رب کے پاس ہے۔ ہاں نیچر کے حوالے سے کافی سچی باتیں ہوتی ہیں، بس اسی حد تک یقین ہے۔ میں بس اپنا اور اپنے ہز ہینڈ جی کا اسٹار پڑھتی ہوں۔''

س: ''کوئی ایسی بات جو ہمیشہ ذہن میں رہتی ہے؟''

ج: ''خاک ہیں، خاک میں اتر جائیں گے۔''

س: ''کوئی آخری بات؟''

ج: ''رہو تو پھولوں کی طرح۔ بکھرو تو خوشبو بن کر تاکہ تمہارے جانے کے بعد بھی لوگ تمہاری خوشبو محسوس کریں۔''

☆☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل ..... ایمان خان

میک اپ ..... روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی ..... موسیٰ رضا

خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے مقبول ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	500/-
سکے دا تماشا	شازیہ چوہدری	300/-
ہم سفر	فرحت اشتیاق	400/-
بن روئے آنسو	فرحت اشتیاق	300/-
متاعِ جان ہے تو	فرحت اشتیاق	500/-
دل دا دیس	ثمرہ بخاری	350/-
ہستی کا آہنگ	ثمرہ بخاری	300/-
وہ خبطی سی دیوانی سی	آسیہ سلیم قریشی	600/-
آرزو نکھر آئی	آسیہ سلیم قریشی	500/-
ایمان، امید اور محبت	عمیرہ احمد	300/-
لاحاصل	عمیرہ احمد	300/-
امر بیل	عمیرہ احمد	750/-
اک دیا جلائے رکھنا	ماہا ملک	350/-
جو چلے تو جاں سے گزر گئے	ماہا ملک	250/-
میرے خواب ریزہ ریزہ	ماہا ملک	350/-
موسم تھا بے قرار	فریدہ اشفاق	300/-
دل اسے ڈھونڈ لایا ہے	آسیہ رزاقی	350/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	600/-
اجالوں کی بستی	فائزہ جبیں	400/-
پھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار	300/-
مصحف	نمرہ احمد	450/-
میں عبدالقادر ہوں	ثروت نذیر	300/-
اے وقت گواہی دے	راحت جبیں	350/-
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر	500/-
رنگ، خوشبو، ہوا، بادل	افشاں آفریدی	500/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	550/-
بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی	300/-
میرے خواب لوٹا دو	نگہت عبداللہ	400/-

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
میرے نام کی شہرت	شازیہ چودھری	300/-
بساطِ دل بھی عجب شہر ہے	افشاں آفریدی	400/-
حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	400/-
دست مسیحا	نگہت سیما	400/-
دل پھولوں کی بستی	نگہت عبداللہ	600/-
کوئی لمحہ گلاب ہو	نگہت عبداللہ	500/-
تو شریک سفر رہا	نسیم سحر قریشی	400/-
میرے دل، میرے مسافر	نسیم سحر قریشی	400/-
ستاروں کا آنگن	نسیم سحر قریشی	450/-
ڈھلے چاند دل کے پار	ثمرہ بخاری	350/-
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	500/-
تیری راہ میں رُل گئی وے	میمونہ خورشید علی	300/-
وہ جو قرض رکھتے تھے	فرحت اشتیاق	300/-
دل سے نکلے ہیں جو الفاظ	فرحت اشتیاق	300/-
میرے ہمدم، میرے دوست	فرحت اشتیاق	400/-
گل کہسار	فرح بخاری	400/-
کسی راستے کی تلاش میں	میمونہ خورشید علی	350/-
تم آخری جزیرہ ہو	آمنہ ریاض	200/-
اماوس کا چاند	بشریٰ سعید	200/-
شب گزیدہ	صفیہ سید	200/-
ریگ زارِ تمنا	ماہا ملک	600/-
بکھر نہ جائے خواب	آسیہ رزاقی	200/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
شکست آرزو	حمید کاشمیری	75/-
بساطِ دل	آمنہ ریاض	750/-
ستارۂ شام	آمنہ ریاض	500/-
برگ گل	ایم سلطانہ فخر	500/-
زرد زمانوں کا سویرا	نبیلہ ابر راجہ	200/-

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32735021

آسیہ مرزا

میرے ہم نفس میرے ہم نوا

حیات علی کی تین بیٹیاں تھیں۔ یہ ایک متوسط گھرانہ تھا۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ راحیلہ بیگم کے گھڑا پے کا منہ بولتا ثبوت۔ اولاد کی تربیت میں کہیں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔ نیلوفر تو تھی ہی ماں کی طرح صابر و شاکر اور ارسلہ نے اس کا لقب قانع آپا رکھ دیا تھا۔ اریبہ چھوٹی فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ بس پڑھائی اور موبائل گیمز سے دلچسپی تھی مگر اماں کا دردسر تو ارسلہ تھی۔

نیلوفر کی منگنی جہاں ہوئی تھی وہ لوگ بہت لالچی تھے اور آئے دن کوئی نہ کوئی مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ ارسلہ کو اس کی خالہ کا بیٹا سکندر پسند کرتا تھا لیکن غربت کی وجہ سے ارسلہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مہوش جیلانی اور اکبر جیلانی کے دو بچے ہیں، رومی اور آبص۔ آبص ایک حادثہ کی وجہ سے اپنی زندگی سے بے زار ہے۔

نادیہ شاہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ کالج کے ایک ٹور پر اس کی ملاقات آبص سے ہوتی ہے جہاں دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

آبص کی ماں کو اس رشتے سے اختلاف ہوتا ہے اور وہ نادیہ شاہ کے گھر جا کر اس کی بہت بے عزتی کرتی ہیں۔ جب وہ اس کے بھائی کو مروانے کی دھمکی دیتی ہیں تو مجبوراً نادیہ شاہ آبص کو چھوڑ دیتی ہے اور اپنا گھر بھی تبدیل کر لیتی ہے۔

ارسلہ کو اپنی دوست روی کے بھائی آبص میں اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آتی ہے۔ جب اس کے گھر والے آبص کا رشتہ لے کر آتے ہیں تو وہ زبردستی اپنی بات منواتی ہے۔

ارسلہ کی شادی آبص سے ہو جاتی ہے لیکن وہ اس بات سے انجان ہے کہ آبص ایک حادثہ میں اپنی ٹانگ سے محروم ہو چکا ہے۔

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

نویں قسط

"ارے۔ اماں بچاری کو کیا پتا، پیسا کتنی بڑی طاقت ہے۔ معاشرے میں بندے کا مقام ہی پیسے سے بنتا ہے۔ عزت، محبت، دوستیاں تو خود بخود حاصل ہو جاتی ہیں۔ پھر میں تو کہتی ہوں مسائل پریشانی کے گرداب سے آدمی دولت کی کشتی میں بیٹھ کر با آسانی نکل جاتا ہے۔ اور میری مانیں تو ابا...... اپنی اریبہ کی شادی بھی کی اونچے گھرانے میں کیجیے گا۔ معاشی چکی میں پستے احمر جیسے سے نہیں۔"

ارسلہ کی غرور سے بھری آواز کی تلوار نیلوفر کے دل کو کاٹ کر رکھ گئی تھی۔ وہ اس وقت تو سر جھٹک کر میکے سے احمر کے ہمراہ نکل آئی تھی۔ اس کی کسی بکواس کا جواب دیے بنا۔ مگر یہ الفاظ، اس کی گونج رہ رہ کر اس کے دماغ پر لگتی رہی۔

اس نے دبئی پہنچ کر بھی کئی پکس اور وڈیوز اسے بھیجیں اور ہر بار تصویر کے نیچے کمنٹس ضرور کرتی۔

"بہت مزا آرہا ہے نیلو۔ مگر یار، تم ایسا مزا زندگی بھر نہیں لوٹ سکو گی۔ بے چارہ احمر ایسی جنت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مزے لینے کی بات تو دور کی۔"

وہ خوش ہونا چاہتی تھی اس کی تصویر دیکھ کر...... اسے خوش دیکھ کر۔ مگر اس کے آگ بھرے جملے اس کی خوشی کو خاکستر کر دیتے۔ وہ دکھی سی ہو جاتی۔ حالانکہ وہ بے حد مطمئن اور آسودہ تھی اب تک۔ مگر اسے لگنے لگا اب اس زندگی میں ارسلہ بے چینی اور اضطراب بھر رہی ہے۔ اسے اپنے حالات سے متنفر کرنا چاہتی ہے یا یہ محض اس کی بچکانہ حرکتیں سمجھی جائیں۔

وہ غیر محسوس طور پر اپنا اور ارسلہ کی زندگی کا موازنہ کرنے لگی تھی۔ یہ سچ تھا شادی کو چند ہفتے گزر چکے تھے مگر اسے ایسا کوئی دل آویز رنگین ماحول نہیں ملا تھا۔ وہ احمر کے ہمراہ کہیں گھومنے نہیں گئی۔ کسی چھوٹے موٹے ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے نہیں گئی۔ ہاں میکے سے واپسی پر ایک دو بار دہی بھلے چاٹ اور آئس کریم کھالی تھی۔

وہ خوش تھی اس پر کہ احمر نے دنیا گھمانے کے وعدے نہیں کیے تھے مگر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی سچی محبت کا یقین دلاتا رہتا تھا۔ وہ مطمئن ہو جاتی اسے لگتا یہ بہت بڑی نعمت ہے کہ شوہر کی توجہ محبت اور اس کا خلوص شروع دنوں میں ہی مل جائے۔

ارسلہ نے آج اپنی ساری شاپنگ کی پکس بھی اسے بھیج دی تھیں۔ وہ اس کے بچکانا جذبات پر بس مسکرا دی تھی۔

"سنو...... یہ سب احمر کو ضرور دکھانا تا کہ اسے بھی احساس شرمندگی ہو کہ وہ تمہیں یہ سب نہیں دے سکتا۔"

اس کی ان باتوں پر اس نے توجہ نہ دی اور احمر کو یہ سب دکھانے کے بجائے ساری وڈیوز اور تصویریں ڈیلیٹ کر دی تھیں۔ مگر رہ رہ کر ذہن کے کسی گوشے سے مضطرب سوچیں سر اٹھا رہی تھیں کہ ارسلہ واقعی خوش نصیب تھی جو چاہا پا لیا۔ خواب دیکھنا اور اس کی تعبیر کی تگ و دو کرنا کوئی جرم بھی نہیں، نہ ہی بے وقوفانہ خواہش ہے۔ ہر انسان کو اپنی مرضی خواہش کے مطابق زندہ رہنے کا حق ہے۔ خدا سے تو وہ کچھ بھی مانگ سکتا ہے کوٹھی، بنگلا، گاڑی، ہر شے۔ وہ تو بادشاہوں کا بادشاہ ہے اس سے مانگنے میں کیا شرمانا۔ بس ارسلہ کے مانگنے کا انداز شاید غلط تھا۔ خواہش کرنا خواب دیکھنا تو غلط نہیں۔

"ہیلو۔" احمر نے اس کے آگے بائیک کی چابی لہرائی تو وہ چونکی۔

"کیا سوچ رہی تھیں۔" وہ اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

"کوئی پرابلم۔"

"ارے نہیں۔" وہ اسے پریشان دیکھ کر جلدی سے مسکرا دی۔

"بس یونہی ارسلہ کی پکس دیکھی تھیں نا تو اسے یاد کر رہی تھی۔"

''اچھا، ارسلہ دبئی سے آ گئی۔''

''ہاں رات کو پہنچی ہے۔'' نیلوفر وارڈروب سے احمر کے لیے کپڑے نکالنے لگی۔

''تم شاید یہی سوچ رہی تھیں کہ ارسلہ کتنی خوش نصیب ہے اور میں کتنی بدنصیب۔'' احمر کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ تھی۔

نیلوفر نے قدرے تعجب سے اس کی طرف دیکھا، دوسرے پل ناراضی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

''ارسلہ کا اور اپنا موازنہ تو کرتی ہو گی تم۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ میں اتنی فضول باتیں نہ سوچتی ہوں نہ کرتی ہوں۔'' اس نے پاجامہ اس کے ہاتھ میں پکڑایا۔ ''آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے کہ میں خود کو بدنصیب سمجھوں گی۔'' اس کا لہجہ شکایتی تھا۔

احمر بیڈ سے اٹھا اور پاجامہ لیتے ہوئے نیلوفر کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔

''فطری بات ہے، دو بہنوں کی شادی ایک ساتھ ہو، ایک امیر کبیر گھرانے کی بہو اور دوسری اس چھوٹے سے آنگن میں اترے تو فرق تو محسوس ہوگا ہی۔ بہن کی زندگی پر رشک تو آتا ہی ہوگا یہ کوئی غیر فطری نہیں ہے۔''

نیلوفر نے یکدم نظریں چرا لیں۔ بے خبری میں تیر سا گھونپ دیا تھا وہ تڑپ بھی نہ دکھا سکی۔ اس نے یکدم احمر کا ہاتھ سختی سے جکڑ لیا۔

''میں ایسا کچھ نہیں سوچتی احمر۔''

احمر مسکرا دیا۔

''[illegible] پرابلم نہیں کر رہا ہوں یونہی ایک عام سی بات کر رہا تھا۔''

''[illegible] بس [illegible] آپ پر کہ میں نے کبھی اونچے خواب نہیں دیکھے تھے کہ جن کا پورا نہ ہونے کا دکھ ہوتا۔ میں ایک [illegible] ہوں۔ خواہشات کو اپنے اوپر حاوی نہیں کرتی۔ عزت اور محبت میری پہلی ترجیح ہے۔ باقی جو مل رہا ہے [illegible] سکون اور اطمینان آپ کی محبت سے مل جاتا ہے۔'' نیلوفر کے لہجے میں حقیقی سکون اور اطمینان تھا۔

احمر نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر پھیلا کر اسے خود سے قریب کر لیا۔

''تمہاری عزت...... تمہارا احترام ہر گزرتے دن میرے دل میں بڑھ رہا ہے نیلو۔ میری محبت میں جب کمی محسوس ہو تم مجھے اس کی سزا دینا۔''

''ارے، آپ تو سنجیدہ ہو رہے ہیں۔'' نیلوفر ہنس دی مگر احمر ہنوز اسے عقیدت مندانہ نظروں سے تکے جا رہا تھا۔

''تمہاری جیسی لڑکیاں بہت قیمتی ہوتی ہیں نیلو۔ سیپ میں بند موتی جیسی پاکیزہ اور انمول...... بے حد بے حساب قیمتی۔ اور میں شکر ادا کرتا ہوں اپنے رب کا کہ اس نے مجھے تمہارے جیسے ہیرا عنایت کیا ہے۔ تم نے میرے بہت سے عیبوں کو بھی میرا فخر اور زینت بنا دیا ہے نیلو۔ آئی لو یو۔''

نیلوفر نے بے اختیار احمر کے کندھے پر سر رکھ کر ایک پرسکون سا سانس لیا۔ ارسلہ کے لگائے تیر کا زخم جیسے لمحہ بھر میں ہی بھر گیا ہو۔ وہ ایک بار پھر ہلکی پھلکی ہونے لگی۔

شریک سفر چھاؤں جیسا ہو تو دھوپ کی تمازت کا احساس نہیں ہوتا۔ تھکن سمیٹنے والا لمس ہو تو تھکن کا خیال تک نہیں آنے دیتا۔

وہ خود کو خوش نصیب تصور کر رہی تھی کہ وہ اپنی تمام تر ذہنی کوفت، تھکن...... اپنا تمام بوجھ اس کے کندھے پر ڈال کر پرسکون ہو سکتی تھی۔

زندی سے یہی گلہ ہے مجھے
تو بڑی دیر سے ملا ہے مجھے
ہم سفر چاہیے، ہجوم نہیں
اک مسافر ہی قافلہ ہے مجھے

احمر کی پیار بھری سرگوشی اس کی شرمگیں پلکوں کو اور بھی جھکا گئی۔

☆☆☆

ارسلہ کی شاپنگ دیکھ کر اریبہ کی آنکھیں تو گویا حیرت سے پھٹ رہی تھیں۔

''واہ آپ! مزے ہیں آپ کے تو۔ یہ اتنی ڈھیر ساری شاپنگ آپ نے خود اکیلے کر لی۔''

''جی جناب۔'' وہ اترائی۔ ''قسم سے بیا۔ زندگی کا مزا تو اب سمجھ میں آیا ہے۔ ترس ترس کر جیتے تھے تو زندگی بوجھ کی طرح لگتی تھی نفرت ہوگئی تھی جینے سے۔ بس لگتا تھا دنیا ایسی ہی ہوتی ہے پھیکی بے رنگ، تنگ و تاریک، پر اب لگتا ہے دنیا تو میرے رب نے شاندار بنائی ہے۔ جینے کا مزا آ رہا ہے.....'' وہ بیگ سے مزید چیزیں نکالتے ہوئے بولی۔ پھر اریبہ کی طرف دیکھ کر قدرے سرگوشی سے بولی۔ ''میری مانو تو، تم بھی شادی ایسے ہی کسی امیر کبیر آدمی سے کرنا۔ نیلو کی طرح ایویں فضول سے غریب، سیلف میڈ ٹائپ سے نہیں۔ اور نہ ہی اماں کی بات مانتے جی حضوری کا مظاہرہ مت کر بیٹھنا۔ اپنے حق کے لیے لڑنا پڑتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ بندہ جو گمان کرتا ہے نا تو اسے مل بھی جاتا ہے.....''

وہ بولتے بولتے یکدم چپ ہوگئی۔ اماں کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

''کیا پٹیاں پڑھا رہی ہو اسے۔'' اماں نے گیلے ہاتھ دوپٹے کے پلو سے پونچھتے ہوئے کھوجتی نظروں سے ارسلہ کو دیکھا۔

''ارے کچھ نہیں اماں۔ آپی کی شاپنگ تو دیکھیں۔ غضب کی چیزیں ہیں اور اتنی مہنگی مہنگی ہیں دیکھیں تو ذرا۔'' اریبہ نے جلدی سے بات بدل کر ان کی توجہ مسہری پر بکھری چیزوں پر کر دی۔

''ہاں ہاں..... خیر سے دیکھ رہی ہوں سب بہت اچھا ہے، خدا اسے اور زیادہ دے۔'' اماں ارسلہ کے چہرے پر محبت بھری نظر ڈال کر کر چیزیں دیکھنے لگیں۔ انہیں چیزوں سے زیادہ ارسلہ کو خوش اور مسرور دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی۔

''آبص بھائی کے لیے بھی تو خوب شاپنگ کی ہوگی۔ کیا کیا لیا ان کے لیے۔ انہیں آپ کی چوائس کیسی لگی۔'' اریبہ دلچسپی سے پوچھنے لگی۔ ''اور رومی کے لیے کیا کیا لیا آپ نے؟ وہ تو بہت جان چھڑکتی ہے آپ پر۔''

''بس رہنے دو اب شادی تو نہیں ہو رہی تھی کسی کی کہ میں سب کے لیے تحفے تحائف سمیٹتی پھرتی۔ بس اتنے مختصر ٹائم میں اپنے لیے ہی تھوڑا بہت لے سکی۔ وہ اماں کی طرف دیکھ کر جیسے وضاحت دینے لگی۔ اریبہ کی آنکھوں میں جھلکتی حیرت پر وہ جیسے چڑ سی گئی۔

''چلو اٹھو۔ اور جا کر فروٹ کاٹ کر لے آؤ۔ کب سے چیزوں پر مری جا رہی ہو۔'' اس نے بیگ کی زپ کھول کر کپڑے ایک طرف کیے اور ساتھ اریبہ کو ہلکے سے جھڑکا۔ اریبہ جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔

''ارے واہ۔ میں کوئی مری نہیں جا رہی ہوں آپ کی چیزوں پر۔ بس ایسے ہی پوچھ لیا۔'' اریبہ کو اچھا خاصا ہتک کا احساس ہوا تھا۔ وہ ناگواری نظر ارسلہ پر ڈال کر اٹھ گئی اور کمرے سے نکل گئی۔

''آبص کے لیے بھی کچھ لے آتیں۔ شوہر ہے تمہارا۔ اسے اچھا لگتا۔ یوں بھی وہ تمہارے ہمراہ نہیں تھا تو ضرور لانا چاہیے تھا۔'' اماں کو بھی بے حد کھلا تھا آبص کے لیے وہ کوئی تحفہ نہیں لائی تھی۔

وہ اپنا سارا سامان بیگ میں رکھ چکی تھی، اماں کی بات پر جھنجلا کر بیگ کو ایک طرف دھکیلا (ہر کسی کو آبص کی فکر پڑ گئی ہے۔ کبھی ساس صاحبہ اب اماں)

''اماں۔ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے ایک سے بڑھ کر ایک چیز ہے ان کے پاس۔ پرفیومز، گھڑیاں، جوتے، موزے، کپڑے،'' وہ قدرے بھنا کر بولی۔

''تحفہ ضرورتاً نہیں دیا جاتا محبتاً دیا جاتا ہے نگوڑی۔ مگر تمہاری اس موٹی عقل میں یہ بات آئے تب نا۔'' اماں پیشانی پر ہاتھ مار کر اسٹول سے اٹھ گئیں۔

''موٹی نہیں لالچی عقل کہیں اماں۔'' اریبہ فروٹ پر چھری چلاتے ہوئے بڑبڑائی۔

''اونہہ! جیسے ہم ان چیزوں پر مرتے ہیں۔ غرور دیکھیں ذرا ان محترمہ کا۔''

اس نے سیب کا چھلکا اتار لیا تھا اب باریک باریک قاشیں کاٹتے ہوئے ارسلا پر نظر ڈالی جو صحن میں آکر تخت پر براجمان ہو گئی تھی۔

''پہلے محترمہ یہی سیب چھلکے سمیت دانتوں سے کتر کر کھا لیتی تھیں اب چھیل کر قاشیں کاٹ کر دو محترمہ کو۔ ایویں کے نخرے۔'' اس نے پلیٹ اس کے آگے پٹخنے کے انداز میں رکھ دی۔ اور جھاڑو اٹھا کر صحن میں دینے لگی۔

☆☆☆

ابا کو اپنا وجود کسی بھاری سل کے نیچے دبا محسوس ہو رہا تھا وہ بامشکل گھر پہنچے۔ گھر میں گھستے ہی نظر ارسلہ پر پڑی جو مزے سے صحن میں رکھے تخت پر لیٹی سیب کی قاشیں اٹھا اٹھا کر منہ میں ڈال رہی تھی اور ساتھ ساتھ موبائل فون پر [illegible] رہی تھی۔ ابا کا دل رنج سے شق ہو گیا۔ وہ ابا کو دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ابا نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو ان کا ہاتھ واضح طور پر کپکپا رہا تھا۔ وہ یک دم پلٹے اور اپنے کمرے کی جانب چل دیے۔

اماں ابا کو دیکھ چکی تھیں۔ چٹنی بنا کر ہاتھ دھو کر کچن سے نکلیں۔

''کہاں ہیں تمہارے ابا؟''

''اپنے کمرے میں۔'' ارسلہ پھر اسی پوزیشن میں لیٹ گئی۔

''ارے، بیٹھے نہیں تمہارے پاس؟''

''تھکے ہوئے ہوں گے۔'' وہ لیٹے لیٹے بولی۔

''چلو دیکھتی ہوں۔ کام بھی آج کل بہت بڑھ گیا ہے تھک تو جاتے ہیں خیر، اور تم اب نکلنے کی مت کرنا۔ کھانا کھا کر جانا۔ تمہارے ابا خوش ہوں گے۔'' اماں دوپٹے کے کنارے سے گیلے ہاتھ پونچھتے ابا کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے ساتھ اسے بھی تاکید کرتی گئیں۔

''مجھے تو معاف ہی رکھیے اماں۔ مجھ سے نہیں اترتے آپ کے گھر کے یہ بدذائقہ کھانے۔''

''اچھا اچھا ابھی بیٹھو۔'' اماں سنی ان سنی کرتے ہوئے ابا کے کمرے میں جا چکی تھیں جہاں ابا پریشانی کے عالم میں بس ٹہلتے ہوئے نظر آئے۔

''کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ یہ چک پھریاں کیوں کھا رہے ہیں؟'' اماں انہیں متفکر دیکھ کر ہول سی گئیں۔

ابا چونکے پھر گہری سانس بھر کر مسہری پر بیٹھ گئے۔

''ادھر بیٹھو تم بھی۔ بہت پریشان کن خبر لایا ہوں۔ جب سے پتا چلا ہے دکان پر بھی نہ جا سکا۔''

''خدا خیر کرے۔ کیا ہوا۔'' اماں سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اور مزید ابا کے نزدیک ہوئیں۔ ''کون سی بری خبر۔''

''بری نہیں، پریشان کن۔'' ابا افسردگی سے بولے۔
''اب بتایئے بھی۔ خود کو ہلکان کیے جارہے ہیں۔'' اماں بے چین ہوگئیں۔
''اکبر صاحب سے ملنے آفس گیا تھا، یونہی آج بیٹھے بٹھائے آبص سے ملنے کو دل کر گیا۔ وہ تو گھر آتا نہیں ہے ارسلہ کے ہمراہ، سوچا خود ہی جا کر طبیعت پوچھ لوں۔ مگر نہ اکبر جیلانی سے ملاقات ہوئی نہ آبص سے مگر وہاں میرا پرانا دوست ہاشم مل گیا۔ اس کے ہمراہ باتیں کرتے چائے کے کھوکھے پر جا کر بیٹھ گیا.....'' ابا پل بھر رکے اور سانس بحال کی۔ ''اسے پہلے تو پتا نہیں تھا کہ آبص میرا داماد ہے جب پتا چلا تو کتنی دیر تو یقین ہی نہیں آیا اسے۔''
''تو اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے بھلا۔ ظاہر ہے اس نے کب سوچا ہوگا کہ آبص جیلانی ہمارا داماد ہوسکتا ہے۔'' اماں نے الجھ کر انہیں دیکھا۔
''اری نیک بخت۔ یہ بات پریشان نہیں کر رہی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ آبص کے پاؤں کا مسئلہ تو سال ڈیڑھ سال پرانا ہے اس کا ایکسیڈنٹ ابھی نہیں ڈیڑھ سال پہلے ہوا تھا۔'' ابا دھیرے سے بولے۔ اماں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ''ہاں اور یہ بھی کہ کسی لڑکی کا چکر تھا۔''
''لڑکی.....!''
''ہاں.....دباؤ ڈال کر اس کی شادی کرائی ہے اکبر جیلانی نے۔'' ابا بے حد نڈھال سے نظر آنے لگے پھر اماں کو ساری باتیں جو آبص کے ماضی سے منسلک تھیں بتانے لگے، اس کا عشق اور عشق میں ناکامی کے بعد اس کی دماغی حالت پھر اس کا ایکسیڈنٹ.....
اماں تو یہ سب سن کر دھک سے رہ گئیں۔
''اتنا بڑا دھوکا۔ میرے خدا۔'' اماں تڑپ کر مسہری سے اٹھیں۔

☆☆☆

میرا سوچنا تیری ذات تک
میری گفتگو تیری بات تک
نہ تم ملو جو کبھی مجھے
میرا ڈھونڈنا تجھے پار تک
کبھی فرصتیں جو ملیں تو آ
میری زندگی کے حصار تک
میں نے جانا کہ میں تو کچھ نہیں
تیرے پہلے سے تیرے بعد تک

وہ آفس سے نکل کر گھر جانے کے بجائے یوں ہی بے مقصد سڑکوں پر گاڑی بھگاتا رہا۔ آج آٹھ تاریخ تھی۔ ٹھیک اسی تاریخ کو نادیہ شاہ جدا ہوئی تھی۔ وہ جاپان کے دورے سے لوٹا تھا، اس کے سفری بیگ میں کئی چھوٹے چھوٹے گفٹس تھے جو وہ اسے دینے کو بے چین تھا۔ مگر مام کے جملے اس کی ساری خوشی، بے قراری اور جوش و خروش کو بجھا کر راکھ کر گئے تھے۔
''اس کا نکاح ہوگیا ہے۔ اس کے کسی کزن سے۔'' مام نے روتے ہوئے اسے بتایا تھا۔
فقط تین ہفتوں میں اس کی دنیا بدل گئی۔ اس کے پیروں سے زمین نکل گئی۔ وہ جیسے ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا تھا۔
''میلیو می آبص! میں نے تو تمہاری خاطر اس گھر کی چوکھٹ ہی پکڑ لی تھی۔ مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ میری

منت، سماجت کسی کام نہ آئی۔'' مام کے آنسو مسلسل ٹشو میں جذب ہو رہے تھے اور اس کے دل میں۔
غم زدہ لہجہ، دکھی انداز..... آنسو سے بھیگی آنکھیں مگر اسے پھر بھی یقین نہ آ رہا تھا، وہ بے یقین نظروں سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔

''کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں۔'' انہوں نے اس کے کندھوں کو نرمی سے چھوا۔
وہ چونکا۔ اور خالی نظروں سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔

''جاؤ اور جا کر اپنے پاپا سے پوچھو۔ وہ بتائیں گے کہ میں بار بار اس لڑکی کے گھر جاتی رہی ہوں۔ تمہاری خاطر میں نے اپنی ایگو ختم کر دی۔ اپنی ضد چھوڑ دی۔ اسٹیٹس کا فرق بھلا دیا۔ اپنا غرور، تکبر سب بھلا کر اپنا آنچل ان کے قدموں میں رکھ دیا۔ کتنا گڑگڑائی میں کہ نادیہ شاہ کو میرے آبص کے نام کر دیں۔ مگر انہوں نے مجھے نادیہ کا نکاح نامہ دکھا دیا۔ اور کہا کہ یہ سب نادیہ کی رضامندی سے ہوا ہے، وہ تو بچپن سے اپنے کزن سے منسوب تھی۔ آبص کو تو وہ محض دوست سمجھتی رہی ہے۔''

''جھوٹ بول رہی ہیں اس کی ماں۔'' وہ فرط رنج سے پھٹ پڑا تھا۔ ''سراسر جھوٹ۔ وہ..... وہ منسوب تھی، نہ وہ رضامند ہو سکتی تھی۔''

''ہاں، مجھے بھی پہلے یہی خیال آیا کہ اس کی ماں جھوٹ بول رہی ہیں، مگر جب میں نے اس کے نکاح کی ویڈیوز اور پکس دیکھیں تو مجھے اس کی ماں کی باتوں پر یقین کرنا پڑا۔ وہ ہر پک میں بہت خوش دکھائی دے رہی تھی، اپنے شوہر کے ہمراہ بیٹھی مطمئن لگ رہی تھی اور مکمل بھی۔''

''مام.....!'' اس نے تڑپ کر انہیں مزید کہنے سے روک دیا۔

''میں بھی ہرٹ ہوئی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جس لڑکی کے لیے تم اتنے دیوانے ہو رہے ہو وہ ایک بے وفا لڑکی نکلے گی۔'' مام کے لہجے میں بے بسی دکھ چیخ رہا تھا۔

''بیلیو می۔ میں نے تمہارے لیے کیا نہیں کیا مگر شاید یہی بہتر ہو تمہارے حق میں۔ اسی شاطر اور بے وفا لڑکی کی حقیقت کھل گئی ہمارے سامنے.....''

اس نے سارے گفٹس توڑ ڈالے تھے، اس کا تو دل چاہ رہا تھا ساری دنیا کو توڑ کر رکھ دے۔ بکھیر دے۔ جس طرح اس کا دل بکھر کر رہ گیا تھا۔

گھٹن کا احساس یک لخت غالب آنے لگا تو اس نے ایک گہری سانس کھینچی اور اپنے اردگرد دیکھا پھر ڈرائیور کو گاڑی روکنے کو کہا۔ وہ ایک ریسٹورنٹ تھا جہاں وہ اکثر آنے لگا تھا۔ فقط اس وجہ سے کہ ایک بار اس نے نادیہ شاہ کے ساتھ یہاں لنچ کیا تھا۔ وہ دن اسے پھر یاد آنے لگا۔ اس نے اسے سرپرائز دیا تھا اسی ریسٹورنٹ اس کی برتھ ڈے سلیبریٹ کر کے۔ اس نے بہانے سے اسے بلایا تھا یہ کہہ کر کہ اس کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، اس کے بازو پر چوٹ لگی ہے اور وہ مزید گاڑی ڈرائیو نہیں کر سکتا اور وہ قریب کے ریسٹورنٹ میں آ کر بیٹھ گیا ہے۔

وہ پریشان ہو کر گویا اڑتی ہوئی آئی تھی۔ چہرے پر پریشانی ہویدا تھی۔ ادھر اُدھر نظریں دوڑاتی آبص کو ڈھونڈتی اس میز تک آئی تو وہاں آبص کو نہایت اطمینان سے کرسی پر بیٹھا دیکھ کر وہ ٹھٹکی پھر مشکوک انداز میں گھورنے لگی۔

''تم..... تم تو وہ..... ایکسیڈنٹ.....'' وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ ویٹر ٹرے میں بڑا سا دل کی شکل کا کیک لے کر میز پر رکھ گیا۔ وہ کیک کو حیرت سے دیکھنے لگی۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔'' آبص کرسی سے اٹھا اور اس کے نزدیک آیا۔ پھر اس کی حیرت اور خفگی سے گھورتی

آنکھوں میں اپنی خوش نما آنکھیں ٹکاتے ہوئے دھیرے سے بولا۔ ''ہیپی برتھ ڈے مائی سویٹ فرینڈ اینڈ مائی نو۔''

نادیہ شاہ یک دم خفیف سی ہو کر پلکوں کی باڑھ گرا کر پیچھے ہٹی۔

میرا سوچنا تیری ذات تک
میری گفتگو تیری بات تک
میں نے جانا کہ میں کچھ نہیں
تیرے پہلے سے تیرے بعد تک

مدھم سی سرگوشی، محبت بھرا لہجہ نادیہ شاہ کے کانوں کی لوؤں تک میں سرخی دوڑ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی یا مزاحمتی انداز اختیار کرتی اس نے کرسی اس کے آگے پیش کر دی۔

''اب اسے کاٹنا بھی ہے اور کھانا بھی۔''

''یو آر چیٹر۔'' وہ زیادہ خفگی نہ دکھا سکی تھی۔ اس کی محبت کے اس انداز نے اس کا غصہ بجھا کر رکھ دیا تھا۔

''رئیلی۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

''بالکل۔'' وہ مصنوعی خفگی دکھانے لگی پھر ہنس دی۔

''ایٹ لیسٹ مجھے بتا تو دیتے۔ میں کس قدر پریشان ہو گئی تھی۔ جان ہی نکال دی تھی تم نے تو میری۔''

''جان ہی تو نکال دینا چاہتا ہوں۔'' وہ از خود رفتہ سا اسے دیکھنے لگا۔

''اچھا اب زیادہ رومانٹک ہیرو بننے کی ضرورت نہیں۔''

وہ نظریں چرا کر چھری اٹھانے لگی۔ اس کی آنکھوں سے چھلکتی محبت اسے گھبرائے دے رہی تھی۔ موم بتی بھی بجھانا بھول گئی اور چھری کیک پر چلا دی۔

''ارے رے..... یہ کیا..... یہ تو بجھاؤ۔'' اس نے لائٹر سے روشن کی ہوئیں موم بتیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''ان کو بجھانے سے احساس ہوگا کہ زندگی کا ایک سال کم ہو گیا جبکہ میں اب بہت زیادہ جینا چاہتی ہوں۔ دل چاہتا ہے سال کم نہ ہو، بلکہ عمر میں اضافہ ہو جائے۔ وقت تھم جائے یہیں اسی جگہ رک جائے۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

آبص کے لبوں کی تراش میں موجود مسکراہٹ گہری ہو گئی، وہ اس کا مخروطی انگلیوں والا ہاتھ تھامنا چاہتا تھا مگر اس کے شرم اور حیا ہو جانے کے ڈر سے فقط دیکھ کر رہ گیا پھر کیک کا ٹکڑا اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اتنی خوب صورت بات اتنے خوب صورت لہجے میں کرو گی تو وقت تو نہیں البتہ میرا دل ضرور ٹھہر جائے گا۔''

''ارے.....'' وہ خفیف سی ہو کر خود فراموشی سے نکلی تھی گویا، پھر کیک اس کے ہاتھ سے لے کر اپنے منہ میں ڈالتے ہوئے مسکرا دی۔

''تھینک یو۔ مجھے تمہاری یہ ادا ہمیشہ یاد رہے گی۔'' وہ ٹشو اٹھا کر لبوں پر پھیرنے لگی۔

آبص نے ایک گہری سانس سینے کی تہ سے کھینچ کر فضا کے سپرد کر دی۔

پتا نہیں اسے یہ ادا یاد رہی تھی یا بھلا دی تھی مگر وہ اسی طرح کی کئی شاموں کے حصار میں اب تک بندھا چلا آ رہا تھا۔ ایک اضطراب اس کی زندگی میں اتر آیا تھا جو اسے سکون نہیں لینے دے رہا تھا۔ وہ اس سے زیادہ ملتی جلتی نہیں تھی، اس طرح کی میل ملاقات سے اجتناب کرتی تھی۔ اچھا ہی کرتی تھی، یادوں میں اضافہ ہی ہوتا.....

نا آسودگی میں یہ یادیں سوائے اذیت دینے کے کچھ نہیں دیتیں۔

وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہوگیا اور اپنی مخصوص میز پر چلا آیا۔ جہاں وہ آخری بار اس کے سامنے اسی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس وقت اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جائے گی۔

اس کے دل میں درد سا پھیلتا رگ رگ کو چھونے لگا۔ گھٹن کا احساس شدت اختیار کرنے لگا۔ اس پل اس کا دل چاہا ارسلہ اس کے ہمراہ ہوتی تو اچھا ہوتا شاید وہ بہل جاتا۔ اس سے اپنا سارا غم کہہ کر ہلکا پھلکا ہو جاتا۔ کچھ تو بوجھ اترتا۔ وہ اس اضطراب سے نکلنا چاہتا تھا۔ بے کلی کے اس عذاب سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ وہ نادیہ شاہ کی یادوں کے اس قید خانے سے فرار ہونا چاہتا تھا۔ یہ بیڑیاں سوائے زخمی کرنے کے کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ اس کی دانست میں ایک ہی حل تھا، اس اضطراب سے، اس اذیت سے نکلنے کا کہ وہ سوچنا چھوڑ دے۔ ماضی سے اس کا رشتہ ٹوٹ جائے، دل پر بے حسی کی برف جمالے تاکہ ساری سوچیں منجمد ہو جائیں۔ ہر احساس سرد ہو جائے۔ ماضی کی کوئی یاد دستک نہ دے سکے اور وہ حال میں خود کو گم کرنے کی کوشش کرے۔ شاید سکون مل جائے۔

وہ یک دم کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔ ویٹر اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ وہ پلٹ کر ریسٹورنٹ سے نکل آیا۔

وہ سوچ رہا تھا اس ریسٹورنٹ میں اب وہ اکیلا نہیں آئے گا بلکہ ارسلہ کو لے آیا کرے گا۔ اسے اکیلے دیکھ کر یادیں اسے پھر چور اور بے ایمان سا بنا دیتی ہیں۔ وہ اپنے دل کی عدالت میں مجرم بن جاتا ہے۔

ارسلہ کا مجرم..... اپنی اس محرم کا مجرم۔

وہ گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

اماں روئے جا رہی تھیں۔ اریبہ کو چپ کرانا مشکل ہو گیا تھا۔ ارسلہ البتہ چپ چاپ ایک طرف بیٹھی تھی قطعاً کسی طرح کے صدمے سے آزاد۔

''تم نے ہم سے کیوں چھپایا ارسلہ! یہ اتنا بڑا دکھ اکیلے اٹھائے پھر رہی ہو۔'' اماں جذباتی ہو کر یک دم اٹھیں اور اسے خود سے لپٹا لیا۔ ''اتنا بڑا دھوکا کھا کر بھی خوش باش دکھائی دیتی ہو۔ کیوں..... کیوں برداشت کیے جا رہی ہو۔ ہمیں کیوں نہیں بتایا۔'' اماں کے آنسو کسی طور رک نہ رہے تھے۔

جواباً اس نے سکون کے ساتھ اماں کو ہٹا کر مسہری پر بٹھا دیا پھر ابا کی طرف دیکھا۔

''کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے ابا۔ اپر کلاس میں لڑکوں لڑکیوں کے گرل بوائے فرینڈ ہوتے ہیں اور چھوٹے موٹے افیئرز چلتے رہتے ہیں۔ آبس کا بھی تھا سال بھر پہلے اب تو نہیں ہے نا۔ آپ بھی نا اماں بھل بھل رونا شروع کر دیتی ہیں اتنی سی بات پر۔''

''اتنی سی بات..... یہ چھوٹی بات کہاں سے ہو گئی اور یہ اس کے پیر کا لنگ..... یہ چھوٹی بات ہے۔'' ابا الجھ کر اسے دیکھنے لگے۔

''او ہو ابا۔ ایک آپریشن ہو گا تو ٹھیک ہو جائے گا ناں۔''

ابا حیرت میں تھے، الجھی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ دن بھر وہ اس تکلیف دہ انکشاف کی زد میں رہے تھے۔ اعصاب چٹخ گئے تھے کہ ارسلہ کو کیسے بتائیں گے۔ اس راز سے پردہ اٹھے گا تو ان کی بچی کس قدر زخمی ہو گی، بکھر جائے گی، کیسے سنبھالے گی خود کو۔ مگر یہاں تو مطلق پروانہ تھی بلکہ پہلے سے سب کچھ آشکار تھا اس پر اور وہ مطمئن اور شاد نظر آ رہی تھی۔

ابا پلٹ کر کمرے سے چلے گئے تاکہ وہ کھل کر ماں سے بات کر سکے۔ وہ یہ خیال کرنے لگے کہ شاید وہ باپ کے سامنے رونا نہ چاہتی ہو۔ اپنا دل ہلکا نہ کرنا چاہتی ہو۔ ان کے کمرے سے نکل جانے پر وہ ماں کے پاس بیٹھ کر

دل ہلکا کرلے گی۔ مگر یہاں معاملہ کچھ اور ہی تھا وہ اماں کو مطمئن کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

''تم کچھ بھی کہو، دھوکا تو ہوا ہے ہمارے ساتھ۔ وہ امیر کبیر ہیں تو اس کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ ہم اپنی ہیرے جیسی بیٹی چار پیسوں کے لیے ان کے اپاہج بیٹے سے بیاہ دیتے۔ جھوٹ بولا ہے انہوں نے ہم سے۔'' اماں جلال میں آ گئی تھیں، جیسے ابھی اٹھ کر مہوش کا جا کر گریبان پکڑ لیں گی۔

''تو میں کب انکار کر رہی ہوں اس بات سے۔ جھوٹ بولا ہے، دھوکا دیا ہے۔ جانتی ہوں میں بھی۔'' وہ سر پر ہاتھ مار کر اماں کے نزدیک آ کر بیٹھ گئی۔ ''سمجھو اماں، سمجھو۔ جا کر آپ ان سے لڑیں گی تو کون سا فائدہ حاصل کرلیں گی۔''

''کیا مطلب..... تو کچھ بھی نہ بولوں۔ اتنے بڑے راز سے پردہ اٹھا ہے تو چپکی بیٹھی رہوں۔'' اماں نے اسے گھورا۔

''ہاں چپکی بیٹھی رہیے اور تماشا دیکھتی رہیے۔''

''تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو۔''

''اماں۔ میری ساس عمر بھر اسی بات پر بلیک میل ہوتی رہیں گی کہ انہوں نے دھوکا دیا ہے ہمیں۔''

''آئے ہائے۔ کیسا بلیک میل۔''

''توبہ ہے اماں۔'' ارسلہ سر پکڑ کر رہ گئی۔ ''بس میں کہتی ہوں نا۔ آپ چپکی بیٹھی رہیے، کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے میرے سسرال والوں کو اور نہ آبص کو۔ میں خوش ہوں۔'' وہ اماں کے نزدیک سے اٹھ گئی۔

''ارے ایسے کیسے خوش ہو؟'' اماں بھی اٹھیں۔ ''ایک اپاہج کے ساتھ۔ بھاڑ میں گئے ایسے پیسے۔''

''اماں! بات کو سمجھیں۔'' اس نے جھٹکے سے اماں کو بازو سے پکڑ کر روکا۔ ''بات یہ ہے کہ میں جو یہ عیش کر رہی ہوں نا، یہ اسی وجہ سے ہے۔ سوچیں اگر ان کا بیٹا اپاہج نہ ہوتا، یہ فالٹ اس میں نہ ہوتا تو وہ میرے جیسی غریب لڑکی کو بہو بنانے کیوں آتیں۔ اس کوٹھی میں کوئی ان کی ہی کلاس کی لڑکی آج بہو بنی ہوتی۔ میں نہ ہوتی۔ ایویں نہیں آ جاتے غریب کی لڑکی لینے کوئی۔'' اس کے انداز میں جھنجلاہٹ تھی۔ اماں ہونقوں کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''آج میں یہ جو عیش کر رہی ہوں، دبئی تک ہو آئی ہوں۔ کل دنیا گھوم لوں گی۔ میرے اکاؤنٹ میں لاکھوں روپے ہیں، یہ مزے کر رہی ہوں..... ایسے ہی نہیں، یہ ان کے بیٹے کے اسی نقص کی وجہ سے کر رہی ہوں۔'' آخری بات کہتے ہوئے فخریہ انداز میں مسکرائی۔

''آپ کی یہ ہیرے جیسی بیٹی کو کوئی کروڑ پتی نہیں ملنے والا تھا اور آپ مجھے بھی ایسے ہی ٹھٹھوٹ پونجیے سے بیاہ دیتیں اور میں کسی چھوٹے سے گھر میں ہانڈی چولہا کر رہی ہوتی۔ یہ سب اسی وجہ سے ہے۔'' اس نے ابرو چڑھا کر اماں کے گال تھپتھپائے۔ ''یہ گاڑی، یہ بینک بیلنس..... گھومنا پھرنا..... یہ مزے..... نوکر چاکر.....''

اماں پر تو حیرت اور دکھ سے سکتہ طاری ہونے لگا۔

''تو تجھے کوئی دھچکا نہیں لگا۔'' وہ بمشکل بول پائیں۔

''مجھے تو شادی سے پہلے بھی خبر ہو جاتی ان سب باتوں کی تب بھی میں اسی رشتہ پر راضی ہوتی، یہیں شادی کرتی۔ پیسا قسمت والوں کو ملتا ہے اماں۔ ہر تو سب کو مل جاتا ہے پر پیسا نہیں ملتا۔ عمریں نکل جاتی ہیں ایک ایک کوڑی جمع کرتے کرتے۔ خواہشوں کو روندتے روندتے، پھر کہیں جا کر یہ چھوٹا سا کوارٹر نما گھر بنتا ہے۔'' اس نے صحن میں طائرانہ نگاہ ڈالی۔

اماں اس کی باتیں سن کر سر پکڑ کر رہ گئیں۔ خدایا! یہ لڑکی پاگل تو نہیں ہوگئی۔

ادھر اریبہ گلاس کولر پر رکھتے ہوئے ایک گہری سانس کھینچ کر رہ گئی۔

''بس میری بات کان کھول کر سن لیں اماں۔ خبردار جو میری ساس کو فون کر کے کچھ کہا، ایسی ویسی بات کی۔'' اس نے اپنا شولڈر بیگ اٹھا کر اماں کو خبردار کیا اور چپلیں پیروں میں گھسائیں۔ ''سب کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔''

وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ اماں یوں ہی مسہری پر دکھ صدمے سے نڈھال بیٹھی رہیں۔

''آپ ناحق پریشان ہو رہی ہیں اماں۔ آپی کو یہی سب چاہیے تھا، انہوں نے دولت کی تمنا کی تھی انہیں مل گئی۔ وہ پیسا حاصل کرنے کے لیے کسی کا قتل بھی کر سکتی تھیں۔ جانتی تو ہیں آپ ان کی فطرت۔ اب وہ خوش ہیں بلکہ بے حد خوش۔ تو آپ اور ابا کیوں ہلکان ہو رہے ہیں۔'' ارسلہ کے جانے کے بعد اریبہ دیر تک اماں کو تسلیاں دیتی رہی۔ ان کا غم ہلکا کرتی رہی۔

''ذہن پر غیر ضروری بوجھ نہ لیں۔ آپی خوش ہیں تو بس اور کیا چاہیے آپ کو۔''

اماں نے اس کے ہاتھ سے سر درد کی گولی لیتے ہوئے سر ہلا دیا اور دونوں گولیاں منہ میں ڈال کر پانی کا گلاس منہ سے لگا کر تین گھونٹ بھرے پھر گلاس اریبہ کو تھما کر وہیں مسہری پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

چار پیسوں کے لیے وہ اس حد تک جا سکتی تھی، ایک اپاہج، ایک نامراد عاشق کو اپنا لے گی۔

☆☆☆

مہوش پر عجیب بے کلی طاری تھی، جب سے دبئی سے لوٹی تھیں کسی پل قرار نہ تھا۔ احساس جرم کچوکے لگا رہا تھا کہ انہوں نے آبص کی ساتھ یہ کیا کر دیا تھا۔

''ایک غلط بلکہ خود غرضانہ فیصلہ عمر بھر کے لیے پچھتاوا دے جاتا ہے، بے سکونی، بے اطمینانی بھر جاتا ہے۔'' اکبر جیلانی انہیں بے کل دیکھ رہے تھے، چشمہ آنکھوں سے اتار کر کتاب سرہانے رکھ کر ہاتھ کے اشارے سے انہیں بیٹھنے کو کہا۔

''ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ خود غرض بن گئی تھی میں محبت میں۔'' وہ افسردگی سے بولیں۔ ''میں نے اپنے بچے کے ساتھ بہت کیا برا اکبر۔ وہ ارسلہ جیسی لڑکی کو ڈیزرو نہیں کرتا۔''

''کم آن۔ جو ہو گیا اس پر رونے کا، سر پیٹنے کا کیا فائدہ۔ آگے اچھا ہو جائے اس پر سوچنا ہے اب۔'' اکبر جیلانی نے نرمی سے انہیں دلاسا دینا چاہا۔

''آگے کچھ اچھا ہوتا دکھائی نہیں دے رہا ہے مجھے۔ اس لڑکی نے مجھے عاجز کر کے رکھ دیا ہے اکبر۔ میں حیران ہوں کہ آبص سے زیادہ اسے دولت کی چاہ ہے اور اتنی زیادہ کہ آبص کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔'' وہ رنج کی کیفیت میں تھیں۔

''ایک پیاسا انسان پانی دیکھ کر اپنی پیاس بجھائے گا۔ اس کے نزدیک پہلی ترجیح اپنی پیاس بجھانا ہوگی اور پیاس دولت کی ہو تو وہ کبھی نہیں بجھتی ہے۔'' اکبر جیلانی نے تاسف سے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ اس کی پیاس بھی لگتا نہیں ہے بجھے گی چونکہ اس کا مقصد فقط پیاس بجھانا ہے۔ میں نے بھی فقط حسن دیکھا اور سوچا کہ آبص مرد ہے، عورت کی خوب صورتی کا اسیر ہو جائے گا..... بھلا دے گا نادیہ شاہ کو۔''

''یہ تمہاری خام خیالی تھی۔'' اکبر جیلانی افسردگی سے مسکرائے۔ ''حسن کی چمک دمک عارضی ہے۔ مصنوعی روشنی نہیں کردار کی روشنی دل کو منور کرتی ہے۔ اسیر تو وہ تھا ہی نادیہ شاہ کا۔ حسن پر مرمٹنے والا ہوتا تو وہ نادیہ شاہ کو پسند نہ کرتا۔ اس کے سرکل میں بہت خوب صورت لڑکیاں آل ریڈی موجود تھیں۔''

مہوش تڑپ سی گئیں۔ وہ سچ ہی تو کہہ رہے تھے، آبص کی ڈیمانڈ حسن کی کب تھی۔ وہ بے رنجیدہ اور دل

گرفتہ دکھائی دے رہی تھیں۔

''جس رشتے کی بنیاد ہی دھوکے پر رکھی گئی ہو وہ عمارت کیسے مضبوط اور پائیدار اور خوش نما ہو سکتی ہے مہوش۔ تم نے پہلی اینٹ ہی غلط رکھی ہے۔ اب قائم رہ جائے یہی بہت ہے، اسی میں عزت ہے۔''

وہ خود بھی دل گرفتہ دکھائی دے رہے تھے۔ آبص کی حالت ان سے چھپی تو نہ تھی۔ انہیں افسوس ہونے لگا کہ انہوں نے اس گھر کے سربراہ ہوتے ہوئے کیوں کمانڈ عورت کے ہاتھ میں سونپ دی تھی۔ ایک ناسمجھ جذباتی عورت کے ہاتھ..... مرد کو اللہ نے حاکم اسی لیے بنایا ہے کہ وہ جذبات اور دل سے نہیں عقل سے فیصلہ کرتا ہے اور کرنا چاہیے۔ دل کے فیصلے بہت سے رویوں کے تابع ہوتے ہیں۔ نفرت، غصہ، تعلق، عقل ان سے ماورا ہوتے ہیں۔ اب جتنا افسوس کرتے کم تھا۔ مہوش کی ہاں میں ہاں ملانے اور چپ رہ کر تماشا دیکھنے والے بن جانے کی اذیت تو اب وہ خود بھی اٹھا رہے تھے۔

''خدایا۔ یہ میرا قصور ہے، کتنا بڑا ظلم کر دیا ہے میں نے اپنے بچے پر۔''

مہوش کو اتنا رنجیدہ دیکھ کر اکبر جیلانی نے نرمی سے انہیں تھاما۔

''جتنا سوچو گی، اتنا بکھرتی رہو گی۔ جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ اب آگے سوچنا ہے کہ ہمیں کس طرح ارسلہ اور آبص کے درمیان موجود ان فاصلوں کو کم کرنا ہو گا۔ میں آبص کو سمجھاتا رہوں گا۔ تم ارسلہ کو پیار محبت سے سمجھاتی رہو۔'' انہوں نے اس کے کندھے پر ہلکے سے تھپکی دی۔

☆☆☆

آبص آفس سے لوٹا تھا۔ کمرے میں آیا تو ارسلہ ڈریسنگ کے دلکش آئینے کے سامنے کھڑی نوک پلک سنوار رہی تھی۔ میرون سلک کی کامدانی کرتی میں اس کی اجلی رنگت دمک رہی تھی۔ بال پشت پر کھلے تھے۔ وہ آنکھوں پر شیڈ کا آخری ٹچ دے رہی تھی۔

آبص کا چونکنا فطری تھا۔ وہ شادی کے بعد پہلی بار اتنے اہتمام سے تیار ہو کر اس کے سامنے تھی۔ آئینے میں اس کا سراپا ابھرا تو وہ میک اپ کٹ بند کر کے پلٹی پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

''کیسی لگ رہی ہوں؟''

''ہوں..... کہیں جا رہی ہو۔'' وہ نظریں یک دم اس کے سراپے سے ہٹا گیا۔

''آپ کا کیا خیال ہے، یہ اتنا اہتمام میں نے آپ کے لیے کیا ہے۔'' وہ ابرو اچکا کر ہنس دی پھر رخ موڑ کر اپنا جائزہ ازسرِنو لینے لگی۔

آبص بیڈ کی طرف بڑھتے بڑھتے ذرا سا رکا، جیسے ہلکی ٹھوکر لگی ہو۔

''کر بھی سکتی ہو۔'' وہ آہستگی سے کہتا بیڈ کے کونے پر ٹک گیا اور کلائی سے گھڑی اتار کر سائڈ پر رکھی۔ پرس اور موبائل بھی رکھا۔

''رومی کے ساتھ جا رہی ہوں، اس کی فرینڈ کی مایوں ہے۔ بڑا مزا آئے گا۔ مجھے تو ایسے فنکشن اٹینڈ کرنے کا بہت شوق ہے۔ بہت بڑے پیمانے پر ارینج کی ہے مایوں۔''

وہ ڈریسنگ سے ہٹ کر ایک طرف رکھی نازک ہیل کی نگوں سے چمکتی سینڈلز اپنے سفید دمکتے پیروں میں ڈالنے لگی۔

''آپ بھی چلیے۔'' وہ رسماً بولی۔

''نہیں، میرے سر میں درد ہے۔ ایک پین کلر دے دو۔'' وہ تکیہ اونچا کر کے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور پیشانی کو انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے سہلانے لگا۔

''میں آنٹی سے کہتی ہوں۔ وہ آپ کو دے دیں گی۔'' وہ اسٹریپس بند کر کے سیدھی ہوئی اور ادھر اُدھر اپنا دوپٹا تلاش کرنے لگی۔

''تم نہیں دے سکتیں۔'' وہ رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر مضمحل سی سانس بھر کر لیٹ گیا۔ ''ہر بات میں مام کو مت گھسیٹا کرو۔ انہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔''

وہ جھنجلا کر رہ گیا تھا۔ یک دم اسے کمرے میں آکر حبس کا احساس ہونے لگا۔

''پلیز۔ یہ بلائنڈز ہٹا دو اور شیشے کھول دو۔'' وہ دراز سے پین کلر خود ہی ڈھونڈتے ہوئے اسے کمرے سے باہر جاتے دیکھ کر دھیرے سے بولا۔

وہ عجلت میں نکلتے نکلتے رک گئی۔ پھر سر کو خفیف سی جنبش دے کر بلائنڈز کی ڈوری جھٹکے سے کھینچنے لگی۔ کانچ کی سلائڈ کھول کر تیزی سے دروازے کی طرف دوڑ گئی۔

''رومی ویٹ کر رہی ہے میرا۔ او کے بائے۔''

آبص نے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے گولی کھائی۔ تکیہ پر سر رکھتے ہوئے اسے پہلی بار کمرے میں تنہائی کا احساس ہوا۔ اپنے اکیلے پن کا خیال شدید ہونے لگا۔ آج آفس سے لوٹتے ہوئے پورے راستے وہ یہی سوچتا رہا تھا کہ اسے ارسلہ سے نارمل رویہ رکھنا چاہیے۔ محبت نہ سہی دوستی کا رشتہ تو وہ اس سے قائم کر ہی سکتا تھا۔ وہ اس کی زندگی میں جبراً داخل کر دی گئی تھی۔ اس کے دل میں تو نہیں داخل کر دی گئی تھی پھر کیا مسئلہ تھا۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر وقت گزار سکتا تھا۔ اس سے باتیں شیئر کر سکتا تھا۔ یوں بھی اسے کسی ایسے ہمدرد، غم گسار کی طلب ہونے لگی تھی جس کے کندھے پر سر رکھ کر اپنے غم کو بہا دے۔ اس وحشت کو نکلنے کو کوئی راستہ مل جائے۔

وہ شعوری طور پر جاگتا اور ارسلہ کا انتظار کرتا رہا۔ گھڑی کی سوئیاں دو بجانے لگیں تو اس کی آنکھیں خود بخود بند ہوتی گئیں۔ پھر اسے خبر نہ ہوئی وہ کب مہربان نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔

☆☆☆

صبح ورزش سے فارغ ہو کر ناشتے کی میز پر آیا تو ارسلہ مہوش کو رات کے فنکشن کی روداد سنا رہی تھی۔ اس کا لہجہ کھنک دار تھا، جیسے رات بھر ہوش ربا پارٹی کا نشہ ہو۔

''اتنا مزا آیا کیا بتاؤں۔ بہت لیٹ ہو گئے تھے تم۔ سچی وہاں سے اٹھنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔''

''میں خاصی دیر تمہارا انتظار کرتا رہا، جاگتا رہا۔'' آبص کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا تو مہوش نے چونک کر اس کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔

''ارے۔ تم ویٹ کر رہے تھے تو ارسلہ کو کال کر کے بلا لیتے۔ وہ آجاتی۔ ناحق اکیلے بور ہوتے رہے۔'' مہوش بمشکل اپنے لہجے میں چھپی خوشی اور جوش کو دبا رہی تھیں۔ آبص ارسلہ کے وجود کو تسلیم کر رہا تھا۔ اس کی کمی محسوس کرتا رہا تھا۔ یہ تبدیلی بے حد خوش آئند تھی۔

''لو دیکھو ذرا۔ موبائل ہاتھ میں رہتا ہے، ایک کال کھڑکا دیتے۔ ہے نا۔'' انہوں نے ارسلہ کی طرف دیکھا۔

''اچھا ہی کیا جو کال نہیں کی۔ اتنے مزے کے فنکشن کو چھوڑ کر میں کہاں آتی۔'' ارسلہ اطمینان سے کہتی سلائس اٹھا کر جیم لگانے لگی۔

مہوش نے اس کی بات پر بے اختیار آبص کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر ایک پل تغیر رونما ہوا تھا۔

''آبص تمہیں بلاتا تو تم منع کر دیتیں۔ نہیں آتیں کیا۔'' انہوں نے اپنائیت بھرے انداز میں جیسے اسے ٹٹولنا چاہا اور انہیں دھچکا لگا جب وہ کہہ رہی تھی۔

''میں کون سا روز جاتی ہوں اور اس طرح کی پارٹی کبھی کبھار ہوتی ہے۔ بندہ گھر آ کر دیواروں کو دیکھتا رہے۔ میں تو بالکل بھی نہ آتی بلکہ میرا تو آج بھی ڈھوکلی میں جانے کا دل ہے مگر شاید رومی نہیں جا رہی ہے۔''

''نصیر کاکا۔ آبص کی لیے چائے ذرا گرم لے آیئے، یہ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' مہوش نے بے زاری سی محسوس کر کے موضوع بدلنے کی غرض سے نصیر کاکا کو آواز دے ڈالی پھر ارسلہ کو جتانے والے لہجے میں بولیں۔ ''ادھر اُدھر کی باتیں چھوڑ و لڑکی! شوہر کے ناشتے کی طرف بھی کچھ دھیان دے دو۔''

''ارے یہ ناشتا ہی کب کرتے ہیں، بس جوس یا ایک کپ چائے۔'' اس نے کندھے اچکا کر آبص کے آگے رکھے اورنج جوس کے گلاس کی طرف دیکھا۔ ''ان کا ناشتا بس یہی ہوتا ہے۔''

''تم دھیان دو گی، محبت اور توجہ سے بنا کر دو گی تو وہ کھائے گا ناں۔'' مہوش نے حتی الامکان لہجے میں شفقت کا تاثر سموئے رکھا۔ ''جب بیوی آ جائے تو پھر سو سولاڈ سے شوہر کو اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے۔''

''مائنڈ اٹ آنٹی۔ ان شوہروں پر رنگ چڑھتے ہیں بیوی کے، جن کے دل پر پہلے سے کوئی رنگ چڑھا ہوا نہ ہو۔'' اس کے لہجے میں ایک کاٹ تھی جو مہوش کو شدید حیران کر گئی۔

آبص یک دم کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا اور وہاں سے چلا گیا۔

ایک دو لمحے تو مہوش بھی اسی سچویشن پر متحیر رہ گئی تھیں۔ انہیں قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ ارسلہ اس طرح کی بات کرے گی۔

''بہت افسوس کی بات ہے۔ تم اس کی چھوٹی سی غلطی کو ایشو بنا رہی ہو۔'' آبص کے ڈائننگ ہال سے نکلتے ہی مہوش اپنی خفگی نہ چھپا سکیں۔ ان کا لہجہ ملامتی تھا۔ ''یہ تمہارے لیے نقصان دہ ہے۔ مرد کے اس طرح کے افیئرز ہوتے ہی ہیں، شادی کے بعد سب نارمل ہو جاتا ہے اور نارمل اس لیے ہو جاتا ہے کہ بیوی ایشو نہیں بناتی۔''

''اچھا.....'' وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائی اور جیسے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ''بات صرف افیئر کی ہوتی تو خیر تھی۔ بات تو چیٹ کرنے کی ہے۔ دھوکا..... دھوکا کیسے برداشت کیا جائے۔'' وہ کڑے لہجے میں بولی۔

جواباً مہوش کے چہرے پر شرمندگی جھلک آئی۔

''میں اس کے لیے شرمندہ ہوں اور سوری کر چکی ہوں۔'' ان کا لہجہ پست ہو گیا۔ ''یہ تمہارا بڑا پن ہے کہ تم نے اپنے گھر والوں کو نہیں بتایا اب تک کچھ بھی۔ میں تمہاری ممنون ہوں۔'' مہوش کی خفگی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی اور چہرے پر شرمندگی اور ندامت تھی۔ وہ اضطراری کیفیت میں تھیں۔ ''تم چاہو تو سب کچھ نارمل ہو سکتا ہے۔ خوشیاں تم دونوں سے زیادہ دور نہیں ہیں۔''

مہوش کا پست لہجہ ارسلہ کو بے حد تقویت دینے لگا۔ اس نے سلائس پلیٹ میں رکھ دیا اور نہایت دل گرفتگی کی مکمل ایکٹنگ کرتے ہوئے بولی۔

''کیسے نارمل ہو سکتا ہے سب کچھ۔ ان کی ٹوٹی ٹانگ، ان کا ٹوٹا ہوا دل۔ اف..... میں کس قدر ہرٹ ہوئی ہوں۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ اگر رومی کے ساتھ ایسا ہی کچھ ہوتا تو آپ کیا کرتیں۔''

''خدا نہ کرے۔'' مہوش کا دل دہل سا گیا۔

''ہاں، خدا نہ کرے۔ میں بھی فقط ایک بات کر رہی تھی بس۔ دل کو اب بہلانے کے لیے گھومنے پھرنے کی باتیں کرتی ہوں۔ یہ تمنا بھی پوری نہ ہو تو پھر کیا کرے بندہ۔ جینے کے لیے، خوش رہنے کے لیے کچھ تو بہانا چاہیے۔ بڑی خوشی سے محروم ہو گئی تو چلو چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے تو دامن بھر سکتی ہوں نا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے تائید چاہی، مہوش نے آہستہ سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''بالکل۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں مگر مکمل خوشی تو اسی میں ہے ارسلہ کہ تم آبص کا دل جیتنے کی کوشش کرو۔اس کے نزدیک ہونے کی کوشش کرو۔اپنا وقت، اپنی توجہ دو اسے۔''
مہوش کی بات پر ارسلہ کے حلق تک میں جیسے کڑواہٹ گھل گئی۔چائے کا گھونٹ بھی کڑوا کڑوا لگنے لگا۔
''تو آپ کو نکاح نامے پر یہ لکھوا دینا چاہیے تھا کہ آبص کا دل جیتنے کی کوشش کرنا ہوگی پھر کہیں جا کر وہ میرا ہوگا اور ہوگا بھی کہ نہیں...... ہے نا۔'' وہ جلے کٹے انداز میں بولی پھر کپ پٹخ کر کرسی دھکیل کر کھڑی ہوگئی۔
''سودا کیا ہے تو پھر پورا کریں۔'' وہ مہوش کی اٹھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مکارانہ انداز میں مسکرائی۔
''سودا...... کیسا سودا...... میں سمجھی نہیں۔'' مہوش میکانی انداز میں سے کرسی سے اٹھیں۔جیسے کسی نے بٹن دبا دیا ہو۔
''آپ کے روٹھے ہوئے، محبت میں ہارے ہوئے اور ٹوٹے ہوئے بیٹے کا دل جیتنے پر مجھے کیا ملے گا۔'' وہ میز پر ہاتھ رکھ کر ان کی طرف جھکی۔
''کک...... کیسی باتیں کر رہی ہو ارسلہ۔آر یو میڈ۔وہ شوہر ہے ہی تمہارا۔''
جواباً اس نے طنزیہ انداز میں بھنویں اچکائیں۔
''ہا...... شوہر......'' یہ کہتے ہوئے اس نے طویل قسم کی سانس بھری۔''شوہر ہوتا تو اس کا دل جیتنے کی کوشش نہ کرنا پڑتی پہلے ہی دن سے۔'' وہ پلٹ کر جانے لگی۔
''سنو۔ارسلہ۔'' مہوش نے اس کا بازو پکڑا۔ان کے انداز میں تلخی تھی۔وہ رک کر پلٹی۔''مجھے ایسا لگتا ہے تم مجھے بلیک میل کر رہی ہو۔''
''ارے۔'' وہ بے ساختہ ہنس پڑی، یوں جیسے کسی بچے کی بچکانا بات پر یک دم ہنسا جاتا ہے۔''بلیک میل تو میں ہو رہی ہوں آنٹی جی۔میں......''
''اوکے اوکے۔آہستہ بولو۔'' مہوش نے اس کی تیز ہوتی آواز پر گھبرا کر اسے ٹوکا اور ادھر اُدھر دیکھا کوئی ملازم تو موجود نہیں تھا۔''تمہیں کون کر رہا ہے بلیک میل۔''
''آپ خود سوچیے، میں اپنا غم اپنے پیرنٹس تک سے شیئر نہیں کر سکتی۔آبص میرا ہم نوا ہے نہیں۔آپ لوگوں پر مجھے ٹرسٹ نہیں ہے، کل کلاں مجھے ہاتھ پکڑ کر کوٹھی سے باہر کر دیں۔آپ امیروں کا کیا بھروسا۔اور میں خالی ہاتھ......''
''کیا چاہتی ہو تم...... کھل کر کہو۔''
وہ چونک کر ارسلہ کو دیکھنے لگیں۔اس کا بدلا بدلا انداز اور جتاتا لہجہ انہیں کسی گہری سازش کا احساس دلانے لگا۔وہ کوئی نادان یا سادہ لوح عورت نہیں تھیں، اب تو ارسلہ کے سارے انداز پہچان گئی تھیں۔اس کی آنکھوں میں لالچ کی چمک تو بہت واضح تھی۔وہ تو دبئی میں فقط چند روز ہی اس کی فطرت سے آگاہ ہو چکی تھیں۔اب بھی وہ اسے بغور دیکھ رہی تھیں یوں جیسے اس کی آنکھوں سے اس کے دل کا حال جان لینا چاہتی ہوں۔
ارسلہ نے چہرے پر نہایت بے چارگی طاری کرتے ہوئے سر نفی میں ہلایا۔
''ایسا کچھ نہیں ہے، بس اپنی سیکیورٹی، تحفظ۔'' یہ کہہ کر اس نے ابرو کو خفیف سی جنبش دی۔''کیا میں اپنے اس رشتے کو قائم رکھنے کے لیے اتنا بھی حق نہیں رکھتی۔''
''یہ رشتہ اتنا کمزور نہیں ہے کہ......''
''کمزور ہی ہے۔'' وہ تیزی سے مہوش کی بات کاٹ گئی۔''بظاہر بہت مضبوط مگر بے حد کمزور۔کچے دھاگے کا سا۔ ذرا سا الجھا تو کھٹ سے ٹوٹ گیا۔''

''خدانہ کرے۔کیسی نامعقول باتیں کررہی ہوتم۔''
''آپ جو بھی کہیے اور سمجھیے۔میری تسلی ہونا ضروری ہے۔میں ایک ہی صورت میں آبص کا دل جیتنے کی کوشش کروں گی، جب میری مالی پوزیشن مستحکم ہوگی۔میں خود کو ان سیکیور (غیر محفوظ) نہیں سمجھوں گی۔'' وہ پلٹ کر ڈائننگ ہال سے نکل گئی۔
مہوش دم سادھے اس کے جملوں پر غور کرتی رہیں، پھر ایک گہری سانس بھری مگر انہیں لگا جیسے فضا میں ڈھیر ساری کڑواہٹ ہو جو سانس کے ذریعے پھیپھڑوں میں اتر گئی ہو۔

☆☆☆

''میرا تو دل چاہتا ہے سکندر! میں راحیلہ سے آج ہی بات کرلوں۔'' عقیلہ خالہ کھانے کی میز سمیٹ کر چائے کا پانی چڑھا کر اسی کے پاس چلی آئیں۔وہ لیپ ٹاپ کھولے مصروف ہو چکا تھا۔چائے کا منتظر تھا، اماں کی بات پر سر اٹھایا۔
''کیسی بات۔''
''بیا کے رشتے کی۔تمہارا اور اس کا رشتہ طے کردوں۔''
''کیا.....؟'' اس کی ساری توجہ اماں کی طرف ہوگئی۔جھنجلاہٹ نمایاں تھی۔''کیا ہوگیا ہے امی آپ کو۔دماغ پر ایک ہی دھن سوار ہوگئی ہے۔سمجھ میں نہیں آتا کیسے سمجھاؤں آپ کو۔'' وہ بدمزا سا ہوگیا۔
''دھن نہیں ہے، فکر ہے تمہاری۔میرے بعد کون دیکھے گا تمہیں۔گھر بار والے ہو جاؤ تو میں پرسکون میں ہو جاؤں۔''
''ہو جاؤں گا۔شادی سے منع تو نہیں کیا، وقت ہی تو مانگا ہے۔'' اس کا ذہن منتشر ہوگیا۔لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کرکے پرے دھکیلا۔
''ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے امی۔''
''کون سا وقت.....کیا بالوں میں سفیدی اتر آئے گی تب وقت آئے گا۔'' وہ خفا ہو کر کمرے سے جانے لگیں۔
''مجھے لگتا ہے آج پھر آپ پر دورہ پڑ گیا ہے تنہائی کا۔'' وہ ہلکے سے ہنسا اور کرسی سے اٹھ کر انہیں کندھوں سے تھاما۔
''بس رہنے دو۔یہ دکھاوے کا لاڈ پیار۔'' خالہ اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹکنے لگیں اور کسی ناراض بچے کی طرح منہ پھلا کر جانے لگیں۔
''جب شادی پر حامی بھرو گے تب بات کرنا مجھ سے۔''
''ارے کیا ہوگیا امی۔'' وہ پریشان ہوگیا مگر عقیلہ خالہ ناراض ہو کر کمرے سے نکل گئیں۔
وہ سخت لاچاری، بے بسی محسوس کرکے رہ گیا۔

☆☆☆

بساط جاں پہ عذاب اترتے ہیں کس طرح
شب و روز یہ عتاب اترتے ہیں کس طرح
کبھی عشق ہو تو پتا چلے
یہ جو روگ ہیں، چھپے ہوئے پس جسم و جاں
تو یہ کس لیے

یہ جو اضطراب رچا ہوا ہے وجود میں
تو یہ کیوں بھلا
یہ جو سنگ سا کوئی آ گرا ہے جمود میں
تو یہ کس لیے
یہ جو دل میں درد چھڑا ہے لطیف سا
تو یہ کب سے ہے
یہ جو پتلیوں میں عکس کوئی خفیف سا
یہ جو لوگ پیچھے پڑے ہوئے ہیں فضول میں
انہیں کیا پتا انہیں کیا خبر
کسی راہ کے کسی موڑ پر جو انہیں ذرا
کبھی عشق ہو تو پتا چلے

اس نے آج ارسلہ کے ساتھ ڈنر کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور ارسلہ کو ایک خوب صورت ریسٹورنٹ میں لے آیا تھا۔ ارسلہ آ تو گئی تھی مگر کوئی خوش گوار احساس دل سے نہیں پھوٹا تھا۔

''میرے پاس ایسا کوئی علم نہیں ہے جس سے میں آپ کے احساسات اور آناً فاناً بدلتے اس رویے کی وجہ جان سکوں۔ آپ براہ مہربانی خود ہی میری یہ مشکل حل کر دیں کہ مجھے ساتھ لانے کا مقصد۔''

وہ فرنٹ سیٹ پر اس کے ہمراہ بیٹھی تھی۔ ریسٹورنٹ کے پارکنگ ایریا میں گاڑی روکی تو وہ مزید ضبط نہ کر سکی اور دل کی بے قراری کو زبان دے گئی۔

آبص نے ونڈ اسکرین سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا، دوسرے پل نظریں چرا کر چابی نزدیک آتے گارڈ کو تھما دی۔

''چلو اترو۔'' وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اترتے ہوئے اس کی بات گویا سنی ان سنی کر گیا۔

ارسلہ گاڑی سے اتر گئی۔

نیلے رنگ کی جدید تراش کی کرتی سیاہ ٹراؤزر، بال شانوں پر پھیلائے وہ بے حد دلکش سراپے کی مالک دکھائی دے رہی تھی۔ کرتی سے ہم رنگ دوپٹا ایک طرف کندھے پر ڈال رکھا تھا اور دوسرے کندھے پر بے حد قیمتی لیدر کا پرس لٹکائے وہ اس کے ہمراہ اس خوب صورت ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئی۔

ملگجے اجالے میں دبیز کارپٹ پر چلتے ہوئے اس کے اندر عجیب بے چینی سی تھی، جاننے کی خواہش کہ یہ بندہ اسے یقیناً کسی مقصد کے تحت لایا ہوگا۔ اسٹک کے سہارے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے آبص کے پیچھے ویٹر ہاتھ باندھ کر چل رہا تھا گویا وہ آبص سے خاصا مانوس ہو۔

سیاہ ٹراؤزر اور سفید اور سرمئی دھاری دار شرٹ میں اس کا سراپا اسٹک کے سہارے چلتے ہوئے بھی عجیب مسحور کن دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی شخصیت یقیناً ماند ہوئی ہوگی، ہلکی لنگڑاہٹ سے تاہم ارسلہ کو تو وہ کسی شہزادے کی آن بان والا دکھائی دے رہا تھا۔ مگر اس پل اس کے دماغ میں جیسے کانٹا سا گڑ گیا تھا اس تبدیلی پر غور کیے جا رہی تھی۔

''بیٹھو۔'' وہ بڑے بڑے شیشوں کی کھڑکی کے پاس والی میز منتخب کر کے اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''ایک عرصہ کے بعد میں اس ریسٹورنٹ میں آیا ہوں۔'' جیب سے موبائل نکال کر میز پر ڈالتے ہوئے وہ طائرانہ نگاہ ریسٹورنٹ کے ڈائننگ ہال پر ڈالی۔

''میں ہمیشہ اسی ٹیبل کو منتخب کرتا ہوں۔ جب بھی یہاں آتا ہوں۔'' اس کا لہجہ کسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔

''اوہ۔ گویا ماضی کی یادیں تازہ کرنے لائے ہیں مجھے یہاں۔'' ارسلہ کی تمسخرانہ ہنسی ابھری۔

آبص نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، دوسرے پل نظریں اس کے چہرے سے ہٹا کر اضطراری انداز میں بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی اور سگریٹ سلگا کر لبوں کے باہم پھنسائی۔

''ماضی کی یادیں تازہ کرنے کے لیے مخصوص جگہوں پر حاضری دینا ضروری نہیں ہوتا۔ یہ تو ہم کسی بھی جگہ، کہیں بھی بیٹھ کر یاد کر سکتے ہیں۔'' پھر ہلکی سانس بھری۔

''ماضی ہی سے تو نکلنا چاہتا ہوں، مگر نکل نہیں پا رہا ہوں۔ تمہاری مدد درکار ہے۔'' وہ فقط سوچ کر رہ گیا۔

''کہتے ہیں کہ سچی دوست مل جائے تو تکلیف کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے دکھ ختم نہیں ہوتا۔ زخم بھرتا نہیں ہے مگر اس کی شدت میں کمی ضرور آجاتی ہے۔'' اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے لگائے ارسلہ کو بڑے دوستانہ انداز میں دیکھا۔

بہت کچھ کہہ دینے کی خواہش، سارا بوجھ اتار دینے کی تمنا اس کے اندر مچل رہی تھی۔ وہ حقیقتاً تھک سا گیا تھا۔ کسی ہمدرد، غم گسار کی طلب ہو رہی تھی جس کے کندھے پر سر رکھ کر ساری تھکن اتار دے۔

''تو یوں کہیں کہ کسی کی یادوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے میرا کندھا استعمال کرنا چاہ رہے ہیں یا کسی کی یاد میں رونے کے لیے۔ دونوں صورتوں مجھے فقط استعمال کرنے لائے ہیں یہاں۔'' وہ چیختے ہوئے بولی۔

''کاش تم خاموش ہی رہ لیتیں۔ تھوڑا بھرم ہی رہ جاتا۔'' آبص متاسفانہ نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

''کیسا بھرم؟'' اس نے ابرو اچکائے۔

''میری ماں کی چوائس کا۔'' وہ یوں ہنسا جیسے خود پر ہنسا ہو۔ عجیب خود آزار قسم کی تھی۔ ''بہت کڑوا بولتی ہو تم۔ جانتی ہو عورت کب خوب صورت دکھتی ہے جب وہ میٹھا بول بولتی ہے۔ جب اس کے لبوں پر محبت آمیز مسکراہٹ ہو، حوصلہ دیتی، تسلی دیتی مسکراہٹ۔''

اس کھلی پھٹکار پر ارسلہ جز بز ہو کر رہ گئی۔

''ایک کڑوے سچ کی طرح آپ میرے سامنے ہیں تو میں میٹھا کیسے بول سکتی ہوں۔'' وہ تپ گئی تھی۔ بے عزتی کا اچھا خاصا احساس ہوا تھا۔ ''خیر اب لفظوں کے ہیر پھیر میں الجھانے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ مجھے یہاں لانے کا جو مقصد ہے وہ تو واضح ہو چکا ہے۔ مزید روشن کر دیں تو عنایت ہوگی۔''

آبص کو لگا زہر سے بھرا جام الٹ گیا ہو۔ اس نے ہلکی سانس بھری اور جیسے ساری کڑواہٹ اپنے اندر اتار لی اور مینو کارڈ اٹھا کر اس پر نظریں دوڑانے لگا۔ بہت کچھ کہنے کی خواہش دل میں ہی رہ گئی۔ افسردگی اور اضمحلال پہلے سے کہیں سوا ہو گیا۔

وہ بھی مینو کارڈ پر نظریں دوڑا رہی تھی پھر اپنی پسند اسے بتانے لگی۔ وہ آرڈر لینے آئے لڑکے کو آرڈر لکھوانے لگا۔ کھانا بے حد لذیذ تھا۔ ارسلہ نے پیٹ بھر کر کھایا تھا، البتہ آبص ایک دو نوالے کھانے کے بعد فقط کافی پیتا رہا پھر سگریٹ سلگا کر جیسے خود بھی اندر ہی اندر سلگتا رہا۔ وہ بے حس بنی آئس کریم پر ہاتھ صاف کر رہی تھی۔

واپسی کا سفر بے حد خامشی سے کٹا تھا۔

☆☆☆

''آپ چاہتے ہیں میں نادیہ شاہ کی باتیں آپ سے سنتی رہوں اور سر دھنتی رہوں اور آپ یہ ساز مدہوش ہو کر الاپتے رہیں۔''

رات وہ بستر پر لیٹا تو وہ ہاتھوں پر کریم لگاتے ہوئے بولی۔ وہ تکیہ ہیڈ کراؤن سے لگا کر بیٹھ گیا۔
''سوچا تو یہی تھا۔'' وہ نا چاہتے ہوئے بھی لہجے کی تلخی نہ چھپا سکا مگر وہاں تو مطلق اثر ہی نہ تھا۔ وہ ڈھٹائی سے ہنسی۔
''خوب۔ تھک نہیں گئے آپ یہ راگ الاپتے الاپتے۔''
''پلیز۔'' اس نے خاصی تنبیہی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روکا۔
وہ لائٹ آف کر کے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ سلک کی بلیو نائٹی میں وہ خاصی دمک رہی تھی۔ آبس اس پر ایک نظر ڈال کر رہ گیا۔
کاش اس کا دل بھی ایسا ہی حسین ہوتا اور زبان بھی۔ وہ سوچ کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں چھائی سنجیدگی گہری ہو گئی۔
''حیرت ہوتی ہے آج کے وقتوں میں ایسے محبوب ٹائپ لوگوں کو دیکھ کر۔'' وہ اسے کروٹ بدلتے دیکھ کر زچ کرتے ہوئے بولی۔ ''آج کا زمانہ محبتوں سے بہلنے اور یادوں میں الجھنے کا نہیں ہے۔ زندگی کو انجوائے کرے بندہ۔ وقت سے اپنا حصہ وصول کر لے، جانے کب آنکھ بند ہو جائے گی۔ سوچے، زندگی ملی ہے اسے..... اسے کیوں نہ بھرپور طریقے سے گزارے، نہ کہ کسی فضول سی لڑکی کے لیے تباہ کر دے۔ فضول ہی نہیں بے وفا بھی۔''
اس نے ضبط سے گزرتے ہوئے پلٹ کر اسے ناراض نظروں سے دیکھا۔
''سوری۔ میں نہیں آنٹی کہتی ہیں کہ نادیہ شاہ نے آپ سے بے وفائی کی۔ شادی کر لی کسی امیر کبیر کزن سے۔'' وہ جلدی سے بولی پھر پرخیال انداز میں بولی۔ ''مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ امیر کبیر تو آپ بھی تھے اور اسے باآسانی میسر بھی تھے یعنی خاصی موٹی تگڑی پارٹی تھے آپ بھی۔ فائدہ ہی فائدہ تھا۔ پھر کیا ضرورت پیش آ گئی بے وفائی کرنے کی۔
اس کے اتنے سخت جملوں سے اس کی نیند اچاٹ ہو گئی، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور دل سے امڈتے اشتعال کو دباتے ہوئے بولا۔
''یہ موٹی پارٹی تمہارے نصیب میں تھی شاید اس لیے۔'' وہ تلخ ہو گیا۔
''ارے ہاں۔ یہ بھی سچ ہے۔'' وہ محظوظ ہو کر قہقہہ لگانے لگی۔ ''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔''
''تو اب سوچ لو۔'' وہ چڑ گیا۔ وہ اسے جان کر زچ کر رہی تھی یا وہ فطرتاً ہی عاجز کر دینے والی تھی۔
''ارے کہاں۔ مجھے تو کوئی خاص فائدے ہی حاصل ہوتے دکھائی نہیں دے رہے۔''
''مطلب۔'' وہ سگریٹ کو باہم لبوں کے درمیان پھنسا کر اسے لائٹر کا شعلہ دکھاتے دکھاتے چونکا۔
''نہ اپنا کوئی بینک بیلنس، نہ کوئی کوٹھی شوٹھی اپنے نام۔ اتنے امیر کبیر کی بیوی ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ محض دل بہلانے کا سامان بنی رہوں۔''
وہ جیسے صدمے کی سی کیفیت میں اسے گھورتا رہ گیا۔
''شادی کی ہے تم نے۔ کوئی سودا نہیں کیا ہے۔''
''آپ کی ماں نے تو سودا ہی کیا ہے۔ آپ کا سودا۔''
''شٹ اپ۔'' وہ تڑخ گیا۔
''میرے لیے تو یہ گھاٹے کا ہو جائے گا اگر کچھ نہ ملا تو.....'' وہ اس کے غصے کی پروا کیے بنا افسردگی سے سانس بھرتے ہوئے بولی اور تکیہ سیدھا کرنے لگی تاکہ اس پر سر رکھ سکے۔
''سنو.....'' اس نے عجیب سرسراتی آواز میں اسے پکارا۔ ''اگر تمہارے سامنے دو راستے رکھے جائیں تو تم

کون سا راستہ چنو گی۔''

بس نیم اندھیرے میں اس کی انگلی میں دبی سگریٹ کی ٹاپ پر چمکتا شعلہ دکھائی دے رہا تھا اس کے چہرے کے تاثرات نہیں۔ وہ تکیے پر سر رکھنے کے بجائے ذرا سا اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''فرض کرو۔ نادیہ آجاتی ہے میری زندگی میں دوبارہ، میں ایک کوٹھی گاڑی تمہارے نام لکھ دیتا ہوں۔ تو تم کوٹھی کے ساتھ خوش رہ لوگی یا مجھے چننا پسند کرو گی۔'' یہ کہتے ہوئے اسے پورا یقین تھا وہ کوٹھی کا نام لے گی مگر اسے حیرت کا جھٹکا لگا جب وہ مبہم مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''آپ کو چنوں گی۔''

آبص کے دل کو جیسے کسی نرم لمس نے چھوا تھا۔ اس کے چہرے کے تنے تنے نقوش میں تبدیلی آنے لگی۔ مگر دوسرے پل وہ اس کی خوش فہمی کی بنتی چادر کو ادھیڑ کر رکھ گئی تھی۔

''ظاہر ہے آپ کو ہی چنوں گی۔ فقط ایک کوٹھی میری منزل تو نہیں۔ بہت کچھ پانا چاہتی ہوں۔ اتنا بڑا رسک لیا ہے..... اپنی زندگی کا سودا کیا ہے تو فقط ایک کوٹھی کے لیے تو نہیں نا۔ بندہ خود کو پیش کرائے تو فقط ایک کوٹھی کے لیے تو نہیں کراتا۔'' پھر قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''آپ جیسی موٹی پارٹی کو ایویں چھوڑ دوں گی بھلا۔ ایسے ہی یہاں تک کا سفر طے کیا ہے تو ایک کوٹھی کے لیے تو نہیں، بہت خواہشات ہیں جو ابھی پوری ہونی ہیں۔''

''بس دولت، پیسہ یہی معیار زندگی ہے تمہارا۔'' وہ تپ کر بولا اور سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دی۔

''شاید.....'' اس سے پہلے وہ مزید کچھ کہتی، آبص نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔

''جذبات، احساسات سے بھی کوئی واسطہ ہے یا نہیں۔ قلبی جذبے کی، کسی تسکین کی خواہش ہے یا دفن کر دیا ہے دولت کی ہوس کی اندھی قبر میں جذبات کو۔''

وہ پوری جان سے کانپ گئی۔ وہ اس کے مضبوط بازوؤں کے گھیرے میں تھی۔ اس کی مضبوط انگلیاں اس کے بازو کے نرم گوشت میں گھستی جا رہی تھیں۔ گرم گرم سانسیں اس کے کانوں کو سلگا رہی تھیں اور وہ بھی سلگتے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''کبھی چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش ہوئی، ٹوٹنے اور توڑ دینے کی تمنا مچلی۔''

اس نے ہاتھ بڑھا کر لیمپ کی مدھم روشنی بھی گل کر دی تھی۔ اس طرف بھی مزاحمت نہیں تھی۔ مکمل اس کی دسترس میں تھی۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

وضاحت

کرن کی تحریریں منتخب کرتے ہوئے ہم تمام تر احتیاط ملحوظ خاطر رکھتے ہیں لیکن غلطی بھول چوک انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ پچھلے شمارے میں نادانستگی میں کچھ سطریں شائع ہو گئیں جس پر ہماری کچھ قارئین کو اعتراض ہوا۔

اس سہو کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری بھول چوک اور غلطیاں درگزر فرمائے، آمین۔

عائشہ تنویر

قبول ہے

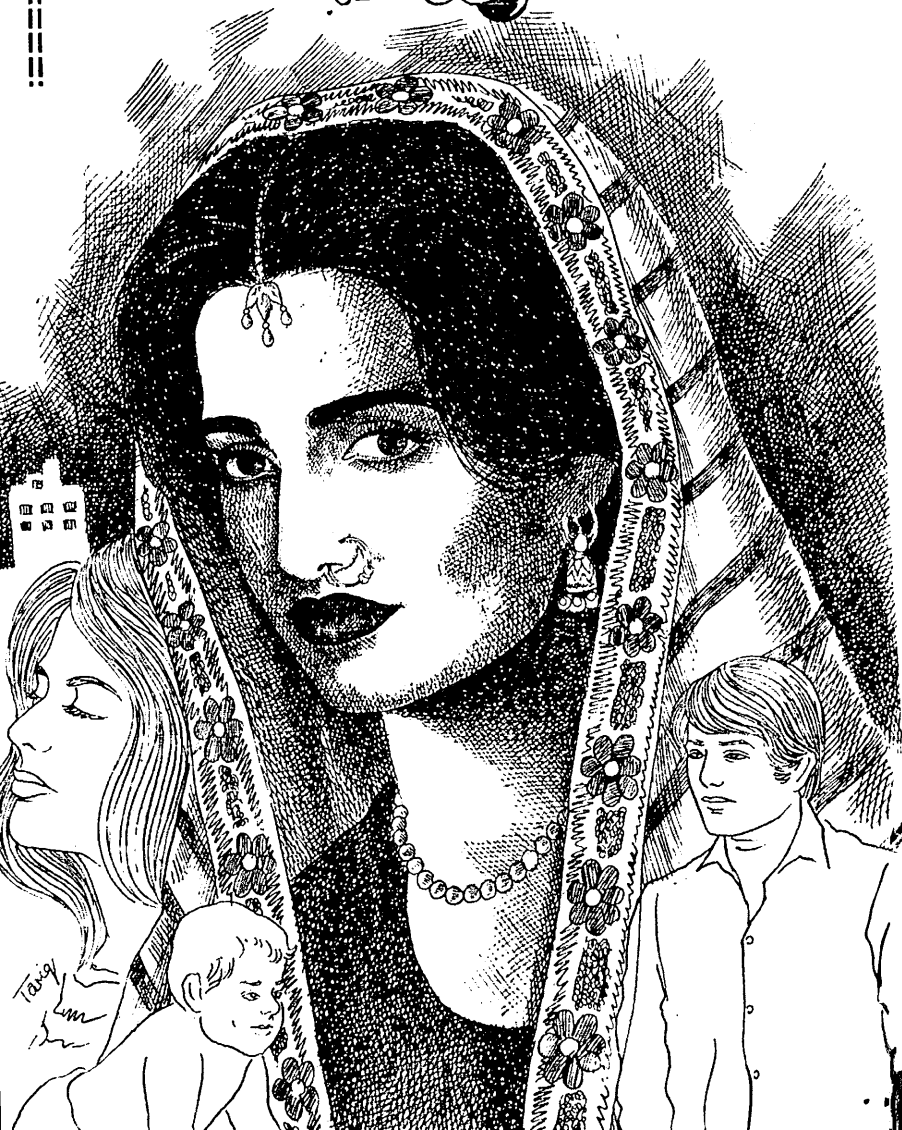

''تم تو آئس کریم کھا کھا کر ہی مجھے کنگلا کردو گی۔''

میں نے اسے رغبت سے آئس کریم کا دوسرا کپ کھاتے دیکھ کر دہائی دی۔ ماہ رخ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ اس کی ہنسی بھی اس کی طرح خوب صورت تھی۔ میں نے دل میں خود سے اعتراف کیا۔

''پھر بھی تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو، بڑی بات ہے بھئی۔''

وہ میرا مذاق اڑا رہی تھی۔ حسین، ذہین اور پھر امیر لڑکی کے مذاق پر کوئی بے وقوف ہی برا مناتا اور میں بے وقوف ہرگز نہیں تھا۔

''شادی تو تم سے ہی کرنی ہے کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے باپ کے پاس بہت پیسہ ہے، وہ مجھے کنگال نہیں ہونے دیں گے۔'' میں نے آنکھ مار کر شرارت سے کہا۔ وہ پھر ہنس پڑی۔

''بہت خوش لگ رہی ہو آج۔'' اس کے بار بار یوں کھلکھلانے نے مجھے پوچھنے پر مجبور کردیا۔

''اپنے منگیتر کا خرچا کروا رہی ہوں، خوش ہونا تو بنتا ہے۔''

وہ مزے سے کہہ رہی تھی، جب کوئی ہمارے پاس آ کر کھڑا ہوا۔ میں نے سر اٹھایا مگر میرے کچھ کہنے سے پہلے وہ لڑکی کرسی کھینچ کر بیٹھ چکی تھی۔

''آپ.....'' الفاظ میرے منہ میں ہی رہ گئے اور نووارد لڑکی بہت اطمینان سے کہہ رہی تھی۔

''مجھے آپ کا پروپوزل منظور ہے عاقب۔ میں چاہتی ہوں کہ شادی میں اب مزید دیر نہ ہو۔''

''کون سا پروپوزل۔'' میرے کچھ کہنے سے پہلے ماہ رخ نے تیزی سے پوچھا۔

''وہی جو عاقب نے یونیورسٹی میں بے شمار لوگوں کے سامنے بہت رومانوی انداز میں میرے سامنے گھٹنے ٹیک کر دیا تھا۔''

بظاہر وہ مسکرا کر کہہ رہی تھی مگر اس کے لہجے میں چھپی تلخی اور آنکھوں کی ٹھنڈک مجھے کچھ کہنے نہیں دے رہی تھی۔

ماہ رخ نے میری طرف دیکھا، میرے چہرے کے تاثرات سب بتانے کے لیے کافی تھے۔ مجھے کچھ کہنے کا موقع دیے بنا وہ بیگ اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔

''پھر ملیں گے۔ بہتر ہوگا، پاپا کو تم خود جواب دے دو۔''

کرسی پیچھے کر کے وہ تیزی سے نکلتی چلی گئی اور میں جو ابھی تک گونگوں کی طرح چپ بلکہ احمقوں کی طرح آنکھیں پھاڑے سب دیکھ رہا تھا، ایک دم ہوش میں آیا۔ میری منگیتر، میرے باس کی اکلوتی بیٹی ماہ رخ جا چکی تھی۔ اب میز پر صرف ہم دونوں تھے۔ میں اور میری اولین محبت.....

''حرا.....تم، اتنے سالوں بعد..... یہ کیا تماشا ہے؟''

میں دبی دبی آواز میں برسا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس قدر غیر متوقع طور پر حرا سے سامنا اور اس کی بات سن کر میرا دماغ اب تک عجیب کیفیت میں تھا، پھر پبلک پلیس پر ہونے کا احساس، مجھے کسی قسم کا ردعمل دینے سے روک رہا تھا۔

''تماشا یہ نہیں ہے، وہ تھا، جو تم نے میرا بنایا تھا۔ میں تو صرف جواب دینے آئی ہوں۔'' وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

''کیا تماشا لگایا تھا میں نے؟ پانچ سال پہلے تمہیں پروپوز کیا تھا۔ تم نے منع کردیا تو اب کیا ساری زندگی تمہارے جوگ میں بیٹھا رہتا؟ اگر تمہاری وجہ سے میری منگنی ٹوٹی تو پھر دیکھنا۔''

اب میرے اوسان بحال ہو چکے تھے۔ دماغ اس صورت حال کو سمجھ رہا تھا۔ اسی لیے میں نے برہمی سے اسے آئینہ دکھایا۔ ٹھیک ہے، ایک زمانے میں اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے میں پہروں خوار ہوتا تھا۔ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اب بھی میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ تھا۔ تب ہی تو پانچ سال بعد بھی اسے پہچان گیا تھا۔ ہم دوستی رکھ سکتے تھے لیکن ایسا بھی مجنوں نہیں ہوں کہ اس کی دوستی کے لیے میں اپنی زندگی خراب کرلوں۔ اس کا تلخ

رویہ مجھے بدلحاظی پر مجبور کر گیا۔

''منگنی تو اب ضرور ٹوٹے گی عاقب صاحب۔ تم نے جس طرح مجھے پروپوز کیا تھا۔ اس ڈرامے نے میری زندگی تباہ کر دی۔ میری منگنی ٹوٹ گئی۔ شادی تو اب میں تم سے ہی کروں گی۔ بہتر ہے کہ تم اس قصے کو خود ختم کر دو ورنہ میں بھی تمہارے پروپوزل کا جواب دینے تمہارے آفس میں آؤں گی۔ وڈیو ہے میرے پاس اس فلمی سین کی، اب اس فلم کا انجام بھی ایسا ہی ڈرامائی ہوگا۔ تم سے ہی سیکھا ہے یہ سب۔''

وہ استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دھمکاتی وہاں سے چلی گئی۔ میں نے اسے دور تک دیکھنا چاہا لیکن راستے میں ہی نظر ساتھ والی میز پر بیٹھی خاتون پر چلی گئی جو پورے انہماک سے بنا ٹکٹ کا شو دیکھ رہی تھیں۔ میں سر پکڑ کر رہ گیا۔

☆☆☆

بظاہر اعتماد سے اسے باتیں سنا کر آگے بڑھتی حرا نے اپنی آنکھیں رگڑتے ان پر سن گلاسز چڑھا لیے تھے۔ اب وہ پہلے جیسی کمزور نہ تھی۔ اب وہ یونیورسٹی میں پڑھنے والی حرا نہ تھی، جو بھابھی کے بے سروپا سوالات کو ہنس کر سہتی تھی۔ بھابھی کے خیال کے ساتھ ہی ذہن کے پردے پر ان کا عکس ابھرا۔

''یہ کس کے نوٹس ہیں، ان پر جمیل احمد صدیقی کیوں لکھا ہے۔'' بھابھی کا لہجہ مشکوک تھا۔ وہ اس کی کتابوں کے درمیان سے فوٹو اسٹیٹ ہینڈ آؤٹ نکال کر دیکھ رہی تھیں۔

حرا نے کتاب سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

''ٹیچر کا نام ہے جمیل احمد۔ ان کے مضمون کا ہینڈ آؤٹ ہے تو ان کا نام لکھا ہے۔''

اس نے تحمل سے وضاحت کی۔

کل ہی بھائی نے اسے سمجھایا تھا کہ جب اسے پڑھنا ہی ہوتا ہے تو کمرے میں اکیلے بیٹھ کر کیوں، لاؤنج میں سب کے درمیان بیٹھے۔ بھابھی سے دوستی بڑھائے، وہاں اسے کون تنگ کرے گا۔

اس کے خاندان میں لڑکیوں کو زیادہ پڑھانے کا رواج نہ تھا۔ وہ پہلی لڑکی تھی جو اپنی خواہش اور بھائی کی سپورٹ کی وجہ سے مخلوط تعلیمی اداروں میں پڑھتی یہاں تک پہنچی تھی۔ یہی بات بھابھی کو اس سے شاکی رکھتی تھی۔ پھر خاندان میں آپس میں شادیوں کا رواج تھا۔ اس کی اکلوتی بھابھی کزن تھیں تو بھابھی کا بھائی اب منگیتر بن گیا تھا۔ وہ حرا کو دبا کر رکھنا چاہتی تھیں تاکہ پڑھ لکھ کر وہ ان سب کے سر پر نہ ناچے۔ اور حرا کے کون سا والدین زندہ تھے۔ جو اس کی حمایت کرتے۔ اکلوتا بھائی اس سے بہت محبت کرتا تھا، خیال رکھتا تھا مگر بیوی کا تیکھا مزاج بہت جگہ اسے بے بس کر دیتا۔

''ہاں بھئی، ہمیں کیا پتا..... ہمیں تو وہی ماننا پڑے گا جو تم کہو۔ آخر خاندان کی پہلی لڑکی ہے جو اتنا پڑھ رہی ہے۔''

بھابھی کا طنزیہ لہجہ اسے اندر تک جلا گیا مگر کچھ بھی کہنا بیکار تھا۔ وہ کل بھائی کو بھی کچھ نہیں کہہ سکی تھی اور اب بھی کیا کہتی۔ بھابھی نے بظاہر تو کچھ نہ کہا تھا۔ لہجے محسوس کیے جاتے ہیں، سنائے نہیں جاسکتے۔

تب ہی دروازے پر بیل بجی تھی۔ اس کا بھتیجا دروازہ کھولنے بھاگا۔ چند لمحوں بعد ہی فرخ ان کے سامنے موجود تھا۔

''واہ بھئی، کیا قسمت والا دن ہے۔ پڑھاکو لوگوں سے ملاقات ہوگئی۔''

وہ اسے دیکھ کر خوش ہوا۔ خاندان کی سب سے پڑھی لکھی، سلجھی ہوئی لڑکی اس کے نام تھی۔ فخر تو بنتا تھا۔ بھابھی کا دل مزید خاک ہوا۔ انہوں نے اس سے ان دیکھا مقابلہ شروع کر رکھا تھا۔ آخر ان کا شوہر، بھائی سب اس لڑکی کے دیوانے کیوں تھے۔ حرا مسکرا دی۔ یہ منگنی اس سے پوچھ کر نہیں کی گئی تھی مگر پھر بھی وہ مطمئن تھی۔ فرخ کی آنکھوں میں نظر آتی پسندیدگی اسے اپنے محفوظ مستقبل کا پتا دیتی تھی۔

''نہ آنے کا وقت، نہ جانے کا، جب چاہے

پڑھو، نہ پڑھو۔ یہ اچھی پڑھائی ہے۔''

بھابھی نے استہزائیہ انداز میں ہنس کر کہا تھا۔

فرخ نے اثر لیے بنا جواب دیا۔

''یونیورسٹی میں ایسا ہی ہوتا ہے آپا۔''

''تب ہی تو بچے ہاتھ سے نکلتے ہیں۔ گھر والوں کو پتا بھی نہیں ہوتا کہ کیا پڑھ رہے ہیں۔''

بھابھی نے ٹھٹا لگایا۔

''سب ایسے نہیں ہوتے بھابھی۔ ہاتھ سے نکلنے کے لیے یونیورسٹی جانا ضروری نہیں، گھر بیٹھے لوگ بگڑ رہے ہوتے ہیں۔''

حرا بالآخر خفگی سے بول اٹھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ فرخ سمیت خاندان کے کتنے ہی لڑکے انٹرنیٹ اور موبائل کا غلط استعمال کرتے تھے۔ لڑکیوں سے ان کی دوستی معمولی بات تھی مگر چونکہ وہ لڑکیاں خاندان کی نہ تھیں تو سب جائز تھا۔

''اور کیا، سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ حرا بھی تو جاتی ہے۔ مجھے پتا ہے یہ تو لڑکوں سے بات بھی نہیں کرتی ہوگی، ہے نا۔''

فرخ نے منگیتر کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا سو شد و مد سے اس کی طرف داری کرتے یقین دہانی بھی چاہی۔ حرا نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

☆☆☆

آج کی رات میرے لیے بہت مشکل تھی۔ اتنے برس بعد حرا کا سامنا اور اس کا تند رویہ مجھے حیران کر گیا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ ایسا کوئی رشتہ بھی زندگی میں نہیں تھا، جس سے مشورہ لیتا۔ امی میرے بچپن میں ہی اس دنیا سے گزر گئی تھیں۔ ابو نے دوستوں کی طرح پالا اور ان کی چھاؤں اور تربیت میں مجھے ساری دنیا ہی کسی فلم کا سیٹ لگتی۔ من پسند سین تھے زندگی میں، کچھ اوپر نیچے ہو جاتا تو ابو سنبھال لیتے اور ہیپی اینڈنگ ہو جاتی۔

حرا یونیورسٹی میں پہلے دن سے میری کلاس فیلو تھی۔ ہم دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ سرد مہری کلاس میں ہوتے ہوئے بھی نہ ہونے والی لڑکی تھی۔ آدھی کلاس اس کا نام بھی نہ جانتی ہوگی اور میں ڈیپارٹمنٹ کی رونق تھا۔ اساتذہ سے لے کر ڈیپارٹمنٹ میں پڑھنے یا آنے والا ایک ایک بندہ میرا جاننے والا تھا۔ دوسرے ڈیپارٹمنٹ کے طلبہ سے بھی دوستیاں تھیں۔ اس قدر تضاد کے باوجود مجھے اس سے سچی محبت کب ہوئی، کچھ پتا نہیں چلا۔ بس یہ ہوا کہ مجھے اس کے ہونے اور نہ ہونے کا احساس ہونے لگا۔ اس کی موجودگی میرے دل کا موسم بدل دیتی۔ اپنے جذبوں کی سچائی جانچنے میں مجھے کچھ وقت لگا۔ اپنی کیفیت کو محبت کا نام دے کر میں ایک نئی سرشاری میں رہنے لگا تھا۔ ابو ہمیشہ کی طرح میری خوشی میں خوش تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ فوری طور پر رشتہ لے کر حرا کے گھر چلا جاؤں مگر میں اتنی عام سی گھسی پٹی کہانی کا کردار نہیں بننا چاہتا تھا۔ میں ڈیپارٹمنٹ کا ہیرو تھا، مجھے اپنی آڈیئنس سے داد لینی تھی۔ میں نے دوستوں کو دل کا حال بتایا اور پورا پلان سیٹ کیا۔

وہ ہماری فیئر ویل پارٹی تھی۔ اس کے ہوسٹ اور آرگنائزر ہمارے جونیئرز تھے، جو میرے متاثرین میں سے تھے۔ مجھے ان کا مکمل تعاون حاصل تھا۔ پارٹی کے دوران ہماری کلاس کے نمایاں لوگوں کو ایک کے بعد ایک بلا کر ٹائٹل دینے کا سلسلہ جاری تھا۔ تقریب کے اختتام میں جب حرا کو اسٹیج پر بلایا گیا تو وہ قدرے حیران سی لگی۔ شاید اپنی ریزرو طبیعت کی بنا پر اسے یہ امید نہیں تھی کہ اسے یوں اسٹیج پر بلا کر ٹائٹل دیا جاتا پھر فوراً ہی وہ مسکراتے ہوئے پراعتماد انداز میں اسٹیج پر آئی تھی۔ میزبان پیچھے ہٹ گئے تھے، اب مائیک میرے پاس تھا اور میں علی الاعلان اس کے سامنے اسٹیج پر گھٹنوں کے بل بیٹھا گلاب کا پھول اسے پیش کرتا پروپوز کر رہا تھا۔

☆☆☆

''چار سال ساتھ پڑھنے کے باوجود ہم دونوں ایک دوسرے سے ناواقف ہیں۔ تمہارا سنجیدہ انداز مجھے کسی قسم کی پیش رفت سے روکتا تھا۔ اس کے

باوجود جانے کب تم میرے دل میں جاگزیں ہوئیں۔ میں اپنی محبت کو کم ہمتی کی نذر نہیں کرنا چاہتا۔ آج میں سب کے سامنے تم سے اظہار محبت کے ساتھ تمہیں پروپوز کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے شادی کرو گی حرا۔"

روایتی ماحول میں پلنے والی اس لڑکی کے لیے یہ پروپوزل کسی بلاسٹ سے کم نہیں تھا۔ وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی۔

"ول یو میری می؟"

عاقب دوبارہ کہہ رہا تھا۔

"سوری۔"

زیر لب کہتی وہ پلٹی تھی۔ اس کے سر میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، نہ ہی عاقب کے وہ دوست وڈیو بناتے نظر آ رہے تھے جو پہلے سے اس سین کے لیے تیار تھے۔ ہال میں سناٹا تھا۔ میزبان لڑکی نے آگے بڑھ کر اسے جانے سے روکنا چاہا۔

"پلیز جواب تو دو حرا۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ایڈونچر کی شوقین نئی نسل کے لیے یہ سب بہت دلچسپ تھا۔

"سوری، میری منگنی ہو چکی ہے۔"

وہ بلند آواز سے کہتی اسٹیج سے نیچے اترتی چلی گئی تھی۔ عاقب کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گرا تھا۔ پھول زمین بوس ہو چکا تھا۔ پورے ہال سے ایک مشترکہ تاسف بھری "اوہ" کی آواز ابھری تھی۔ اس کے بعد بھانت بھانت کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ ان آوازوں اور تبصروں کو سننے کے لیے رکی نہیں بلکہ فوراً ہی وہاں سے چلی گئی تھی۔ پیچھے ساؤنڈ سسٹم پر موجود سنگر جو عاقب کا بتایا ہوا گانا گانے کو تیار تھا۔ اس تمام صورت حال پر دکھی ہونے لگ گیا۔ اور انسٹرومنٹس بجانے والوں کو گانا تبدیل کرنے کا اشارہ دے چکا تھا۔ دکھی میوزک کے ساتھ سنگر نے گانا شروع کر دیا تھا۔

کہاں نے جو ٹوٹے کوئی سپنا

جگ سونا سونا لاگے،

جگ سونا سونا لاگے

فیئر ویل پارٹی جاری و ساری تھی

☆☆☆

آنے والے دنوں میں عاقب نے ڈیپارٹمنٹ سے حرا کا ایڈریس لے کر اپنے ابو کو بھیجا مگر وہاں سے واضح انکار تھا۔ درحقیقت حرا کے گھر کسی نے ان سے سیدھے منہ بات بھی نہ کی تھی۔ کلاسز ختم ہو چکی تھیں۔ دوبارہ ان دونوں کا سامنا نہیں ہوا۔ عاقب اس واقعے سے دل برداشتہ تو بہت ہوا کیونکہ پورے ڈیپارٹمنٹ میں اس کا مذاق بنا تھا۔ مگر پھر باپ کی بیماری اور غم روزگار نے اسے سب بھلا دیا۔ حرا کو معلوم بھی نہیں ہوا۔ وہ وڈیو جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی اور اس کی زندگی جلا گئی تھی۔ فرخ نے اس سے شادی سے انکار کر دیا تھا۔

"آپا ٹھیک کہتی تھیں، تم جیسی لڑکیوں پر یقین کرنا ہی نہیں چاہیے۔"

فرخ نے ہاتھ سے انگوٹھی اتار کر اس کے منہ پر ماری تھی۔ ماتھے پر زور سے ٹکرا کر انگوٹھی زمین پر گر کر لڑھکتی ہوئی دور چلی گئی تھی۔ دل میں زوردار ٹیس اٹھی تھی۔ "تم جیسی" نے ماتھے کی چوٹ محسوس نہیں کرنے دی تھی۔ کیا تھی وہ، اور کیا تھیں اس جیسی لڑکیاں؟ سینکڑوں ایسی لڑکیاں جو عزت سے صرف پڑھنے جاتیں اور پڑھ کر واپس گھر آ جاتیں۔ کسی اور کے فعل کی ذمہ دار وہ کیوں تھی۔ کسی اور لڑکی کی بے راہ روی یا کسی لڑکے کی بے باکی اس کے ماتھے کا کلنک کیوں بنی تھی۔ وہ رونا چاہتی تھی، چیخنا چاہتی تھی مگر آواز اس کے گلے میں گھٹ گئی تھی۔ خاندان بھر میں یونیورسٹی میں پڑھنے والی لڑکیوں کی آزاد خیالی پر ایک طویل مباحثہ جاری تھا۔ سب کا خیال یہی تھا کہ حرا کی طرف سے کوئی نرمی ضرور ہو گی جو لڑکے کو اس پیش رفت کی ہمت ہوئی۔

اپنی بیٹیوں کو اعلا تعلیم سے محروم رکھنے کا مضبوط جواز ہاتھ آ گیا تھا۔

حرا کے والدین حیات ہوتے تو شاید اسی صدمے سے مر جاتے یا یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اس کی طرف آتے طنز کے تیر توڑ دیتے مگر اکلوتا بھائی جو پہلے بہن کی ضد پر ہار کر خاندانی روایات سے سرتابی کر چکا تھا، ہمت ہار چکا تھا۔ وضاحت، معافی تلافی کچھ کام نہ آئی۔ بھابھی کے طعنوں کی وجہ سے وہ گھر میں ایک مجرم کی طرح رہا کرتی۔ اس کی سزا اس وقت طویل ہوگئی جب سب کی زیادتیوں کے ردعمل کے طور پر اس نے بھائی کے سامنے بھابھی کو جتایا کہ بدکردار وہ نہیں تھی، اس کا صرف رشتہ آیا تھا۔ جس میں اس کی مرضی شامل نہیں تھی، کردار اگر کسی کا کمزور تھا تو وہ ان کا بھائی تھا جو خود لڑکیوں سے دوستی کرتا تھا اور پھر ان ہی لڑکیوں کے آئینے میں اپنی منگیتر کو تول گیا۔

یوں منہ توڑ جواب بھابھی کو اس کا باقاعدہ دشمن بنا گیا۔ انہوں نے اس کے خلاف پراپیگنڈہ تیز کر دیا۔ خاندان والے تو پہلے ہی اس کے خلاف تھے۔ اس تمام صورت حال سے عاجز آ کر ناچار بھائی نے خاندان سے باہر اس کا رشتہ دیکھنا چاہا۔ شادی ہو جاتی تو وہ دونوں بہن بھائی سکون کی زندگی گزارتے مگر باہر سے آنے والے رشتے بھی بھابھی کی آنکھوں سے اسے دیکھتے تھے۔

حرا نے حالات کے سامنے ہار ماننے کے بجائے اپنی تعلیم کو ہتھیار بنایا اور جاب کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ گو اس پر بھی بہت باتیں بنیں مگر بھائی اس کے لیے کچھ اچھا نہ کر سکا تھا تو پابندیاں بھی نہیں لگانا چاہتا تھا۔ پچھلے سال بھائی بھی روزگار کی خاطر اپنی فیملی کے ساتھ دوسرے ملک جا بسا اور وہ ہاسٹل میں رہنے لگی۔ محض عاقب کے ایک ایڈونچر کی وجہ سے وہ تنہا رہ گئی تھی۔

☆☆☆

''سر ایک خاتون آئی ہیں۔ خود کو آپ کی منگیتر کہہ رہی ہیں۔''

انٹر کام پر سیکریٹری نے عاقب کو بتایا۔ اس کے ذہن میں کل کا منظر تازہ ہوا اور بے اختیار زبان سے پھسلا.....

حرا!

''جی سر، یہی نام بتایا ہے۔ آپ کی منگیتر ہیں سر۔''

سیکریٹری جوش اور حیرت کے ملے جلے انداز سے پوچھ رہی تھی۔

''فضول سوال مت کیا کرو۔''

عاقب نے اسے ڈپٹا، اسی وقت کمرے کا دروازہ کھول کر حرا اندر داخل ہوئی۔ اس نے سیکریٹری یا عاقب سے اجازت ملنے کا انتظار نہیں کیا تھا۔

''واہ بھئی، تم تو اچھے سیٹ ہو گئے ہو۔ اتنی بڑی کمپنی میں اس عہدے تک اتنی جلدی کیسے آ گئے۔ ڈگری تو ہم دونوں کی ایک جیسی ہے بلکہ میری زیادہ بہتر ہے، تم تو بمشکل پاس ہوئے ہوگے۔''

وہ سلام دعا کیے بغیر کرسی گھسیٹ کر بیٹھی، بیگ سامنے میز پر رکھا اور اب آفس کو دیکھتے ایسے تفصیلی تبصرہ کر رہی تھی، جیسے وہ دونوں بچپن کے دوست ہوں۔

عاقب لمحے بھر کو سب بھولا تھا۔ وہ ریزروسی اچھی لگتی تھی تو یوں پراعتماد بہت اچھی لگ رہی تھی۔ حرا کی موجودگی اسے پھر یونیورسٹی کے دنوں میں لے گئی۔ دوسرے لمحے خود کو ڈپٹتے ہوش میں آتے ہوئے وہ کہنے لگا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔ جابز کہاں ملتی ہیں۔ میں تو ابو کے انتقال کے بعد خوار ہو گیا تھا۔ ماہ رخ میری منگیتر کے والد، اس کمپنی کے مالک ہیں۔ وہ میرے ابو کے اچھے دوست ہیں۔ انہوں نے مجھے جاب دی، کام سکھایا، یہ عہدہ دیا۔ بدلے میں ان کی صرف یہی خواہش ہے کہ میں ماہ رخ سے شادی کر لوں۔ انہیں ڈر ہے کہ وہ کوئی غلط بندہ پسند نہ کر لے۔ مگر جسے انکل راضی کر کے لاتے ہیں، اسے بھگا دیتی ہے۔ میں تو دنیا میں اکیلا اور پھر بے روزگار ہوں، اس لیے ڈٹا رہا۔''

عاقب نے سکون سے جواب دیا۔ وہ اس معاملے کو جذباتی ہوئے بغیر حل کرنا چاہتا تھا۔ لڑے سال اسے عقل سکھا گئے تھے۔ اب وہ پہلے جیسا خوابوں میں رہنے والا یا فلمی ہیرو کی نقل کرنے والا ٹین ایجر نہیں تھا۔ وہ ہنگامہ کیے بنا اسے مایوس لوٹانا چاہتا تھا۔

حرا بے اختیار ہنسی۔

"کتنی محنت کی ماہ رخ کے والد نے مگر ماہ رخ نے تمہاری بھی چھٹی کردی۔ ویسے لڑکی اچھی ہے۔"

عاقب کو ایک دم اس کے گھٹیا پن کا سوچ کر غصہ آیا تھا۔ حرا نے یقیناً اس کے بارے میں بہت کچھ جان کر ماہ رخ کے سامنے اپنی اینٹری دی تھی۔ تب ہی ماہ رخ کے کل والے رویے کو دیکھ کر وہ پر یقین تھی کہ یہ منگنی مزید قائم نہیں رہ سکتی۔ وہ عاقب کو بلیک میل کرکے شادی کرنا چاہ رہی تھی۔

"اگر ماہ رخ میری چھٹی کرے گی تو انکل نوکری سے بھی میری چھٹی کردیں گے۔ پھر شادی کر کے پالو پوسو گی مجھے۔" عاقب نے طنزیہ انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ جان گیا تھا، اس کی ظاہری دولت حرا کو اتنے سال بعد اس تک کھینچ لائی تھی۔ وہ اسے جتا دینا چاہتا تھا کہ اسے بدنام کرکے بھی وہ کچھ حاصل نہیں کرسکتی۔ وہ مر کر بھی اس سے شادی نہیں کرے گا۔

"بات یہ ہے عاقب کہ وہ سب جو تمہارے لیے مذاق تھا یا شاید کوئی انوکھی مہم، میرے لیے اب تک ایک طعنہ ہے۔ وہ وڈیو میری بدکرداری کی سند ہے۔ میں اسے ایک اعزاز بنانا چاہتی ہوں۔ تمہاری فیملی میں ایسا نارمل ہوتا ہوگا لیکن جس فیملی سے میرا تعلق تھا، وہاں یہ سب اچھا نہیں سمجھا جاتا اور تمہاری بے وقوفی نے مجھے میرے اپنوں کے لیے پرایا کردیا تو اب تمہیں اپنانا میری مجبوری ہے۔"

وہ اس کے یوں دیکھنے سے گھبرائی نہیں تھی بلکہ اٹھ کے ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر متوازن لہجے میں بولی۔

عاقب کے پاس لفظ ختم ہوگئے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی، مہم، طعنہ، بدکرداری الفاظ کانچ کی طرح ٹوٹ کر اس کے اندر بکھرے تھے اور روح میں چبھن ہوئی تھی۔

"جہاں تک کمانے کا تعلق ہے تو یہ بات تمہیں پورے ڈیپارٹمنٹ کے سامنے اسٹیج پر مجھے پروپوز کرتے ہوئے سوچنی چاہیے تھی، تب بھی باپ کی کمائی پر پل رہے تھے۔ آج بیوی کی کمائی کا آسرا لینا چاہتے ہو۔ جن میں غیرت ہو وہ محنت مزدوری کر کے بھی گھر چلا لیتے ہیں ورنہ بیویاں تو بے چاری معذور شوہروں کو بھی پال ہی لیتی ہیں۔"

چبا چبا کر بولتے اس نے بات مکمل کی۔

عاقب اتنے سال بعد اپنی زندگی میں آنے والی اس اچانک تبدیلی سے گھبرا گیا تھا مگر خدا جانتا ہے کہ اس وقت حرا کو پروپوز کرنا کوئی گھٹیا مذاق نہیں، اس کی دلی خواہش تھی۔ وہ خود کو ہیرو سمجھتا تھا۔ پھر بھی اس نے اپنے طور پر بہت شریف بن کر یہی سوچا تھا کہ جس لڑکی کو پسند کرو، اس سے شادی کرلو۔ بس رضامندی حاصل کرنے کا طریقہ کچھ ہٹ کر ہونا چاہیے، تاکہ کچھ تو عام لوگوں سے منفرد ہو مگر ماحول کا فرق یوں اس کی انوکھا کرنے کی خواہش کو حرا کے لیے گالی بنا دے گا، اسے بالکل اندازہ نہ تھا۔ وہ ساکت و جامد بیٹھا تھا۔

"کہاں ہیں تمہارے انکل اور وہ ماہ رخ، ملواؤ نا مجھے ان سے۔" اس کی مکمل خاموشی پر وہ اب دوبارہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ایک دم لہجہ بدل کر بشاش لہجے میں بولی۔

"اس وڈیو میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ میں نے تمہیں صرف پروپوز کیا تھا۔ کوئی غلط بات نہیں کہی تھی، وہ تمہاری بدکرداری کی سند کیسے ہوسکتی ہے۔"

عاقب اس کے متوازن لہجے کے پیچھے چھپا دکھ ذہن سے نہیں جھٹک سکا تھا۔ حرا کے کردار کا وہ خود گواہ تھا۔ اس کی پاکیزگی کو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی کجا کہ لوگ اسے طعنے دیتے۔ حرا کے الفاظ

اسے شرمندگی میں مبتلا کر گئے سو اس کی بات نظر انداز کر کے بے اختیار پوچھا۔

''تم واقعی اتنے معصوم ہو یا بن رہے ہو۔'' حرا نے اسے غور سے دیکھا۔ عاقب کے چہرے پر موجود فکر، کرب اور پچھتاوا حقیقی تھا۔ اس نے یہ تو نہیں چاہا تھا۔

''یہ سب ہمارے معاشرے میں انہونا نہیں۔ یہاں یہی سب ہوتا ہے۔ بس تم ہی کسی یوٹوپیا کے رہائشی تھے۔'' وہ بیگ اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔ ''تمہیں کوئی مارجن دینے کا ارادہ تو نہیں تھا مگر کیا یاد کرو گے۔ سوچ لو ماہ رخ یا میں، پھر اپنا فیصلہ بتا دینا۔''

''میں نوکری ڈھونڈ لوں گا ورنہ مزدوری کر لوں گا، تم مجھے بے روزگار قبول کر لو گی نا!''

عاقب کے لہجے میں آس تھی۔ کہاں وہ سوچ رہا تھا کہ اسے منہ نہیں لگانا۔ زبردستی تو شادی نہیں کر سکتی۔ اب ایک ہی نشست میں وہ اسے سب بھلا چکی تھی، اپنا روشن مستقبل بھی۔ اس کا دکھ دل میں تیر بن کر پیوست ہوا تھا۔ درد اندر تک محسوس ہو رہا تھا۔

حرا نے جاتے جاتے مسکرا کر اسے مڑ کر دیکھا۔

''میں سوچ کر آئی ہوں۔ تم مجھے ہر حال میں قبول ہو مگر تمہیں وقت مل ہی گیا ہے تو تم بھی سوچ سمجھ لو۔''

عاقب کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھا تھا۔ اسے آج صبح ہی انکل نے وارننگ دے دی تھی کہ ماہ رخ سے رشتہ ختم ہونے کی صورت میں وہ اس عہدے کا اہل نہیں۔

☆☆☆

''ماہ رخ، ماہ رخ، ماہ رخ۔''

پاپا ادھر سے ادھر چکراتے ایک ہی لفظ کہے جا رہے تھے۔

''کیا ہے پاپا.....! ویسے تو بہت مہربان، انسان دوست بنتے ہیں اور میری کی گئی ایک نیکی بھی برداشت نہیں۔'' ماہ رخ شرارت سے جگر جگر کرتی آنکھوں کے ساتھ منہ بسور کر کہہ رہی تھی۔

''نیکی.....! اپنے منگیتر کو کسی اور کی جھولی میں ڈال دینے والی نیکی۔'' وہ جھلائے، پھر ماہ رخ کے برابر میں بیٹھی حرا کو دیکھ کر دھیما پڑے۔

''اس سب مسئلے کو تمیز سے بھی سلجھایا جا سکتا تھا۔ حرا میری بیٹی کی طرح ہے، تم مجھے سب بتاتیں، میں خود عاقب سے بات کرتا۔''

''مسئلہ کیسا پاپا! عاقب میرا منگیتر کبھی نہیں تھا، بس اچھا دوست تھا۔ آپ نے اسے اتنا سکھا پڑھا کر میرے حوالے کیا تھا کہ میری پاگل پن کی ایکٹنگ یا چھوٹی موٹی باتوں کو تو وہ آرام سے نظر انداز کر دیتا تھا۔ میں نے بھی سوچا کہ بچو ایسا مزا چکھاؤں گی کہ تڑپ تڑپ کر بھی دعا ہی دو گے۔ اسے حرا سے سچی محبت تھی، تب ہی تو جذبات میں بہہ کر مجھے یہ قصہ سنا گیا تھا۔ پھر میں نے کتنی مشکل سے حرا کو ڈھونڈا۔ اسے اس سب کے لیے راضی کیا۔ اب ان دونوں کی شادی ہو جائے گی تو دیکھیں اللہ کتنے خوش ہوں گے۔''

''خاک شادی ہو جائے گی، عاقب بدک گیا تو..... اتنی دھمکیاں دلوائیں اس بے چارے کو نوکری جانے کی، پھر یہ تمہاری حرا اسے سوچنے کا موقع بھی دے آئی۔ یاد رکھو بیٹا! تم بچہ لوگ ہماری بات نہیں سمجھتے مگر حقیقت یہی ہے کہ محبت کچھ نہیں ہوتی، بھوکے پیٹ تو چاند بھی روٹی نظر آتا ہے۔'' پاپا تھک کر اپنی کرسی پر آ بیٹھے۔

''اس کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے پاپا، مجھے اس سے شادی نہیں کرنی نا۔''

ماہ رخ ٹھنکی۔

''نہیں انکل! مجھے ماہ رخ نے اپنے پلان میں شامل کیا تو خود اٹھائی جانے والی مشکلات کا بدلہ لینے کے لیے میں مان گئی۔ میں عاقب کو پریشان کرنا چاہتی تھی مگر میں زبردستی کسی پر مسلط نہیں ہونا چاہتی۔

اگر وہ ماہ رخ کو منتخب کرتا ہے تو میں اس سے ہرگز شادی نہیں کروں گی، میری بھی کوئی عزت ہے، وقار.....''

حرا کا جملہ ادھورا تھا۔ جب عاقب تیزی سے اندر آیا تھا۔ وہ انکل کو استعفیٰ دے کر اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے آیا تھا مگر کمرے کا دروازہ ذرا سا کھولتے ہی ان دونوں کے ساتھ حرا کی موجودگی اسے حیران کر گئی۔ وہ خاموشی سے ان کی گفتگو سننے لگا اور اب ایک دم سیخ پا ہو کر اندر آیا۔

''بس میں ہی کاٹھ کا الو ہوں۔ میری کوئی عزت نہیں جو یہ استعفیٰ دینے چلا آیا۔ باقی سب کی عزت ہے۔ تم ماہ رخ، تم نے دوست بن کر دھوکا دیا ہے مجھے۔ اور انکل آپ سے ایسی امید نہیں تھی مجھے۔''

وہ باری باری کمرے میں موجود تینوں نفوس کو گھور رہا تھا ماہ رخ اس کے غصے کا اثر لیے بنا شرارتی نظروں مگر خاموش لبوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

حرا اسے اچانک سامنے دیکھ کر نظر چرا گئی تھی اور پاپا نے ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر تسلی سے اس کی بات سنی تھی۔

''بیٹھ جاؤ۔'' وہ چپ ہو گیا تو پاپا کی آواز ابھری تھی۔ کسی اور نے وضاحت دینے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ غصے میں کھولتا بدستور کھڑا رہا۔

''سٹ ڈاؤن۔''

پاپا نے بلند آواز میں حکمیہ لہجے میں کہا تو وہ مجبوراً بیٹھ گیا۔ غصہ اپنی جگہ مگر بہرحال وہ ان کی بہت عزت کرتا تھا۔

''تمہارا خلوص جانچنا حرا کا حق تھا۔ وہ اتنی بے مول نہیں ہے کہ تم جیسا نکما بھی اسے نخرے دکھائے اور وہ تم سے زبردستی شادی کرے۔ اس لیے مزید کوئی ڈرامہ کیے بغیر سب اپنا اپنا دل صاف کرو اور آگے کا پلان کرو، شادی کب کرنی ہے؟''

انہوں نے بارعب لہجے میں بات ختم کی اور حرا کتنی انمول تھی..... یہ عاقب سے بہتر کون جانتا تھا۔

''اگلے ہفتے ٹھیک ہے پاپا مگر اس سے پہلے آج آفس میں ان کی منگنی کرتے ہیں۔ عاقب ویسے ہی پروپوز کرے گا حرا کو۔'' ماہ رخ نے جلدی سے کہنا شروع کیا۔

''تم تو چپ ہی رہو۔'' عاقب نے اسے گھورا۔

''کیا ہے یار! تمہاری محبت ملوا دی، اب تھوڑا سا یہ فرض بنانا تو میرا بھی حق تھا۔ سارے حق حرا کے ہی تو نہیں نا۔''

ماہ رخ شرارت سے بولی تو بے اختیار مسکراہٹ سب کے لبوں پر دوڑی۔

عاقب اپنی جگہ سے اٹھ کر حرا کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھا اور استعفیٰ اس کے سامنے کیا۔

''آپ کے لیے اپنا آفس چھوڑ دیا، مجھ سے شادی کریں گی میم۔''

حرا نے ماہ رخ اور اس کے پاپا کو دیکھا، وہ مسکرائے تو اس کا استعفیٰ چٹکی سے پکڑ کر ہوا میں اڑا دیا اور بولی۔

''ضرور کروں گی۔ ایسا عاشق زار مجھے اور کہاں ملے گا۔''

''لیں، آخر اتنے سال بعد میرا پروپوزل قبول ہو ہی گیا۔''

عاقب نے نعرہ لگایا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اپنے غیر حقیقی رویے کی وجہ سے وہ خود بھی پریشان ہوا اور حرا نے بھی اذیت سہی لیکن سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ بہت سی مشکلات کے بعد نئے اسباق پڑھا کر زندگی ایک بار پھر اس کے لیے کسی فلم کی طرح ہو گئی تھی۔ جس کے آخر میں ہیرو، ہیروئن کو ملنا ہی تھا۔ ہیپی اینڈنگ۔

☆☆

قرۃ العین سکندر

ہجر اثاثہ رہ جاتا ہے

ہجر اثاثہ رہ جاتا ہے
ہاتھ میں کاسہ رہ جاتا ہے
جب امید نہ باقی ہو تو
صرف دلاسا رہ جاتا ہے
زخم بہت سے مل جاتے ہیں
وقت ذرا سا رہ جاتا ہے
دل سے درد نکل کر بھی تو
اچھا خاصا رہ جاتا ہے
موجیں جب بھی چھو کر گزریں
ساحل پیاسا رہ جاتا ہے
ایک شناسائی کی دھن میں
دکھ ہی شناسا رہ جاتا ہے
وقت بھلا دیتا ہے سب کچھ
ایک خلاصہ رہ جاتا ہے

پو پھوٹ چکی تھی۔ مگر اس کو تو اب صبح و شام کی جیسے خبر بھی نہ رہتی تھی۔ آنکھوں سے کوسوں دور نیند رہا کرتی تھی۔ محبت کے عذاب ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ نمناک نگاہوں کو انتظار کے روگ لگا دیتی ہے۔

اس نے کھڑکیوں سے پردے ہٹاتے ہوئے صبح کی ٹھنڈی ہوا کو محسوس کیا۔ ہوا کے جھونکوں نے استقبال کیا۔ عقبی لان کا خوش نما منظر دل کو مسحور کر رہا تھا۔ زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت اس طرح دلکش تھی۔ دل تو اس کا مرجھایا ہوا سا تھا۔

اس نے سست روی سے باہر کی جانب کچن کا رخ کیا۔ جہاں تانیہ بھابھی تندی سے پراٹھے بیلنے میں مصروف تھیں۔ دوسری طرف چولہے پر چائے کا پانی چڑھا رکھا تھا۔ اس کی آمد پر تانیہ بھابھی نے ذرا سی ذرا مصروف انداز میں مڑ کر اس کو دیکھا۔ مگر کہا کچھ نہیں تھا۔ صبح کا وقت یونہی ہڑبونگ لیے ہوتا تھا۔ سفیر بھائی کا آفس جانے کا وقت اور پھر ثوبان عدنان کا اسکول ٹائم ہوتا تھا۔ ردا بھی شور مچاتی تھی۔ اس کی وجہ سے روزانہ تو تکار بھی ہو جایا کرتی تھی۔ ردا بھی بھی آرام سے اسکول کے لیے تیار نہ ہوا کرتی تھی۔ اسے نخرے کرنے آتے تھے اور اس کے تمام تر ناز سفیر بھائی اٹھاتے بھی تھے۔ وہ دو بھائیوں کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اور سفیر کو بیٹی کی بے حد چاہت تھی۔ اس لیے ردا بھی اس بات کا پورا پورا فائدہ اٹھایا کرتی تھی۔

سنبل نے خاموشی سے آملیٹ کی تیاری کے لیے پیاز کاٹنا شروع کر دی تھی۔ ندا بیگم نے کچن میں جھانک کر دیکھا اور پھر اس کو بھابھی کے ساتھ یوں کام کرتے دیکھ کر مطمئن انداز میں واپس پلٹ گئی تھیں۔ بچے ناشتا کرتے ہوئے آپسی بحث میں بھی ساتھ ساتھ مصروف عمل تھے۔ تبھی بچوں کی اسکول وین کا ہارن بجنے لگا۔ بچے ماں کو چومتے چاٹتے دادی سے دعائیں لینے باہر کی جانب لپکے۔ تب تک سفیر بھی چائے کی پیالی خالی کر چکے تھے۔ پھر وہ بھی آفس بیگ تھامے باہر کی جانب چل دیے۔

اسی اثناء میں بسمہ آ گئی تھی۔ اس نے ایک بھرپور نگاہ خاموش سی سنبل پر ڈالی تھی۔

"کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" بسمہ نے اس کی متورم نگاہیں دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں بس رات دیر تک پڑھتے پڑھتے نیند نہیں آئی۔ کتاب ہی بہت دلچسپ تھی۔" وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اس وجہ سے

اب سر بوجھل بوجھل سا ہو رہا ہے۔''

بعض اوقات انسان سچ سے دامن چھڑانے لگتا ہے۔ نگاہیں چرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ بسمہ سے بھی اپنی دلی کیفیت بیان کرتے ہوئے کترا رہی تھی۔

''اچھا ایسا کرو چائے کے ساتھ کوئی ٹیبلٹ لے لو۔ ورنہ سر درد بڑھ جائے گا۔ پھر ہم نے کل تک شادی کی ساری شاپنگ کرنی ہے۔ اس کے بعد روانگی کی تیاری ہے۔'' بسمہ کو اپنی ہی فکر کھائے جا رہی تھی۔

شادی کا لفظ سن کر سنبل کے سر درد میں اچانک جیسے اضافہ ہوا تھا۔ وہ مزید کوئی بات کیے بغیر آرام کرنے کی غرض سے سیدھا اپنے کمرے میں آ گئی۔ مگر ذہن کی سوئی ماضی کے دھندلکے میں الجھی ہوئی اس کو کشاں کشاں پیچھے گزر جانے والے دنوں میں دھکیل رہی تھی۔

☆☆☆

ہم سیاہ بخت
عمر بیتی ہے۔جنہیں ہجر کی پیمائش میں
ہم سیاہ بخت
ترے فاصلہ بردار
مسافر شب کے
رات آتی ہے تو چل پڑتے ہیں
بے بہا سلگی ہوئی یاد کے انگاروں پر
رو ح برسات میں بھڑکتی ہوئی آتش ہے
کہ بجھتی ہی نہیں
رات آتی ہے تو گر پڑتے ہیں
ترے اندوہ کی نم غاروں میں
کون اب آ کے نکالے مجھ کو
کون ٹھہرائے گا بکھرے ہوئے پتوں کے
نصیب
ہم جو روندے ہوئے رستوں کی طرح
آہ بھی بھرتے ہوئے ڈرتے ہیں
زندگی کسی مرجھائے ہوئے دل کی طرح
سوگ کے کپڑوں میں لپٹی ہوئی بیوہ کوئی
کوئی دم بھر بھی ٹھہرتے ہیں کس آس کی
چھاؤں میں تو رو پڑتی ہے
ہم سیاہ بخت
ترے فاصلہ بردار
مسافر شب کے
عمر بیتی ہے جنہیں ہجر کی پیمائش میں
رات آتی ہے تو چل پڑتے ہیں

''تم نے کیا ضد لگا رکھی ہے۔ جب سارے معاملات ابا نے از خود طے کر لیے ہیں تم فکر کاہے کرتی ہو آرام سے رہ لوگی۔اور تم کوئی پردیس نہیں جا رہی ہو یہ ساتھ ہی ہے کراچی۔ جب چاہو ویک اینڈ پر آ جاؤ اپنا بیگ خاموشی سے تیار کرو۔کہاں سے پورے کریں ہم گھر کے خرچے اور اس پر تمہاری تعلیم کے اخراجات۔سچ پوچھو تو ڈاکٹری اتنی بھی آسان نہیں ہے اس کے لیے انسان کو ہر طرح کے ماحول کے مطابق خود کو ڈھالنا پڑتا ہے۔ پھر تمہارا ہی شوق تھا۔تمہارے بابا کی تھی خواہش.....اب بھگتو۔''

ندا بیگم نے پہلے پہل تو رسانیت سے سمجھایا پھر تھک ہار کے سارا ملبہ اس کے سر پر ہی جیسے گرا کر خود دست بردار ہو گئی تھیں۔

''مگر امی.....ہم نے کبھی تایا کا گھر نہیں دیکھا ہے۔کبھی ملنا ملانا نہیں ہوا ہے۔اچانک ہی ابا مجھے وہاں بھیجنے کے درپے ہو گئے ہیں۔اگر ایڈمیشن کا بھی مسئلہ ہے تو پھر میں وہاں ہوسٹل میں رہ لوں گی۔اور دوسری لڑکیاں بھی رہتی ہیں۔رہی اخراجات کی بات، تو اس طرح بھی تو تایا مدد کر سکتے ہیں۔''

اب کے ندا بیگم نے اس سے شاید مزید بحث و مباحثہ کرنا سراسر وقت کا زیاں سمجھا تھا۔بھی سامنے پھیلائے پرات میں پالک کے پتے چننے شروع کر دیے۔ندیم صاحب کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔سفیر تو پھر بھی شام تک لوٹتا تھا۔اور پھر بچے بھی اسکول سے آتے ہوں گے۔کچن کی تمام تر ذمہ داری تو ندا بیگم سنبھال رہی ہیں کہ ثوبان عدنان کے بعد کسی نئے مہمان کے چکر میں تانیہ کی طبیعت سخت خراب رہنے لگی تھی۔بچے بھی ان دنوں سنبل ہی سنبھال رہی تھی۔ اب جبکہ اس کا نام بھی میرٹ پر آ چکا تھا۔مگر اس دور افتادہ قصبے میں تعلیمی سہولیات کا فقدان تھا۔

بہت عرصے پہلے نسیم صاحب کھڑے کھڑے آئے تھے۔بس اطراف کا جائزہ لیتے رہے تھے۔یہ ان دونوں بھائیوں کا آبائی گھر تھا۔شاید ماضی کی کسک ان کو گھیر لائی تھی۔اسے تو بس اتنا یاد تھا کہ ہزار ہزار کے چند کھڑکھڑاتے نوٹ انہوں نے سب بچوں کے ہاتھوں میں تھما دیے تھے۔اس کے بعد نسیم صاحب کی دوبارہ آمد نہ ہوئی تھی۔اب نجانے کیسے دونوں بھائیوں کے آپسی تعلقات دوبارہ روابط میں آ گئے تھے۔اور یوں دونوں نے آپسی بات چیت سے یہ معاملہ طے کیا تھا کہ سنبل کو کراچی بھیجنے کی بات طے ہو گئی تھی۔دل سے سنبل کسی طور بھی آمادہ نہ تھی۔

وقت کے گھاؤ بتاتے ہیں کہ بسا اوقات رشتہ داروں میں بھی روپے پیسے کی وجہ سے بھید بھاؤ ہوا

کرتے ہیں۔ ندیم صاحب کا شروع سے ہی پڑھائی لکھائی میں اتنا دل نہیں لگتا تھا۔ وہ پھر جیسے ہی کتابیں سامنے رکھ کر پڑھنے کی کوشش کرتے۔ سر چکرانے لگتا تھا۔ سامنے لکھے ہوئے لفظ اودھم مچانے لگتے تھے۔ جی ہی نہیں لگتا تھا۔ رو دھو کر انٹر کے امتحانات کے بعد انہوں نے پڑھائی لکھائی سے باقاعدہ توبہ کرلی تھی۔

والد صاحب کی دیرینہ خواہش تھی کہ ان کے بچے قابل بنیں۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہوجائیں مگر بڑے بیٹے نے ضرور ان کی اس تمنا کو پورا کیا تھا۔ وہ پوزیشن ہولڈر تھے ترقی کی راہوں پر گامزن رہا کرتے تھے۔ دنیاوی اعتبار سے بہت آگے نکل گئے تھے۔

جبکہ اس بھیڑ چال میں ندیم صاحب بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اس تفاوت کو والد صاحب کی دور رس نگاہیں بھانپ گئی تھیں۔ اس لیے وہ آزردہ اور ملول سے رہنے لگے تھے۔ اس طرح جب وہ ایک دن اداس سے تھے تو ندیم ان کے سامنے دوزانو بیٹھ گئے تھے۔ پوچھنے لگے۔

''ابا جان۔ کیا بات ہے جو آپ کو اندر ہی اندر کھائے جارہی ہے؟'' والد صاحب نے اک ملول سی نگاہ نیک تابعدار بیٹے پر ڈالی۔

''بیٹا...... میری شدید خواہش تھی کہ میرے بچے خوب تعلیم حاصل کریں۔ کیونکہ میں ٹھہرا چٹا ان پڑھ۔ یہ آرزو نسیم پتر نے تو پوری کردی ہے مگر اسی تعلیم کی وجہ سے اب ہم سب کے درمیان ان دیکھے فاصلے آکھڑے ہوئے ہیں۔'' ان کی آواز میں بلا کا درد تھا۔

''مگر ابا جان...... تعلیم سے کیسے فرق آسکتا ہے۔ تعلیم تو ذہنی شعور اجاگر کرنے کا دوسرا نام ہے۔ ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑتی ہے۔ دل کو گداز کرتی ہے۔'' وہ شش و پنج میں ڈوبے ہوئے ہوا پوچھ بیٹھے۔

''ہاں پتر۔ مگر جب تعلیم دل تک اثر نہ کرے تو پھر وہ روح تک بھی نہیں پہنچ پاتی ہے۔ تو نے نہیں دیکھا مگر میری ان بوڑھی آنکھوں نے دیکھا ہے کہ نسیم اب ہم سے کترانے لگا ہے۔ اب ہم اس کے معیار کے مطابق نہیں رہے۔ میری تو خیر چلتی ہوئی سانسوں کی ڈوری نجانے کب ٹوٹ جائے مگر پتر میرے بعد شاید تم دونوں بھائیوں میں دوری آجائے گی۔ وہ پہلے جیسا میل جول، میل ملاپ نہیں رہے گا۔''

وہ بہت ہی آزردہ دکھائی دے رہے تھے۔

وقت نے ثابت کردیا کہ باپ کی وفات کے بعد بھائیوں میں وہ میل جول نہیں رہا تھا۔ نسیم صاحب نے اپنی ہی کلاس فیلو عینا سے محبت کے بعد شادی کرلی تھی۔ بے پناہ دولت کی مالک عینا نے نہ صرف نسیم صاحب کو اپنی زلف کا اسیر بنالیا۔ بلکہ ساری دولت لٹا کر اپنا مفتوح بھی بنالیا تھا۔ نئے بنتے ہوئے رشتے میں پرانے رشتوں کی گنجائش نہ رہی تھی۔ پرانے رشتوں میں شگاف آچکا تھا۔

انسان کس قدر جلد بدل جاتے ہیں۔ رویہ، لہجہ انداز۔ ندیم صاحب کو لگتا تھا کہ ان کے اندر صدیوں کی روح حلول کرگئی تھی۔ جو رشتوں میں ہی جیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ نسیم صاحب کے کھردرے لہجے کی پروانہ کرتے ہوئے وہ رشتوں کو اپنائے رکھنے کے متمنی تھے۔

نسیم صاحب کو پرانا محلہ پرانے لوگ پرانے رشتے سب اب محض وقت کا زیاں لگتے تھے۔ انہوں نے کراچی شہر کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ ندیم صاحب جاتے تو مل لیتے۔ وہ بھی کھڑے کھڑے احوال دریافت کرتے۔ کبھی اتنا بھی نہ کہا کہ اتنی دور سے طویل مسافت طے کرکے آئے ہو رات ہی یہاں بسر کرلو۔

جب دلوں میں دوری آجائے تو باقی ساری باتیں ہیچ ہوجاتی ہیں۔

☆☆☆

''یہاں کیوں بیٹھی ہو۔'' طاہر نے اسے ایک جانب عقبی سیڑھیوں کی جانب بیٹھا دیکھا تو پوچھ لیا تھا۔ یہ زینہ بالائی منزل کی جانب جاتا تھا۔ جہاں صرف ایک اسٹور سا بنا رکھا تھا۔ وہاں عموماً جانا کم ہی

ہوا کرتا تھا۔ وہ اسے یوں گم صم بیٹھا دیکھ کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔

''انسان اس قدر مجبور کیوں ہوتا ہے کہ اپنی زندگی کے اہم ترین فیصلے تک خود کرنے کا مجاز نہیں اور دوسروں کی ہی مرضی کو اپنے لیے منتخب کرنے کا پابند ہوتا ہے۔'' وہ نروٹھے پن سے بولی۔ مسکان نے طاہر کے لبوں کو چھوا۔

''دیکھو بڑوں کے فیصلے ہمارے حق میں بہتر ہوتے ہیں۔ اگر چہ وقتی طور پر درست نہ بھی محسوس ہو رہے ہوں۔ مگر دیر سویر ہمیں احساس ہو ہی جاتا ہے کہ بڑوں کے فیصلے درست تھے۔ طاہر نے متانت سے کہا۔''

''رہنے دو تم تو ویسے بھی اپنی خالہ کی زبان ہی بولو گے۔'' وہ سخت زچ ہو کر بولی۔

''مگر یہ فیصلہ خالہ جان کا تو نہیں ہے۔ خالو کا فیصلہ ہے۔ اور تمہیں اعتراض کس بات کا ہے۔'' وہ اب سیدھا ہو بیٹھا تھا۔ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتا دل کے آر پار کے تمام رازوں سے جیسے پردہ اٹھا دینا چاہتا ہو۔

''تم رہنے دو مجھے بحث نہیں کرنی ہے۔'' وہ جیسے نظریں چرا گئی تھی۔

''اچھا۔ بحث کی گنجائش اب رہی بھی نہیں ہے۔ صبح میں وقت پر آجاؤں گا۔ تم اپنی تیاری رکھنا۔ سفیر بھائی کا آفس ورک ہے۔ جاب کا مسئلہ ہے اور پھر خالو جان نے یہ ذمہ داری مجھ پر سونپی ہے تو میں اسے احسن طریقے سے انجام دینے کا خواہش مند ہوں۔''

طاہر نے اس کے سامنے کھل کر وضاحت کی تھی۔

''ہاں، تم پریشان نہ ہو میں تیار ہی رہوں گی۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور واقعی طاہر کی کار آتے ساتھ ہی وہ دونوں روانہ ہو گئے تھے۔ طاہر مشاقی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اور وہ فرنٹ سیٹ پر ہی بیٹھی باہر کے مناظر میں گم تھی۔

☆☆☆

طویل و عریض محل نما بنگلے میں اس وقت کسی تقریب کا سماں تھا۔ چار دیواری کے ساتھ ساتھ قطار در قطار رنگ برنگی لمبی گاڑیوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ نسیم صاحب کی بیگم عینا دل کھول کر روپیا پیسا بے دریغ لٹانے کی قائل تھیں۔ پارٹی کا تو یوں بھی بہانہ درکار ہوا کرتا تھا۔ فلاں بچے نے آج ٹیسٹ میں اعلا کامیابی حاصل کی تو پارٹی منعقد کر دی گئی۔ آج بزنس میں فلاں کانٹریکٹ سائن ہو گیا تو پارٹی کا بہانہ مل گیا۔ اور تو اور محض نمود و نمائش، نئی کراکری اور نئی طرز پر ڈیکوریشن کی تعریف و ستائش کی طلب ہوئی تو بھی پارٹی منعقد کر دی گئی۔ ایسی تقاریب میں عموماً خواتین قیمتی زیورات اور ہر لحاظ سے تراش خراش لیے عمدہ سے عمدہ لباس زیب تن کرتی تھیں۔ تاکہ وہ دوسری خاتون سے زیادہ دلکش اور پرکشش دکھائی دیں۔

ایسی ہی ایک تقریب آج عینا بیگم نے اپنے ہونہار بیٹے کی وطن واپسی پر منعقد کی تھیں عرشان اعلا تعلیم حاصل کر کے وطن واپس لوٹا تھا بزنس کی تمام تر باریکیوں میں طاق ہو کر اب باپ کا دست راست بننے کے لیے بالکل تیار تھا۔

عینا بیگم تفاخر سے گردن اٹھائے تمام مہمان گرامی کا خوش دلی سے استقبال کر رہی تھیں۔

عرشان اور ثناء دو ہی بچے تھے۔ عرشان کو جتنا علم حاصل کرنے کا جنون تھا۔ ثناء کو اتنا ہی تعلیم سے بے رغبتی محسوس ہوتی تھی۔ ہر طرح کی کوششوں کے باوجود اس نے رو دھو کر سادہ بی اے کیا تھا۔ وہ بھی بہت عام سے نمبروں سے اس کے بعد تو ثناء کی بس ہی ہو گئی تھی۔ اس کے برعکس عرشان ان کے لیے ہر لحاظ سے تفاخر کا سبب تھا۔

ایسے وقت جب وہ مہمانوں کو ریسو کر رہی تھیں تب طاہر منبل کو یہاں تک چھوڑ کر جا چکا تھا۔ اس ہجوم میں جہاں بھڑکیلے لباس اور نت نئے فیشن کے شوخ ملبوسات میں جیسے پریاں زمین پر چل رہی تھیں۔ وہ بالکل سادہ سی صاف شفاف چہرہ لیے اسکارف میں

اپنے ہالوں کو مقید کیے کھڑی تھی۔ مسز نسیم نے ایک تحیر زدہ نگاہ اس حسین معصوم اور سادہ مگر پرکشش چہرے والی لڑکی پر ڈالی۔ انہیں یاد کرنے پر بھی اپنے حلقہ احباب میں سنبل کا تعلق یاد نہیں آیا تھا۔ ایسے میں نسیم صاحب آگے بڑھے۔

''سنبل بیٹا۔ آ گئیں تم..... ماشاء اللہ، کیسا سفر گزرا۔'' نسیم صاحب کے لہجہ میں بشاشت اور اپنائیت تھی۔

سنبل جو اس پرہجوم تقریب میں خود کو یکسر تنہا محسوس کر رہی تھی اور اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس وقت نسیم تایا کی آمد اس کے لیے ڈھارس کا سبب بن گئی تھی۔ اسے ایک دم سے تحفظ کا شدید احساس ہوا۔ سادہ سی لڑکی سب میں ممتاز لگ رہی تھی۔ اس لیے سب ہی اس کی جانب متوجہ تھے۔

عینا بیگم نے اپنے مجازی خدا کا انداز محبت بغور ملاحظہ کیا تھا۔ فی الوقت موقع نہ تھا کہ وہ اعتراض جڑتیں۔

''اب آ ہی گئی ہو تو تم بھی ہمارے ساتھ اس تقریب میں شمولیت اختیار کرو۔ یہ عرشمان کی خوشی میں ہے۔ آؤ اس طرف بیٹھ جاؤ۔'' نسیم صاحب نے محبت پاش لہجہ میں کہا تھا۔ جو عینا بیگم کو ایک آنکھ نہ بھایا۔

''کیا بات کر رہے ہیں، بچی تھکن سے چور ہے۔ اسے آرام کی ضرورت ہے۔ اسے آرام کرنے دیں۔'' اب وہ کھلے لفظوں میں کہنے سے رہ گئی تھیں کہ سنبل کا سادہ سا حلیہ اس تقریب میں ان کے لیے ہتک کا سبب بن سکتا ہے۔ وہ پھر ان کے مجازی خدا کا خون تھی۔ اتنا قریبی رشتہ وہ چھپا بھی نہ پاتیں۔

ایک ملازمہ نے اس کی رہنمائی کی اور اسے انیکسی کی طرف لے گئی تھی۔ وہاں ایک کشادہ سا کمرہ جہاں سہولت کی تمام اشیاء موجود تھیں۔ اب اس کی ملکیت میں تھا۔

رات کے ڈھلتے سکوت میں باہر میوزک کا پروگرام شروع ہوتے ہی ساز و آواز کی لہریں یہاں تک بازگشت کرتی ہوئی ہوا کے دوش پر پہنچ رہی تھیں۔

اس نے اپنا سفری بیگ ایک جانب رکھا تھا اور بیڈ پر نیم دراز ہو گئی تھی۔ نئی جگہ نیا ماحول نئے لوگ وہ الجھن میں تھی۔ کیسے اس اجنبیت بھری فضا میں خو کو مدغم کر سکے گی۔ اس کا ذہن ایسے اس ایک نقطے پر منجمد سا ہو کر رہ گیا تھا۔ تبھی ملازمہ دوبارہ لوٹی۔

''بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں باہر آ کر کھانا کھالیں کھانا کھل چکا ہے۔''

ملازمہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ شاید وہ اسے ساتھ لے جانے کے لیے انتظار کر رہی تھی۔

''میں آ جاتی ہوں۔ فریش ہو کر۔''

اس نے کہا تو ملازمہ سر ہلاتی واپس ہو لی تھی۔

اچھے سے اسکارف سے بالوں کو ڈھانپ کر وہ باہر نکلی۔ سیدھا چلتی وہ جدھر سے آئی تھی۔ ادھر ہی چل دی تھی۔ مگر اب وہاں جو لوگوں کا ہجوم بیکراں تھا کم ہو چکا تھا۔ شاید کھانے کے لیے کوئی اور جگہ مختص کی گئی تھی۔ اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چلا تھا۔ کاش وہ خانساماں کے ساتھ ہی آ جاتی۔ وہ اس الجھن میں متذبذب کھڑی تھی جب اسے کسی نے ہولے سے پکارا تھا۔

''ایکسکیوزمی مس۔''

اس نے پلٹ کر دیکھا بلیک پینٹ شرٹ میں ملبوس وہ بڑا وجیہہ شخص اپنی براؤن آنکھیں اس کے چہرے پر مرتکز کیے تھا۔ بڑی سیاہ آنکھیں گھیری پلکیں۔ دلکش نقوش، متناسب سراپا، الغرض وہ مکمل خوب صورتی کا پیکر تھی۔ اس سادگی میں بھی وہ دل کو موہ رہی تھی۔ وہ اچنبھے سے اس دراز قامت شخص کو دیکھ رہی تھی۔

''کھانا اس طرف ہے میں نے آپ کو آتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ پھر آپ کہاں چلی گئی تھیں۔''

وہ شخص اس کی ذات میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پنپتی ہوئی اپنائیت اسے ہولائے دے رہی تھی۔ وہ بنا کوئی

جواب دیے چپ چاپ اس کے بتائے راستے پر چل دی۔ ادھر وہ شخص اسے جاتے ہوئے دیکھ کر کندھے اچکا کر رہ گیا۔ بلاشبہ اس نے اس طرح کی نخریلی لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ جس نے رہنمائی پر شکریے کا لفظ تک کا ادا نہیں کیا تھا۔ یہ بات حیدر علی شاہ کے لیے تحیر زدہ بات تھی۔

☆☆☆

وہ اپنے آفس کے ایر کنڈیشنڈ ماحول میں لمبی میز کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر سخت غصے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتا ہوا اس کا غصہ سوا نیزے پر تھا۔ اس وقت وہ شدید اشتعال میں تھا۔ اس کے ایک ورکر کی کوتاہی کی بدولت ایک اہم پروجیکٹ ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ بروقت دوسری پارٹی کو میٹنگ کی تاریخ اور دوسری اہم دستاویزات فراہم نہیں کر سکا تھا۔ اس کی بدولت کمپنی کو پروجیکٹ ہاتھوں سے نکل جانے کی وجہ سے خسارے کا سامنا تھا۔ عرشان کا موڈ سخت خراب تھا۔ تبھی اس نے انٹر کام پر سر حماد کو بلوالیا۔ وہ اپنی عمر رسیدہ ہستی کی بدولت سر کہلاتے تھے۔ بڑے چھوٹے سب میں اپنی منکسر المزاجی کے تحت وہ یکساں مقبول تھے۔ اس وقت عرشان کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ان کو سب کے سامنے کھری کھری سنائے۔

اور تھوڑ دیر بعد ہی وہ سر جھکائے مودب انداز میں اندر آئے۔ اس وقت آفس میں ان دونوں کے سوائے کوئی بھی موجود نہ تھا۔

''میں نے آپ کو یہ کہنے کے لیے یہاں بلوایا ہے کہ ڈیڈ نے آپ سب کو سر پر بٹھا کر رکھا ہوا ہے۔ آپ سب کو بیٹھے بٹھائے کھانے کی لت پڑ چکی ہے۔ مگر میری فہرست میں معافی کی گنجائش نہیں ہے۔ نہ ہی میں دوبارہ موقع دیتا ہوں۔ سو ناؤ یو گیٹ لاسٹ۔ پرانے بڈھوں کی اب یہاں گنجائش نہیں رہی ہے۔ نئے جواں خون کی ضرورت ہے۔ جو تندہی سے اپنا فریضہ ادا کریں۔ رہی بات آپ کی پے کی تو جتنے دن بنتے ہیں اس ماہ کے، آپ جاتے ہوئے کیشئر سے اپنا حساب کتاب کلیئر کرتے ہوئے جائیں۔''

عرشان کا انداز بے حد تضحیک آمیز تھا۔ حماد صاحب کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ ان کے چہرے پر ان کے اندرونی اضطراب سے آتی دکھ کی لہر صاف پڑھی جاسکتی تھی۔ مگر وہ صبر کیے ہوئے تھے۔

''عرشان صاحب! میں نے برسوں اس کمپنی کی خدمت کی ہے۔ نمک خوار ہوں۔ جو غلطی سرزرد ہوئی انجانے میں ہوئی۔ نسیم صاحب کافی دنوں سے آفس نہیں آرہے تھے۔ اب ان کی غیر موجودگی میں اتنا بڑا فیصلہ میں کیسے لے سکتا تھا۔ تاخیر میں سراسر میری غلطی نہیں تھی۔''

وہ مدہم لہجے میں جھکے کندھوں کے ساتھ گویا ہوئے۔ مفلسی کے خدشات ان کے چہرے پر رقم تھے۔

''اوہ! تو اب آپ برسوں کی خدمت کے عوض مجھ سے رقم مانگیں گے۔ معذرت۔ جو کام آپ کرتے رہے ہیں ہر ماہ اس کی ایک معقول تنخواہ آپ کو ملتی رہی ہے۔ نہ ہی مفت کام کیا ہے جو احسان جتا رہے ہیں۔''

سفید پوش شخص جو عزت نفس کو کل متاع قرار دیتا ہو اس کے نزدیک اتنی ہی عزت افزائی کافی تھی۔ سو وہ بنا کسی مزید بحث کے باہر نکل گئے۔

حماد صاحب کو ذلیل کرنے کے بعد عرشان کے اندر جلتی ہوئی آگ پر جیسے ٹھنڈی پھوار سی پڑ گئی تھی۔ اس کا موڈ اچانک ہی نارمل سا ہو گیا تھا۔

تکبر، رعونت، گھمنڈ، غصہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

نسیم صاحب ایک حلیم طبیعت کے مالک انسان تھے۔ ان کو جب علم ہوا تو انہیں شدید صدمہ پہنچا اور انہوں نے عرشان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بیٹا۔ حماد صاحب ہمارے پرانے ورکر ہیں۔ مجھے ان پر پورا بھروسا ہے۔ جب بھی بیماری کی وجہ سے یا میں اور تمہاری مام ورلڈ ٹور پر گئے تو پیچھے سارا

چلایا۔ کبھی کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اور مجھے بے حد افسوس ہے کہ تم نے بنا مجھ سے مشورہ کیے ان کو جاب سے ہی فارغ کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بزنس میں اور اس کی روز افزوں ترقی میں حماد صاحب کا بھی خون پسینہ لگا ہوا ہے۔''

وہ اس وقت سخت تنفر سے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے نصیحت پسند نہ تھی۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اسے آزاد فضا میں تعلیم کی غرض سے بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں سارے فیصلے نوجوان نسل از خود کرنے کی مجاز ہوا کرتی ہے۔ اب اس کا یوں موڈ خراب ہونا اچنبھے کی بات نہ تھی۔ اسے اپنے فیصلوں میں کسی کی بھی دخل اندازی کی عادت نہ رہی تھی۔

''ڈیڈ! اگر یہ سب کرنا تھا تو مجھے یہاں اپنی کرسی پر بٹھانے کا مقصد ہی کیا تھا۔ جب سارے فیصلے آپ کے ہیں تو میں یہاں کیا صرف رسم نباہنے کے لیے بیٹھا ہوں۔'' وہ سخت نروٹھے پن سے بولا۔

نسیم صاحب چونک سے گئے۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی خفگی وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ سو فوری طور پر ایک دم سیدھے ہو بیٹھے تھے۔

''کیسی باتیں کرتے ہو۔ بیٹے یہ ایک بات مان لو اس کے بعد تمہارے کسی بھی فیصلے میں میری کوئی مداخلت نہیں ہوگی۔ میں اب تھک چکا ہوں۔ بوڑھا سا ہو گیا ہوں میرے ناتواں کندھے اب اس قدر وسیع و عریض کاروبار کا بوجھ نہیں برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔ میں نے تمہیں یونہی خالی نام کا اس کرسی پر نہیں بٹھایا۔ بلکہ یہ سب تمہارا ہی ہے میرے بیٹے۔'' نسیم صاحب کا لہجہ بے حد گداز اور محبت سے بھرا تھا۔

عرشمان نے باپ کا لجاحت بھرا انداز بغور ملاحظہ کیا۔ اگرچہ وہ حماد صاحب کی واپسی کو آفس میں سراسر اپنی توہین شمار کر رہا تھا۔ مگر اس وقت باپ کے انداز کے سامنے چپ ہو گیا۔

''ٹھیک ہے ڈیڈ۔ مگر اس کے بعد ان کی جانب مجھے کوئی شکایت ملی تو پھر میں چپ نہیں رہوں گا۔'' وہ سخت لہجہ میں اپنا فیصلہ باور کروا گیا۔

اس ساری بات کا عینی شاہد ہمدانی تھا۔ وہ باپ بیٹے کی ساری بحث و تمحیص ملاحظہ کر چکا تھا۔ ہمدانی کو از خود حماد صاحب سے ایک عرصے سے بیر تھا۔ وجہ ہمدانی کی جاب میں عدم دلچسپی تھی۔ وہ تنخواہ تو وقت مقررہ پر لے لیتا مگر رزق کو حلال نہ کرتا تھا۔ کبھی دیر سے آنا، کبھی بہانے بازی کرنا اور کبھی حجت بازی کرنا۔ اس کا وطیرہ بن چکا تھا۔ ہمدانی کو حماد صاحب نے اکثر باتوں ہی باتوں میں احساس دلایا تھا۔ حماد صاحب اگرچہ باس نہ تھے مگر سب جانتے تھے کہ آفس میں ان کا مقام مرتبہ کیا تھا۔ نسیم صاحب نے اپنے بعد کے تمام فیصلوں کا اختیار کلیتہً حماد صاحب کو دے دیا تھا۔

حماد صاحب سارے اسٹاف پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ ایک تو وہ خود وقت کے بے حد پابند تھے۔ اور اسی طرح دوسروں کو بھی وقت کی پابندی کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ اور یہ تلقین و نصیحت ہمدانی کی عیاشی کی راہ میں حائل ہو رہی تھی۔ جلدی آفس سے چھٹی کر لیتا تھا۔ کبھی گھریلو پریشانی کا بہانہ کرتا کبھی سر درد کا اور کبھی کوئی اور عذر تراش لیتا۔ مگر حماد صاحب کی مشاق نگاہیں ان کی چیلہ بازی کو بھانپ لیتی تھیں۔ اس طرح ایک موقع پر انہوں نے ہمدانی کو سخت سنا دی تھیں اور اس دن کے بعد سے ہمدانی کے دل میں ان کے لیے کینہ اور بغض آ گیا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ حماد صاحب سے اپنی اس دن کی تذلیل کا بدلہ لے۔

اور اب تقدیر کی طرف سے ہمدانی کو یہ سنہری موقع ملا تھا۔ اول تو عرشمان کا دل حماد صاحب کی جانب سے میلا ہو گیا تھا۔ دوسرا حماد صاحب کا اب آفس میں وہ دھاک اور دبدبہ نہیں رہ گیا تھا۔ جو نسیم صاحب کی موجودگی میں پورے اسٹاف پر ہوا کرتا تھا۔ بلکہ اب تو ان کی خود کی نوکری کے بھی لالے سے پڑ گئے تھے۔ یہ سب باتیں ہمدانی کو جی ہی جی میں خوش کر گئی تھیں۔

☆☆☆

طویل میز پر کھانے کی مختلف چیزیں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ یہ رات کے کھانے کا وقت تھا۔ اس وقت کھانے کی میز پر سب ہی اہل خانہ بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن کھانے کے دوران گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ شاید ایک اضافی شخص کی شرکت ٹھہری تھی۔ دن میں تو عینا بیگم نے خانساماں کو خصوصی ہدایات دے رکھی تھیں کہ وہ سنبل کو اس کے کمرے میں ہی کھانا پہنچادیا کرے۔ وہ اس کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔ مگر اس وقت جب انہوں نے خصوصی طور پر کھانے تیار کروائے تھے۔ کیونکہ ان کی عزیز از جان بھابھی اور بھائی مدعو تھے۔ ساتھ ہی ان کا اکلوتا لخت جگر حیدر علی شاہ بھی موجود تھا۔ ایسے پرتکلف سے ماحول میں جب کھانے پینے میں سب مشغول تھے۔ نسیم صاحب نے اچانک ہی خانساماں کو سنبل کو بلا بھیجنے کا کہا۔ عینا بیگم مہمانوں کے سامنے کوئی بدمزگی نہیں چاہتی تھیں اس لیے اپنی جگہ پر کسمسا کر رہ گئیں۔

''کوئی خصوصی مہمان آیا ہوا ہے کیا؟'' اس دن زاہد صاحب سے تعارفی مراحل طے نہ ہو سکے تھے وہ سنبل کی آمد سے یکسر انجام تھے۔ جبکہ نازیہ بیگم بھی اچنبھے سے اس وقت اپنی نند کی جانب متوجہ تھیں۔

جہاں خفگی کے واضح تاثرات ملاحظہ کیے جاسکتے تھے۔ عینا بیگم کا جی چاہا تھا کہ وہ اس وقت نسیم صاحب کو ٹوک دیں۔ ان کی بھرپور کوشش تھی کہ حیدر علی شاہ کا رشتہ ثناء سے طے ہو جائے۔ کیونکہ حیدر علی شاہ اول تو ان کے اپنے خاندان کا تھا۔ پھر کھاتا پیتا ایک امیر وکبیر شخص ہونے کے علاوہ ملنسار، پرکشش اور وجیہہ شخصیت کا مالک تھا۔ وہ ایسے قابل ہونہار بھتیجے کا رشتہ کسی طور بھی ہاتھوں سے گنوانا نہیں چاہتی تھیں۔ نہ ہی وہ ایسے نازک موقع پر حیدر کے سامنے کسی طرح کی اپنی پوزیشن خراب کرنے کی روادار تھیں۔ اس لیے سنبھل کر بولیں۔

''آپ بھی نا کمال کرتے ہیں، کھانا وہ کمرے میں ہی کھالیتی۔ یہاں آخر وہ بچی جھجک میں بھلا کیا کھانا کھا سکے گی۔''

''بچی سارا دن کمرے میں بند رہ کر بیمار ہو جائے گی۔ تمہارا تو فرض بنتا تھا اس کی خوب مہمان نوازی کرتیں اتنے سالوں میں پہلی مرتبہ تمہاری سسرالی رشتہ دار آئی ہے۔ مگر تم نے تو اس کو سرے سے نظر انداز کر رکھا ہے۔ پھر وہ جس قدر مشکل پڑھائی میں مصروف ہے۔ اس طرح کی فریش ایکٹیوٹیز کی اس کو سخت ضرورت ہے۔ کبھی آؤٹنگ پر لے جاؤ۔ کبھی گھمانے پھرانے۔ اور نہیں تو کسی دن بچی کو شاپنگ پر ہی لے جاؤ۔'' نسیم صاحب نے بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر کھل کر بات کی کیونکہ اس وقت عینا بیگم کے بھائی اور بھابھی دونوں موجود تھے۔

''انکل میں چند دن ادھر ہی ہوں۔ آپ کہیں تو میں ثناء اور آپ کی بھتیجی دونوں کو آؤٹنگ پر لے جاؤں گا۔''

حیدر نے خوش دلی سے کہا۔ اس کا یہی کھلا ڈلا انداز جس میں ہر دوسرے انسان کے لیے اپنایت ہوا کرتی تھی۔ نادیہ بیگم کو بالکل بھی پسند نہ تھا۔ کبھی انہوں نے بھنویں سیکیڑ کر اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھا۔ مگر وہ حیدر ہی کیا جو کبھی ماں کی آنکھوں کی گھوریوں کی پروا کر جائے۔ اس وقت بھی یکسر نظر انداز کیے بیٹھا اطمینان سے کباب پلیٹ میں رکھ رہا تھا۔

جبکہ عینا بیگم ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

ثناء ایک خوش شکل لڑکی تھی۔ مگر سنبل کے سامنے اس کی شخصیت پھیکی سی پڑ جاتی تھی۔ کیونکہ سنبل کا حسن آنکھوں کو پہلی ہی نگاہ میں مبہوت کر دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی جس کی وجہ سے عینا بیگم اس لڑکی کی آمد کی وجہ سے ہراساں سی تھیں۔ پھر اس پر متزاد یہ کہ وہ اعلا تعلیم کے حصول کے لیے تندہی سے پڑھائی میں مشغول تھی۔ اس کا سارا دھیان اپنے نصب العین پر تھا۔ انہوں نے اکثر انیکسی کی جانب چکر لگا کر دیکھا تھا۔ وہ جب بھی وہاں سے گزرتی تھیں۔ ان کو سنبل ہمیشہ پڑھائی میں جتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

سنبل کی آمد کے ساتھ ہی گفتگو کا سلسلہ وقتی

طور پر جیسے موقوف سا ہوگیا۔
حیدر نے دیکھا ہلکے گلابی کاٹن کے سادہ سے لباس میں ملبوس وہ لڑکی آج بھی سر کو اچھی طرح ڈھانپے ہوئے تھی۔ اس کا سرخ وسفید رنگ اس پر بے حد دلکش نقوش آنکھوں کو خیرہ کررہے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی حیدر کی نگاہیں بار بار سنبل کے چہرے پر بھٹکنے لگتی تھیں۔
سنبل کو نسیم صاحب نے اپنے پاس ہی بٹھا لیا تھا۔ پھر ایک ایک شے اس کی پلیٹ میں از خود ہی ڈالتے جارہے تھے۔ وہ وہاں موجود سب نفوس کے سامنے واقعی گھبرائی ہوئی سی تھی۔ اجنبی ماحول اور یکسر انجان چہرے اس وقت اس کے اطراف میں بیٹھے تھے۔

اتنی دور آکر اپنوں سے الگ رہنا کہاں آسان تھا۔ مگر یہ سب اس کے بابا کا فیصلہ تھا۔ اور وہ ان کے تمام فیصلوں کے سامنے ہمیشہ ہی مودب رہا کرتی تھی۔ وہی نہیں اس کی ماں نے بھی ایک عمر اسی طرح جی حضوری میں گزار دی تھی۔ اور اب کسی طرح بھی سر اٹھانا اور اختلاف رائے کرنا ان سب کی سرشت میں ہی نہ تھا۔
''بیٹا جی۔ کسی شے کی ضرورت تو نہیں۔'' نسیم صاحب کے لہجہ میں بزرگوں جیسی فکر گھلی ہوئی تھی۔
لمحہ بھر کے لیے سنبل کو محسوس ہوا کہ جیسے یہ سوال نسیم صاحب نے نہیں بلکہ خود ان کے اپنے والد نے کیا ہو۔ نمی سی اس کی آنکھوں میں گھل سی گئی تھی۔ جسے چھپانے کے لیے اس نے جلدی جلدی سے پلکیں جھپکالیں۔ آنکھوں میں لبالب اترتے ہوئے پانیوں کو اپنے اندر آگے ہی آگے دھکیلا۔
''جی کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔'' سنبل شائستگی سے کہا۔ لمحہ بھر کے لیے سنبل کی نگاہوں کا اسلام حیدر کی نگاہوں سے ہوا۔ حیدر وارفتگی سے اسی کی جانب متوجہ تھا۔ وہ ہچکچا کر نظریں جھکا گئی۔
''کل حیدر۔ تم ایسا کرنا کہ دونوں بچیوں کو لے جانا۔''

نسیم صاحب نے اپنی پاکٹ سے ایک خطیر رقم نکال کر سنبل کی گلابی تھیلی پر رکھ دی۔ وہ انکار کرنے کے لیے لفظ تراش ہی رہی تھی۔ جب نسیم صاحب نے یہ کہہ کر اسے بالکل بولنے ہی نہ دیا۔
''جب تک یہاں ہو تم کو میری ہر بات بلا چون وچرا اس طرح ماننی ہوگی جس طرح گھر میں اپنے بابا کی مانتی ہو۔ نسیم صاحب کی بات پر اس کا سر از خود اثبات میں ہل گیا تھا۔
عینا بیگم نے ایک نفرت بھری نگاہ اس لڑکی پر ڈالی۔ جو اس وقت ایک اطمینان بخش مسکراہٹ لبوں پر آویزاں کیے بیٹھی ہوئی تھی۔
پھر کھانے کے بعد سب خوش گپیوں میں مصروف ہوگئے۔ سنبل گومگو کی کیفیت میں مبتلا سوچ میں گم تھی کہ آیا کہ واپس پلٹ جائے یا ابھی ٹھہرے۔ اس کی سوچ شاید نسیم صاحب نے پڑھ لی تھی۔ اسی لیے اس سے کہا۔
''جاؤ بیٹا آرام کرو۔''
وہ سر ہلا کر پلٹ گئی۔

☆☆☆

''کیا بات ہے کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں۔'' زہرہ بیگم نے حماد صاحب کو سوچوں میں گھرا دیکھ کر پوچھا تو وہ چونک پڑے۔
کھانا ان کے سامنے رکھا تھا۔ مگر وہ کھانے کو فراموش کیے ہوئے کسی اندھی دنیا میں گم بیٹھے تھے۔ زہرہ بیگم دیکھ رہی تھیں کہ کتنے دنوں سے وہ پریشان سے ہیں۔ اور کہتے کچھ نہیں ہیں۔ یہ برسوں کا ساتھ تھا۔ ایک ایسا پائیدار محبت بھرا ساتھ جس میں دوسرے فریق کی سوچ کے دھارے بھی ایک دوسرے سے ملنے لگتے ہیں۔
''نہیں ایسا تو کچھ نہیں ہے۔'' حماد صاحب نے زہرہ بیگم کے چہرے پر فکروں کا جال بچھا دیکھا تو ہنس کرٹال سے گئے۔
''اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر آپ نے اب تک کھانا کیوں نہیں کھانا شروع کیا ہے۔ جبکہ کھانا بھی

آپ کا من پسند ہے۔ کڑھی چاول تو آپ بہت ہی رغبت سے کھاتے ہیں۔" زہرہ بیگم نے بھی بصد اصرار ان سے دل کے راز اگلوانے کا تہیہ کرہی لیا تھا۔ بات ضرور ایسی تھی کہ وہ اب جاننے کی تمنائی تھیں۔

کچھ عرصے سے سارے کاروباری معاملات عرشان میاں سنبھالنے لگے ہیں۔ سارے معاملات اب وہی سنبھال رہے ہیں۔ نسیم صاحب کا چکر لگتا تو ہے آفس میں مگر وہ کھڑے کھڑے ضروری فائلوں پر دستخط کر کے دوبارہ گھر کی راہ لے لیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ساری ذمہ داری اب عرشان میاں ہی سنبھالیں گے۔" حماد صاحب نے مبہم لفظوں کہا تھا۔

"اچھا مگر یہ تو خوشی کی بات ہے۔ آخر باپ کا سہارا بیٹا ہی تو ہوا کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ نے ہمیں بیٹا نہیں دیا بیٹیاں دی ہیں۔ زہرہ بیگم نے ٹھنڈہ آہ بھر کر کہا۔

"ناشکری کی بات مت کرو بیگم، بیٹا یا بیٹی دونوں رب کی عطا ہوا کرتے ہیں۔ پھر بات تو تم گھما پھرا کر کہاں کی کہاں لے گئی ہو۔ مجھے عرشان صاحب کے آفس سنبھالنے سے چنداں پریشانی نہیں ہے۔ مگر وہ ابھی ناسمجھ ہیں۔ ناتجربہ کار انسان ہیں۔ تجربہ کی بھٹی میں جل کر تپ کر کندن نہیں بنے ہیں۔ میری تو کوئی بات وہ سرے سے سننا ہی نہیں چاہتے۔ خواہ وہ ان کے حق میں ہی کیوں نہ بہتر ہو۔ مگر جو لفظ میرے لبوں سے ادا ہو جائیں وہ انہیں ایک تواتر سے رد کرتے چلے جاتے ہیں۔ مجھے اندازہ ہوا ہے کہ ان میں انائیت حد درجہ ہے۔ مگر اس سے سوا بھی ایک مسئلہ درپیش ہے۔ وہ سارے معاملات میں اب ایک ایسے انسان سے مشورے لینے لگے ہیں اتنا اعتماد کرنے لگ گئے ہیں، جو کسی طرح بھی بھروسے کے قابل نہیں ہے۔ وہ شخص اپنی چکنی چپڑی باتوں سے بہلا تو سکتا ہے مگر کسی طرح بھی وہ فیصلوں میں معاون ثابت نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کا تو میں خود عینی گواہ رہا ہوں کہ ہمدانی ایک انتہائی خود غرض مطلب پرست کینہ پرور انسان ہے۔ جو شخص دولت کے حصول کے لیے کسی حد تک بھی جا سکتا ہے۔ اس نے عرشان صاحب کے دل میں گھر کر لیا ہے۔ اور گاہے بہ گاہے میرے خلاف زہر اگلتا رہتا ہے۔ پھر یہ کہ نسیم صاحب بھی ان سب میں خاموش تماشائی کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

حماد صاحب نے دل کی ساری باتیں کہہ کر جیسے خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔ اور قدرے توقف سے دوبارہ گویا ہوئے۔

"خیر چھوڑو ان باتوں کو بسم اللہ کرو۔ بچیاں دکھائی نہیں دے رہی ہیں۔ ان کو بھی بلاؤ سب مل کر کھانا کھاتے ہیں۔

"بچیوں نے کھا لیا تھا۔ آپ کھائیں میں ساتھ کھاتی ہوں۔" زہرہ بیگم اب اپنے مجازی خدا کی باتوں میں الجھی ہوئی آہستہ سے بولیں۔

جتنی بھی باتیں حماد صاحب نے بتائی تھیں وہ واقعی تشویش ناک تھیں۔ لحہ لحہ اذیت سہہ رہے تھے۔

کھانے کے بعد زہرہ بیگم نے سارے برتن اٹھا لیے اور پھر اس کے بعد لامتنا ہی سوچوں میں گھرے ہوئے حماد صاحب سونے کی غرض سے لیٹ گئے۔ بچیوں کی فکریں لاحق تھیں۔ بڑی بیٹی کو خیر سے پڑھائی لکھائی کے آخری مراحل میں تھی اور جلد ہی اس کا رزلٹ آنے والا تھا۔ جبکہ چھوٹی ابھی پڑھ رہی تھی۔ ان کے مستقبل کے حوالے سے ان دیکھے وسوسے اور خدشات منہ کھولے کسی آسیب کی مانند ان کو اندر ہی اندر جیسے کھائے جا رہے تھے۔ پھر نجانے کب وہ نیند کی آغوش میں گم ہو گئے۔

نیند کی دیوی بہت مہربان ہوتی ہے [illegible] فکریں بھی اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔

☆☆☆

سنبل نئے ماحول میں خود کو ضم کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہو چکی تھی۔ یوں بھی اس کا نصب العین اعلا تعلیم کا حصول تھا۔ جس کے لیے اس کے والدین نے اسے خود سے دور بھیجا تھا۔ ایک مان اور بھروسے کے ساتھ۔ اور وہ ان کا یہ مان اور بھروسا کسی

صورت تو ژنا نہیں چاہتی تھی۔ کالج میں اس کی دوستی سدرہ سے ہوگئی تھی۔ سدرہ ایک ہنس مکھ اور شوخ سی لڑکی تھی۔ مگر فطرتاً اس کی طرح ہی تھی۔ شرمیلی سی اور اپنے ہی اندر خوابوں کو سینت سینت کر رکھنے والی' سال بھر کا عرصہ نجانے کیسے بیت گیا تھا۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہ ہوا تھا۔ منزل بے حد قریب تھی۔ پھر وہ اپنے بابا کے ادھورے تشنہ خواب پورے کرسکتی تھی۔ اس نے ہمیشہ اپنے بابا جان کے یہ الفاظ سنے تھے۔

''کاش کوئی میرا بچہ ایسا نام روشن کرے تعلیم میں کہ میں بھی سر اٹھا کر کہہ سکوں میں اتنا نہیں پڑھا لکھا تو کیا ہوا' اس خلش کو میری اولاد نے پر کردیا ہے۔''

اور ایسے وقت میں بابا کے چہرے پر ایک اضطراب اور دکھ کے گہرے سائے دیکھتی تو دل میں مصمم ارادہ باندھ لیتی تھی کہ وہ ضرور اپنے بابا کی اس ادھوری خواہش کو پورا کرے گی۔ اور اب اس نے اس کے لیے قدم بڑھا دیے تھے۔

بڑے بھائی سفیر بس واجبی سی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جاب پر لگ گئے تھے۔ چھوٹی بسمہ کو اتنا پڑھائی لکھائی کا شوق نہ تھا۔ اور اس نے جیسے از خود ابا کا یہ خواب پورا کرنے کی ٹھان لی تھی۔

وہ بابا کا مان تھی۔ اور اس مان کا بھرم رکھنا بھی خوب جانتی تھی۔ یہاں اسے عینا بیگم کے سرد رویے کا بھی سامنا رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس سے خار کھاتی ہیں۔ اس لیے اس کی زیادہ قریبی کوشش ہوتی تھی کہ وہ خود کو اپنے کمرے تک ہی محدود کرلے اور ثناء بھی اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی تھی۔

''ویسے کہیں سے لگتا نہیں ہے کہ تم ہماری کزن ہو۔ تمہارا اور ہمارا کیا تقابل۔ اف! بابا جان کا خاندان کتنا پسماندہ ہے۔ اور یہ تم ہمہ وقت سر کیوں ڈھانپ کر رکھتی ہو۔ کوفت نہیں ہوتی ہے کیا تمہیں۔''

ثناء نے ایک مرتبہ اسے آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے ماتھے پر آئی ہوئی لٹوں کو ایک جھٹکے سے پیچھے کیا تھا۔ اس کے نزدیک یوں دوپٹے میں ملبوس سر کو لپیٹے رکھنا محض دقیانوس اور فرسودہ سی کوئی سوچ تھی۔

آزاد خیال فضا میں پروان چڑھنے والی ثناء بالکل آزاد خیال تھی۔ اور اس طرح کی باتوں کو اپنانے کا تو وہ تصور بھی نہ کرسکتی تھی۔ جواباً سنبل فقط مسکرا کر رہ گئی تھی۔

''یہ صرف اپنی اپنی سوچ اور طرز عمل کی بات ہوتی ہے ثناء اور جسے تم محض دقیانوس گردانتی ہو۔ یہ ہمارا مذہب ہے ثناء۔'' وہ جواباً نرمی سے کہتی چلی گئی۔

اسی وقت لاؤنج میں قدم رکھتے حیدر علی شاہ کے دل میں سنبل کی یہ بات گھر کر گئی تھی۔ اس کی زندگی میں بھی بہت سی لڑکیوں کا گزر ہوا تھا۔ پروفیشنلی اور کس حد تک دوستانہ تعلق بھی استوار ہوا تھا۔ مگر کسی نے بھی حیدر علی شاہ کے دل پر دستک نہ دی تھی۔ ثناء وہ واحد لڑکی تھی جو اس کے زیادہ قریب ہونے کی کوشش میں جت گئی تھی۔ پھر کزن ہونے کے ناطے وہ اس کے ایک بلاوے پر آ بھی جایا کرتا تھا۔ مگر دل کے تار اس کو دیکھ کر بھی نہ چھڑے تھے۔ جو اب ایک یکسر انجان سی لڑکی کو دیکھ کر چھیڑ چکے تھے۔

سنبل سراپا حسن تھی۔ اس کو اپنے حسین اور شہزادیوں جیسی آن بان سے بھی کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ وہ سادہ مزاج کی لڑکی دل میں گھر کرنے کا فن جانتی تھی۔ وہ اس کے لیے نجانے کب سے دل میں نرم گرم جذبات محسوس کرنے لگا تھا۔ جبکہ اس کی اب آئے روز کی آمد عینا بیگم کو اچھی لگنے لگی تھی۔ وہ اسے ثناء کی طرف اس کی دلچسپی سمجھ کر قدرے مطمئن سی تھیں۔

نسیم صاحب سنبل کو دیکھتے تو ان کو رشک آجاتا۔ ان کے ان پڑھ بھائی نے کس احسن طریقے سے اپنی اس بیٹی پرورش کی تھی۔ اس کا سلجھا ہوا انداز اور بات کرتے ہوئے ٹھہراؤ دل میں سیدھا اترنے لگا تھا۔

اب وقت کے پہیے پر چل کر انہوں نے جانا تھا کہ تعلیم صرف ڈگریاں سمیٹنے کا نام نہیں ہے اصل علم فقط تربیت کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ جو ماں کی گود سے

آگے بڑھتی ہے۔ انہوں نے چار لفظ پڑھنے کے بعد تکبر کی راہ چن کر اپنے ہی بھائی کو اپنے آپ سے دور کر دیا تھا۔ ایسے ہی ایک دن پچھتاووں میں گھر کر وہ بالکل خاموشی سے ندیم صاحب کی دکان پر چلے گئے تھے۔ اس وقت ندیم صاحب دکان بند کر رہے تھے۔ کریانہ اسٹور میں انواع واقسام کی اشیاء تھیں جو سرِشام رونق لگ جانے سے جلدی بک جاتی تھیں۔ اب رات ڈھلنے والی تھی۔ اس لیے انہوں نے سارا سامان سمیٹ کر دکان کا شٹر گرانے کا ارادہ ہی کیا تھا جب نسیم صاحب ان کے عین سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔

ندیم صاحب لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک کر ساکت سے رہ گئے۔ اتنے ماہ وسال میں بھائی نے پلٹ کر خبر نہ لی تھی۔ دونوں بھائی خاموش زبان میں ایک دوسرے سے گلے شکوے کرتے رہے۔ اور اس کے بعد ندیم صاحب نے لپک کر بڑے بھائی کو ہمیشہ کی طرح پرتپاک انداز سے گلے لگالیا اور سیدھا گھر چلنے کی بات کی تھی۔

''آپ گھر چلیں آپ کی بھابھی اچھا کھانا بناتی ہے، ہم بھائی برسوں بعد مل کر کھانا کھاتے ہیں۔''

آج بھی ندیم کا دل وسیع تھا۔ نسیم صاحب کی آنکھیں نم ناک ہوگئیں۔ آنکھوں کے گوشے بھیگ سے گئے تھے۔

''ندیم۔ گھر نہیں جانا چاہتا کچھ باتیں یہاں آمنے سامنے بیٹھ کر کرنے کا جی چاہ رہا ہے۔ گھر جاؤں گا تو سارے پرانے درد جاگ جائیں گے۔ کسی کونے سے بی جان کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دے گا تو ندامت گھیر لے گی۔ کسی کونے سے ابا جان کی خفگی بھری نگاہ مجھے اپنے اندر ہی جھانکنے پر مجبور کر دے گی۔ میں چاہتا ہوں یہیں میں تم سے چند باتیں کرلوں۔'' نسیم صاحب نے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہا۔

''ایسی بات ہے تو میں کوئی اصرار نہیں کروں گا مگر ایک پیالی چائے تو پی سکتے ہیں۔ یہاں میرے ساتھ۔''

انہوں نے اس وقت سامنے دکان والے چھوٹے کو آواز لگا کر دو پیالی چائے لانے کا کہا تھا۔ اور کرسی پر کپڑا مار کر بڑے بھائی کو وہاں بٹھایا تھا۔

''تم مجھ سے اس طرح کا سلوک روا رکھو گے تو مجھے لگے گا کہ تم نے ابھی بھی مجھے معاف نہیں کیا۔ تم سے ایک درخواست کی تھی کہ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے بچوں کو اعلا تعلیم میں مددگار ثابت ہوں۔ تاکہ میری پشیمانی کچھ کم ہو سکے۔''

اتنے عرصے بعد بھی وہ ایک سودا کرنا چاہتے تھے۔ رویے سے کیا انسان کے جذبات خریدے جاسکتے ہیں۔ اپنی ذات اور نظر اندازی کا ازالہ ممکن ہے۔

یوں بھی میں جانتا ہوں کہ ڈاکٹر کی تعلیم کے اخراجات ادا کرنا تمہارے لیے بہت مشکل ہوگا۔ نسیم صاحب نے تلخی انداز میں کہا۔

''بھائی بات یہ ہے کہ ہم جوان بیٹی کو یوں دور نہیں بھیج سکتے ہیں۔ پھر میں یہ فیصلہ اس کی ماں سے پوچھے بنا نہیں کرسکتا۔'' ندیم صاحب نے تھکے ہوئے جواری کی طرح جیسے ہار سی مان لی تھی۔

ندیم صاحب نے جب اپنی بیگم سے رائے طلب کی تو انہوں نے تو لمحہ بھر میں کہہ دیا کہ کوئی مضائقہ نہیں یوں بھی قصبہ میں تعلیمی لحاظ سے مواقع کم تھے۔ اسے جانا تو تھا ہی شہر کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اپنے ہی گھر میں محفوظ ہاتھوں میں رہے۔

یوں ندیم صاحب کو فیصلہ کرنے میں مزید مدد ملی تھی۔ جو فیصلہ وہ اتنے برسوں میں نہ کر پائے تھے ایک لمحہ میں ہوگیا تھا۔

اور اب سنبل یہاں موجود تھی۔ بسا اوقات اس کا دل اپنوں کے لیے بے حد اداسی سی محسوس کرنے لگتا تھا۔ یہاں اس کے لیے اپنائیت مفقود تھی۔ ہر شے کی فراوانی تھی مگر ہر شے کی بہتات کے ساتھ ہی جتاتا ہوا انداز بھی اسے پل بھر میں بے مایہ کر جاتا تھا۔ مگر ایک سعادت مند بیٹی کا رول نباہتے ہوئے وہ اس وقت

ہی صرف اپنے نصب العین پر نظریں مرکوز کیے تھی۔
دل بے حد فریب تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اسے بسا اوقات حیدر علی شاہ کی ذو معنی گفتگو سے سخت الجھن ہوتی تھی۔ اور اس کی نگاہیں دل میں اترتی جیسے جگہ بنانے میں سرگرداں ہوں۔ اور وہ کسی سنگلاخ چٹان کی مانند اپنی ذات کو اجنبیت کے خول میں مقید کیے ہوئے تھی۔

☆☆☆

''اب آپ کیا کہیں گے ڈیڈ! میں نے تو پہلے روز ہی کہا تھا کہ یہ شخص کسی طور پر قابل بھروسا نہیں ہے۔ برسوں کی رفاقت خوب نباہی اس شخص نے۔ اب پوچھیں اس سے کہ اس قدر بڑا گھپلا کر کے اتنی بڑی رقم کہاں جمع کروائی ہے۔''

اس وقت میٹنگ روم میں بڑی سی میز کے عین سامنے لگی قطار در قطار کرسیوں پر عرشمان، نسیم صاحب اور ہمدانی صاحب اکٹھے ہوئے تھے۔ جبکہ حماد صاحب کو کسی نے بھی بیٹھنے کا نہیں کہا تھا۔ اور حماد صاحب اس آفت ناگہانی پر سر جھکائے تحیر زدہ سے مجرم بنے کھڑے تھے۔ انہیں تو ابھی تک مکمل بات ہی پلے نہیں پڑی تھی۔ تو یہ کہتے اپنی صفائی میں۔

''ہوسکتا ہے کہ کوئی بھول چوک ہوگئی ہو۔'' نسیم صاحب نے تھکے ہوئے لہجہ میں دفاع کیا تھا۔ جس پر عرشمان کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

''یہ دیکھیں ڈیڈ۔ اس مرتبہ پکے ثبوت کے ساتھ اس شخص کو گھیرا ہے۔ جو برسوں سے وفاداری کے نعرے لگا کر ہمیں دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا اور پچاس لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ اگر چہ ہم لاکھوں کے لیے معمولی ہوسکتی ہے مگر حریص شخص کے لیے بہت ہے۔''

''یہ سراسر جھوٹ ہے بہتان ہے۔ میں نے کبھی نمک حرامی نہیں کی ہے۔ میں رزق حلال کھانے کا قائل ہوں۔ خون پسینے کی کمائی اپنے بچوں کے حلق میں اتارتا ہوں۔ اس طرح کی من گھڑت باتوں پر ہر گز یقین نہ کریں۔'' حماد صاحب نے وضاحتی انداز میں کہا تھا۔

''ہونہہ.....'' نسیم صاحب نے اپنی آنکھوں کے سامنے کھلی ہوئی فائل کو دیکھ کر ہنکارا بھرا اور ان کے دل میں اچانک ہی غصے کی تیز لہر ابھری۔ جس شخص کی وکالت کرتے ہوئے ان کی زبان نہ تھکتی تھی اس نے کاروباری آڑ میں اس قدر خورد برد کی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس وقت انہیں اپنے بیٹے کے سامنے بے حد سبکی محسوس ہو رہی تھی۔

''مجھے افسوس ہے کہ میری نگاہیں زمانہ شناسی میں ناکام ٹھہری ہیں۔ میں جس شخص کو قابل بھروسا سمجھتا تھا اس نے ہی میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ ابھی میں پولیس کو بلواتا ہوں۔ مار کھانے کے بعد ضرور سچ اگل دو گے تم۔'' نسیم صاحب نے نفرت انگیز نگاہ اس وقت حماد صاحب پر ڈالی۔ جو لب بھینچے ہوئے الزامات کی زد میں کھڑے ہوئے تھے۔

''ارے پولیس کو کیوں بلوانا ہے۔ ہماری پوزیشن خراب ہوسکتی ہے نسیم صاحب۔'' اس ساری تحریک کا روح رواں اور اس ساری تخریب کاری میں ملوث اصل شخص ہمدانی پولیس کے نام پر سٹپٹا گیا۔

اگر پولیس اس معاملے میں ملوث ہوئی اور ڈنڈے کے زور پر سچ اگلواتی تو سچ کے ساتھ اس کا سچ بھی سامنے آجاتا۔ یقیناً سب سے پہلے یہ سوال پوچھا جاتا کہ اس ساری خورد برد کی اطلاع کس نے دی اور یہ حقائق کیونکر سامنے آئے۔ اور ہمدانی نے اپنے حصے کی ساری سزا اور اپنے حصے کی ساری ذلت اس وقت حماد صاحب کی جھولی میں ڈال دی تھی۔ اور خود بری الزمہ ہوگیا تھا۔

''بالکل ٹھیک کہا تم نے ہمدانی..... واقعی اس نہج پر تو میں نے سوچا ہی نہ تھا مگر میں اس کی ٹھکائی تو ضرور کراؤں گا کیونکہ اس نے میری انا..... میرے بھروسے کو قتل کیا ہے۔'' نسیم صاحب بیل بجائی تو چپڑاسی حاضر ہوگیا تھا۔

''گارڈ سے کہو کہ اس شخص کو دھکے دے کر باہر کا رخ دکھائیں۔ اس انداز میں کہ سارا اسٹاف دیکھ لے

کہ چوری اور ہیرا پھیری کی سزا کیا ہوتی ہے۔"

عرشان کے چہرے پر اس وقت جیت کی خوشی چمک بن کر بکھری ہوئی تھی اور ہمدانی کا تو دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اپنے بدترین دشمن کو ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دینا اس کے لیے انتہائی خوش کن تھا۔

"نسیم صاحب آپ سخت ناانصافی کررہے ہیں۔ میں نے کبھی اس آفس میں ایک روپیا بھی نہ صرف خود بلکہ دوسروں کو بھی ادھر سے ادھر نہیں کرنے دیا۔ شاید اس کی سزا مل رہی ہے۔ میں نے ہمیشہ رزق حلال کو اپنا شعار بنایا ہے۔ خدا گواہ ہے۔ آپ ایک مرتبہ ٹھنڈے دل سے اس پر سوچیں آپ کو سارے حقائق صاف دکھائی دینے لگیں گے۔ یہ ہمدانی کی سازش ہے اس کو میں نے کئی مرتبہ برے کاموں سے روکا ہے۔ اس کی نااہلی پر اسے سرزنش کی ہے۔ اور آج اس انسان نے میرے خلاف من گھڑت شواہد اکٹھے کرلیے ہیں۔"

نجانے نسیم صاحب کیوں رک سے گئے۔ انہیں حماد صاحب کی آنکھوں میں سچائی دکھائی دے رہی تھی۔ مگر جوان کے سامنے صفحات پر بکھرا ہوا سچ تھا۔ اس کو بھی رد کرنا اب ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ پرسوچ انداز میں گم تھے جب عرشان نے چپڑاسی کو گارڈ کو ذریعے بلوا کر حماد صاحب کو خوب بے عزت کر کے آفس سے نکلوا دیا۔ مین گیٹ تک ان کی ذلت کا یہ منظر سب ہی ملازمین نے دیکھا۔

"حماد صاحب جیسے عزت دار شخص کے لیے یہ ایک ناقابل برداشت منظر تھا۔ ان کا دل جیسے ڈوب سا گیا۔ برسوں کی بنی بنائی عزت خاک میں مل گئی تھی۔ اس عزت کی خاطر تو انہوں نے برسوں روکھی سوکھی جیسے تیسے گزاری مگر کبھی بھی نیت میں کھوٹ نہیں رکھا۔ اور آج ان کو ان کے خلوص کا صلہ بھی خوب مل گیا تھا۔ وہ گیٹ سے باہر دھکے دے کر نکلوا دیے گئے تھے۔ سب کی چبھتی ہوئی نگاہیں ان کی روح کو تار تار کررہی تھیں۔

زندگی کی بساط پر انسان ساری چالیں من چاہی چلنے کی تمنا رکھتا ہے۔ مگر یہ بھول جاتا ہے کہ ایک اور ذات ایک اور بلند ہستی بھی ہے جو سب پر حاوی ہے۔ وہ رب العالمین کی ہستی ہے۔ اس وقت ان کی آنکھ سے رنجور دلگیر سا آنسو ٹپکا۔ تقدیر نے ان کو ستانے والوں کے لیے بھی کوئی سزا تجویز کردی تھی۔ وقت کا سکہ چلتا رہتا ہے۔ کبھی کسی کے حق میں تو کبھی کسی کے حق میں آج کا دن حماد صاحب کے لیے رسوائی بھرا تھا۔ بظاہر وہ رسوا ہوگئے تھے۔ دل درد سے پھٹا جارہا تھا۔ مگر وہ بے گناہ تھے۔ وہ تھکے ہوئے جواری کی مانند اپنا وجود گھسیٹتے ہوئے نجانے کیسے گھر پہنچے تھے انہیں کچھ خبر نہ تھی۔

زہرہ بیگم نے حماد صاحب کے چہرے پر دکھ ایسی ان دیکھی تحریر ضرور پڑھ لی تھی۔ جو اس سے قبل کبھی ان کے چہرے پر رقم نہ ہوئی تھی۔ نسیم صاحب خالی الذہنی کی کیفیت سے دوچار صحن کے احاطے میں بچھی چارپائی پر ہی ڈھے سے گئے تھے۔

"الٰہی خیر۔ کیا بات ہے حماد صاحب!" آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"پانی پانی۔" ان کے خشک گلے نے سوال کیا تھا۔ جس ذہنی اذیت اور رسوائی کا سامنا وہ کر آئے تھے اس کے بعد حلق واقعی سوکھ کر کانٹا ہورہا تھا۔ اس وقت وہ بھاگم بھاگ پانی کا گلاس بھر لائی تھیں۔ بچیاں بھی سہمی ہوئی باپ کو یوں اجڑا ہوا بکھرا ہوا دیکھ کر ایک جانب کھڑی تھیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے سوال داغتے ہوئے کہ کیا ہے۔

حماد صاحب نے پانی پی کر آنکھیں موند تھیں۔

زہرہ بیگم نے بچیوں کو اندر کمرے میں جانے کہا اور خود حماد صاحب کے پاس بیٹھی رہیں۔

"جانتی ہو زہرہ، میری صرف ایک ہی تمنا عزت پانا۔ میں نے سفید پوشی کو اپنا شعار بنایا، محنت

سے جو رزق مقدر میں تھا گھر لاتا رہا، ایک سوال کروں تم سے بیگم۔''

اب کے پہلی مرتبہ نسیم صاحب نے براہ راست زہرہ بیگم کی آنکھوں میں دیکھا۔ دکھ اور گہری سیاہی میں لپٹی ہوئی آنکھیں۔

زہرہ بیگم اس سے زیادہ ان کی آنکھوں میں دیکھنے کی سکت نہ پا رہی تھیں۔ مگر اس سے قبل ہی حماد صاحب نے ہی نگاہ پلٹ لی تھی۔

''اگر کوئی تم سے کہے کہ میں نے غبن کیا ہے۔ مال چرایا ہے اور اپنے آفس میں چوری کی ہے۔ کیا تم اس بات پر یقین کر لو گی۔'' زہرہ بیگم کا چہرہ فق ہو چکا تھا۔

''یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ میرا دل ہول رہا ہے۔ میں مر کر بھی اس بات پر یقین نہیں کر سکتی ہوں۔ میں نے آپ کو ہمیشہ سادگی پسند پایا ہے۔ یہ وتیرہ تو وہ لوگ اپناتے ہیں جن کو حرص و ہوس کی لت لگ چکی ہو۔ مگر آپ نے تو کبھی بھی ایک مخصوص حد سے آگے زندگی کو لیا ہی نہیں۔ جتنی چادر اس قدر ہی پاؤں پھیلائے۔ کبھی مجھے یا بچیوں کو بھی حد سے تجاوز کرنے اور بے جا اسراف کرنے نہیں دیا۔ میں تو آپ کی مزاج آشنا ہوں۔ آپ نے مجھ سے یہ پوچھ کر گویا میرے برسوں کے ساتھ پر شک کیا ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ آپ ایسے الٹے سیدھے سوال پوچھ ہی کیوں رہے ہیں۔'' زہرہ بیگم نے الجھن بھرے لہجہ دریافت کیا۔

''اس لیے بیگم کہ مجھ پر اپنے ہی آفس میں پیسوں کی چوری کا الزام لگا کر سب کے سامنے دھکے مار کر رسوا کر کے نکال دیا گیا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ابھی زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ مجھے اس کی فکر نہیں کہ نوکری چھن گئی تو اب گھر کا بچیوں کا کیا ہوگا۔ مگر مجھے اس کی فکر ہے جو سیاہی میرے منہ پر مل دی گئی ہے وہ کیسے اور کیونکر دھل سکے گی۔ رزق تو کل بھی رب نے دیا تھا اور اب بھی رب ہی دے گا اصل مسئلہ تو میرے اندر اس شخص کا ہے جو اب ایک قدم مزید چلنے کا روادار نہیں۔ ٹوٹ کر بکھر چکا ہے۔''

اندر دروازے کی اوٹ میں کھڑی حماد صاحب کی بڑی بیٹی سب سن رہی تھی۔ اور اپنے باپ کو یوں کرچیوں کی طرح بکھرا دیکھ کر اسے سخت غصہ اور دکھ محسوس ہو رہا تھا۔

''کس نے لگایا ہے یہ الزام آپ پر۔'' زہرہ بیگم کی آواز جیسے گہرے پاتال سے آئی تھی۔

''نسیم صاحب کا بیٹا عثمان..... جس دن سے وہ آفس آیا ہے اس نے میرے خلاف ایک محاذ کھول لیا تھا اور اب اس کو ثبوت بھی دے ڈالے اس ہمدانی نے جو میرے سامنے کئی مرتبہ ہیرا پھیری کرتے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا جس سے میں نے ہمیشہ درگزر کا معاملہ کیا کہ مجھے کیا حق حاصل ہے کہ کس کے رزق پر لات مارتا پھروں۔ ہاں نصیحت کرتا رہا مسلسل۔ مگر اب کیا ملا اس کے بدلے۔ اس کے سارے سیاہ کرتوت میرے نامہ اعمال میں لکھ ڈالے گئے۔'' حماد صاحب کا لہجہ درد میں بھیگا ہوا تھا۔

وہ رات سب گھر والوں کے لیے بے حد خوف ناک رات تھی۔ کہتے ہیں کہ ہر رات کے بعد سویرا آتا ہے۔ مگر اس رات کے بعد بھی سویرا نہ ہوا۔ صبح حماد صاحب جو سونے کا کہہ کر بستر پر لیٹے تھے۔ صبح ان کا جسد خاکی زندگی کی ڈائری سے آزاد ہو چکا تھا۔ سب جانتے تھے کہ کون سا درد اور کرب وہ سہہ نہ سکے تھے۔ مزید زمانے کے الزام اور لوگوں کی نگاہوں کے تیر وہ سہہ نہ پاتے۔ ان میں اتنا حوصلہ ہی نہ تھا۔ ہاں اپنے تمام معاملات رب کے سپرد کرتے ان کی آنکھ لگ گئی تھی۔ مگر رات کے کسی پہر ہارٹ اٹیک نے ان کو دنیا کے تفکرات سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا دی تھی۔

جانے والے چلے جاتے ہیں۔ سارے غموں سے نجات مل جاتی ہے۔ مگر ان کے پیچھے سہنے والے کمال کا حوصلہ اور ضبط رکھتے ہیں۔ اصل کہانی تو تبھی شروع ہوتی ہے جب پیچھے رہ جانے والے اک مرگ مسلسل سہتے ہیں۔ ایسی ہی ایک کہانی کا آغاز ہو چکا

تھا۔

نسیم صاحب کے کانوں تک بھی حماد صاحب کی ناگہانی موت کی بازگشت پہنچی تھی۔ وقتی طور پر انہیں ملال ہوا۔ لیکن درحقیقت وہ انہیں مجرم گردانتے تھے۔ جنہوں نے ان کے برسوں کے اعتماد کو بھربھری مٹی کی مانند ڈھیر کردیا تھا۔

☆☆☆

پورا گھر قمقموں سے روشن تھا۔ مصنوعی پھولوں سے آراش کی گئی تھی۔ لان میں ایک تقریب منعقد کی گئی تھی۔ جس میں صرف فیملی ممبرز کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ یہ تقریب ثناء کی سالگرہ کی تقریب تھی۔ جس میں ثناء کو وی آئی پی پروٹوکول مل رہا تھا۔ اس خوشی کے موقع پر عینا بیگم نے جیسے احسان عظیم جتاتے ہوئے اس وقت سنبل کو بھی اس تقریب میں مدعو کیا تھا۔ بلکہ تقریب سے دو دن کے لیے انہوں نے بذات خود سنبل کے پاس جا کر اسے ثناء کے پرانے کپڑوں کا تحفہ دیا تھا۔ کسی اترن کی مانند لیکن سنبل کے نزدیک تو یہ تمام تر کپڑے بھی بیش قیمت تھے۔

عینا بیگم اک ادائے بے نیازی سے کھڑی اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان کے عقب میں دو دو ملازمائیں کپڑوں کے شاپرز تھامے مودب کھڑی تھیں۔

''پرسوں میری بیٹی کی سالگرہ ہے میں چاہتی ہوں کہ اس تقریب میں تم بھی شریک ہو۔ اس خوشی میں تمہارے لیے یہ کپڑے ہیں کوئی سا بھی پہن لینا۔ ثناء کی برسوں کی عادت ہے ایک مرتبہ جو کپڑا تن پر سجا لیتی ہے۔ دوبارہ پہننے کا اس کا جی ہی نہیں کرتا ہے۔ میں وہ ضرورت مندوں میں بانٹ دیتی ہوں۔ اس مرتبہ بھی میرا یہی ارادہ تھا۔ مگر پھر سوچا تم کالج جاتی ہو۔ باہر آنا جانا سو لوگوں سے میل جول تمہیں ان کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ اس لیے یہ تم رکھ لو اور کوئی سا بھی پہن کر تقریب میں شامل ہو جانا۔'' عینا بیگم کا لہجہ بالکل بھی طنزیہ نہیں تھا۔ البتہ الفاظ ضرور دل شکنی کرتے ہوئے تھے۔

سنبل نے ناسمجھی کے عالم میں انہیں دیکھا۔ قبل اس کے کہ کوئی جواز انکار کا ڈھونڈتی۔ ملازماؤں نے وہ شاپرز اس کی الماری میں رکھنے شروع کردیے تھے۔ اب انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے سنبل لب بھینچ کر رہ گئی۔ یوں بھی اگر وہ حقیقت کی آنکھ سے دیکھتی تو اب وہ ان کے در پر ہی تو پڑی تھی اور اب ان کے ہر طرح کے سلوک کو برداشت کرنا سہنا اس کی مجبوری ٹھہرا تھا۔ اس لیے تقریب میں شمولیت بھی اب عینا بیگم کے حکم کے مطابق ضروری تھی۔

دراصل عینا بیگم کو اپنی جب کوئی بات بھی نسیم صاحب سے منوانا ہوتی تھی۔ وہ اس سے پہلے نسیم صاحب کو خوش کرنے کی کوشش شروع کر دیا کرتی تھیں۔ اب بھی انہیں معلوم تھا کہ سنبل کی غیر موجودگی کے حوالے سے یوں بھی نسیم صاحب سوال ضرور اٹھائیں گے۔ اس لیے یہ بے حد ضروری تھا کہ وہ اس سے پہلے ہی اس کی تقریب میں موجودگی کو یقینی بنا لیں۔ اس لیے انہوں نے سنبل کو نہ صرف قبل از وقت دعوت دے ڈالی تھی۔ بلکہ اپنے تئیں ملبوسات دے کر ایک اہم کارنامہ بھی سرانجام دیا تھا۔ جس سے نسیم صاحب ضرور خوش ہو جاتے۔

اور واقعی سنبل کو انہی ملبوسات میں سے ایک ہلکا آسمانی رنگ کا لباس بے حد اچھا لگا تھا۔ اس نے وہی زیب تن کرلیا تھا۔ اسکارف سے بالوں کو لپیٹتی ہوئی وہ سادہ سے چہرے کے ساتھ باہر آ گئی تھی۔ میک اپ کی وہ عادی ہی نہ تھی۔ اسے یاد تھا ایک آدھ مرتبہ کسی موقع پر اس نے تیاری کے لیے میک اپ کرنے کی خواہش کی تھی۔ تو اماں نے اسے سخت سرزنش کی تھی۔

''پکا خرانٹ چہرہ ہو جائے گا کنواری بچیوں کو تو صرف منہ دھو کر ہی نکھار سا آ جاتا ہے۔ یہ ساری خرافات شادی کے بعد کے لیے بچا کر رکھنا چاہیے۔'' اس لیے اس دن کے بعد سے بہت ہو گیا تو وہ کبھی کبھار کاجل لگا لیتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ میک اپ سے مبرا رہا کرتی تھی۔

اس نے جیسے ہی باہر قدم رکھا۔ اسے کنارے پر کسی کے مدھم بولوں نے اپنی جانب متوجہ کرلیا تھا۔ باقاعدہ میوزک کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ کچھ حیران سی تھی۔ اس طرح کی اعلا پیمانے پر رکھی گئی تقریب اس نے کہاں دیکھی تھی۔ بہت ہوا تو اس کے گھر میں سالگرہ کے دن امی دال کا حلوہ بنا دیتی تھیں۔ جو سارے گھر والے کھانے کے بعد کھا کر ہی خوش ہوجایا کرتے تھے۔ یہ سب اسراف کہاں دیکھے تھے؟''

''ماشاء اللہ میری بیٹی تو آج بے حد خوب صورت لگ رہی ہے بالکل کسی آسمانی پری کی مانند لگ رہی ہے۔'' نسیم صاحب جو اس وقت حیدر علی شاہ سے محو کلام تھے۔ اسے آتا دیکھ کر چونک سے گئے تھے۔ اس وقت حیدر نے بھی نسیم صاحب کی بات پر چونک کر اسے دیکھا تھا۔ واقعی وہ عام دنوں سے ہٹ کر آج اس خوب صورت لباس میں بہت ہی حسین لگ رہی تھی۔ اگرچہ آج ابھی اس کا وہی مخصوص انداز تھا۔ سر کو ڈھانپے ہوئے تھی۔ مگر کپڑوں کے رنگوں میں اس کے چہرے کے رنگ بھی جیسے ہم آہنگ ہو رہے تھے۔ اس لیے تو نسیم صاحب نے اسے آسمانی پری کا خطاب دیا تھا۔

وہ حیدر کی پراشتیاق نگاہوں سے جیسے الجھن کا شکار ہو چکی تھی۔ اس لیے نسیم صاحب کو سلام کرنے کے بعد آگے بڑھ گئی تھی۔ عینا بیگم جو اپنے ہی سرکل کی کسی خاتون سے باتوں میں منہمک تھیں۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی ایک دم ساکت سی رہ گئی تھیں۔ عام سے انداز میں تیاری کے بعد بھی وہ کسی قدر خاص اور جاذب نظر لگ رہی تھی۔

''ماشاء اللہ۔ عینا۔ یہ خوب صورت لڑکی کون ہے؟'' فروا عالم اب ان سے سنبل کی بابت پوچھ رہی تھیں۔ ان کی نگاہوں میں گہری دلچسپی تھی۔

''نسیم صاحب کی بھتیجی ہے کسی دیہات سے آئی ہیں یہاں۔'' انہوں نے لفظ دیہات پر خاصا زور دیا تھا تاکہ فروا عالم کے ذہن میں بنے ہوئے سنبل کے بت کو پاش پاش کرسکیں۔ مگر ان کی دلچسپی اور گہری نگاہیں ابھی بھی سنبل کی طرف ہی مرکوز تھیں۔

تبھی ثناء تیاری کے ساتھ آئی۔ گہرا میک اپ..... شاید وہ پارلر سے تیار ہو کر آئی تھی۔ سرخ رنگ کے لباس میں ملبوس ثناء اس وقت اپنے لحاظ سے مکمل تیار تھی۔ مگر جیسے ہی ثناء کی نگاہ سنبل پر پڑی تھی۔ اس کا موڈ جیسے یک لخت آف سا ہونے لگا تھا۔

سنبل واقعی بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ اور اس کے عین سامنے قدرے فاصلے پر کھڑے ہوئے حیدر علی شاہ کی وارفتگی بھری نگاہیں بھی سنبل کی جانب مرکوز تھیں۔ وہ ثناء سے بالکل بھی پوشیدہ نہ رہی تھیں۔ فروا عالم سنبل سے نجانے کیا کچھ پوچھنے لگی تھیں۔ جب ثناء نے ماں کا ہاتھ تھام کر انہیں ایک طرف لے جا کر دھیمے سے انداز میں سرگوشی کی۔

''مام! ایسی لڑکی کو یہاں بلانے کی کیا ضرورت تھی؟'' اس کا لہجہ بے حد زہریلا تھا۔

عینا بیگم پٹپٹاتی ہوئی بولیں۔

''کچھ عقل سے کام لو۔ اس کا اور تمہارا کوئی بھی مقابلہ نہیں ہے۔ دو ٹکے کی لڑکی ہے۔ آج کل میں تو اسے ویسے بھی چلتا کرنے والی ہوں۔''

ماں کی بات سے اس کی تشفی نہ ہوسکی تھی۔ کیونکہ وہ کافی عرصے سے حیدر کا گہرا جھکاؤ اس لڑکی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ شاپنگ کے بہانے کبھی آؤٹنگ کے بہانے اور تو اور کبھی آئس کریم کے بہانے وہ دونوں کو ساتھ لے جاتا۔ مگر نگاہیں صرف اور صرف سنبل کے چہرے کا طواف کرتی رہتی تھیں اور وہ خود کو پس منظر میں ہوتا محسوس کرتی۔ مگر آج کوئی عام سا دن نہیں تھا آج اس کی سالگرہ کا دن تھا۔ جو بے حد خاص تھا۔ اس لیے وہ اپنے اور حیدر کے درمیان کسی بھی تیسرے کی موجودگی کو یکسر برداشت نہیں کرسکتی تھی۔

اسی وقت ثناء کی فرینڈز آ گئیں۔ جن میں سے بیشتر اس کی ہمراز تھیں اور ثناء نے اپنی حیدر سے محبت کسی سے چھپائی نہیں تھی۔ ساری فرینڈز نے آتے ہی

حیدر کو گھیر لیا تھا۔

''حیدر بھائی۔ بتائیں آج ہماری فرینڈ کیسی لگ رہی ہے؟'' ہما نے قریب آ کر حیدر سے پوچھا۔

حیدر ان سب لڑکیوں کی ذومعنی باتوں سے اور ان کی مسلسل کھی کھی سے جیسے ہراساں سا ہونے لگا تھا۔

''ارے بھئی۔ میں کیا بتاؤں۔ اچھی لگ رہی ہے تمہارے سامنے ہی تو ہے۔'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں گویا ہوا۔

''صرف اچھی؟'' ساری فرینڈز نے بیک وقت احتجاجاً چیخ کر کہا۔

''جی بہت اچھی۔ میرا مطلب ہے بہت سے بھی اچھی۔''

وہ واقعی اب لڑکیوں کے جھرمٹ میں گھبرا سا گیا تھا۔ جبکہ اس کی نگاہیں تو کسی ایک سادہ سی من موہنی صورت والی سنبل میں اٹکی ہوئی تھیں۔ دراصل جہاں دل اٹک جاتے وہاں نگاہیں بھی اٹک ہی جاتی ہیں۔ اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا کسی سے بھی محو کلام نہ ہو۔ اور ایک جانب کرسی پر بیٹھی ہوئی سنبل کو جی بھر کر دیکھتا رہے۔ یوں بھی سنبل گوشہ نشین سی لڑکی تھی۔ کسی خاص موقع پر ہی دکھائی دیتی۔ ورنہ نگاہوں سے اوجھل ہی رہتی تھی۔ اس کی پڑھائی بھی سخت تھی۔ اور اس سے بھی سخت اس کے اصول تھے۔ جو خود سنبل کے بنائے ہوئے تھے۔ جن پر وہ شدت سے عمل پیرا تھی۔

''اچھا جی۔ اگر ہماری دوست اچھی لگ رہی ہے تو کوئی اچھا سا گانا ہو جائے۔'' ہما تو جان سے ہی اٹک گئی تھی۔

''ارے مجھے کہاں گانا آتا ہے؟'' وہ واقعی اب جھنجلا گیا۔ اگر ثناء سامنے خوش گوار مسکراہٹ لیے نہ کھڑی ہوتی تو وہ اس وقت ہی صاف کھرا جواب دے کر جان چھڑا لیتا۔ مگر اس وقت خاموش ہو گیا۔ کیونکہ ثناء کے لیے یہ ایک خاص دن تھا۔

''یہ تو سفید جھوٹ ہے۔'' ہما سے پہلے ثناء نے منہ بنا کر کہا۔ ''میری سالگرہ پر ایک گانا تک نہیں گا سکتے ہو۔'' وہ نروٹھے پن سے بولی۔ تبھی اس نے ایک دم ہی اسٹیج کا رخ کیا۔ یہ اسٹیج بھی لان کے احاطے میں ایک جانب کرسیوں کی قطاروں کے سامنے بنایا گیا تھا تاکہ لوگ کھانے پینے کے شغل کے دوران میں میوزک سے بھی لطف اندوز ہوتے رہیں۔

حیدر علی شاہ کے جی میں اچانک ہی کسی دھن نے دستک دی تھی۔ وہ سنبل پر نگاہیں مرکوز کیے تھا۔ سنبل اور اس کی نگاہوں کا تصادم ہوا۔ سنبل کی نگاہوں میں جھجک اور تحیر پنہاں تھا۔ جبکہ حیدر کی نگاہوں میں محبت کے دیپ لرزاں تھے۔ وہ اسے محبت کے سندیسے دیتی نگاہیں لیے کھڑا تھا۔ سنبل اسے یکسر نظر انداز کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس وقت اس کی پور پور حسیات بین چکی تھیں اور وہ حیدر علی شاہ کی جانب ہی متوجہ تھی۔ حیدر علی شاہ کے خوب صورت بول اس کے دل کے تار جیسے چھیڑ سے گئے تھے۔

وہ سندر لڑکی
گلاب رنگ شاداب رنگ
مسکان کے پھول لبوں پر کھلتے ہیں
مخمور نگاہیں دل میں اترتی ہوئیں
سادگی کا پیکر ہے
موہ لیتی ہے دل کو
جب جب دکھائی دے مجھ کو
من موہنی سی
دل میں گھر کرتی
پیاری ہے مجھ کو

پھر کیک کاٹا گیا اور ہر طرف سالگرہ مبارک کا شور مچ گیا تھا۔ تب بنا کہے وہ مخمص دھیمے قدموں سے اس کے پاس آ گیا۔

''ایک بات کہوں سنبل۔ میرے دل کے تمام راستے آپ تک جاتے ہیں۔ اب تو بند آنکھوں سے بھی آپ کا پیارا چہرہ دل میں اترنے لگتا ہے۔ جذب ہونے لگتا ہے۔'' سنبل ایک دم اس کی بات سے ٹھٹک

رک سی گئی۔
''پیر آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' سنبل کے ...ے پر خفگی در آئی۔ اسے یقین نہ تھا کہ اس کی ...ہیں بارہا جو اقرار کر چکی ہیں اب وہ یوں برملا اظہار بھی کر دے گا۔
''میں وہی کہہ رہا ہوں جو میرے دل میں ہے۔ لفظوں کے جال بننا مجھے نہیں آتا ہے۔ میں صاف گو بندہ ہوں۔ جو جی میں ہوتا ہے وہی لبوں پر ہوتا ہے۔ اس دن جب پہلی مرتبہ تمہیں دیکھا تھا۔ اسی دن میرے دل میں محبت کی پہلی کونپل کھل اٹھی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ تمہاری خوبیاں مجھ پر عیاں ہوتی چلی گئی اور اب میں واپس پلٹنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہوں۔ محبت میں واپسی کا راستہ فقط سانس کی ڈوری ٹوٹ جانے کا راستہ ہوا کرتا ہے۔''
وہ نجانے اور کیا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ثناء اس کو آ کر بازو سے تھامتی لے گئی۔
''آؤ بھئی کیک کھلاؤ مجھے۔'' ثناء چہک رہی تھی۔ اسے یہ خوش گمانی سی ہو رہی تھی کہ آج کا گایا گیا گانا بھی اس کی نذر کیا گیا ہے۔ جبکہ حیدر کی نگاہیں اس وقت بھی سنبل کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔
تبھی مائیک پر ہما بول اٹھی۔
''یہاں ایک گاؤں والی بھی موجود ہے۔ سنا ہے دیہاتی لوگ اس طرح کی تقریب میں کبھی شریک ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ لڑکی سنبل جو بہت باپردہ بی بی ہے۔''
دوستوں کا رخ اس وقت اسٹیج سے سنبل کی جانب ہو گیا تھا۔ ہما کے لہجہ میں طنز تھا۔ لڑکیوں نے قہقہے بکھیر کر ہما کو مزید شہ دی تھی۔ حیدر کے لیے یہ ...ب اچانک تھا۔ وہیں سنبل کی آنکھیں بھی لبالب پانی سے بھر چکی تھیں۔ یہ سب ہما، ثناء کی منشاء کے مطابق کر رہی تھی۔ ثناء نے بتایا تھا ہما کو کہ سنبل حیدر کو ...یں اتارنے کی سعی میں سرگرداں ہے۔
...یم صاحب جو اپنے دوستوں میں مگن تھے۔ انہیں اس ساری کارروائی کی مطلق خبر نہ تھی۔ وہ تو ایک جانب بیٹھے ہوئے موجودہ سیاسی اور کاروباری مسائل کو زیر بحث لا رہے تھے۔
حیدر کو ہما کا یوں سرعام سنبل کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کرنا بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ اسی لیے اس نے ہما کو اسٹیج پر جا کر سرزنش کی اور باقاعدہ اس کے ہاتھوں سے مائیک لے لیا۔ تب تک عینا بیگم اور نسیم صاحب کے ساتھ ساتھ سبھی اس کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔
''ہما صاحبہ شہری ہیں ناں اس لیے اپنی تہذیب کا خاصا اچھا مظاہرہ کر رہی ہیں اور جس لڑکی کو پینڈو گردان رہی ہیں ان شاء اللہ بہت جلد وہ میری شریک سفر ہو گی۔''
حیدر کے اس اعلان کے بعد جیسے سارے عالم میں سکوت چھا گیا تھا۔ چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ سب آپس میں اشارے کنائیوں میں باتیں کر رہے تھے اور سنبل کو دیکھ دیکھ کر اشارے کر رہے تھے۔
اسی وقت سنبل سے مزید وہاں بیٹھنا دوبھر ہونے لگا۔ اسی لیے وہ اپنے بوجھل وجود کو گھسیٹتی ہوئی انیکسی میں آ گئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی اس وقت یہاں سے چلی جائے۔ کافی سارا رونے کے بعد جب وہ واپس روم سے باہر نکلی تو عینا بیگم خشمگیں انداز لیے وہیں موجود تھیں۔ ان کے ساتھ ساتھ نادیہ بیگم (حیدر کی والدہ) بھی موجود تھیں۔ دونوں کے ہی تیور اچھے نہ تھے۔
''اپنا سامان سمیٹو اور صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی یہاں سے چلتی بنو۔'' عینا بیگم نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔
''بالکل ثناء ہی میری بہو بنے گی۔ اس لڑکی کی اوقات ہی کیا ہے کہ میرے بیٹے کے ساتھ کھڑی ہو سکے۔'' نادیہ بیگم کے لہجے میں تنفر تھا۔
نسیم صاحب دروازے میں ایستادہ تھے اور سب سن کر بھی چپ تھے۔ شاید اپنی بیٹی کی خوشیاں بھتیجی کی خوشیوں پر بھاری پڑ چکی تھیں۔

''میں صبح تمہیں ہوسٹل چھوڑ آؤں گا پیپرز کے بعد گھر والے لے جائیں گے۔ میں نے جو وعدہ کیا تھا اسے درمیان میں یوں ادھورا نہیں چھوڑ سکتا ہوں اب۔'' نسیم صاحب کی تھکن زدہ آواز تھی۔

''ہوسٹل میں رہے یا جہنم میں لیکن آئندہ یہ اس گھر میں دکھائی نہ دے اور نہ ہی اس کا نام سنائی دے۔''

عینا بیگم پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئیں۔

اور وہ پیپرز دینے کے بعد سیدھا گھر لوٹ آئی تھی۔ مگر کچھ اس انداز میں کہ اس کے حوالے سے ایک جلا کڑھا فون عینا بیگم نے کیا تھا اور باور کرواتے ہوئے باقاعدہ جتا بھی دیا تھا کہ ان کی بیٹی یہاں پڑھائی لکھائی کرنے نہیں بلکہ اپنے لیے خوب رو لڑکے کا رشتہ تلاش کرنے آئی تھی اور اس کے لیے اس نے باقاعدہ ان کے ہی بھانجے کو پھانسا ہے۔

ندیم صاحب چپ رہ گئے تھے اور اس کا ڈگری مل جانے کے بعد ندیم صاحب کا خوش نہ ہونا اس بات کی دلیل تھی کہ کہیں نہ کہیں وہ اسے بھی مجرم تصور کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس سب میں سنبل کا سرے سے کوئی قصور نہ تھا۔ وہ تو خود بھی دل میں نرم گرم جذبوں کے باوجود کبھی حیدر علی کی جانب مائل نہ ہوئی تھی کبھی اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کی حوصلہ افزائی نہ کی تھی۔ اور اب اس مقام پر آ کر جب وہاں سے عرصے بعد دوبارہ شادی کا سندیسہ ملا تھا۔ سارے اہل خانہ اس شادی میں شرکت کرنے جانے والے تھے۔ ایسی صورت میں اس کا انکار اسے دوبارہ مجرم بنا سکتا تھا۔ جبکہ وہ مجرم نہ تھی۔

اس کو تو یہ تک معلوم نہ تھی کہ ثناء کی شادی کس سے ہو رہی ہے۔ ایک اندازہ تو تھا کہ شاید اس دشمن جان سے ہو رہی ہے۔ جسے بھلانے کی سعی میں وہ اتنے عرصے سے ہلکان ہو رہی تھی۔ جسے بھلانے کی کوشش ہر مرتبہ ناکام ہو جاتی تھی۔

وہ کھڑکی کا پٹ کھولے کھڑی باہر کن من بارش میں اس کا عکس ڈھونڈ رہی تھی۔ اچانک ہی بارش کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اور بارش ٹوٹ کر برس رہی تھی زندگی اب اس کے لیے ایک مسلسل آزمائش تھی۔ جس میں دو گام چلنا بھی اسے دشوار لگنے لگا تھا۔

اسے بھول جانے کی جہد مسلسل
رائگاں ٹھہری
کیونکہ ہر بار دل جیتا اور
میں ہاری

☆☆☆

وہ لیپ ٹاپ کھولے ریوالونگ چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں جانب ہمدانی بیٹھا تھا۔ جبکہ وہ یکسر آنے والے انٹرویو کے لیے لاتعلق سا بنا بیٹھا تھا۔ اسے سوال و جواب کی تکرار اب بوریت کا شکار کرنے لگی تھی۔ یہ فریضہ اب ہمدانی ادا کر رہا تھا۔ تبھی اتنے سارے ہونے والے انٹرویوز میں سے ایک بھی اچھا نہ لگنے کے سبب اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔

''میرا خیال ہے اب بس کر دینی چاہیے کوئی بھی اس سیٹ کے لیے اہل نہیں لگ رہا ہے۔ مجھے کوئی ایسا شخص چاہیے اس جاب کے لیے جو پراعتماد ہونے کے ساتھ ساتھ مخلص بھی ہو۔ باتوں سے اس کا اظہار ہو۔ سب ہی عجیب سی شکلوں والے ڈرے سہمے لوگ..... کیا یہ بن سکتے ہیں؟ اس جاب کے اہل؟'' اس کا بے زار کن لہجہ قطعیت بھرا تھا۔

''سر! بھی صرف ایک لڑکی ہے اور جو انتظار کر رہی ہے اسے بھی موقع دے دیں۔ اس کے بعد کل کا دن رکھ لیتے ہیں۔''

ہمدانی نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اسے عرشمان کے غصیلے انداز سے کچھ خوف سا محسوس ہوتا تھا۔ جو کہتا تھا وہی کرتا تھا۔ جو ٹھان لی کر گزرتا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے اس نے نجانے کیا سوچ کر لیپ ٹاپ بند کر دیا۔

''جائیں بھیج دیں اسے اندر اور میرے لیے اچھی سی کافی بنوا کر لائیں۔ سر میں درد ہو گیا ہے۔''

ہمدانی نے اتنے عرصے میں چاپلوس کی روش ہی تو اپنائی تھی۔ اس لیے فوراً خوشامدی انداز میں اٹھ کھڑا ہو گیا۔

''جی بالکل ابھی بنا کے لاتا ہوں۔'' تبھی دروازے پر آہستہ سے ناک کیا گیا تھا۔

''یس۔'' اس نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ دروازے پر کھڑی وہ ایک دلکش سی لڑکی اجازت طلب نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''پلیز سٹ۔'' اس نے سیدھے ہوتے ہوئے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ لڑکی پراعتماد مسکراہٹ کے ساتھ وہاں بیٹھ گئی۔

''تھینک یو سر۔'' اس کا لہجہ بھی اس کے چہرے کی مانند بے حد شیریں اور شگفتہ سا تھا۔ عرشمان نے اس کی فائل اٹھائی اور اس کی ورق گردانی شروع کردی تھی۔

''ہونہہ۔'' عرشمان نے ہنگارا بھرا تھا۔ ''جی تو مس اریبہ۔ ماشاءاللہ، آپ کا تعلیمی ریکارڈ تو نہایت شان دار ہے۔ مگر تجربہ نہیں ہے آپ کے پاس۔''

اس نے سامنے رکھی فائل سے سر اٹھا کر اب بغور اریبہ کا جائزہ لینا شروع کردیا۔ سامنے بیٹھی ہوئی وہ لڑکی سر پر اچھے سے دوپٹا جمائے ہوئے بھی نہایت پراعتماد سی تھی۔ اس کی نگاہوں کا دوبدو مقابلہ کرتی ہوئی بالکل پرسکون بیٹھی رہی۔

''تجربہ بھی ہوجائے گا سر۔ آپ کے ساتھ کام کرتے کرتے۔'' اریبہ نے مطمئن انداز میں کہا تو عرشمان چونک سا گیا تھا۔ اریبہ کا انداز اس قدر دو ٹوک تھا لگتا تھا جیسے وہ اس جاب کو حاصل کرنے کا عزم کیے بیٹھی ہو۔

''ویل۔ یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کام کرنے سے ہی تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ مس اریبہ، میں ایک بات آپ کو بتادوں کہ میں ذرا سخت قسم کا باس ہوں۔ مجھے بہانہ بازیاں پسند نہیں ہیں۔ وقت کی پابندی لازم ہے۔ ورنہ میں فوری طور پر برخاست کرنے کا اہل ہوں گا۔'' عرشمان نے سخت لہجے میں کہا۔ مگر وہ اس کی طرح نرم مسکان سے دیکھتی رہی۔

لمحہ بھر کے لیے اریبہ کی نگاہوں میں بجلی سی کوندی تھی۔ مگر وہ صرف ایک لمحہ ہی تھا۔ وہ اپنے اعصاب پر قابو پا چکی تھی۔

''میں جانتی ہوں سر، تنخواہ کوئی بھی ادارہ تھالی میں سجا کر یوں ہی پیش نہیں کردیتا ہے۔ اس کے لیے ان تھک محنت کرنا ہوتی ہے۔ پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں تب جا کر گھر میں روٹی بیلنے کی نوبت آتی ہے۔''

اس مرتبہ اریبہ کے لہجہ میں ہلکا سا طنز بھی تھا۔ اور سرد مہری بھی تھی۔ نجانے کیوں عرشمان کو لگا کہ وہ اسے سنا رہی ہے مگر یہ محض اس کا گمان بھی ہوسکتا تھا۔ اور وہ گمان پر چلنے والا شخص ہرگز نہیں تھا۔

''آپ باہر بیٹھیں انتظار کریں، میں ابھی اپائنٹمنٹ لیٹر بنوا دیتا ہوں۔ سیلری پیکیج بھی ہر لحاظ سے بہترین ہوگا۔ مگر کام میں کسی قسم کی کوتاہی قطعی طور پر برداشت نہیں کروں گا۔ باقی کام آپ کو مس ارم سمجھا دیں گی۔ رفتہ رفتہ سب سیکھ جائیں گی آپ۔''

عرشمان نے حتمی انداز میں کہا تو وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ لڑکی عرشمان کو جھٹکے پر جھٹکے دے رہی تھی۔ عرشمان کا خیال تھا کہ وہ لڑکی اس کی شان میں قصیدہ گوئی کرے گی اور شکر گزاری میں نجانے کیا کچھ بول دے گی۔ مگر اس نے کہا تو فقط اتنا ہی۔

''او کے سر!'' وہ اتنا کہتی ہوئی پراعتماد قدموں سے واپس پلٹ گئی۔

عرشمان اس کے جانے کے بعد بھی اس کے متعلق ہی سوچتا چلا گیا۔ وہ لڑکی کیوں اس کے حواسوں پر چھا رہی تھی۔ یہ اسے بالکل اندازہ بھی نہ تھا اور نہ ہی ایسے اس کا ادراک تھا۔ وہ اسے اس قدر مرعوب کرگئی تھی کہ اس نے ذرا وقت نہیں لگایا تھا اسے اس جاب کا اہل قرار دینے میں۔ شاید اریبہ کی نگاہوں میں جھانکتی ہوئی وہ ذہانت تھی جو عرشمان کو اپنے اندر باہر اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ یا شاید اریبہ کی وہ شاندار ڈگریاں تھیں جو اسے اس اہم جاب کا اہل گردانے پر مجبور کر رہی تھیں۔ یا شاید اب تک کے تمام امیدواروں میں وہ سب سے الگ تھلگ سی تھی۔ اس کی تمام تر امیدوں پر پورا اترنے والی۔ وہ جواز

تراشتے تھکنے لگا تھا۔ مگر اس کے ذہن کے کینوس پر اس لڑکی کی پرچھائیں بے حد گہری تھی۔ اس کے نہاں خانوں میں اس لڑکی کی مدہم سی مسکان ہلکورے لے رہی تھی۔ اس نے بیرون ملک کافی وقت گزارا تھا۔ یہاں بھی وہاں بھی ہر رنگ ہر مزاج کی لڑکیاں دیکھی تھیں۔ مگر کوئی بھی اسے سوچنے پر مجبور نہ کرسکی تھی۔ اریبہ ان سب میں کچھ منفرد سی تھی۔

اپنی سوچ میں مگن وہ باہر نکلا۔ تھکن سی طاری تھی۔ بھول گیا تھا کہ اس نے کافی کا آرڈر بھی دے رکھا تھا۔ جب وہ باہر نکلا تو ہمدانی اس کے پیچھے لپکا۔

''سر کافی نہیں پئیں گے؟'' تحیر سا ہمدانی کے لہجہ میں در آیا۔

''آں، ہاں نہیں اب جی نہیں کررہا ہے۔''

عرشان نے دیکھا وہ کسی میگزین کی ورق گردانی کرتے ہوئے یقیناً لیٹر کی منتظر تھی۔ چہرے پر گہرا ٹھہراؤ سا تھا۔ عرشان کو اپنی نظر ہٹانا مشکل ترین کام لگ رہا تھا۔ وہ اس کی بے توجہی کی وجہ سے اس کا جائزہ لینے میں منہمک ہوگیا تھا۔

وہ لڑکی بالکل عام لڑکیوں کی طرح تھی۔ بلکہ قدرے سانولا سا رنگ تھا۔ دلکش نقوش تھے۔ دلفریب مسکان تھی اور تب اریبہ نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ ہاں ہاں بالکل یہ نگاہیں سب سے منفرد تھیں۔ دل میں سیدھا دستک دیتی ہوئیں۔

عرشان کو یوں ساکت کھڑا دیکھ کر ہمدانی نے حیرت سے پوچھا۔

''سر۔ کیا کچھ چاہیے تھا؟''

''ہاں اس لڑکی کا اپوائنٹمنٹ لیٹر بنوادو۔ اور اس کے ساتھ ہی مس ارم سے کہو کہ سارا کچھ سمجھا دیں اسے۔''

یہ کہہ کر وہ رکا نہیں تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ وہاں سے سیدھا باہر نکلتا چلا گیا۔ یوں جیسے لمحہ بھر کے لیے رکا تو وہ پتھر ہوجائے گا۔ کار بھگاتا ہوا وہ باہر نکل آیا تھا۔ مین روڈ پر۔

☆☆☆

بورڈ آف میٹنگ رکھی گئی تھی۔ ملٹی میڈیا پریزنٹیشن تھی۔ کمپنی کے ایک نہایت سینئر ایگزیکٹو ممبر سب کو پروجیکٹ سے متعلقہ معلومات اور تفصیلات پہنچاتے ہوئے۔ اہم نکات بیان کررہے تھے۔ وہ بھی اس میٹنگ میں موجود ہمہ تن گوش تھی۔ پھر کسی ایک بات پر اس نے دخل اندازی کی۔

''سر! میرا خیال ہے کہ اس پروجیکٹ میں نئے اور پرانے دونوں ورکرز کو حصہ لینا چاہیے۔ اس طرح نئے بھی پرانوں کے ساتھ کچھ سیکھ سکیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نئے ہر لحاظ سے نئی موجودہ سوچ لے کر آگے بڑھتے ہیں۔ جو فی زمانہ اہم بھی ہے۔ اس لحاظ سے اس پروجیکٹ کو ہر زاویے سے پرکھا جاسکتا ہے۔'' اپنی بات مدلل انداز میں پیش کرتی ہوئی بالکل بھی اجنبی نہیں لگ رہی تھی بلکہ سیدھا دل میں اترتی ہوئی وہ اس کی جانب متوجہ تھی۔

عرشان نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ پچھلے دو ماہ سے مسلسل اس کے اعصاب پر سوار ہو رہی تھی۔ نہ تو اس کی جانب مائل ہوئی اور نہ ہی رجحانات کی کوئی گھٹیا ٹرک آزمائی تھی۔ بلکہ اول روز کی طرح آج بھی اس کا لیا دیا سا انداز تھا۔ مگر اس کی ہر بات اس قدر مدلل ہوتی تھی۔ پھر اس نے اپنی ان تھک محنت اور ملنساری سے سارے اسٹاف میں اپنی ایک خاص جگہ اور مقام بنالیا تھا۔

وہ گراف چارٹس اور اعداد و شمار ہر بات میں اپنی رائے دیتی چلی گئی۔ اس لیے عرشان کو یہ فیصلہ کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی تھی کہ وہ ہر مرتبہ میٹنگ میں فل تیاری کے ساتھ آتی ہے۔ جبکہ اس کی ساتھی ورکرز تو اپنے میک اپ اور ناز و انداز پر ہی توجہ دیتے ہوئے فل تیاری میں ہوا کرتی تھیں۔ شاید یہی بات اس کو سب سے ممتاز بناتی تھی۔

''مس اریبہ! آپ بھی اس پروجیکٹ میں کام کریں۔ مجھے بہت اچھا لگے گا۔ آپ کی اس پروجیکٹ میں دلچسپی سے ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ اس میں معاون و مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔ سو بات یہ ہے

"میں نے طے کیا ہے کہ ہمدانی کی صاحب کی جگہ ...ایلیٹ کی تمام اپ ڈیٹ اب مس اریبہ کو دیں ...یں اور وہی اس پروجیکٹ کی ہیڈ بھی ہوں گی۔ باقی سب ان کے مطابق چلیں گے۔"

اچانک ہی عرشان کا کہنا سارے اسٹاف کو تحیر میں مبتلا کر گیا۔ کیونکہ وہ تو ابھی نئی تھی اور برسوں پرانے ورکر کو پیچھے کر دیا گیا تھا۔

"سر! یہ کیسے ممکن ہے میں پرانا ورکر ہوں اور یہ ابھی نئی ناسمجھ ہیں آپ مجھے پیچھے کر رہے ہیں محض اس نئی لڑکی کی دو باتوں میں آ کر۔"

ہمدانی کا لہجہ سفاک سا ہو گیا تھا۔ شکوے کی لپیٹ میں اٹا ہوا لہجہ۔

عرشان نے اپنی نگاہوں کا فوکس اب ہمدانی کی جانب کیا۔

"ہمدانی صاحب! آپ میری پالیسی جانتے ہیں۔ میں نے کبھی پرانے نئے کا نہیں سوچا۔ اور پرکھا دیکھا تو صرف کام کو۔ اور رہی بات مس اریبہ کی...... نئی ضرور ہیں مگر ناسمجھ ہرگز نہیں ہیں۔ اور مجھے بطور باس ہر طرح کے فرائض کی ادائیگی میں اپنا کردار نباہنا بخوبی آتا ہے۔" عرشان کا لہجہ بے حد سرد ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں سرخی در آئی تھی۔ یقیناً اسے ہمدانی کا انداز ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ ہمدانی ہونق چہرہ لیے چپ کا چپ رہ گیا۔

"اور ایک آخری بات سب ممبرز کے لیے ہے۔ میری بات کے رد کرنے والے کو میں کھڑے کھڑے آفس سے نکال باہر کروں گا۔" مجھے کوئی ٹوکے یہ کسی طور پر مجھے پسند نہیں ہے۔

عرشان کا انداز اس قدر قطعیت بھرا تھا کہ ہمدانی بھی تھوک نگل کر رہ گیا اور ایک لفظ بھی ادا نہیں ہو سکا تھا اس کے منہ سے۔

عرشان کی نگاہوں کا تصادم اریبہ سے ہوا۔ جہاں مسکراہٹ تیر رہی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں اترتی ہوئی خوشی میں خود کو ڈوبتا ابھرتا محسوس کر رہا تھا۔ کیا وہ واقعی اس ایک چھوٹی سی لڑکی کا اسیر ہو چکا تھا۔

اور پھر جو اسیر محبت ہوتے ہیں وہ نہ تو کچھ اور سوچتے ہیں اور نہ ہی انہیں کچھ اور دکھائی دیتا ہے۔ وہ محبوب کی آنکھ سے ہی دیکھتے ہیں۔ اور محبوب کی سوچ کو ہی لفظوں میں بن دیتے ہیں۔ وہ بھی تو یہی کر رہا تھا۔ بنا کسی جوابی لفظوں کے وہ ساری بات جان گیا تھا کہ اس کے اس فیصلے سے جہاں سارا اسٹاف اس سے خفا خفا سا لگ رہا تھا۔ وہ ایک لڑکی اس سے بالکل راضی لگ رہی تھی۔ پھر سب نے ہی عرشان کی بات پر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"اوکے یہ میٹنگ آج کے لیے برخاست ہوتی ہے۔ اب آپ سب اپنی اپنی سیٹ پر جا کر کام دیکھیں۔"

سب اپنی اپنی فائلز اٹھائے ہوئے وہاں سے جانے لیے اٹھے۔ جب آخر میں اریبہ نے فائل اٹھائی تو عرشان نے اسے آواز دی تھی۔

"مس اریبہ! آپ یہیں ٹھہریں، میں نے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔"

عرشان کے پکارنے پر اریبہ نے ٹھٹک کر اسے دیکھا تھا۔ اسے شاید عرشان سے اس طرح کی توقع نہ تھی۔ یہ سچ تھا کہ اتنے عرصے میں عرشان نے ایک لمحہ کے لیے بھی اریبہ پر بری نظر نہ رکھی تھی اور نہ ہی اریبہ کو کام کے علاوہ کبھی گھڑی بھر کے لیے بھی روکا ہو۔ ویسے بھی اریبہ کا رکھ رکھاؤ بھی اس بات کا متقاضی تھا کہ اسے توقیر دی جائے۔

عرشان خوب صورت نوجوان تھا۔ اس کی مردانہ وجاہت بہت ہی پرکشش تھی۔ لڑکیاں اس کے گرد منڈلاتی رہتی تھیں وہ کسی میں دلچسپی نہ لیتا تھا۔

اسے یاد تھا کہ تعلیم کے دوران بیرون ملک مقیم تھا تو لڑکیاں اس کی ایک نگاہ التفات کی منتظر رہا کرتی تھیں۔ ایک لڑکی ماریا تو اس کے پیچھے اس کے لگژری فلیٹ تک آ پہنچی تھی۔ کبھی اسے چائے کبھی، کافی بنا کر پیش کرتی تھی۔ مگر اس نے ایک حد کا فاصلہ ہمیشہ قائم رکھا تھا۔

اسے لڑکی ذات سے دلچسپی تھی ہی نہیں۔ اس کا

مقصد ہمیشہ اعلا تعلیم کا حصول رہا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا مستقبل کس قدر تابناک ہے۔ وہ ایک کروڑ پتی باپ کا بیٹا ہے۔ جس کے لیے زندگی میں اور بھی بہت کچھ تھا۔ پر کشش سا۔ اس سے آگے اور زیادہ اہم۔ یوں بھی اس کے نزدیک عجلت میں کیے گئے فیصلے بعد میں ہمیشہ پچھتاووں کی زد میں ہوتے ہیں۔ اور ٹوٹ جانے پر خاندان کی زبان کے چٹخارے میں ہی زبان زدعام رہ جاتے ہیں۔ مگر اس مرتبہ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ درست سمت میں فیصلہ کر رہا ہے۔ دو ماہ تک اس نے اپنے دل کو ہر لحاظ سے جانچا اور پرکھا تھا۔ اور دل نے گواہی دی تھی کہ وہ اس لڑکی اریبہ کے لیے بے حد گہرائی میں جا کر سوچنے پر مجبور ہے۔

وہ نجانے کن خیالات میں یدغم سا بیٹھا تھا اور اس کے عین مقابل اریبہ بیٹھی ہوئی تھی۔

''مس اریبہ آپ کو اگر برا نہ لگے تو میں کچھ پرسنل سوالات کرنا چاہوں گا۔ کیا آپ کی منگنی ہو چکی ہے۔ آئی مین آر یو انگیجڈ اور ناٹ۔''

وہ جو بلا تکان بولنے کا عادی تھا۔ اس وقت ایک لڑکی کے سامنے لفظ ناپ تول کر بول رہا تھا۔ اور پھر خود کو قدرے نروس سا محسوس کر رہا تھا۔ اریبہ کی نگاہوں میں حیرت در آئی تھی۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی سر، اس بات کا کیا میری موجودہ جاب سے کوئی تعلق ہے؟'' وہ سرد لہجہ میں جتا گئی۔

''جی تعلق ہے بھی اور نہیں بھی بہتر ہوتا اگر آپ مجھے میرے سوال کا مطلوبہ جواب دے دیتیں۔'' وہ کچھ الجھا الجھا سا لگ رہا تھا۔ جیسے کسی نتیجے پر پہنچنے کی اسے جلدی ہو۔

''جس کے گھر میں دو وقت کا کھانا عزت سے پیٹ بھر کر ملنا دشوار ہونے لگے۔ وہاں کون رشتہ لاتا ہے۔ بہر حال آپ کو مل گیا ہوگا آپ کے سوال کا جواب؟'' اب کے اریبہ نے تلخ لہجہ میں کہا۔

''مگر آپ کا تو سیلری پیکج بے حد اچھا ہے۔''

''جی درست کہا۔ مگر میں خود ہی اکیلی لڑکی ہوں پورے گھر کی کفالت کرنے والی اس لیے گھر کے سارے اخراجات اس ایک تنخواہ میں نپٹ جاتے ہیں۔ پھر میری امی تو کچھ اور ہی خواب دیکھتی ہیں۔ اس لیے تنکا تنکا جمع جوڑ میں لگا دیتی ہیں۔ باقی ماندہ رقم گھر کے راشن اور سفید پوشی کا بھرم رکھتے رکھتے ہی ختم جاتی ہے۔'' وہ اب کے ٹوٹے بکھرے لہجہ میں بولتی چلی گئی۔

عرشمان کو حیرت اور دکھ ہو رہا تھا اس نے کبھی بھی اریبہ کے گھریلو حالات جاننے کی آج سے پہلے کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اریبہ کا سادہ سا حلیہ اور عام سے کپڑے اس کی توجہ کا مرکز نہیں رہے تھے۔ دراصل وہ کپڑوں اور نمائش کا عادی شخص نہ تھا۔ اسے ذہانت متوجہ کرتی تھی اور اس لیے وہ اریبہ کا اسیر ہوتا چلا گیا۔ باقی ساری باتیں اس کے نزدیک محض سطحی تھیں۔ اسے دکھ سا ہو رہا تھا۔ اس کے نزدیک تو زندگی محض آسائشات کا دوسرا نام تھی۔ اس نے تو زندگی میں کبھی کسی طرح کی تکلیف نہیں سہی تھی۔ ہر شے اسے مانگنے سے پہلے ہی میسر ہو جایا کرتی تھی۔

''مس اریبہ! اگر میں آپ سے کہوں کہ مجھے آپ سے محبت ہوگئی ہے۔ تو کیا آپ میری اس بات پر یقین کریں گی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ آپ کو عجیب سا لگے گا۔ میری خواہش ہے کہ میں آپ کے گھر باقاعدہ رشتہ بھیجوں۔ یہ پروپوزل لے کر میرے والدین آئیں گے۔ صرف آپ سے ایک مرتبہ پوچھنا چاہتا تھا کہ کہیں آپ کے دل کے تار کسی اور شخص سے تو نہیں جڑے ہوئے۔''

عرشمان نے جذبات سے مغلوب لہجہ میں دل کا عندیہ دیا پھر.....

وہ اسے یک ٹک دیکھتی چلی گئی۔ قدرے توقف سے وہ بولی۔

''جی مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر ابھی چند دن ٹھہر جائیں۔ ایک دو ضروری کام نپٹالوں اس کے بعد میں خود ہی آپ کو اوکے کا سگنل دے دوں گی۔'' اریبہ نے یہ بات یوں ادا کی جیسے وہ رشتے کی نہیں کسی اہم

معاملے کی بات کر رہی ہو۔ جسے صرف ادا کرنا لازمی ہو۔ اس میں جذبات اور احساسات کا کوئی بھی گزر ہو۔ وہ حیران سا تو ہوا تھا۔ مگر دل سے خوش بھی تھا۔ اس نے جو چاہا تھا پالیا تھا۔

☆☆☆

دھڑام سے آفس کا دروازہ کھول کر ہمدانی کمرے میں آیا۔ عرشان جو ایک فائل کے مطالعہ میں منہمک تھا۔ اسے ہمدانی کا یوں بنا دستک دیے بنا اجازت طلب کیے اندر آنا ایک آنکھ نہ بھایا۔

''یہ کیا طریقہ ہے؟ عرشان نے زہر خند لہجے میں پوچھا۔ مگر ہمدانی تو جیسے اس وقت سن ہی نہیں رہا تھا۔

''آپ نے مجھے آفس سے کیوں نکالا ہے۔ کیوں بے دخل کیا جا رہا ہے۔ میرا قصور کیا ہے۔'' وہ سخت لہجہ میں سوال کرتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے تو جیسے بھول ہی گیا تھا کہ اس کے سامنے اس وقت کون بیٹھا ہوا ہے۔ اور وہ کس سے مخاطب ہے۔

''کس لب ولہجہ میں مجھ سے مخاطب ہو تم یاد رکھو اس آفس کا باس میں ہوں۔ اور ہر طرح کا فیصلہ کرنے کا مجاز بھی ہوں۔ اور رہا سوال کہ کیوں تمہیں نوکری سے برخاست کیا جا رہا ہے۔ اگر چہ اس سوال کی نوبت آنی تو نہیں چاہیے پھر بھی تمہاری تشفی کے لیے یہ دیکھو۔''

عرشان نے ایک فائل اس کے سامنے رکھی۔ اس نے حواس باختہ ہو کر فائل کھولی اور منٹوں میں اسے ساری اصلیت معلوم ہوگئی۔ یہ وہی فائل تھی جو اس نے الزام تراشی کر کے تھوڑے سے پیسوں کے عوض من گھڑت طریقے سے نام تبدیل کیے تھے۔ اپنے سیاہ کرتوت اس نے خوب چال بازی اور مکاری سے حماد صاحب کے نامۂ اعمال میں لکھ ڈالے تھے۔ لیکن وقت بہت بڑا استاد ہوا کرتا ہے سب کی گھناؤنی اصلیت سامنے لا کر کہتا ہے کہ اب دیکھ یہ ہے وہ سچ وہ لڑا ترین سچ۔

کل جب آفس ٹائم کے بعد اریبہ اس کے پاس آئی تھی کہ اسے عرشان کے محض دو منٹ درکار ہیں۔ وہ لڑکی جس کے لیے وہ دو منٹ کیا دو صدیاں انتظار کی سولی پر چڑھ سکتا تھا۔ وہ اس سے محض دو منٹ مانگ رہی تھی۔ اس کے دل میں محبت کے شگوفے کھلنے لگے تھے۔ مگر اس کی سوچ کے برعکس اس لڑکی نے ہمدانی کا کچا چٹھا اس کے سامنے ایک فائل کی صورت میں کھول کر رکھ دیا تھا۔

اور وہ تحیر زدہ سا سچ جان کر گہری سوچ میں گم ہوگیا تھا۔ اس نے گویا حماد صاحب پر جھوٹے الزام عائد کر کے آفس سے رسوا کر کے نکلوا دیا تھا۔ اور ذرا سی تصدیق اور چھان بین کرنا بھی ضروری تصور نہیں کیا تھا۔ جب انسان کی آنکھوں پر غرور کی پٹی چڑھی ہو۔ تو پھر اسے اپنی ذات کے سامنے کسی اور کی ذات نظر نہیں آتی ہے اور نہ ہی اپنی شخصیت کے سامنے کسی کا کھرا سچ دکھائی دیتا ہے۔ آج اس کا زعم زدہ بت پاش پاش ہوگیا تھا۔ دل میں تاسف کی ایک لہر اٹھی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے اندر جوار بھاٹے اٹھنے لگے تھے۔ ہمدانی نے اس قدر چالاکی سے اس کو بے وقوف بنایا تھا۔ اور ابھی بھی اس کی چال بازی برقرار تھی۔ اس فائل کے اعداد وشمار کے مطابق وہ اس وقت بھی آفس کے کیش سے مکر وفریب سے رقم اینٹھ رہا تھا اور اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اس نے عرشان کو خوب صورتی سے شیشے میں اتارا ہوا تھا۔

''اب کیا کہیں گے آپ سر۔ اس سچ پر بھی یقین کریں گے یا آج بھی آپ کو لگتا ہے کہ حماد صاحب ہی قصوروار ہیں۔''

وہ اپنی جھوٹی شان اور کھوکھلی انا کو سرنگوں رکھنے کی سعی میں اسی طمطراق بیٹھا ہوا فقط اریبہ کو دیکھتا رہا تھا۔ اور جواباً کہا تو صرف اتنا ہی۔

''اس سچ کو میرے سامنے لانے کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اس بارے میں جو بھی ہو سکا میں کل دیکھ لوں گا۔ اور آپ کا نام بالکل بھی سامنے نہیں آئے گا؟ عرشان اس پیاری سی لڑکی کو تفکر میں ڈوبا ہوا دیکھ کر دل کو اداسی کی دبیز تہ تلے دیکھ رہا تھا۔

جبکہ اریبہ اس کی نگاہوں کی تپش محسوس کر کے فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''آپ نے اتنا وقت دیا اس کے لیے میں بے حد شکر گزار ہوں۔ مگر ایک بات کہوں عرشمان سر۔ انسان کو صرف اپنے اندر کے انسان کو زندہ رکھنا چاہیے۔ وہ جو ضمیر کہلاتا ہے۔ انسان سارے معاملات حل کر لیتا ہے۔ اور سارے فیصلے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مگر اگر انسان ضمیر کی عدالت میں ہی کھڑا نہ ہونا چاہے تو پھر سارے معاملات ہی الٹ جاتے ہیں۔''

نجانے اس کے انداز میں ایسا کیا تھا کہ عرشمان بری طرح سے چونک گیا تھا۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اس معاملے میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہی ہے کہ بذات خود اس نے یہ ساری تحقیق کی اور نہ صرف کی بلکہ اس کے سامنے اس تحقیق کے نتائج بھی لے کر آ کھڑی ہوئی۔

مگر قبل اس کے کہ وہ اپنے دل کے سوال کو زبان پر لاتا وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور پلٹ کر جا چکی تھی۔ اس کے بعد عرشمان ساری رات سو نہیں سکا تھا۔ اور اس کشمکش کا شکار رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔

برسوں پہلے جو معاملہ اس نے ہمدانی کے کہنے پر اچھالا تھا۔ اب پھر اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کیا لائحہ عمل مرتب کرے گا۔ اور اب اس نے براہ راست ہمدانی تک اس کا استعفیٰ پہنچا دیا تھا۔ شاید وہ اس سے اتنا سخت سلوک روا نہ رکھتا۔ مگر ہمدانی نے آ کر دوبدو اس کے غصے کو للکارا تھا۔

وہ جو اپنی سبکی کے خوف میں مبتلا ہو کر اس معاملے کو چپکے سے دبا دینا چاہتا تھا کہ اب نسیم صاحب کے سامنے ہی نہیں بلکہ پورے آفس میں یہ بات پھیل جاتی کہ عرشمان نے حماد صاحب کے ساتھ بے حد زیادتی کی تھی۔ اس لیے چپکے سے ہمدانی کو استعفیٰ تھما دیا گیا تھا۔

مگر چونکہ ہمدانی اس سارے پس منظر سے قطعی طور پر ناواقف تھا اس لیے اس وقت کینہ توز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ مگر جیسے ہی اس نے فائل کھولی اور اپنے سیاہ کرتوت نامہ اعمال کی مانند اس کی نگاہوں میں سمائے تو اس کی آنکھوں میں سراسیمگی سی پھیل گئی۔ خوف اس کی آنکھوں میں ہی نہیں بلکہ اس کی صورت پر بھی دیکھا جا سکتا تھا۔

''سر یہ سچ نہیں ہے سراسر الزام ہے۔'' ہمدانی نے انتہائی مدھم لہجہ میں کہا۔ یوں جیسے خود کو ہی تسلی دے رہا ہو۔

''برسوں پہلے ایک معصوم اور بے گناہ شخص نے بھی یہی کہا تھا۔ مگر تب میں نے اس کی بات نہیں سنی تھی۔ نہ تصدیق کروائی تھی۔ لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ مجھے کل تمہاری الماری سے سارے ثبوت مل گئے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں جانے والی رقم بھی دیکھ لی ہے۔ اور اس کے علاوہ جو تم یہاں تمام لڑکیوں کو ہراساں کرتے رہے ہو وہ سارے کرتوت بھی کھل کر سامنے آ چکے ہیں۔ اس سب کے بعد تمہیں یہاں آفس میں رکھنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا ہے۔ ہاں البتہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ضرور تمہیں ہونا چاہیے۔ جو فیصلہ کل نہ ہو سکا اب ہو گیا۔''

عرشمان نجانے کب باتوں ہی باتوں میں پولیس کو فون گھما چکا تھا اور اپنے ہی ایک دیرینہ دوست جو پولیس میں بھرتی تھا اسے فوری طور پر بلوا چکا تھا۔ پولیس نے آ کر ہمدانی کو گرفتار کر لیا۔ وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے پولیس کے عملے نے ڈنڈے برسا کر اسے اپنے ساتھ باقاعدہ گھسیٹا تھا۔ یہ منظر بہت سوں کے لیے ایک سبق تھا۔ وہیں اریبہ کے لیے دل کے سکون کا سبب تھا۔ طمانیت بھری مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

''سر! میں یہ جاب چھوڑ رہی ہوں۔'' اریبہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اور وہ چاہ کر بھی اسے روک نہ پا رہا تھا۔

''مگر کیوں؟'' عرشمان نے بے حد ملتجی انداز

پوچھا۔

''سر! اس کا جواب اس خط میں ہے۔ آپ میرے جانے کے بعد ضرور پڑھ لیجیے گا۔'' اریبہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

عرشان نے اس کی ہتھیلی پر رکھا ہوا خط اٹھالیا۔ کسی بے حد متاع جان اور متاع عزیز کی مانند۔ وہ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر تھی جو عرشان کو تو محبت نامہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔

''میں آپ کے گھر رشتہ بھیج دینا چاہتا ہوں اب تو آپ خوش ہیں آپ نے ہمدانی صاحب کے لیے جو سزا تجویز کی تھی اور جو چاہا تھا۔ ویسا ہی ہوا۔'' عرشان نے خوش گوار لہجے میں کہا۔

''آپ ابھی بھی اس بدکردار انسان کو صاحب لگا کر یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ ابھی بھی اس معاشرے میں معتبر ٹھہرا ہے جبکہ وہ اس سے بھی زیادہ سزا کا حق ہے۔ مگر بعد میں رب ہی انصاف کرے گا اس جہان میں۔'' اریبہ اداسی سے بولی۔ ''اور ہاں سر شادی کا معاملہ فی الوقت بھول جائیں۔ میں نے تا عمر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' اریبہ نے قطعیت سے کہا۔ اس کا لہجہ دوٹوک اور فیصلہ کن تھا۔ عرشان اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اور اس کے بعد وہ رکی نہیں تھی۔ وہ اسے روکنا چاہتا تھا مگر ابھی اسے بہت سارے سوالوں کے جواب تلاشنا تھے۔ جو اس خط میں پوشیدہ تھے۔

☆☆☆

ثناء کی شادی ایک امیر و کبیر شخص دانیال سے ہو رہی تھی۔ یہ جان کر سنبل کو خاصی حیرت ہو رہی تھی۔ اور تو اور اس مرتبہ عینا بیگم کا رویہ بھی اس کے ساتھ سخت نہیں تھا۔

گھر والے بھی رسماً ہی سہی ان سب سے اچھے سے ملے تھے۔ مہندی کی رات وہ سب پہنچے تھے۔ مہندی کی تقریب تھی۔ سب لڑکیاں پیلے جوڑوں میں ملبوس بے حد حسین لگ رہی تھیں۔ سنبل نجانے کیوں خائف تھی کہ کہیں بھی اسے حیدر نہ دکھائی دے جائے۔ اس لیے وہ سب سے کتراتی ہوئی ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ سب لڑکیاں سر اور تال پر گا رہی تھیں۔ جبکہ وہ خاموشی سے بیٹھی تھی۔ حتیٰ کہ تالیاں بھی بجانے کا اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے اندر اداسی کا درخت اگ چکا تھا۔ جو ہر دوسرے روز بڑھتا جا رہا تھا۔ اس تناور درخت کی جڑیں محبت میں ڈوبی تھیں اور وہ محبت جو اسے حیدر علی شاہ سے تھی اور شاید زندگی کی آخری سانس تک رہتی مگر حیدر کب اس کا نصیب ہو سکتا تھا۔ وہ تو شاید کوئی تشنہ خواب تھا۔ جس کی حسرت میں عمر گنوانی تھی۔

''ادھر آؤ میرے پاس۔'' نادیہ بیگم نے اسے آواز دے کر بلایا تھا۔ وہ اچنبھے سے ان کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

''دیکھو بیٹا ماضی میں جو ہوا اس کو بھلا دو۔ سب ناراضی سب رنجشیں سارے گلے سب مٹا دو۔ دراصل تمہارے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں نے ایک غلط فیصلہ کر ڈالا تھا۔ حیدر بیمار ہو گیا تھا۔ اس قدر شدید علیل کہ میں لفظوں میں اس درد بھری داستان کو زبان نہیں دے سکتی ہوں۔ میرا حیدر جس کی آنکھوں میں جگنو چمکتے تھے۔ وہ مرجھا گئے اور اسے ٹی بی ہو گئی۔ اس خبر کے ساتھ ہی میں نے اپنوں کے اصل رویے اور مکروہ صورتیں دیکھیں۔ کیا یہ کوئی جان لیوا بیماری ہے..... ہرگز نہیں۔ مگر شاید حیدر میرے انکار سے دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ پھر تمہارے جانے کے بعد جو الزام تراشی عینا نے تم پر، تمہارے گھر والوں پر کی تھی۔ اس کے بعد بگڑی بات سنورنے کی امید حیدر کے دل میں جیسے ختم ہو گئی تھی۔ حیدر کو میں نے راتوں کو بے چین اداس دیکھا ہے۔ مجھ سے اس قدر خفا ہے برسوں سے میرے گلے نہیں لگا۔ آج اس موقع کی وجہ سے میں نے اور سب نے ہمت کی کہ تم سب سے ٹوٹے ہوئے رشتے دوبارہ استوار کر لیے جائیں۔ حیدر باہر ہے۔ میں چاہتی ہوں تم ہاں کر دو تو آج ہی میں یہاں تم دونوں کی منگنی کی رسم ادا کر دوں۔ میں نے دیکھا کہ ثناء ہی حیدر کی بیماری کے بعد اس سے

کترانے لگی تھی۔ اس نے اپنی نگاہیں پھیر لی تھیں اور پھر جب اس کا ایک بے حد اچھا رشتہ دانیال کی صورت میں آیا تو عینا نے صاف کہہ دیا کہ اب نجانے تمہارا بیٹا کب ٹھیک ہوتا ہے۔ اور ثناء کب تک انتظار میں لٹکی رہے گی۔ اور فوراً سے شادی طے کردی۔ میں سمجھتی ہوں یہ سب منشاء الٰہی تھی۔ میری بھی آنکھیں کھل گئیں۔ میں جو سمجھ رہی تھی کہ میری سگی بہن اور سگی بھانجی ہے۔ سب رشتے خاک میں مل گئے میرے منہ پر آرہے۔

بعض اوقات خلوص اور پیار کے رشتے ہر رشتے پر بھاری ہوا کرتے ہیں۔ اور بیٹا۔ تم ہاں کردو تمہارے بابا سے میں نے پوچھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے سنبل کو اس بات کا فیصلہ کرنے کا اختیار سونپ دیا ہے۔ جو فیصلہ سنبل کا ہوگا وہی میرا ہی ہو گا۔''

وہ نجانے کب کا غبار دل سے نکالتی چلی گئی تھیں۔ اطراف میں سب گہما گہمی اور قہقہوں میں مصروف تھے۔ کوئی بھی اس جانب متوجہ نہ تھا۔ سوائے عینا بیگم کے۔ انہوں نے کئی مرتبہ پلٹ پلٹ کر اس طرف دیکھا تھا۔ اندر ہی اندر کہیں ان کو آج بھی بے چینی سی تھی کہ نجانے ان دونوں میں کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں۔ اب ان کو سنبل سے کوئی پرخار نہ رہی تھی۔ کیونکہ سنبل اب ان کی بیٹی کی راہ کا کانٹا نہیں تھی۔

''پھر بیٹا تم جواب دو۔'' وہ امید بھری نگاہوں سے سنبل کو دیکھ رہی تھیں۔

''میں جانا چاہتی ہوں ان کے پاس..... ان کا احوال پوچھوں گی۔'' اس نے فیصلہ کرلیا تھا۔ دل تو ہمکنے لگا تھا حیدر کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے۔

نادیہ بیگم نے اٹھ کر اس کے سر پر پیار دیا۔ اسے گلے لگایا۔ ان کی نگاہیں نمناک تھیں۔

''جیتی رہو بیٹی۔'' وہ مسکرادیں۔ ''جاؤ باہر کھڑا ہے پگلا۔''

وہ ہال سے نکل کر باہر آئی۔ اسے ایک دم خاموشی سی محسوس ہوئی۔ اندر کس قدر قہقہوں کی گونج تھی۔ میوزک کا شور تھا۔ ڈھولک کی تھاپ پر گانے گائے جارہے تھے۔ مگر یہاں ایک دم سے سناٹا تھا۔ ایک سناٹا تو ایک عرصے سے اس کے اندر بھی گونج رہا تھا۔ اس کو لگا جیسے اس کی پشت پر وہ ہے اور اس نے ٹھٹک کر پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ واقعی اس کے عین مقابل کھڑا بے حد پراشتیاق نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اف کس قدر کمزور ہو چکا تھا۔ آنکھوں کے نیچے پڑے ہوئے حلقے اس کی بے خوابی کی گواہی دے رہے تھے۔ اور حیدر کی اداسی اس وقت سنبل کی نگاہوں میں چبھ رہی تھی۔ یہی تو محبت کا امتزاج ہوا کرتا ہے۔

''کیسی ہو سنبل!'' وہ بے حد دھیمے لہجے میں بولا تو اور وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی تھی۔

''آپ کے سامنے ہی ہوں۔'' سنبل کے انداز میں نجانے کیوں شکوہ سا تھا۔ اتنے عرصے اس شخص نے اسے یادوں میں آکر رلایا تھا۔ ستایا تھا۔ اس کے حواسوں میں چھایا رہا۔

''اب تو چھوڑ کر نہیں جاؤ گی ناں مجھے۔'' وہ بے حد اداسی سے بولا۔

''نہیں کبھی بھی نہیں۔'' دو آنسو سنبل کی آنکھوں سے چھلکے۔

ہجر صرف اب یادوں میں اثاثہ بن کر رہ گیا تھا اور اس وقت ان دونوں کا ملاپ نگاہوں ہی نگاہوں میں ازل سے ابد تک تھا۔

پھر اسی شام بے حد خوب صورت تقریب میں سنبل اور حیدر کو ایک دوسرے کے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی اور سب خوش تھے۔ اس وقت نسیم صاحب نے ہاتھ بڑھا کر سنبل کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ندیم صاحب مسکرا دیے تھے۔

☆☆☆

نیت صاف ہو تو منزل بھی صاف نظر آنے لگتی ہے۔ اس وقت وہ ریش ڈرائیونگ کرتا ہوا اریبہ کے گھر کی جانب رواں دواں تھا۔ اتنے عرصے سے وہ

ایک بے کلی کا شکار تھا۔ اس کے اندر بے حد اضطراب ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

اریبہ نے نہ صرف جاب چھوڑ دی تھی بلکہ اس کے گھر کا ایڈریس بھی جو درخواست پر رقم تھا، غلط تھا۔ وہ اس کے اطراف میں نجانے کتنے دنوں سے اریبہ کو تلاش کر رہا تھا۔ مگر ناکامی ہو رہی تھی۔ اس نے اریبہ کے جانے کے بعد خط کھولا تھا اور وہ خط پڑھتے ہی اس کو ایک نامعلوم خسارے کا احساس ہونے لگا تھا۔

عرشمان صاحب۔

میں اریبہ ہوں۔ اریبہ حماد۔ حماد صاحب کی بیٹی۔ یاد نہیں آپ کو حماد صاحب! میرے بے حد نیک والد..... بے حد شفیق والد اور ہاں والد سے ہٹ کر ایک بے حد نیک انسان..... انہوں نے تا عمر ہمیں رزق حلال کھلایا اور آپ نے کیا کیا؟ ان کی عمر بھر کی پونجی کو مٹی میں رول دیا۔ عزت بننے میں مدت لگتی ہے۔ مگر رل جانے میں لمحہ لگتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے یہ جاب کیوں کی؟ ضرورت مند تھی مستحق بھی تھی۔ مگر یہاں ہی کیوں؟ اس لیے کہ مجھے اپنے باپ کے ماتھے پر لگا ہوا وہ سیاہ داغ دھونا تھا۔ جس داغ کے دکھ میں انہوں نے اس دنیا کو ہی چھوڑ دیا۔ وہ بالکل بھی قصوروار نہ تھے۔ اب جبکہ سچائی آپ کے سامنے روز اول کی طرح نمایاں ہے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے میرے اور آپ کے راستے کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔ میں نے بارہا آپ کی نگاہوں میں محبت کے دیپ جلتے ہوئے دیکھے ہیں۔ مگر خدا گواہ ہے میں نے کبھی انتقاماً آپ کو محبت کے جال میں نہیں پھانسا۔ میں ایک نیک انسان کی بیٹی ہوں۔ جس کی تربیت میں کہیں بھی ذرہ بھر بھی کجی نہیں رہی تھی۔ میرا مقصد آپ کو اس کچھے دار باتوں میں رکھنا نہ کبھی تھا اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ یہ محبت آپ نے کب کیسے کر لی۔ اس کا میری ذات سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔

میں نے عہد کیا تھا۔ جس دن میں سچ اور جھوٹ کھول کر رکھ دوں گی۔ اس دن ہی آپ کے آفس سے ریزائن کر دوں گی۔ آج وہ دن تھا۔ سو میں جا رہی ہوں۔ مجھے تلاشنا بے کار ہے۔ یوں بھی امیروں کی محبتیں بھی وقت گزاری اور بیش قیمت لباس کی مانند ہوتی ہیں۔ وقت گزرا تو دل سے اتر گئی اور لباس سے دل بھر گیا تو پھینک دیا۔ محبت تو دل میں جذب ہو جانے کا نام ہے۔ وہ آپ نہیں سمجھیں گے۔ میں اور میری امی نے بہت دکھ دیکھے ہیں بابا کے بعد محلے والے ہمیں طعنے دیتے تھے اور اس بدنامی سے میری امی بھی مجھے چھوڑ جاتیں یہ مجھے برداشت نہیں تھا۔ اس لیے ہم لوگ اب پرانے محلے میں بھی نہیں رہتے۔ نیز یہ ایڈریس بھی ایک طرح سے خانہ پری ہے۔ بہر حال میں نے جتنے عرصے یہاں کام کیا بطور انسان آپ کو برا نہیں پایا۔ سوائے خود پرستی میں مبتلا ہونے کے۔ سلامت رہیں۔

اریبہ حماد۔

آج اسے بہت مشکل سے اس کا ایڈریس ملا تھا۔ یہ ایک تنگ و تاریک گلیوں والا بوسیدہ سا علاقہ تھا۔ جہاں اس کی لمبی چوڑی کار اندر جانے سے انکاری تھی۔ اس لیے اس نے کار کو ایک جانب ہی لاک کر دیا۔ وہ گلیوں سے گزرتا ہوا سیدھ میں نکلتا چلا گیا۔ سامنے ہی براؤن گیٹ تھا۔ جو اس کا مطلوبہ ایڈریس تھا۔ اس کا دل نجانے کیوں اس وقت بے حد تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کاش وہ دکھائی دے جائے۔

اس نے دروازے پر دستک دی۔

''کون ہے۔'' سامنے ہی اریبہ کھڑی تھی دروازے کے پٹ کھولے اور اس پر نگاہ پڑتے ہی اس کا چہرہ فق ہو گیا۔

''کون ہے اریبہ بیٹی؟'' اندر سے یقیناً اس کی والدہ زہرہ بیگم نے پوچھا تھا۔

''امی..... وہ.....'' اسے لفظ ہی نہیں مل رہے تھے کہ کیا کہے۔ تبھی زہرہ بیگم خود آگے بڑھیں ایک اجنبی خوش پوش نوجوان کو کھڑے دیکھ کر وہ حیران رہ گئیں۔

''میں عرشمان ہوں۔ نسیم صاحب کا بیٹا۔'' اس نے آہستہ سے کہا اور زہرہ بیگم ساکن رہ گئیں۔ پھر فوراً ہی سنبھل کر بولیں۔

''آؤ بیٹا'' وہ اندر کی جانب راستہ دکھا رہی تھیں۔
اریبہ کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔
جیسے وہ عرشمان کو یہاں دیکھ کر اندر سے خوش نہ تھی۔
زہرہ بیگم نے ایک جانب بچھی ہوئی کرسی کو اپنی چادر کے کونے سے دوبارہ صاف کیا۔
''بیٹھیں غریب خانے میں۔'' وہ طنزاً گویا ہوئیں اور وہ شرمسار ہو رہا تھا۔ وہ ان لوگوں کا مجرم تھا۔
''میں معافی مانگنے آیا ہوں بہت ہمت یکجا کر کے۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی ہے۔ میرے اندر روگ لگ چکا ہے۔ بے شک میں آپ کی بیٹی اریبہ کا ہاتھ مانگنا چاہتا ہوں۔ اس میں بھی خود غرضی کا ایک پہلو پنہاں ہے۔ مگر میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں جو ہوا وہ انجانے میں ہوا۔ میں نے ہرگز نہیں چاہا تھا کہ حماد صاحب کو کچھ ہو۔ میں معافی چاہتا ہوں۔''
لفظ ٹوٹنے لگے تھے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے اس کا مقصد کیا ہے؟
''بیٹا میں سب جانتی ہوں۔ میری بیٹی نے مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپایا ہے۔ مگر یہ تم نے کیسے سوچا کہ میں انکار کر دوں گی۔ تم یہاں تک آئے اور میری بیٹی کا ہاتھ مانگا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر اریبہ۔''
وہ خاموش ہو گئیں۔ اریبہ ایک جانب کونے میں کھڑی ہوئی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔
''میں پانی لاتی ہوں۔'' شاید وہ ان دونوں کو کسی فیصلے تک پہنچنے میں مدد دینا چاہتی تھیں۔ گمبھیر خاموشی ان کے جانے کے بعد چھا چکی تھی۔
''بہتر ہو گا کہ آپ چلے جائیں۔ امی نرم دل ہیں بابا کی طرح مگر میرا اتنا ظرف نہیں ہے کہ ساری عمر آپ کے ساتھ گزار دوں۔ ایک ایسے انسان کے ساتھ جو میرے بابا کی زندگی ختم ہونے کا سبب بن گیا۔'' وہ رو دی تھی۔ لرز رہی تھی اور وہ سوچتا رہ گیا کہ کیا کہے۔
''اریبہ مجھ پر رحم کرو۔ میں تمہارے بنا جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہوں۔ اریبہ میرے اندر تمہاری آنکھیں اتر چکی تھیں۔ گڑ چکی ہیں۔ میں کیسے ان کو اتنے

اندر سے نکالوں۔'' وہ کس قدر آزردہ لگ رہا تھا۔ تھکن زدہ لہجہ شکست خوردہ سا۔ ''ایک بار میری آنکھوں میں دیکھ کر یہ کہہ دو اریبہ میں قسم کھاتا ہوں دوبارہ تمہیں اپنی شکل بھی نہیں دکھاؤں گا۔'' وہ ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔
اریبہ نگاہیں چرا کر کھڑی تھی۔ کہیں دل میں اس کے بھی چور تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ محبت کرنے والا دل دوسرے کی محبت کو محسوس ہی نہ کر سکے۔ وہ بھی تو عرشمان کی بہت ساری خوبیوں کی گرویدہ ہو چکی تھی۔ اس کا بے شک سب کے ساتھ ایک لیا دیا انداز تھا۔ مگر اس کے لیے تو وہ صرف عرشمان تھا۔ اس کے لیے دیوانہ وار سوچنے والا۔ اس کی ایک ایک بات کی پروا کرنے والا۔
اچانک ہی عرشمان پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔
ایک مرد اگر کسی عورت کے لیے رو دے تو اس کی محبت میں سچائی ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں۔ اور وہ بھی تو رو دیا تھا۔ تھک گیا تھا۔
تبھی اریبہ نے لرزتے ہاتھوں سے اس کے کندھے پر ہولے سے ہاتھ رکھ دیا۔
''عرشمان میں پتھر نہیں ہوں کہ جس کے دل پر آنسوؤں کا سیل رواں بہتا رہے اور وہ پھر بھی نم ہو کر ریزہ ریزہ نہ ہو جائے۔ میں آپ کا ساتھ دوں گی تاعمر۔''
عرشمان کے دل میں محبت کے کشکول کھل اٹھے۔ تبھی زہرہ بیگم نے بھی دونوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیے۔
زہرہ بیگم نے دیکھا تھا کہ اریبہ بہت سارے دنوں سے اداس ہے اور ماں کی نگاہیں تو زمانہ شناس ہوا کرتی ہیں۔ وہ سارے راز جان لیتی ہیں پھر وہ کیسے اپنی بیٹی کی دل کی بات نہ جان لیتیں۔
عرشمان نے زہرہ بیگم سے وعدہ کیا تھا کہ جلد ہی وہ نسیم صاحب کو لائے گا اور اسے معلوم تھا کہ وہ انکار نہیں کریں گے۔ کیونکہ وہ پہلے ہی گھر والوں کو راضی کر چکا تھا۔

☆☆

مریم شہزاد

دو اور دو پانچ

''راہول کے بارے میں تمہیں کیا بتاؤں، کہاں سے شروع کروں..... بس اتنا سمجھ لو کہ اس جیسا کوئی نہیں۔ کبھی وہ معصوم ہے تو کبھی شیطان..... کبھی پاگل ہے تو کبھی جینئس..... کبھی غصے میں بہت ڈانٹ دیتا ہے تو کبھی الٹے سیدھے چہرے بنا کر ہنسا دیتا ہے..... کبھی بچوں سے بھی زیادہ ضدی ہے تو کبھی بہت پیارا ساتھی۔ وہ کیا ہے اور کیا نہیں..... میں اسے لفظوں میں ڈھال نہیں پاتی۔ پتا نہیں کیوں، مجھے ایسا لگتا ہے کہ جب وہ مجھے دیکھتا ہے تو مجھے لگتا ہے میں خوب صورت ہوں۔ جب وہ ہنستا ہے تو دل چاہتا ہے ناچ اٹھوں۔ جب وہ روٹھ جاتا ہے تو جی چاہتا ہے اسے بانہوں میں لے لوں۔ وہ مجھے احساس دلاتا ہے کہ میں اس کے لیے بنی ہوں اور وہ میرے لیے۔ میں اس سے بہت پیار کرتی ہوں، ایک دن کے لیے نہیں..... ایک پل کے لیے نہیں..... زندگی کے لیے، آئی لو یو راہول..... آئی.....''

وہ دم سادھے انڈین مووی کا آخری سین دیکھ رہی تھی کہ پیچھے سے آپی نے اچانک اس کی کمر پر ایک زوردار دھپ رسید کی اور بولیں۔

''ایسا کچھ نہیں ہوتا بی بی امیمہ، حقیقی زندگی میں۔''

''اف فو..... آپی! تم بھی نا۔ اتنا زبردست رومانٹک سین چل رہا تھا، سارا بیڑا غرق کردیا۔'' امیمہ نے منہ بنا کر کہا۔

''ہمم..... بیڑا غرق کردیا۔ حقیقت کی دنیا میں آؤ۔ یہ صرف فلمی باتیں ہیں۔ پیار، عشق محبت، کچھ نہیں ہوتا۔ صرف خرافات ہیں یہ سب۔ شادی سے پہلے جو لڑکیاں ایسا سوچیں بھی تو بدنام اور شادی کے بعد تو کچھ دن رومینس کے اور پھر کام، کام، کام..... شادی تو بس ذمہ داری کا نام ہے۔'' آپی نے کہا۔

''اچھا، اگر میں اس بات کو غلط ثابت کردوں، پھر؟'' امیمہ بحث کے موڈ میں تھی۔

''ہائیں کیا ثابت کردوں۔'' آپی نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی کہ رومینس، محبت، شادی کے بعد اپنے شوہر سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ ساری زندگی قائم دائم بھی رہ سکتا ہے تو؟'' امیمہ نے کہا۔

''بہت مشکل ہے، ایک تو ابھی تمہاری شادی نہیں ہوئی۔ تم کیا جانو، شادی کے بعد کے جھمیلے..... اور مرد کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے۔ چھ مہینے کے بچے کی طرح ٹریٹ کرنا پڑتا ہے۔''

''چلیں..... دن ہی کتنے ہیں میری شادی میں۔ صرف مہینہ بھر ہی تو ہے۔ دیکھ لیں گے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''بے شرم ہو پوری۔ کیسی ڈھٹائی سے کہہ رہی ہو۔ مہینہ بھر ہی تو ہے۔ شروع کے دن ہی بس رومانٹک ہوتے ہیں اور جب مکمل زندگی شروع ہوتی ہے نا تو عشق محبت سب ہوا ہو جاتے ہیں۔ بس پھر صرف کھانا، کپڑے..... سب چیزیں وقت پر چاہیے ہوتی ہیں مرد حضرات کو، ورنہ..... ورنہ اتنا بڑا گول گپا بن جاتے ہیں۔'' آپی نے سمجھایا۔

''آپ دیکھنا تو سہی.....''

اس شرط پر کھیلوں گی پیا، پیار کی بازی
جیتوں تو تجھ کو پاؤں، ہاروں تو پیا تیری

امیمہ ناامید نہیں ہونا چاہتی تھی۔

''اب تم سے کون بحث کرے۔ دعا ہی کرسکتی ہوں کہ اللہ تم کو کامیاب کرے۔ مگر کچھ عرصے بعد پوچھوں گی ضرور کہ اب کیا کہا کرتی ہو، محبت زندہ باد یا کام کام.....'' آپی نے مسکرا کر کہا۔

☆☆☆

اور مہینہ بھر بعد امیمہ..... امیمہ سے مسز ناصر بن گئی۔ شروع شروع میں تو اس کو لگا کہ آپی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ کام اور رومینس ساتھ ساتھ نہیں چل سکتا مگر وہ ہار ماننے والوں میں سے نہ تھی۔

زندگی ہوا کے دوش پر گزرتی جارہی تھی۔ پانچ سال کب اور کہاں، کیسے بیت گئے پتا ہی نہیں چلا

ناصر کی محبت اور دو پیارے بچوں کی آمد بھی اس کی زندگی کو مکمل کر گئی۔ اب بھی وہ زندگی میں رومینس کی قائل تھی، بے شک انداز بدل گئے تھے مگر ہر صورت میں اس کی توجہ ناصر پر اسی طرح مرکوز تھی، جیسے کہ عاشق کی معشوق پر۔ کبھی وہ معشوقہ بن جاتی تو کبھی گرل فرینڈ۔ کبھی اچھی سامع بن کر اس کو سنتی تو کبھی پرابلمز شیئر کرتی۔ کبھی کسی قسم کی کوئی شکایت ناصر کی زبان پر آ ہی نہیں سکتی۔ ہر لحاظ سے امیمہ پرفیکٹ تھی، چاہے وہ گھر کے کام ہوں یا خود اس کی اپنی حالت۔ ہمیشہ تازہ دم صاف ستھری، زندگی کے کسی پہلو میں کوئی کمی نہیں مگر امیمہ اب بھی ہار سکتی ہے اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

''ٹھیک ہی کہتی تھی اماں آپ۔ ہر وقت میاں کے لیے حاضر خدمت رہنا بھی ٹھیک نہیں۔ اب سمجھ میں آیا۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

☆☆☆

آج ناصر کا پرانا دوست آیا ہوا تھا۔ وہ اور ناصر ڈرائنگ روم میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ امیمہ چائے کی ٹرے لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہونے ہی والی تھی کہ فیصل کی آواز آئی۔

''اور کیسی چل رہی ہے زندگی، سنا ہے بھابھی نے ہاتھ کا چھالا بنایا ہوا ہے تمہیں۔''

امیمہ کے کان کھڑے ہو گئے اور قدم وہیں رک گئے۔ اس نے دل میں سوچا کہ اب یقیناً ناصر اس کی تعریف کرے گا، مگر جواب سن کر اسے پاؤں کے نیچے سے زمین نکلتی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے آپ کو کوسا۔ کیوں سننے کھڑی ہوئی ناصر کی بات، وہ کہہ رہا تھا۔

''یار! بیوی کو بیوی ہی ہونا چاہیے۔ اتنا پرفیکٹ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ٹھیک ہے میں بھی بہت قدر کرتا ہوں اس کی محبت کی..... مگر کچھ اور بھی چاہیے زندگی میں۔''

''کچھ اور کیا میرے بھائی! ایسی بیوی کی تو سب تمنا کرتے ہیں، ترستے ہیں پرسکون زندگی کے لیے..... اور تو ناشکری کر رہا ہے۔'' فیصل نے پریشان ہو کر کہا۔

''ارے بھائی! میں پرسکون زندگی کو جہنم بنانے کی بات نہیں کر رہا، مگر کچھ اور چاہیے۔ پتا نہیں مگر کچھ کمی ہے۔''

امیمہ ناصر کی بات سن کر کمرے میں داخل ہوئی اور کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے، ہنستے مسکراتے چائے سرو کی اور باہر آ گئی۔ کچن میں واپس آ کر اس نے گہرا سانس لیا۔

''اچھا تو ناصر صاحب آپ کو کچھ اور چاہیے۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''چلو امیمہ بی بی! سوچو اب کچھ اور.....''

کتنا چاہا ہے تجھے، کبھی سوچ، کبھی غور تو کر
اتنے تو ہم اپنے بھی طلب گار نہ تھے

اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر شعر پڑھا۔

☆☆☆

''ناصر میں سوچ رہی ہوں کہ قریب ہی اسکول میں جاب کر لوں۔'' امیمہ نے کہا تو ناصر چونک گیا۔

''کیوں بھئی، خیریت۔ کوئی کمی ہے تم کو جو جاب کا سوچ رہی ہو؟''

''نہیں..... بس ویسے ہی خیال آیا تھا کہ دیکھنا تو چاہیے کیسا رہتا ہے بلکہ میں سوچ رہی ہوں صبح صبح ہی ہو آؤں۔ بس آپ صبح پریشان مت ہوئیے گا۔ میں صبح آپ کے جاگنے سے پہلے ہی ایک چکر لگا آؤں گی۔ سامنے ہی تو اسکول ہے۔ بچوں کے ایڈمیشن کا بھی معلوم کر لوں گی، ٹھیک ہے نا؟ بلکہ بالکل ٹھیک ہے۔ ویسے بھی آپ تو گیارہ بجے نکلیں گے تو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔'' اس نے خود ہی پوچھا اور خود ہی فیصلہ بھی سنا دیا۔

صبح ساڑھے نو بجے ناصر کی آنکھ کھلی تو وہ کچھ حیران ہوا کہ آج میں اتنی جلدی کیسے اٹھ گیا۔ کچھ غور کیا تو معلوم ہوا کہ چھوٹا سعد رو رہا ہے، اس نے امیمہ کو آواز دی۔

''امیمہ.....امیمہ! کہاں ہو بھئی۔ یہ سعد کیوں رو رہا ہے۔''

''کیا ہو گیا سعد؟''

''امی نہیں ہے.....امی.....امی.....امی.....''

وہ پھر رونے لگا۔

تب ناصر کو یاد آیا کہ.....

''اوہو۔ رات کو کہہ رہی تھی کہ صبح اسکول جاؤں گی۔ کہاں گیا موبائل.....؟'' اس نے جلدی سے موبائل ڈھونڈا اور امیمہ کو کال کی۔

''ناصر ابھی بات نہیں کر سکتی۔ مجھے انٹرویو کے لیے اندر بلایا ہے۔'' امیمہ نے فون اٹھاتے ہی کہا اور بند کر دیا۔ ناصر فون کو دیکھتا رہ گیا پھر سعد کی طرف متوجہ ہوا۔

''مما ابھی آ رہی ہیں۔ آپ سو جاؤ آرام سے۔''

اور سعد کو اپنے ہاتھ پر لٹایا۔ آدھے گھنٹے بعد امیمہ آئی تو سعد ناصر کے ہاتھ پر لیٹے لیٹے سو گیا تھا۔ امیمہ نے آہستگی سے سعد کو نیچے لٹایا اور ناصر کو جگایا تاکہ وہ آفس کے لیے تیار ہو سکے۔ ناصر کو محسوس ہوا کہ اس کا بازو سن ہو رہا ہے، اس نے امیمہ سے کہا تو اس نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

''ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔ سعد لیٹا ہوا تھا نا اس لیے سن ہو گیا ہو گا۔'' وہ کہتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی اور ناشتا تیار کرنے لگی۔

ناشتے کی میز پر وہ ناصر کو اسکول کے انٹرویو کی روداد سناتی رہی اور پھر اس کے جانے تک خود ہی دماغ میں حساب کتاب کرتی رہی۔ آج نہ اس نے دروازے تک اس کو سی آف کیا، نہ موبائل اور چشمے کی یاددہانی کرائی۔

ناصر کو بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ آفس میں بھی کچھ الجھا الجھا رہا۔ ایک تو اس کو لنچ گھر سے لانے کی عادت تھی اور آج امیمہ نے کھانا نہیں بنایا تھا جس کی وجہ سے آج اس کو باہر سے منگوانا پڑا جو اس کو بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

دو دن..... تین دن..... غرض پورا ہفتہ امیمہ نے اسی چکر میں گزار دیا۔ رات کو بھی پتا نہیں وہ موبائل پر کیا کیا ڈھونڈ کر لکھتی رہی۔ ناصر کو کہاں ایسے نظر انداز کیے جانے کی عادت تھی۔ وہ تو ہر لمحہ امیمہ کی نظر کرم کا عادی تھا۔

''بس بہت ہو گیا..... ابھی تو جاب شروع نہیں کی اور تم اتنی مصروف ہو گئی ہو کہ میرے اکثر کام تم کو یاد ہی نہیں رہتے۔ اگر واقعی تمہاری جاب لگ گئی تو میں اور بچے تو تم کو نظر ہی نہیں آئیں گے۔'' وہ آخر برس پڑا۔

امیمہ اندر ہی اندر مسکرا دی۔ مگر ہڑبڑا کر بولی۔

''کیا ہوا ناصر! کچھ غلط ہو گیا؟''

''کچھ..... سب کچھ ہی جیسے الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔ نہیں بھئی، نہیں..... کوئی ضرورت نہیں جاب واب کرنے کی۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

''اب آیا نا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔ ہونہہ..... بڑے آئے سب کچھ اتنا پرفیکٹ نہیں ہونا چاہیے۔'' امیمہ نے دل ہی دل میں کہا اور ناصر کی طرف دیکھا، وہ کافی پریشان لگ رہا تھا۔

''چلیں جیسا آپ کہیں..... مگر اچھی جاب ہے، آپ.....''

''نہیں بھئی۔ کتنی ہی اچھی جاب کیوں نہ ہو، تم گھر گرہستی کرتی ہی اچھی لگتی ہو۔ مجھے تو ویسی ہی امیمہ چاہیے جو ہر کام میں پرفیکٹ ہے۔'' ناصر نے کہا تو امیمہ مسکرا دی۔

''او کے باس، جیسا آپ کہیں۔''

اور گنگناتی ہوئی کچن کی طرف چل دی۔

''جو سوچیں، جو چاہیں وہ کر کے دکھا دیں
ہم وہ ہیں جو دو اور دو پانچ بنا دیں.....''

☆☆

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ بہت سے علاقے لاک ڈاؤن کی زد میں ہیں جس کی بناء پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔ ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو مارچ یا جون کا پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم -/70 روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بنک اکائنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ نمبر 03172266944 میں رقم بھیج کر سکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ -/840 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام ''عمران ڈائجسٹ، اکاونٹ نمبر 0010000015680030، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے PK44ABPA0010000015680030''، کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہوا گر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہوا تو -/500 روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک -/500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔

فی ڈائجسٹ ایشیا، افریقہ، یورپ -/7000 روپے، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/8000 روپے،

کسی بھی معلومات اور آڈر کے لیے اس واٹس اپ نمبر 03172266944 پر رابطہ کریں

مصباح علی سید

کانچ سے سائبان

منہل اپنی نانی اور مما کے ساتھ رہتی ہے۔ برابر کے پورشن میں اس کے ماموں رہتے ہیں جن کے بیٹے منجی کو وہ پسند نہیں کرتی۔ کالج کے ایک ٹرپ پر جاتے ہوئے اس کی دوستی ذیاج سے ہوگئی ہے۔

الحمد لیگلی ملٹی نیشنل کمپنی ہے۔ اعظم لیاقت ''الحمیدز'' میں فنانس منیجر کے طور پر کام کر رہا تھا، اس کے نامناسب رویے کی وجہ سے عابس حمید نے اسے ہٹا کر ہائم انصر کو ترقی دے کر اعظم لیاقت کی پوسٹ اسے دے دی۔ اعظم لیاقت ذات کی نفی کرنے والوں سے تو تھا نہیں، اس نے جاب چھوڑ دی لیکن وہ وقتاً فوقتاً آفس میں ملنے کے لیے آتا رہتا ہے۔

یونیورسٹی میں ہائم انصر نے ردابہ کو پرپوز کیا لیکن ردابہ نے اپنی محتاط فطرت کی وجہ سے سختی سے انکار کر دیا۔ بعد میں ابا کے دوست کی بیٹی نکل آنے کی وجہ سے ہائم نے اپنی ماں نعیمہ خاتون کو ردابہ کے لیے رشتہ لے جانے پر مجبور کیا۔

ہائم اور ردابہ کی شادی ہوگئی لیکن نعیمہ خاتون کا پرانی رنجش کی وجہ سے ردابہ کے ساتھ سلوک اچھا نہیں ہے۔

دوسری قسط

''کلاس فیلو ہے۔'' وہ منہ بنا کر تفصیل بتانے لگی۔ ''خاصا بڑا لگ رہا ہے ناں، مجھے لگتا ہے، دو دو سال میں ایک کلاس کلیئر کی ہوگی، یا بچپن میں بیمار رہتا ہوگا۔''

''میں نے یہ نہیں پوچھا بڑا لگ رہا ہے، یا چھوٹا، میں اس لیے پوچھ رہی ہوں، تمہاری ہر پک میں کہیں نہ کہیں یہ دکھائی دے رہا ہے۔''

وہ استہزا میں کھل کر ہنسی تھی۔ ''مما لڑکوں کو عادت ہوتی ہے، جہاں دو تین لڑکیاں سیلفی بنا رہی ہوں، خود جان کر اپنا ہاتھ، یا وں چہرا کہیں گھسیڑ دیتے ہیں، تاکہ لڑکیاں جب بھی اپنی پک دیکھیں، وہ بھی حاضر اسکرین ہوں۔''

اس دن تو اس نے ذیاج کا ویسا ہی تعارف کروایا جتنی وہ اسے تب تک ویلیو دیتی تھی، لیکن پھر جانے ایسا کیا ہوا، کب کیسے، معمول کی باتیں بڑھنے لگیں، بات بے بات اس کا ذکر نکل آتا، ایک دوسرے کے آنے جانے، غیر حاضر ہونے کا لاشعوری دھیان بڑھتا گیا، اور پھر یہ نوبت بھی آگئی کہ فون پر بات چیت ہو جاتی، ایک دوسرے کے احساس اور کمی کو محسوس کیا جانے لگا۔ اور جس دن یہ بات مما کے نوٹس میں آئی، اُن کے سخت لہجے سے پتھر کی نوکیں ابھریں، دوٹوک انداز میں اس پر واضح کر دیا۔

''آج کل تمہارے منہ سے میں ذیاج کا بہت ذکر سن رہی ہوں، یونی تم صرف پڑھنے جاتی ہو، اور بس..... اگر وہاں سے کوئی پروپوزل آیا، تو یاد رکھنا، تمہارا گلا میں اپنے ہاتھوں سے دبا دوں گی۔''

ان کا ایسا اٹل انداز بہت کم ہوتا تھا، اور نا نو بھی کہیں قریب نہیں تھیں۔ وہ خاموش مما کا چہرا دیکھے گئی، بولی کچھ بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

یہ شادی کے شروع دنوں کی بات تھی، انگوری شیفون کے ہلکے سے کامدار سوٹ میں ردابہ ہلکی پھلکی تیار ہوئی کمرے سے نکلی تھی، بشاش چہرے کی روشنی شوہر کی بے تحاشا محبت، چاہت کی چغلی کھا رہی تھی۔ وہ سلام کی غرض سے باہر نکلی کچن کی کھٹر پٹر سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی کچن میں موجود ہے۔ اس نے اپنا رخ ادھر ہی موڑا۔ قدم اندر رکھتے ہی سلام کیا۔ سلائس گرم کرتے زارا بھابھی نے سر کے خم سے جواب دیا اور جلدی جلدی انڈا فرائی کرتے بچوں کو اونچی آواز میں ہدایات دینے لگیں۔

”ٹیپو۔ اجو کو دیکھو وہ کیوں رو رہا ہے، بیلا بیگ میں بکس چیک کر لینا۔ بیلا پانی کے تھرماس مجھے پکڑا کر جاؤ۔ جلدی کرو، لنچ میں کیا لینا ہے تم نے۔“

بچے کسی بات کا جواب دے رہے تھے کسی کا نہیں، وہ سلیب سے پشت ٹکائے کچھ دیر انہیں دیکھتی

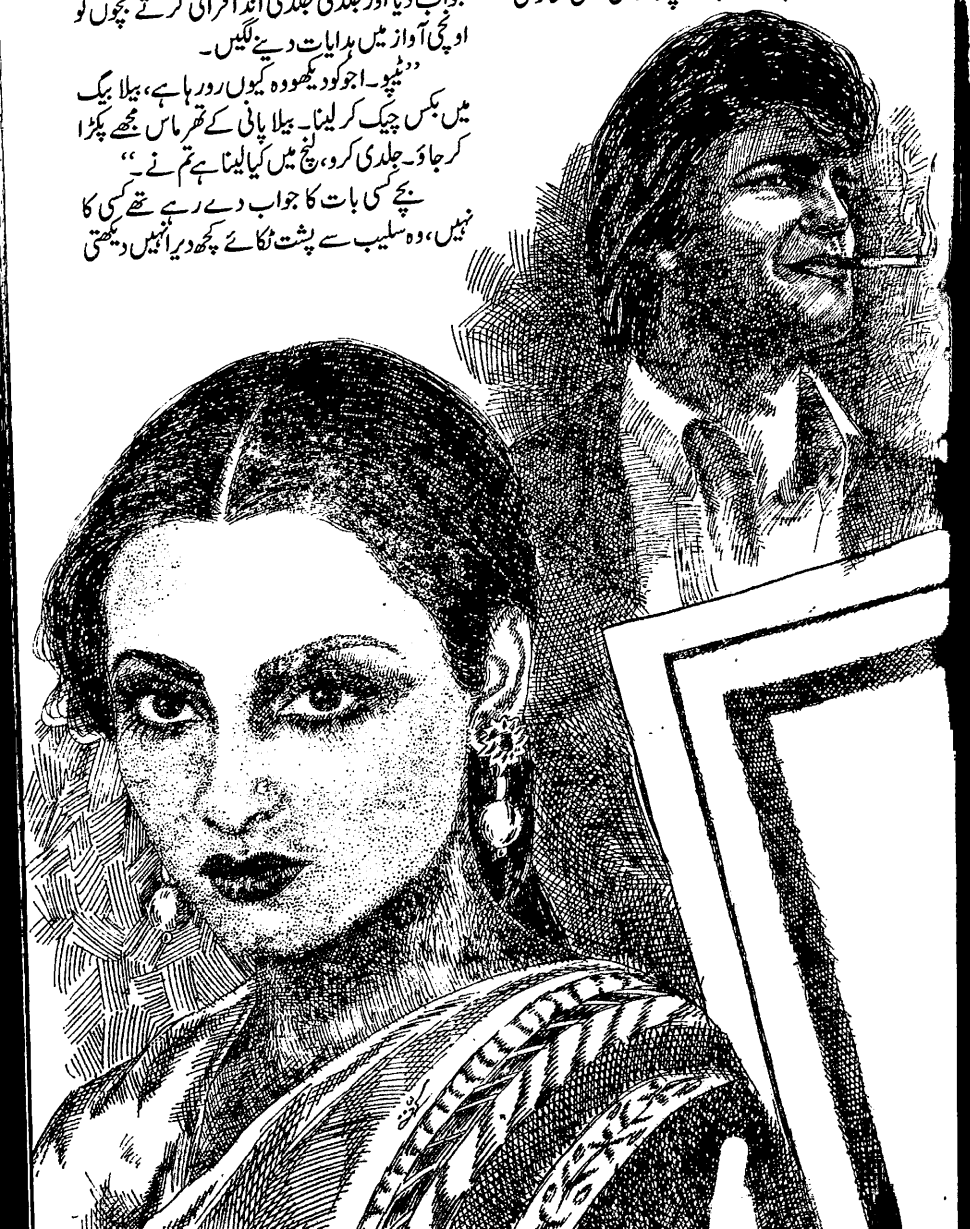

رہی پھر کچن چیئر پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔

''بڑا مشکل ہے بھابھی، صبح صبح بچوں کو تیار کرنا۔ کیسے کر لیتی ہیں آپ۔''

وہ پھیکا سا مسکرائیں۔

''سر پر پڑتی ہے بہن، سب آجاتا ہے۔''

بیلا ٹیپو کی کسی بات پر لڑائی شروع ہوگئی تھی دونوں چلا رہے تھے۔ نعیمہ زارا کو انہیں دیکھنے کا کہنے کچن کی طرف آئیں ردابہ کو چیئر پر ٹانگیں جھلاتے دیکھ کر نعیمہ کی آنکھوں میں ناگواری اتری۔ پہلے زارا کو بچوں کو دیکھنے کا کہا پھر اس سے مخاطب ہوئیں۔

''شکر ہے تمہیں بھی خیال آیا کچن میں آنے کا۔''

وہ جھٹ سے چھلانگ لگا کر چیئر سے اتری۔

''شادی کو ہفتہ گزر گیا، مہمان تھوڑی ہو، ذرا جلدی کمرے سے نکل آیا کرو۔ زارا نے دو بچے تیار کرنے ہوتے ہیں میاں الگ، پھر گھر کی ذمہ داریاں، اور چھوٹا سا بچہ بھی..... ناشتے کی ذمہ داری کم از کم تمہیں لے لینی چاہیے۔''

وہ حکم بجالاتے انداز میں سر ہلاتی تیار ہوا ناشتا باہر میز پر لگانے لگی۔ نعیمہ نے اب زارا کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

''کیوں زارا! دوپہر میں آج ردابہ کی کھیر پکائی نہ کرلیں، ہفتہ تو ہوگیا شادی کو، اور کتنا آرام ہوگا۔''

زارا حسب عادت تائید اً سر ہلاتے ہوئے اپنے کاموں میں مصروف رہیں، بلاوجہ اِدھر اُدھر بیٹھنے سے گھر کے کام کی مصروفیت اچھا ٹائم پاس تھا پھر فریدہ جب بھی فون کرتیں ایک ہی بات، سمجھاتی تھیں۔

''ردابہ میری جان، اپنی بھاوجوں کو باتیں بنانے کا موقع مت دینا، سسرال میں دل لگانا۔ میری بوڑھی عزت اب تمہارے ہی ہاتھ میں ہے بیٹا۔''

پھر کیسے ممکن تھا وہ ان کی بات سے اختلاف کرتی۔

☆☆☆

یہ اگلے دن کی بات ہے، الارم کے زور وشور پر وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی، بکھرے بال سمیٹ کر کیچر میں جکڑے، اس کے یوں جلدی اٹھنے پر ہی ہائم کسمسایا اور مندی آنکھوں سے ٹائم دیکھتے پوچھا۔

''خیریت، کہاں جارہی ہو، ابھی تو چھ بجے ہیں۔''

''مجھے فریش ہو کر کچن میں جانا ہے۔'' ناسمجھی میں ذیاج کی بھنویں سمٹیں۔ ''ناشتا بنانا ہے ناں۔''

''ناشتا.....'' وہ تعجب سے کہنی کے بل اوپر ہوا۔

''میں آٹھ بجے کروں گا یار۔ دو سلائس کھانے ہیں میں نے، ابھی تو چھ بجے ہیں، لیٹ جاؤ چپ کر کے۔''

''آپ نے آٹھ بجے کرنا ہے، لیکن بچے جلدی کرتے ہیں۔''

''بچے.....'' اس کا تعجب سوا تھا، یقیناً ردابہ کی ذہنی حالت پر شبہ ہی ہوا ہوگا۔

''ڈیئر کون سے بچے..... ہماری شادی کو ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔''

''اوہو۔ ٹیپو بیلا کی بات کر رہی ہوں۔ امی نے رات خاص طور پر کہا تھا، ناشتا میں بناؤں۔ بھابھی زارا نے بچوں کو تیار کرنا ہوتا ہے۔''

''افف.....'' وہ کوفت زدہ سا ہو کر دھپ سے تکیے پر گرا تھا، اور غصیلی نگاہوں سے ردابہ کو اٹھتے گھورتا رہا۔

اس نے ناشتا پورے اہتمام سے تیار کیا تھا، ذمہ داری سے کیا گیا یہ اس کا سسرال میں پہلا تجربہ تھا، وہ کسی حد تک خوش بھی تھی۔ اچاری قیمہ، پراٹھے، چائے دم پر رکھنے کے بعد ناشتے کی میز تیار ہوتے ہی سب باری باری آتے گئے۔ ٹائی باندھتا ہائم جب ناشتے کے لیے آیا تب بھی اس کے چہرے پر دبی دبی خفگی کے آثار تھے۔ ہائم کے بیٹھتے ہی نعیمہ اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئیں اور معمول کی باتیں شروع کر دیں۔

دوسری جانب ٹیپو آ بیٹھا جسے چاچو سے کوئی بہت اہم فرمائش کرنا تھی۔ وہ اس کی جانب سر جھکائے توجہ کا تاثر دیتا بات سن رہا تھا، تبھی ردابہ نے چائے کی ٹرے لا کر میز پر رکھی، اس کی خواہش تھی اُسے دیکھ کر کم از کم ٹیپو تو جگہ چھوڑ دے۔ وہ ابھی اسے اٹھانے کا سوچ رہی تھی کہ نعیمہ فوراً سے بولیں۔

''ضماد تو آملیٹ کے بغیر ناشتا نہیں کرتا۔

آملیٹ نہیں بنایا کیا؟''

بیلا کی وی (اسٹول) درست کرتے زارا نے فوراً پیشکش کی۔

''میں بنا دیتی ہوں۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔'' اپنے لیے پانی گلاس میں ڈالتے نعیمہ کو اچنبھا لگا۔ ''ضماد گھر کا فرد نہیں ہے کیا۔ جب سب کے لیے بن رہا ہے، اس ایک کا ناشتا بھاری ہے۔''

ردابہ کچھ خفیف سی ہوئی تھی، اور فوراً سے کہتی۔

''ابھی بناتی ہوں۔'' پاس سے ہٹ گئی۔

ہائم کو ماں کا شکوہ چبھا ضرور تھا، اس نے دبے دبے غصے سے ماں کو دیکھا پھر کچھ فاصلے پر بے فکری سے بیٹھے ضماد بھائی کو، جو ہر بات سے قطع نظر اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے، ان کا سپر اسٹور شہر کی بہترین مارکیٹ میں تھا، جو تقریباً گیارہ بجے کے بعد ہی کھلتی تھی۔ ان کا ناشتا تو بعد میں بھی بن سکتا تھا، مگر ساس کی تائید حاصل کرنے کو وہ کچن میں جا چکی تھی۔ ہائم کو ناشتا کرنا بھی ناگوار لگا، بے دلی سے دونوالے لیے۔

نعیمہ ہانک لگا کر ردابہ کو مزید ہدایات دے رہی تھیں۔

''مرچیں ہاتھ چھوڑ کر مت ڈالنا، ضماد کے معدے میں درد ہو جاتا ہے۔ اور ایک انڈا تانیہ کے لیے بھی ابالنے رکھ دو، اٹھنے والی ہوگی۔''

ہائم نے تلخ چائے یک لخت بہت سی اندر انڈیلتے صرف اتنا ہی کہا۔

''ضماد بھائی کی صحت کا مسئلہ ہے، بھابھی سے کہتیں وہ ذرا دھیان سے بنا لیتیں۔''

زارا ''ہاں ہاں'' کرتے کھسیانی سی ہوتے اٹھیں مگر نعیمہ تو غصے میں بھر گئی تھیں۔

''ایسا کیا بنوالیا تمہاری بیگم سے، جو اتنا برا لگ گیا..... رہنے دو بھیا.....'' انہوں نے کچن کی جانب منہ کرتے ہانک لگائی۔ ''موجود ہے اس کی بیوی بنا لے گی۔ نہیں تو میں کون سا نہیں بنا سکتی، ابھی ٹوٹے نہیں ہاتھ ہیں میرے۔''

وہ غصے سے بولتے ہوئے اٹھ گئیں ہائم الگ نئی صورتِ حال سے بوکھلا گیا۔

''کیا ہو گیا..... میں نے جسٹ بات ہی کی ہے۔''

ناشتا ویسے ہی چھوڑ وہ اٹھ گیا تب نعیمہ کو اپنی سختی کا کچھ احساس ہوا، وہ بھی صرف بیٹے کے لیے۔

''ناشتا تو پورا کر لے، جا رہا ہے اٹھ کر۔''

''کر لیا ہے۔'' وہ آملیٹ لے کر کچن سے باہر نکل رہی تھی تب ہائم فائلز اور لیپ ٹاپ اٹھائے پاس سے گزرا، ایک اچٹتی نگاہ اُس پر ڈالی پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

صبح کی پہلی نگاہوں میں خفگی معمول بننے لگی تھی، شروع کے چند دن روٹین کا ناشتا بنتا رہا، پھر نعیمہ کی فرمائش روز بدلنے لگی، پراٹھے بن گئے تو سادہ روٹی چاہیے، کبھی بن گرم کر دو، مکس چائے نرا دودھ لگتی، سپیریٹ بنا کر دو، کبھی کیسا آملیٹ کبھی ہاف فرائی، اور تو اور زارا بھابھی جن کی کبھی گھر میں پہلے عام بہو سی حیثیت بھی نہ تھی۔ ساس کی غیر متوقع حمایت ملنے سے کچھ پھیل ہی گئیں۔ ان کے بچوں نے سادہ سلائس کی جگہ بیٹھے کھانے شروع کر دیے۔ بیلا کو ہاف فرائی، ٹیپو کو آملیٹ، چھوٹا سا اجو سادہ دودھ نہیں پیتا، اس کی روز نئے شیک کی فرمائش ہوتی۔ پھر آہستہ آہستہ خود کو بچوں میں الجھا ظاہر کر کے فریزر سے دو چار کباب نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیتیں۔

''ردابہ میری بہن، ذرا یہ فرائی کر دو، بیلا لنچ میں لے کر جائے گی۔ میں ذرا اس کے شوز پالش کر کے آئی۔''

پھر کبھی نوڈلز کے پیکٹ، کبھی نگٹس، تو کبھی چند آلو سنک میں پھینک جاتیں۔

''ذرا ان کے فنگر چپس کاٹنا، میں ابھی آئی۔''

ان کی آمد تب ہی ہوتی جب چپس فرائی ہو کر لنچ باکس میں رکھے بھی جا چکے ہوتے۔ اور تانیہ اس سب ہنگامے کے بعد تیار ہو کر نکلتی تھی۔ اسے یونی

جانے کی جلدی ہوتی، کچھ ڈائٹ کونشس تھی وہ کمرے سے نکلتے ہی ہانک لگا دیتی۔

''بھابھی آئل والی بریڈ میں نہیں لوں گی پلیز..... سادہ ہی، اور جوس میں خود بنالوں گی، آپ رہنے دیں۔''

اس کے کچن کی جانب بڑھنے سے پہلے نعیمہ کا حکم پہنچ جاتا۔

''تم کھاؤ..... بنا دے گی، سیب جوسر میں ڈال کر نکالنے ہی ہیں، کون سا پاپڑ بیلنے ہیں۔ سارا دن بعد میں فارغ ہی رہتی ہے۔''

جب اپنا ناشتا بنانے کی باری آتی تب ہائم کچھ نہ کچھ کھا کر لب تھپتھپا کر میز چھوڑ رہا ہوتا۔ ردابہ کے مزاج میں فرماں برداری نہ ہوتی تو شاید یہ سب مینج کرنا دشوار ہوتا۔ ہائم کی معمولی سی حمایت پر ہی نعیمہ پٹڑی سے اتر جاتی تھیں، وہ بمشکل برداشت کرتا رہا مگر کب تک ایک دن اسے شدید غصہ آ گیا تھا۔ اپنی شرٹ کے بٹن بند کرتا چلاتا ہوا باہر نکلا۔

''ردابہ..... ردابہ! کیا مصیبت ہے یار، صبح ہی صبح کہاں الجھ جاتی ہو، میری ٹائی نہیں مل رہی، آ کر ڈھونڈ کر دو۔''

اس کے غیر متوقع غصے پر سب کو ہی حیرت ہوئی تھی۔ نعیمہ کو اچنبھا ہوا۔

''کیوں دو مہینوں میں اپنی چیزیں سنبھالنا بھول گئے ہو۔''

''بیڈ کی سائیڈ پر ہوں گی۔'' اس نے آملیٹ پلیٹ جواب دیا۔

''نہیں مل رہیں..... کر کیا رہی ہو اتنی دیر سے، آ کر ڈھونڈ کر دو۔''

زارا بھابھی جلدی سے کچن کی سمت بھاگیں مگر نعیمہ نے اشارے سے روک دیا۔

''تم اجو کو ناشتا کرواو۔ میں دیکھتی ہوں وہاں کون سی دیگیں دم دی جا رہی ہیں جس پر میاں آگ بگولا ہوا ہے۔''

کوئی کچھ بھی کہے ہائم کی بلا سے اس کی آوازیں تب تھمیں جب وہ کمرے میں آ گئی۔

''حد کرتے ہیں ہائم، یہ رکھی ہے۔'' اس نے آتے ہی سائڈ ٹیبل سے اٹھا کر اسے تھمائی۔ ''دکھائی نہیں دے رہی تھی کیا۔''

''دے رہی تھی، لیکن تم دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔'' وہ اپنی سازش پر خود ہی مسکراتا اس کے قریب ہوا۔ ''زارا بھابھی پہلے بھی سارے کام اکیلے ہی کرتی تھیں، تمہارا ساتھ ملنے سے بجائے شکر گزار ہونے کے بالکل ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئیں۔ بات تو غلط ہے۔''

''آپ امی کے غصے کو جانتے ہیں ناں، پھر بھی۔''

''جانتا ہوں، اسی لیے میں نے خود بلایا ہے۔ تمہارا شوہر بھی تمہاری ذمہ داری ہے، اسے تیار میں تمہاری ضرورت نہیں پڑ سکتی.....! تم نوکرانی نہیں ہو، جو ہر ایک کے آگے پیچھے پھرو۔ اور میں دکھائی نہیں دیتا.....!''

وہ خوب صورت لہجے میں کہتا اس کے چہرے کے بل دیکھ رہا تھا۔

''اپنے یہ خیالات امی تک مت پہنچا دینا، پلیز.....''

''کیوں۔'' خود پر کلون چھڑکا، کمرہ خوشبو سے مہک گیا۔ ''اگر یہی روٹین رہی میں تو کم از کم برداشت نہیں کر پاؤں گا۔''

اس نے معطر اسپرے کا رخ اس کی جانب کرتے بٹن دبایا۔ ردابہ نے آنکھیں بند کرتے ہوئے گردن پیچھے کی جانب کی تھی، ہائم کی مسکراہٹ گہری ہونے سے ردابہ کے رخسار تپ گئے۔

☆☆☆

اس دن ہائم کے سامنے تو نعیمہ خاموش رہیں لیکن اس کے جانے کے بعد دبے لفظوں میں سارا دن جس طرح سے ردابہ کی تضحیک کی وہ ناقابلِ بیان تھی۔ جتنا مسرور ہائم کی وارفتگی نے کیا تھا اس سے کہیں زیادہ ہتک نعیمہ کے الفاظ کرتے رہے۔ ردابہ کی پلکوں پر آنسو آ کر ٹوٹے نہیں تھے بس۔

''آج کل کی اماؤں نے اتنا ہی سکھایا ہے،

میاں کے سامنے سج سنور کر بیٹھ جاؤ، باقی جائیں جہنم میں..... ہم نے ایک وقت میں بچے بھی پال لیے ساس سسر نند دیوروں کی خدمتیں بھی کیں۔ مجال جو میاں کے آگے رونا رویا ہو۔''

اس سے کچن سمیٹنا دشوار ہو گیا وہاں سے ہٹ کر کمرے میں چلی گئی۔

رات کا وقت تھا وہ دونوں اپنے کمرے میں تھے، اور کمرے میں ہائم کے انداز عروج پر ہونا عام سی بات تھی۔ لیکن صبح والے رویے پر ردابہ ابھی تک خفا تھی کیوں کہ نعیمہ نے سارا دن اس سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی۔ اس نے اگر کوئی بات پوچھی، چبھتی نگاہ سے دیکھ کر نپا تلا جواب دیا۔ ہائم آفس سے آیا بے شک نعیمہ نے اسے بھی نظر انداز ہی کیا مگر وہ ان کے رویوں کا عادی تھا اسے بالکل بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ ویسے بھی وہ ماں تھیں، اولاد کو انداز اطوار بہت اچھے سے پتا ہوتے ہیں، لیکن ردابہ نے کہہ دیا۔

''خود تو تماشا لگا کر مزے سے چلتے بنے، یہ سوچے بنا مجھے گھر میں ہی رہنا ہے۔ آپ کا یہ رویہ میرے لیے مشکلات پیدا کرے گا، ہائم۔''

''کیوں، تمہیں کسی نے کچھ کہا ہے؟''

ردابہ کی ناگواری سمتی بھنوؤں سے جھلکی۔

''امی نے کچھ کہا ہے..... بتاؤ کیا کہا ہے؟''

اس کا چہرہ اپنی جانب موڑا۔

''کچھ نہیں۔''

''پھر، تمہیں کیا مسئلہ ہے۔'' وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

''مسئلہ یہ ہے، آپ آئندہ اس انداز میں بات نہیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے میز سے پانی کا گلاس اٹھا کر دو گھونٹ پیے، اور بہت آرام سے کہا۔

''پھر تم بھی مجھے صبح ہی صبح اگنور نہیں کرو گی۔''

وہ نرمی سے مسکرائی۔ ''کوشش کروں گی۔''

''پھر میں بھی کوشش ہی کر سکتا ہوں۔''

اس نے شانِ بے نیازی سے کندھے اچکاتے پانی پیا، خالی گلاس میز پر رکھ دیا۔ اس کی شکوہ کناں نگاہیں خود پر دیکھ کر صوفہ بیک سے ٹیک لگاتے محظوظ ہوتا رہا۔

☆☆☆

وہ بہت سے پیپرز میز پر پھیلائے ان میں الجھی بیٹھی تھی، جب چائے لے کر وہ بھی خاموشی سے آ کر مما کے پاس بیٹھ گئی۔ ویسے تو یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، مما کو زیادہ کام کرتے دیکھ کر وہ بنا کہے چائے بنا کے ان کے پاس آ بیٹھتی تھی لیکن آج اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے اسے ان سے کچھ کہنا ہے۔ غالباً اس دن اُن کے دوٹوک انداز نے کہیں اندر تک شرمندگی آنکھوں میں دھڑکا لگا دیا تھا۔ صرف پروپوزل آنے پر گلا دبا دیں گی، پروپوزل پر خواہش کا اظہار کر دیا تو شاید عالم برزخ سے اسکیپ کر کے سیدھا دوزخ کے آخری گڑھے میں ہی نہ ڈال آئیں۔ اب بات کرے تو کس سے۔ ویسے تو نانو اس کا رائٹ ہینڈ بن جاتی تھیں مگر کچھ ایسے معاملات بھی نکل آتے جن میں وہ جان بوجھ کر چپ لگا لیتی تھیں، اور اسے یقین تھا یہ معاملہ بھی ان کی گویائی و سماعت کے ناقص ہونے کا ہی ثبوت دے گا، سو خود ہی بات کی جائے۔

کچھ دیر بلاوجہ اپنی انگلیوں کو توڑنے مروڑنے پر اس کا زور چلتا رہا، ذیاج نے اسے پورا اسکرپٹ لکھ کر دیا اور اپنے سامنے یاد بھی کروایا تھا، کہ آنٹی سے کیسے بات شروع کرنی ہے کس جملے کو کہاں فٹ کرنا ہے، ایکسپریشنز، بلیک میلنگ سب سمجھا دی تھی، لیکن مما کا جلال اپنا ہی تھا، حالانکہ بہت محبت، بہت لاڈ سے انہوں نے اسے پالا تھا، ایک ایک بات پوری بھی کرتی تھیں، اپنی شعوری کوشش سے اسے بااعتماد، اپنے حق کے لیے اٹھ کھڑی ہونے والی، نڈر دلیر، اور کسی حد تک بدتمیز، منہ پھٹ بنانے کی کوشش بھی کی، لیکن اپنے اندر کی کمزوریاں، خوف لاشعوری طور پر اس میں انڈیلتی چلی گئیں۔

اولاد کو جب عملی زندگی کے لیے تیار کرنا ہو تو اپنی غلطیوں سے سیکھے تجربے، جملوں اور باتوں سے ان کی شخصیت نہیں ڈھالی جا سکتی، بلکہ اپنے اندر کے

خوف کمزوریوں کو دفنا کر، خود کو اس جگہ پر کھڑا کرنا پڑتا ہے جہاں اولاد وہ عمل دیکھ کر خود بخود سیکھ سکے۔ زبانیں سیکھنا بہت مشکل ہے، صرف عمل ہوتے ہیں۔ جو خود بخود شخصیت میں جذب ہوتے چلے جاتے ہیں، پھر اس کے لیے ماں باپ کو بٹھا کر کچھ خاص سمجھانا نہیں پڑتا، کیوں کہ اولاد آپ کا لاشعوری عکس ہوتی ہے، اور وہ مکمل عکس ہی تھی، باہر سے کچھ دکھائی دیتی اندر سے وہی ماں جیسی۔ اور اس دن جو مما نے محسوس بھی کر لیا تھا یقیناً، مگر دونوں کے بیچ اجنبیت سی اجنبیت تھی۔

اس نے کچھ بے وقوفانہ سے سوال شروع کیے۔

''آپ کے اسکول میں چھٹیاں کب ہو رہی ہیں۔''

انہوں نے باریک کمانی کی عینک سے اُسے جھانک کر دیکھا۔

''کون سی چھٹیاں، ابھی تو اسکول کھلے ہیں۔''

''ہاں سچ۔'' اس نے کھسیاہٹ سے تھوک نگلا۔ ''میں پیپرز کا پوچھ رہی تھی۔''

''اور یہ میں کیا چیک کر رہی ہوں۔'' باریک کمانی کی عینک لپیٹ کر پیپرز پر رکھی گئی، شرمتی آنکھوں میں خوف تھا مگر ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ پھیلی تھی۔

''اوہ، میں نے غور نہیں کیا۔''

''تم کچھ کہنا چاہ رہی ہو؟''

اس کی گردن بیک وقت نفی اور اقرار میں ہلی۔

''نہیں..... ہاں، ہاں..... وہ میرا سمسٹر ختم ہونے والا ہے۔''

''اچھا۔ تو پھر آگے کیا سوچا ہے۔''

اس نے تھوک نگلا۔

''وہ ذیاج.....''

انہوں نے جس طرح سے کرنٹ کھا کر اسے دیکھا، لگتا تھا سارے زمانے کا خوف صرف اس کے اندر آ گیا ہو۔ پل بھر اسے لگا جیسے وہ ماں کے سامنے نہیں کسی جلاد کے سامنے کھڑی ہو۔

''یاد ہے، میں نے تم سے کیا کہا تھا۔ میں تمہاری ماں ہوں، مجھے بہت اچھی طرح سے پتا ہے، تمہارے رشتے کے لیے مجھے کب، کس کو یہاں بلانا ہے، اور بلانا بھی ہے یا نہیں۔''

کسی کام سے وہاں سے گزرتے ہوئے نانو رک گئیں اور خاصی تلخی سے بولیں۔

''مطلب کیا ہے تمہاری اس بات کا..... کیا بیٹی کی شادی بھی نہیں کرو گی؟''

''امی، پلیز۔ آپ ہماری بات میں مت بولیں۔''

وہ کہہ کر اٹھ جانا چاہتی تھی لیکن فریدہ نے کڑواہٹ سے اسے دیکھا تھا۔

''میرا تو کبھی بھی اختیار نہیں رہا، تمہارے کسی بھی معاملے میں بولنے، یا سمجھانے کا۔ سب اختیار تمہارے ہی تھے، اب بیٹی کی دفعہ بھی تم با اختیار ہو۔''

''آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟'' اس نے فریدہ کو دیکھ کر کہا۔

''جو تم کبھی بھی سننا نہیں چاہتیں۔ آج اس وقت، اگر اس کا باپ موجود ہوتا تو یہ یوں تمہارے آگے نہ منمنا رہی ہوتی۔''

نانو کی حمایت پر جہاں منہل کی شربتی آنکھیں تحیر سے اٹھیں وہاں ردابہ کی آنکھوں میں بے یقین سا کرب دائیں بائیں تیرتا اُس کے چہرے کو سن کیے جا رہا تھا۔

☆☆☆

ہوا کے تیز جھونکے، طوفانی آندھی، اور پھر گرد بڑھنے سے آنکھوں میں ریت مٹی گھسی جا رہی تھی، اوپر سے شجی اس کے قریب بڑھتا دکھائی دیا۔ شجی کے بارے میں کسی کی کوئی اچھی رائے کبھی نہیں رہی تھی، اسے پڑھائی لکھائی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، کاروبار کا مشورہ دیتے تو وہ بھی شاہانہ چاہیے تھا۔ معمولی کام تو وہ کبھی نہ کرے، مما نانو کو آپس میں باتیں کرتے ہوئے وہ سن چکی تھی۔

''آج سے تھوڑی..... وہ بچپن سے ہی ایسا ہے، جس بات پر اڑ جائے سو اڑ جائے۔ کبھی کسی بات پر بھابھی نے منع کیا ہے اسے۔''

''ہمیں کیا لینا۔ تم چپ رہا کرو۔'' فریدہ کہہ کر

ہاتھ ہی بدل دیتیں۔
"میرے چپ ہوجانے سے اس کی شخصیت تھوڑی بدل جائے گی، گھر والے وقت پر نہ بولیں، تو باہر والے گھر کے اندر آکر بولنے لگتے ہیں۔"
نانو کا ناگوار انداز بات ختم کر دیتا، البتہ نانو اور مما کی طرف سے ماموں کے پورشن میں بلاوجہ جانا اسے ختی سے منع تھا، وہ جانا پسند بھی نہیں کرتی تھی جتنا شجی سے اُسے خوف محسوس ہوتا تھا۔ اور اب چند ماہ پہلے ہونے والے واقعے نے تو اسے اچھا خاصا محتاط بنا دیا تھا۔ شجی کی نگاہوں سے اُسے خوف سا آنے لگتا۔ جب بھی کبھی سامنا ہوتا، عجیب انداز میں دیکھتا رہتا۔ رخ پھیر لینے پر بھی پشت اس کی نگاہوں کی کراہیت سے جھلستی محسوس ہوتی تھی۔ اللہ پاک نے عورت کی چھٹی حس میں یہ صلاحیت بہت باریکی سے رکھی ہے، وہ مرد کی خود پر اٹھی نگاہیں بنا دیکھے بھی بہت اچھے طریقے سے محسوس کرلیتی ہے، اگر وہ کرنا چاہے۔ اور منہل ایسی ہی تھی۔ وہ شجی کی نگاہیں بنا دیکھے بھی جانچ جاتی تھی، کئی بار چاہا، کم از کم نانو کو بتائے مگر بدمزگی کے خوف نے زبان پر پردہ ڈالے رکھا۔ اور نانو کو کیا بتاتی، کچھ واضح تھا بھی نہیں، چھٹی حس کا کہہ کر اب کیا خاندان میں شور ڈالتی۔
شجی اسے بلانے کے موقعے ہی ایسے تلاشتا رہتا تھا کہ کسی طرح وہ اُدھر آئے، بڑی ممانی الگ بلا لیتی تھیں، ان کی اکلوتی بیٹی جو پڑھائی کی غرض سے دوسرے شہر ہوسٹل میں تھی، کوئی کام پڑ ہی جاتا تھا، جتنا اس کا خوف بڑھتا جا رہا تھا، اتنے ممانی کو کام پڑتے جاتے تھے۔ انہی کے کام کو کپڑے سمیٹنے چھت پر آئی تھی، لیکن شجی کی پیش رفت جان نکال گئی، خوف زدگی سے اس کی آنکھیں پھیلے جا رہی تھیں وہ جلدی سے سیدھی ہوئی اور سیڑھیاں اتر کر برآمدے کی جانب بڑھنے لگی۔
نیا نیا گھر بنا تھا اس کی تعمیر کچھ ایسے تھی، پچھلے صحن سے اگلے حصے میں آنے کے لیے پہلے برآمدہ آتا تھا جس کے ایک جانب زینہ تھا دوسری جانب چھوٹا سا فرنٹ لان جس کے سائیڈ پر بنی راہداری سے آگے گیراج تھا۔ ادھر اگر نہ مڑو تو دائیں جانب عمارت تھی جو بہت عالی شان تو نہیں لیکن نئی بننے اور نئے نئے پینٹس نے جدید ضرور بنادی تھی۔
وہ کپڑے لیے جلدی سے سیڑھیاں اتری، برآمدے کی جانب بڑھی تاکہ بھاگ کر عمارت کی طرف جاسکے، لیکن شجی نے ایک جست میں اس کی کلائی پکڑ لی۔
"یہ...... یہ کیا بدتمیزی ہے...... میرا بازو چھوڑیں۔"
بازو چھڑانے کے لیے احتجاجاً اس نے زور لگایا، نازک کلائی اس کی سخت گرفت میں بل کھانے لگی، تمام تکلیف آنکھوں سے چہرے پر امڈ آئی تھی اور لفظوں میں بہنے لگی۔
"آپ کیوں میرے ساتھ ایسا کر رہے ہیں...... بگاڑا کیا ہے میں نے آپ کا...... آخر چاہتے کیا ہیں؟"
"تمہیں...... تمہیں چاہتا ہوں، اور دل و جان سے چاہتا ہوں۔"
اس کے بے باک لہجے میں صرف کراہیت تھی، اس کی کلائی کو جھٹکا دیتے ہوئے اسے اپنے قریب کیا تھا۔ اس کی بے بسی پر وہ لطف اندوز ہوا۔ ایسے لگا جیسے سفید سنگِ مرمر کی ٹھنڈی مورتی اس کی گرفت میں ہو، پانی میں بھیگی شربتی آنکھیں اس کے اندر کے شیطان کو اکسا رہی ہوں۔
"پلیز میرا بازو چھوڑ دیں۔ نانو انتظار کر رہی ہیں انہیں دوا دینی ہے۔"
"پہلے مجھے تو دے دو، اس مریض کی جان بھی لبوں پر ہے۔"
اس نے بل دینے کے انداز میں اس کے بازو قریب کیا۔
"پلیز شجی بھائی۔"
"اے ے ے......" وہ دھاڑا۔ "آئندہ مجھے بھائی مت کہنا، تمہارا کوئی بھائی وائی نہیں ہے۔ اکلوتی

ہو تم اکلوتی..... سمجھیں۔''

''میں ماموں کو بتاؤں گی۔''

آخری احتجاج پر وہ استہزائیہ ہنسا۔

''تم کیا بتاؤ گی۔ سب کو خود ہی پتا چل جائے گا۔ مجھے انکار کیا، یعنی شجی کو..... اب میں بتاؤں گا انکار کا مطلب جب تمہارے بزرگ بھی ہاتھ جوڑ کر میری منتیں کریں گے، پاؤں پکڑے گے..... ہاہاہا، نکاح میں لے لو۔''

قہقہہ لگاتے اس نے کلائی چھوڑی اور اپنی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''پھر انکار شجی کرے گا، اس سے زیادہ حقارت سے جتنی حقارت سے تم نے کیا۔''

وہ ساری کانپ گئی، وحشت و ناگواری سے اس کی تراشیدہ بھنویں سمٹ رہی تھیں، کلائی پر اس کی سخت گرفت سے انگلیاں چھپ گئی تھیں۔ بازو پر ڈالے کپڑے زمین پر گر چکے تھے، آسمان پر بجلی کی صرف ایک لکیر ابھری اور سیاہ بادل تمام پرتوں کی صورت اکٹھا ہو کر بوجھل ہو گیا، بوندیں پھسلنے کو تیار تھیں۔

''بلکہ ایسا ہے۔ ویڈیو بنا کر اس ذیاج کو بھیجوں گا، جس کے عشق میں تم انکار کر رہی ہو۔ پھر دیکھتا ہوں، تب بھی وہ ایسا ہی پاگل ہوگا تمہارے لیے، ایسے ہی اس کے گھر والے تمہارا رشتہ مانگنے کو بے قرار ہوں گے، جیسے اب اتاولے ہو رہے ہیں؟''

سنتے ہی وہ لمحہ بھر کو گھبرائی، بھلے ذیاج کی محبت پر اسے بہت اعتماد تھا، وہ اتنا کم ظرف نہیں تھا کسی مشکل میں اسے یوں اکیلا چھوڑ دے گا، لیکن مشکل تو پھر مشکل ہی ہوتی ہے۔ اور پھر مرد کی محبت کو مشکل میں ڈالنا، اس کا دل یک بارگی سے دھڑکا۔ یک لخت اس میں بہت سی طاقت آ گئی، اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے پیچھے کی جانب دھکا دیا اور خود پلٹی۔

اس کے معمولی سے دھکے سے وہ لمبا چوڑا جوان گرنے سے تو رہا تھا، البتہ پل بھر کے لیے زمین پر گرے کپڑوں میں اس کا پاؤں الجھا ضرور تھا۔ مگر وہ پاؤں جھٹک اس کے پیچھے بھاگا۔ وہ اندھا دھند برآمدے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس کا دوپٹا گردن سے پھسل کر قدموں پر گر چکا تھا وہ بدحواسی میں آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ساتھ ''نانو، نانو'' چلا رہی تھی، وہ بھی اتنی ہی تیزی سے پیچھے تھا، اب اس کی آنکھوں میں پہلے سے کہیں زیادہ کروفر اتر آیا تھا۔

''آج تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا، ہو کیا تم، ایک چیونٹی سی۔''

اس کے یوں جرأت دکھانے پر جس قدر اسے غصہ آیا تھا، عین ممکن تھا اگر وہ اس کے ہاتھ چڑھ جاتی تو وہ اس کا گلا دبا دیتا یا سر پھاڑ دیتا یا برآمدے کے ستونوں سے ٹکرا دیتا۔

وہ بجائے مڑ کر عمارت کی جانب بھاگنے کے لان پار کر سیدھی گیٹ کی جانب بھاگی وہ اس کے پیچھے تھا۔ ساون کی بارش نہیں تھی کہ دو چار بھاری بوندیں برسا کر حبس بڑھاتی۔ بھادوں کی بارش برس رہی تھی یک دم ہی تاڑ تاڑ بوندیں دھواں دھار اُتر آئی تھیں، جو بھاری پتھر کی طرح ماربل کی راہداری پر سر پٹخ رہی تھیں، اس نے آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا، تب تک شجی اس کے سر پر کھڑا تھا، دانت کچکچاتے خوں خوار آنکھوں سے اُسے کھا جانے کی حد تک گھورنے لگا۔

''بس..... بس اتنا ہی بھاگ سکتی تھیں۔'' اس نے اونچا قہقہہ لگایا۔ ''اچھا لگا ویسے تمہارا خوف، چلو اور بھاگو، سڑک پر بھاگو..... دیکھتا ہوں کہاں تک جا سکتی ہو۔ چلو، آخر ایک جرأت مند ماں کی بیٹی ہو، دیکھتا ہوں اور کتنا بھاگو گی..... بلکہ ایسا کرو بھاگتی بھاگتی اپنے باپ تک پہنچ جاؤ۔''

شجی نے نفرت سے کہتے اسے دیوار کی جانب زور سے دھکا دیا تھا، اس کا سر دیوار سے ٹکرایا، اور اس کی شرارتوں کے آگے تارے ناچ گئے تھے۔

☆☆☆

اس دن بات آئی گئی ہو گئی۔ دن اپنے معمول پر گزرنے لگے تھے، ناشتے کے بعد برتن سمیٹ، دھو کر، کچن صاف کرتے ہی ردابہ فارغ ہو جاتی، پھر لمبی فراغت تھی۔ دوپہر کے کھانے کا سارا انتظام

شروع سے ہی زارا بھا بھی کرتی تھیں۔ بے شک کام اچھا خاصا تھا، مگر دونوں بچے اسکول ہوتے۔ اجو کو کوئی تنگ کرنے والا نہیں تھا، کبھی خاموشی میں سویا رہتا کبھی واکر میں ٹہلتا، میاں اسٹور پر، وہ بہت سہولت سے کام کرلیتیں۔ سبزی سلاد، مارننگ شو دیکھتے دیکھتے بن جاتا۔ نعیمہ، اور ردابہ بھی باتیں کرتے ہوئے ساتھ لگ جاتیں، باقی پکانے کا وہ کچن میں خود ہی کرتی تھیں۔ ردابہ نے کئی بار ان کی مدد کرنے کو بڑھی مگر انہوں نے صاف کہہ دیا۔

''کوئی مسئلہ نہیں، میں کرلوں گی۔ ویسے بھی ضماد کی شاپ پر کھانا بھجوانا ہوتا ہے۔ سات آٹھ ملازم ہیں، اگر ان کی مرضی کا ٹیسٹ نہ آئے ضماد غصہ کرتے ہیں۔''

نعیمہ ایسے میں اپنی زبان بول جاتیں۔

''اور ویسے بھی تمہارا میاں کہہ دے گا، کھانا ضماد کی دکان پر جاتا ہے، میری بیگم کیوں بنائے۔ نوکر ہے کسی کی۔ رہنے دو بی بی تم..... ناشتا بنا دیتی ہو یہی بڑا احسان ہے۔''

''امی۔ ایسی بات نہیں ہے دراصل.....''

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا نعیمہ نے بات کاٹ دی۔

''ایسی ہی بات ہے بھیا۔ اپنی بیگم کا ہی نظر آتا ہے، زارا سارا دن اکیلی لگی رہتی ہے۔ روٹی سالن، رائتہ، سلاد، چٹنیاں الگ، اکثر تو دو دو ہانڈیاں بنتی ہیں۔ چاول الگ۔ کھاتے تو سب ہی ہیں نا، وہ بھی انسان ہے تھک جاتی ہوگی۔''

''میں بھی ہاتھ بٹانے کا کہہ رہی تھی۔'' ردابہ منمنائی، مگر نعیمہ اپنی ہی سوچے بیٹھی تھیں۔

''اگر اتنا ہی خیال ہے تو رات کا دیکھ لیا کرو۔ اب وہ بھی زارا ہی دیکھے..... اور رات کو ہوتا ہی کیا ہے، روٹی ہی اتارنی ہے۔ دوپہر کا کچھ نہ کچھ سالن تو ہوتا ہی ہے تھوڑا بہت بنانا ہوتا ہے۔ نام کرنے کو، گوارا سمجھو تو بنالینا۔''

اس تھوڑے بہت میں کبھی فرائیڈ فش، کبھی چکن، کباب کے ساتھ سادہ چاول ہوتے، ماشاءاللہ بھرا پورا کنبہ تھا کھانا بنتا بھی خوب تھا، اس نے کچھ دن تو کیا پھر وہی ہائم کا موڈ بدلنے لگا۔ کیوں کہ وہی وقت اس کے گھر آنے کا تھا، جس وقت کھانے کی تیاری شروع ہوتی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے نعیمہ سے کہا تھا۔

''امی۔ دوپہر میں میں کرلوں گی، ایکچوئلی اس وقت ہائم گھر نہیں ہوتے، آسانی سے کرلوں گی۔''

''کیوں..... ہائم بچہ ہے جسے گود میں اٹھانا ہوتا ہے۔'' وہ گھور کر بولیں۔ ''اچھا بھلا سمجھ دار ہے میرا بیٹا۔ اٹھنا، بیٹھنا، چلنا سب آتا ہے۔ اور ویسے بھی شام کو زارا نے بچوں کو ہوم ورک کروانا ہوتا ہے، آگے تمہاری مرضی ہے، اگر نہیں ہوتا میاں کو چڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود کرلوں گی، ابھی ہاتھ پاؤں چلتے ہیں میرے۔''

ناچاہتے ہوئے بھی وہ لہجے کو خوش گوار بنا کر بولی تھی۔

''نہیں نہیں امی۔ کرلوں گی، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

☆☆☆

وہ آج روٹین سے جلدی گھر آ گیا تھا موڈ بھی بہت خوش گوار تھا۔ کچھ دیر نعیمہ کے پاس بیٹھ ادھر اُدھر کی باتیں ہانکتا رہا، پُرشوق نگاہیں ردابہ پر ہی تھیں۔ ردابہ سے چائے بنوا کر پی، ردابہ کسی کام سے کمرے کی جانب بڑھی تھی وہ بھی پیچھے آ گیا۔

''جلدی سے تیار ہو جاؤ۔''

''خیریت کہاں جانا ہے؟'' اس کے استفسار میں حیرت تھی۔

''یار۔ آج بونس ملا ہے، بیگم پر لٹانے کو دل کر رہا ہے۔'' اس کی نگاہوں میں شوخی تھی۔ ''چلو شاباش جلدی کرو۔''

''اس وقت.....'' اس نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی سات بجنے والے تھے۔ ''دیر ہو جائے گی، سنڈے کو چلیں گے۔''

''اوہو.....'' وہ گھرک کر بولا۔ ''میں سنڈے والی شاپنگ پر نہیں لے جا رہا یار۔ میرا لانگ ڈرائیو

کا موڈ ہے۔ تم نے ہلکی پھلکی شاپنگ کرنی ہوئی تو کر لینا۔ اب جلدی کرو، بہانے نہ بناؤ۔"

وہ پورا پروگرام ترتیب دے کر الماری کھولے پہننے کے لیے شرٹ پسند کر رہا تھا۔

"لیکن مجھے کھانا تیار کرنا ہے۔"

اس نے ڈریس شرٹ نکال کر ہنگر سے اتاری۔

"کھانا باہر ہی کھائیں گے۔"

وہ جانا تو پورے دل سے چاہ رہی تھی لیکن نعیمہ کی جانب سے شش و پنج میں تھی۔

"لیکن باقی سب نے تو کھانا ہے۔"

"تو......؟"

"تو شام کو میری ڈیوٹی ہوتی ہے۔ سنڈے کو دن میں چلیں گے۔"

"ردابہ ڈیئر۔ یہ گھر ہے، آفس نہیں جہاں ڈیوٹیاں چل رہی ہیں۔ تم ذرا بھابھی سے کہو، وہ تیار کر لیں گی۔ اینڈ پلیز نو ایکسوز۔ میرا موڈ خراب نہ کرنا، بہت خوش ہوں آج میں۔"

وہ کپڑے لے کر واش روم کی جانب بڑھا، اُسے کوفت میں جہاں کی تہاں کھڑا دیکھ کر گردن موڑ کر بولا۔

"یار۔ میں امی سے خود کہہ دوں گا۔ اب پلیز منہ مت لٹکاؤ۔ کچن سے ضروری چیزیں سمیٹ کر جلدی آکر تیار ہو، دیر نہیں کرو یار۔"

تب وہ مطمئن ہوتی باہر کی جانب نکلی۔ نعیمہ لاؤنج میں بیٹھی چھاپہ مار پروگرام دیکھنے میں محو تھیں۔ اسے دیکھتے ہی بولیں۔

"ادھر آؤ، دیکھو...... یہ کیا دکھا رہے ہیں۔"

وہ چند قدم آگے کو آئی، نگاہ اسکرین پر گئی، جہاں اینکر کے عتاب کا نشانہ ایک ہوٹل کا کچن تھا۔ ایک جانب کچے گوشت کا ڈھیر لگا تھا، دوسری جانب بچے کھچے کھانوں کا، جس پر ایک کم عمر لڑکا بیٹھا بوٹیاں چن چن کر ایک برتن میں اکٹھی کر رہا تھا۔ اینکر کا چھاپہ دیکھتے ہی لڑکا قمیص سے ہاتھ پونچھتا اٹھ کھڑا ہوا، اس کے چہرے کا رنگ خوف سے اڑ چکا تھا۔ اس لڑکے کے پیچھے کھلے مسالا جات کا ڈھیر ایسے ہی کھلا پڑا تھا، بے ترتیب گندے بدبودار برتن، گندگی اور پھیلاوے سے وہ کسی جانور کے اصطبل سے بھی زیادہ بکھرا معلوم ہوتا تھا۔ پروگرام گدھے کے گوشت کی فروخت پر تھا۔ اینکر نے پروفیشنل انداز میں ملازمین کے خوب لتے لیے۔ ایسی ایسی باتیں کیں سننے والوں کو خود سے کراہیت آنے لگی، ردابہ آہستہ قدموں سے نعیمہ کے پیچھے آکھڑی ہوئی وہ پورے ذوق وشوق سے پروگرام میں محو تھیں۔

"پھر کہتے ہیں بیماریاں کیوں پھیل رہی ہیں، بیٹھے بٹھائے جوان کیوں مر جاتے ہیں۔ جب کتے بلے، گدھے کھائیں گے بیمار تو پڑیں گے، یہ آج کل کی نسل کی بھی کام کرتے جان جاتی ہے سارا دن فیس بک پر لگی رہیں گی۔ پکاتے ہاتھ ٹوٹتے ہیں، مرا کھوتا کھانا منظور ہے، گھر میں نہیں کچھ ڈھنگ کا پکتا ان سے۔"

وہ ایک نگاہ اسکرین پر دوسری نعیمہ پر ڈال رہی تھی جو ساتھ ساتھ استغفار کیے مسلسل بولے جا رہی تھیں۔

"ایک ہمارا دور تھا۔ مجال نہیں ناشتے میں چنے ہی منگوا لیں، گھر سے باہر جانے پر تو شاید گھر سے ہی نکال دیتے، تبھی جان تھی، بھاگ بھاگ سارے گھر کا کام کرتے تھے، اور اب...... پیسے لگا کر کھوتے کھاؤ۔ موت کو ماسی سمجھ کر گلے لگا رہے ہیں۔"

ثانیہ کچھ فاصلے پر اپنے لیپ ٹاپ پر جھکی بیٹھی تھی، اپنا کام جاری رکھتے ہوئے بنا گردن گھمائے ماں کے تبصرے پر ہنسی جا رہی تھی۔

"امی۔ اب اتنا بھی اندھیر نہیں مچا۔ بڑی کمپنیوں والے جان کر اس طرح کے پروگرام بنواتے ہیں، تاکہ لوگ گھن کھا کر عام خوراک چھوڑ دیں، پھر اُن کی برانڈڈ چیزیں بکیں۔"

"اچھا......" نعیمہ نے چبھتا سا اچھا کہا۔

"ہوٹل والے پاگل ہیں، اپنے آپ کو خود بدنام کرواتے پھریں۔ دیکھ ملازم کیسے سہم رہے ہیں،

جان نکل رہی ہے بے چاروں کی، اور وہ مالک اسے دیکھ کیسے منمنا رہا ہے۔''

تانیہ نے دوسری فائل کھولتے الجھن سے بھنویں سکیڑیں ایک اچٹتی نگاہ ٹی وی پر ڈالی پھر اپنا کام کرنے لگی۔

''اوہ۔ میری اماں۔ یہ سب ڈرامہ ہو رہا ہے، اسکرپٹڈ ہوتا ہے۔ اس منمنانے کے پیسے مل رہے ہیں اسے۔ یوں منہ اٹھائے کوئی کسی کے کچن میں گھس سکتا ہے بھلا، اور یہ اینکر کیمرہ مائیک سب لے کر پہنچ جاتے ہیں۔''

نعیمہ نے ایسے ناگوار منہ بنائے جیسے تانیہ کی بات سے بالکل اتفاق نہ ہو، تانیہ پھر سے سمجھاتے ہوئے کہنے لگی۔

''امی۔ اس طرح کے پروگرام ہماری عوام بہت شوق سے دیکھتی ہے، اپنے سب کام چھوڑ کے بیٹھ جاتے ہیں، منہ آنکھیں پھاڑے۔ یہ سب ریٹنگ کے چکر۔ بڑی کمپنیوں کے تماشے، اس ملک میں سب اپنا الوسیدھا کرنے پر لگے ہیں، ملک نہ ہو گیا نانا جی کی پرات ہو گئی۔''

تانیہ کو ایسے پروگرام بہت ہی برے لگتے تھے، آخر پہلے بھی دور دراز علاقوں میں ایک آدھ واقعہ ہو جاتا تھا، لیکن اس طرح کے پروگرامز کی بھرمار نے ہر انسان کو دوسرے کی نگاہ میں بے اعتبار کر دیا تھا۔ اب ایسے بھی دلوں میں کفر نہیں بس گئے تھے، ہر دوسرا شخص حرام کھلانے پر تلا ہے، نالیوں کا گند، مرے ہوئے جانور اور غلاظت سے بنے دودھ، حد ہو گئی۔ مگر امی کو کون سمجھائے، وہ گردن جھٹک کر اپنا کام مکمل کرنے لگی، البتہ نعیمہ کو ایک موضوع مل گیا تھا، جس پر وہ گھنٹوں بے تکان بول سکتی تھیں، ان کا ہر جملہ ردابہ کے چہرے پر مایوسی پھیلا رہا تھا، ایسے میں باہر جانے کی اجازت انہیں مزید تاؤ دینے کے مترادف تھی، ہائم ابھی تک باہر نہیں نکلا تھا، ردابہ اُسے دیکھنے کے لیے اٹھی تھی جب نعیمہ نے ہانک لگائی۔

''ردابہ۔ رات کو دال خشکہ بنا لینا، بہت دن ہو گئے دال نہیں پکی۔ گوشت کے تو نام سے بھی ابکائی آ رہی ہے، اور ہاں، چاول اچھی طرح دھو لینا پتا نہیں کیسے کیمیکل لگاتے ہوں گے۔''

تانیہ کام کرتے ہوئے استہزائیہ مسکرائی تھی، ردابہ کے مرے قدم کمرے کے بجائے کچن کی جانب مڑے تھے۔

''چاولوں میں پانی ذرا دھیان سے ڈالنا۔'' نعیمہ کی مسلسل ہانک کچن میں جا رہی تھی۔ ''پچھلی بار بھی بیٹھ گئے تھے، ذرا جو اچھے لگے ہوں۔ کھانا بھی ڈھنگ کا پکانا نہیں سکھایا فریدہ نے، باتیں تو بہت کیا کرتی تھی۔'' نعیمہ کہہ کر دوسرا چینل دیکھنے لگیں۔

ذیاج خاصے اہتمام سے تیار ہو کر کف لنکس بند کرتا کمرے سے نکلا۔ نگاہ سامنے صوفے پر بیٹھی چاول صاف کرتی ردابہ پر گئی آنکھوں میں ابھرتی حیرانی لہجے میں در آئی تھی۔

''تم ابھی تک فارغ نہیں ہوئیں، اور اب یہ کیا کر رہی ہو۔ اٹھو تیار ہو۔''

نعیمہ نے دونوں کو باری باری دیکھا مگر چپ رہیں۔

''امی ہم ذرا باہر جا رہے ہیں دیر ہو جائے گی۔ زارا بھابھی سے کہیں کھانا وہ بنا لیں۔'' اس سے پہلے نعیمہ کچھ کہتیں ان کے سامنے ردابہ اچھی بننے کے چکر میں خود ہی بول پڑی۔

''کھانا کھا کر چلتے ہیں، بس، میں تھوڑی دیر میں بنا لیتی ہوں۔''

وہ غصیلی نگاہ اس پر جما کر بولا۔

''میں نے کیا کہا تھا، کھانا باہر کھائیں گے۔''

نعیمہ نے دونوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا ردابہ ساس کے جواب کے انتظار میں تھی تانیہ البتہ بول پڑی۔

''چلی جائیں بھابھی، ایسی آفر روز روز نہیں ملتیں۔''

نند کی حمایت سے اسے کچھ حوصلہ ہوا، اس سے پہلے کہ وہ پرات کچن میں رکھنے کا ارادہ کرتی نعیمہ نے

چینل سرچنگ کے دوران پہلو بدلتے کہا۔
''وہ نہیں جانا چاہ رہی، تو نے ضرور لے کر جانا ہے اُسے۔''
وہ ملتجی نگاہ سے اسے دیکھتی منہ میں بدبدائی۔
''پھر کسی دن۔''
ہائم کی نگاہ میں خفگی کے ساتھ تندی بھی تھی، اس نے ایک نگاہ گاڑھ کر اُسے دیکھا تھا، اور تیزی سے باہر کی جانب یہ کہتے نکل گیا۔
''اوکے۔ واپسی پر مجھے دیر ہوجائے گی۔''
ردابہ کا دل مٹھی میں سمٹ کر پھیلا۔ نعیمہ آرام سے دوسرا چینل لگا کر بیٹھ گئیں، جہاں اب کوئی حقیقتاً ڈرامہ ہی چل رہا تھا۔

☆☆☆

وہ رات کو بہت دیر سے واپس آیا، تب تک سب اپنے ٹھکانوں پر ٹک گئے تھے، وہ کاؤچ پر اس کی بہت دیر سے منتظر بیٹھی تھی، سو طرح کے وہمے اسے ستا رہے تھے، اسے دیکھتے ہی جان میں جان آئی، اٹھ کھڑی ہوئی۔
''کہاں تھے..... اتنی دیر کردی۔''
''تمہیں مطلب..... جہاں بھی تھا۔''
وہ بیڈ پر بیٹھ کر جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔
''کیا مطلب.....؟'' ردابہ کو اچنبھا ہوا۔ ''میں پریشان ہورہی تھی، دل گھبرا رہا تھا میرا۔''
''تو کچن میں بیٹھ جاتیں، اپنی من پسند جگہ، افاقہ ہوتا۔''
اس نے بوٹ اتار کر جرابیں اتاریں، پھر بوٹ اٹھا کر شوریک میں رکھ کر نائٹ سوٹ نکالنے لگا، وہ پیچھے آکر کھڑی ہوگئی۔
''آپ ناراض ہیں؟''
''نہیں، بہت خوش ہوں۔ اپنی بیگم کو ڈیٹ پر لے جارہا تھا، کسی نازیبا حرکت کے خوف سے اس نے میرے ساتھ جانے سے انکار کردیا۔''
وہ کہہ کر سائیڈ سے ہو کر نکلنے لگا، ردابہ نے اس کی کہنی تھام لی۔
''آپ کیوں نہیں سمجھتے ہائم، امی کو یہ سب اچھا نہیں لگتا۔''
''ایک منٹ۔'' اس نے اسے روکا۔ ''وہ میری ماں ہیں، میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں، انہیں کیا اچھا لگتا ہے کیا برا۔ یوں کیوں نہیں کہتیں تم میرے ساتھ جانا ہی نہیں چاہتی تھیں۔''
''ہائم۔''
اس کے عنصیلے لہجے پر اس کی دبی دبی آواز نکلی، نازک گرفت کہنی پر سخت ہوئی۔
''کیا ہائم.....'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ذرا سا اس پر جھکا۔ ''تم پہلے ہی جانے سے انکار کررہی تھیں، پچھلے ہفتے بھی میں نے آؤٹنگ کا پروگرام بنایا، تب بھی تم نے بھابھی کی طبیعت کا بہانہ کردیا تھا۔''
''تب واقعی زارا بھابھی کی طبیعت خراب تھی، اور آپ کو پتا تو ہے، ثمرین آپی نے بھی آنا تھا اس شام۔'' ردابہ سچ کہہ رہی تھی لیکن ہائم آج کچھ ماننے تب ناں۔
''سب بہانے ہیں تمہارے جب ہنی مون کا پروگرام بنایا تھا، تب..... تب کیا تھا..... تب بھی تم نے انکار کیا تھا ناں۔ بہت ڈر لگتا ہے تمہیں پہاڑوں سے، خوف آتا ہے۔ روز ایکسیڈنٹ ہورہے ہیں، آدھے نئے شادی شدہ جوڑے تو پہاڑوں پر ہی مرچکے ہیں اب تک۔''
وہ جتاتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا، اور ردابہ کی سانس جیسے اندر کہیں گم ہوگئی، اس کے سامنے تین ماہ پہلے کی نعیمہ مجسم آکھڑی ہوئیں۔
نئی نئی شادی کے بعد ہائم کی چھٹیاں ابھی رہتی تھیں، اس نے عام سے انداز میں نادرن ایریاز جانے کا ذکر کیا تھا، نعیمہ بیٹے کے سامنے تو کچھ نہیں بولیں۔
''مرضی ہے۔'' کہہ کر بات ٹال دی، لیکن ردابہ کے سامنے اگلے دن ہی خوب جتا جتا کر کہا تھا۔
''ہمارے خاندان میں تو کبھی کوئی بہو، لور لور

نہیں پھری، سب کے ماں باپ اپنے گھر سے دل بھر کر بھیجتے ہیں۔ کہیں سسرال جا کر حسرتیں نہ کھول کر بیٹھ جائیں۔ بندہ موسم ہی دیکھ لیتا ہے، کیسی برف باری پڑ رہی ہے، سڑکیں بند، رستے بند، روز گاڑیاں پھسل رہی ہیں، کچھ ہو جائے، کسی کا کیا جائے گا، میرا تو جوان بچہ ہے۔''

لمحہ بھر کے لیے ردابہ کا دل رک کر دھڑکا تھا۔

''مرضی ہے تم دونوں کی، جہاں مرضی آؤ جاؤ۔ میں تو خیر کی دعا ہی مانگ سکتی ہوں۔''

پھر ردابہ نے اپنے طور پر ہی انکار کر دیا تھا، ہائم نے اصرار بھی کیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''مجھے پہاڑی سفر سے ڈر لگتا ہے۔ کتنے خطرناک موڑ ہوتے ہیں، پھر کبھی چلیں گے۔''

''کیوں پھر پہاڑوں کے موڑ نکل جائیں گے۔''

''ہائم پلیز۔''

''کیا پلیز۔ اب میری چھٹیاں ہیں، اتنی فرصت پھر تھوڑی آئے گی یار۔''

بہت سی منتوں پر بھی وہ مان کر نہ دی، اس کے اندر نعیمہ سے ملنے والے طعنے کا خوف تھا۔ اور اس وقت ہائم ہر بات سے انجان اسے کٹیلے انداز میں جتا رہا تھا۔

''ایکچوئلی۔ میڈم ردابہ۔ آنا جانا تو درکنار، تمہیں میں پسند ہی نہیں تھا، تم صرف اپنے گھر والوں کے فیصلے کو نباہ رہی ہو۔ یاد ہے ناں، یونی میں کتنا آگے پیچھے پھرا تھا، کیسے کیسے منتیں کی تھیں تمہاری۔ اب اتنا بھی بے اعتبار نہیں تھا، ساتھ پڑھ رہے تھے، لڑکیاں جان دینے کو تیار تھیں، تم نے تو ایڈریس تک نہیں دیا تھا، آج کل کی لڑکیاں اتنے بھی نخرے نہیں دکھاتیں۔''

وہ منہ وا کیے اس کا ستا چہرہ دیکھے گئی۔ آنکھوں میں تحیر سے پانی سمٹنے لگا اُس کی مضبوط کہنی پر گرفت ڈھیلی پڑتے پھسلتا ہاتھ کلائی پر جا رکا۔

''مجھے اس گھر میں آپ کے ساتھ ساتھ باقیوں کی بھی مرضی دیکھنی پڑتی ہے، ضروری نہیں جو آپ چاہ رہے ہیں باقی بھی چاہ رہے ہوں۔''

صدمے سے اس کی آواز بالکل رندھ گئی، نمکین گھونٹ گلے میں انڈیلا، گھنی سیاہ پلکیں زور سے جھپک کر نمی اندر ہی روکنی چاہی۔

''میرے سر پر باپ نہیں ہے ہائم۔ یہاں پر کسی بھی اختلاف کی صورت میں، میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں میرا میکا میری کتنی سپورٹ کرے گا۔ جن لڑکیوں کے سر پر باپ نہیں ہوتے وہ سب کشتیاں جلا کر سسرال کنارے اترتی ہیں۔''

اس کی آنکھوں میں تیرتے آنسو دیکھ کر پل بھر میں ہائم کا لہجہ انداز دونوں بدل سے گئے۔

''ایک تو یہ عورتوں کے آنسوؤں والے ڈرامے۔'' ہائم نے سوچتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا نائٹ ڈریس بیڈ پر پٹخا، اور اس کے دونوں شانے مضبوطی سے پکڑ لیے۔

''باپ کا سر پر موجود ہونا باپ کے گھر تک ہوتا ہے، اب تم اپنے شوہر کے گھر ہو، اور میں موجود ہوں، مجھ پر اعتبار نہیں ہے کیا۔''

وہ گردن جھکائے اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

''باپ بے اعتبار ہو بھی جائے، چھت نہیں چھینتا۔ شوہر بے اعتبار ہو جائے چھت لمحے میں گر جاتی ہے۔''

''پاگل ہو گئی ہو کیا۔'' لاشعوری طور پر اس کے شانوں پر ہائم کی گرفت بہت مضبوط ہو گئی۔

''بہت محبت کرتا ہوں تم سے، پاگل نہیں ہوں الٹی سیدھی باتوں میں آ جاؤں گا۔ سب نظر آتا ہے مجھے، امی کا رویہ، تمہاری بوکھلاہٹ، تم جب سب کے سامنے منمناتی پھرتی ہو ناں بہت غصہ آتا ہے تب، بہت شوق ہے نوکرانی بننے کا۔ جب میں ان سے بات کر چکا تھا، تم بیچ میں کیوں بولیں۔ انہوں نے تو ابھی کچھ کہا ہی نہیں تھا، اگر وہ کہتیں میں دیکھ لیتا، تمہارا بولنا ضروری تھا کیا؟''

''ہائم مجھے آپ کی امی سے بہت ڈر لگتا ہے، وہ بات بے بات خفا ہو جاتی ہیں۔''

اس کے آہستگی سے کہنے پر وہ مسکرا دیا، معانی خیز دیکھتے بولا۔

''میاں کے موڈ سے ڈر نہیں لگتا؟'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ہائم کی مسکراہٹ دلفریب ہو گئی۔

''تو مائی ڈیئر، امی سے بھی نہ ڈرا کرو۔ اُن کی خفگی کی وجہ میں جانتا ہوں، اور ویسے بھی تم اس گھر میں میری ضد پر آئی ہو، بس اسی لیے انہیں تم پر جلد غصہ آجاتا ہے، مگر کچھ کہتیں تو نہیں ناں، اگر کہتی ہیں تو بتاؤ، میں خود ہنڈل کرلوں گا، تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں تمہارے ساتھ ہوں، آج، کل، ہمیشہ، پلیز، پلیز ردابہ۔ میرا یقین رکھو یار۔''

اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

''چلو اب جاؤ منہ دھو کر آؤ۔ سرخ آنکھوں والی خوف ناک چڑیل لگ رہی ہو۔''

''تم بھی غصے میں پورے بھوت لگتے ہو۔'' وہ کہہ کر مسکراتی واش روم کی جانب بڑھ گئی تھی تب پیچھے سے ہائم کی ہانک آئی تھی۔

''اور اس بھوت نے چڑیل سے شادی ہونے پر سونفل پڑھے تھے۔ مجھے ان نفلوں سے بہت عقیدت ہے، یار۔ ہمیشہ یاد رکھنا۔''

☆☆☆

ذیاج منہل کا انداز کئی دن سے محسوس کر رہا تھا، کچھ خاموشی سی تھی، کسی بھی بات کا چند لفظوں میں جواب دے کر اٹھ جاتی، اس نے جاننے کی بہت کوشش کی، مگر وہ ٹالتی رہی تھی، بتانے کو کچھ خاص تھا بھی نہیں بس ماں کی وارننگ، ان کے خوف، خدشے، حالانکہ اس روز نانو نے بہت دیر اس کی سائیڈ لی تھی، یہاں تک کہ ردابہ کو ہی پاس سے اٹھنا پڑا، اور فریدہ نے منہل کو پاس بٹھا کر اچھی طرح سمجھایا تھا۔

''جب تک میں زندہ ہوں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اور اپنی ماں کے مزاج کو چھوڑو، مجھے بتاؤ اس لڑکے کے بارے میں میں خود پتا کرواتی ہوں۔''

پھر وہی تفصیل، کون ہے، کہاں رہتے ہیں، ماں باپ، بہن بھائی۔ اتنی تفصیل تو خود وہ بھی ذیاج کے بارے میں نہیں جانتی تھی۔ بات پڑھائی لکھائی کے معاملات سے ہو کر ایک دوسرے کے مزاج آشنائی تک ٹھہر گئی۔ اور ایسا قطعاً نہیں تھا کہ وہ ذیاج سے اس کی فیملی کے بارے میں پوچھے تو وہ بتانے سے گریز کرتا، بلکہ اس نے اپنے بڑے بہن بھائی سے ایک دو بار یونی میں ملوایا بھی تھا، اچھے سلجھے ہوئے لوگ لگے تھے، منہل نے مزید کریدا تو اس لیے نہیں کی، پھر وہ بھی تو اس کے بارے میں ویسے ہی پوچھتا، تو کیا بتاتی۔ ایک ماں اور ایک نانو، وہ نانو کے گھر کب سے ہے..... کیوں ہے..... باقی فیملی..... بس انہی سوالوں سے بچ بچا کر اگر ذیاج مل جائے تو غنیمت۔ لیکن ایسا بھلا کب ہوتا ہے، بہتر حل کے طور پر یہی تھا وہ خود اُس سے کنارہ کش ہو، اور وہ ہونا شروع ہو گئی تھی۔

لیکن یہ ضروری تھوڑا ہوتا ہے ایک شخص کنارہ کرلے تو دوسرا بھی اپنا رخ بدل لیتا ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ قریب ہونے لگا۔ اور اس دن کلاس کے بعد وہ اس کے ساتھ ساتھ تھا، اور ایک ہی اصرار۔

''بتاؤ مجھے، آخر بات کیا ہے، میری جانب سے امان نے کچھ کہہ دیا، یا میری ہی کوئی بات تمہیں بری لگی۔''

''نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ بس کچھ پرسنل پرابلمز ہیں۔''

وہ دونوں بات کرتے ہوئے گراونڈ میں ایک جانب کچھ فاصلہ رکھتے ہوئے بیٹھ گئے، ذیاج اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔

''تم اپنے پرسنل، مجھ سے شیئر کرنے سے ڈرتی ہو؟''

وہ یک دم سے بولی۔

''نہیں تو۔'' لہجے میں ان دیکھا سا خوف ہلکورے مارتا تھا، جس پر ذیاج پھیکا سا ہنسا۔

''پھر لہجہ خوف زدہ کیوں ہے؟''

منہل اسے دیکھتے ہوئے پل بھر رکی، پھر اعتماد سے بولی۔

''تم میرے ماضی، میری فیملی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے، ہوسکتا ہے وہ سب تمہیں پتا چلے تم خود ہی راستہ بدل لو۔''

''منہل میں حال میں جینے اور مستقبل پر نگاہ رکھنے والا انسان ہوں، مجھے تمہاری فیملی یا ماضی میں جھانکنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے اور میری فیملی بھی اسی قسم کی ہے، انہیں ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہیں پتا ہے میری بہن نے خود دادی سے کہہ کر پھوپھو کے گھر منگنی کروائی ہے، اور میرے بھائی کا رشتہ صرف مما نے دیکھا تھا، پسند بھائی نے ہی کیا، نہ کسی نے ان کے خاندانوں کو کھنگالا، نہ ہی رشتہ داروں کو۔''

''لیکن میری مما اس معاملے میں بہت پوزیسو ہیں۔'' اس نے گہرے انداز میں کہا۔ ''اول تو وہ مجھے خود سے دور کرنے کے حق میں ہی نہیں ہیں، اور اگر ایسا کرنا پڑا تو شاید بہت چھان بین کریں۔''

ذیاج نے جکڑے ماحول کو کچھ ہلکا کرنے کے لیے ہنس کر کہا۔ ''تو کرنے دو، خدا کی قسم مجھ میں کچھ ایسی بیماری نہیں نکلے گی، جس سے ان کی بیٹی کو کوئی خطرہ لاحق ہوسکے۔''

منہل نے اسے زور سے گھورا تھا۔

''ایک کام کرتے ہیں، تم کسی طرح میری ان سے ملاقات کروادو، عین ممکن ہے، میں پہلی نظر میں ان کے دل میں اتر جاؤں۔''

یہ بھی انسان کی خوش فہمی ہی ہوتی ہے، وہ پہلی نظر میں کسی کے دل میں اتر جائے، یہ بھی تو ممکن ہے، وہ دل سے اتر ہی جائے۔ بہر حال، اس وقت منہل اس کی بات پر غور کررہی تھی، ممانہ سہی کم از کم نانو سے تو اس کی ملاقات کرواہی سکتی ہے۔ لیکن اب اسے وہ وقت دیکھنا تھا جب مما سے چوری ایک بار اسے نانو سے ملوادے۔

☆☆☆

چاند روشن حلقے کو ساتھ لیے آسمان پر کچھ اوپر آچکا تھا، رات کا سناٹا ہر طرف چھانے لگا، لیکن اس سناٹے میں چاند کی روشنی شیشے کی کھڑکی سے پردے پر گرتی اچھی لگ رہی تھی۔ موسم بدلنے پر اس پہ خنکی بھی بڑھنے لگی تھی۔ وہ بیڈ پر لیٹی کئی کروٹیں بدل چکی تھی۔ اس کی ہر کروٹ پر ہائم اُسے گھور کر دیکھتا۔

''کیا مسئلہ ہے؟''

اس نے پہلے منہ لٹکایا پھر بولی۔

''ہائم، مجھے نیند نہیں آرہی۔''

''جاؤ کچن میں جا کر لیٹ جاؤ اپنی فیورٹ جگہ۔ آجائے گی۔''

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' لہجہ اکتاہٹ بھرا تھا

''تو میں کون سا جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ میاں سے زیادہ تو تمہیں کچن سے محبت ہے۔''

''کافی پیو گے؟'' اس کی مٹھاس بھری آفر پر وہ بلا لحاظ بولا۔

''ہاں، مگر بنانے نہیں جاؤں گا۔''

''پلیز بنالاؤ۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ پلیز پلیز۔''

اس دن دال خشکہ بنا کر وہ بہت دیر کھانے پر ہائم کا انتظار کرتی رہی تھی، ایک تو وہ بہت لیٹ آیا تھا، اور جب آیا تو موڈ ایسا نہیں تھا کہ کھانے کی بات کرتی، وہ پہلے ہی اُسے کھانے کو پڑ رہا تھا، مگر سوتے سے پہلے معافی تلافی، اقرار، محبت سب ہو چکا تھا، لیکن اس سب میں کھانا کہیں گم ہوگیا، جو رات کے دوسرے پہر شدت سے بھوک کا احساس جگا رہا تھا، ہائم نے اس سے سرسری انداز میں استفسار کیا۔

''تم نے کھانا نہیں کھایا تھا؟''

''نہیں میں آپ کا ویٹ کرتی رہی۔ آپ نے کھایا؟''

''ہاں بہت خوش کر کے بھیجا تھا ناں، دعوت اڑانے ہی تو گیا تھا۔''

معافی ہو جانے کے بعد بھی اپنا پروگرام خطا ہونے کا قلق ہائم کے دل سے ابھی نکلا نہیں تھا۔ جل

بھن کر بولا۔

''اکیلا کھوتوں کی ضیافت اڑاتا۔ تم بھی ناں۔ سچ میں مجھے بہت غصہ ہے، تمہارے انکار پر۔''

''سوری بول تو دیا۔''

''پھر میری جانب سے بھی سوری سے پیٹ بھر لو، اور دوسری جانب منہ کر کے سو جاؤ۔'' وہ جھنجلا کر بولا، کیوں کہ بھوکا وہ بھی تھا، بہت دیر ادھر اُدھر گاڑی بھگاتا رہا جب غصہ اتر گیا گھر آ گیا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

''چلو اٹھو، کھانا لے کر آؤ۔ مجھے بھی بھوک لگی ہے۔''

''پلیز۔ آج آپ لے آئیں۔ صرف کافی بنا لائیں، بسکٹ ڈرا میں رکھے ہیں، وہی کھا لیں گے۔ پلیز.....''

''میری تمام تر انفارمیشن میں بیوی کے عہدے پر صرف تم فائز ہو، میں نہیں۔ اور اچھی بیویاں شوہروں کے لیے ٹرے سجا کر لاتی ہیں۔ اٹھو شاباش اٹھو، اور اچھا سا کچھ بنا کر لاؤ، تاکہ آؤٹنگ کینسل ہونے کا کچھ تو کفارہ ہو۔''

''ہاں تو لاتی ہوں نا، لیکن آج آپ لے آئیں، لائٹ گئی ہوئی ہے، کچن کا یو پی ایس کا بلب خراب ہے، مجھے ڈر لگتا ہے پلیز۔''

اس کے ملتجی انداز پر اس نے مصنوعی خفگی سے دیکھا۔

''اتنے لمبے چوڑے میاں سے ڈر نہیں لگتا، ننھے منے کاکروچ، چھپکلیوں سے ڈرتی ہو۔''

''پلیز زز۔'' وہ منمنائی

وہ کمفرٹ پھینک کر اٹھا۔ ''لڑکی اگر تمہاری ساس نے دیکھ لیا نا۔ حسبِ معمول تم فوراً مکر جاؤ گی۔ مگر میں بھی اعلانیہ کہوں گا آپ کی بہو روز راتوں کو کھانے بنوا کر مجھ غریب پر ظلم کرتی ہے۔''

وہ زور سے کھلکھلائی تھی، اور ہائم گھور کر باہر نکلا تھا۔

''ویسے امی ٹھیک کہتی ہیں، میں اچھی خاصی لکی ہوں، مجھے ہائم جیسے شوہر کا ساتھ نصیب ہوا، غصہ کرتے ہیں لیکن جلد بھلا بھی دیتے ہیں۔''

وہ اکیلے میں سوچتے ہوئے آپ و آپ ہی مسکراتی خود پر فخر کر رہی تھی، آنکھوں میں استحقاق کا ناز خود بخود آ بسا تھا۔

وہ کچھ دیر بعد ہی ٹرے لیے کمرے میں آیا، پہلے تو ہاتھ میں ٹرے دیکھ کر حیرت ہوئی پھر ٹرے میں رکھے کافی کے دو مگ کے ساتھ سینڈوچز۔

''یہ..... یہ..... آپ نے خود بنائے ہیں۔''

''نہیں۔'' وہ جل کر بولا۔ ''من وسلویٰ کاؤنٹر پر رکھا تھا، ایک آواز آئی، بیٹا اٹھاؤ، اندر کمرے میں لے جاؤ۔'' اس نے پلیٹ اسے پکڑاتے کہا۔ ''کھاؤ اسے، لڑائی ناراضی اپنی جگہ، مگر کھانا کھائے بغیر آئندہ مت سونا۔ میں کلمہ پڑھ پڑھ کر تھک گیا آخر زلزلہ رک کیوں نہیں رہا، کروٹیں بدلنے کی بھی حد ہوتی ہے یار۔''

ردابہ نے سینڈوچ کا کونا کترتے مصنوعی اداکاری کی۔

''ہونہہ بدمزا۔''

''تمہارے تیار کردہ ملغوبوں سے تو بہت بہتر ہے، ابلیس خود میرے کان میں آ کر یاد کرواتا ہے، بھائی بسم اللہ پڑھ لے، میں تیرے ساتھ نہیں کھا سکتا۔''

''ہائم۔''

اس کے چلانے کو ہائم نے بے حد محظوظ کیا تھا، کچھ دیر پہلے کی خفگی یاد بھی نہیں تھی، کس بات پر جھگڑ رہے تھے، فی الوقت دونوں اس خوب صورت لمحوں میں ڈوبے ہوئے تھے، اور بہت دیر تک ڈوبے رہے۔

☆☆☆

وقت اپنی چال چل رہا تھا، شاطر لمحے کس خاموشی سے وار کرتے اپنی جگہ بناتے رہتے ہیں، آسانی سے سمجھ میں آتے بھی نہیں، اترتی شام کے ٹھنڈے سے پہر ہائم گھر میں تھکا تھکا سا داخل ہوتا، وہ ہلکی پھلکی سی تیار اس کی منتظر ہوتی، اسے چائے پانی دے کر کچن میں مصروف ہو جاتی، وہ اکثر ہی جھلا جاتا تھا۔

''کوکنگ میرے آنے پر ہی کرنی ہوتی ہے۔''

وہ خاموش نگاہ سے دیکھتی رہ جاتی تھی، کیوں کہ ضماد بھائی کچھ لیٹ آتے تھے، ہائم شام کو۔ رات کا کھانا

شام میں بننا شروع ہوتا تو رات کو کھایا جاتا۔ ہائم نے کئی بار نعیمہ سے شکوہ بھی کیا مگر وہی ان کی تلخ مزاجی۔

''بوڑھی بیوہ ماں ہوں ناں، اسی لیے تو باتیں بنانے آجاتا ہے، سارا دن زارا اکیلی لگی رہتی ہے، وہ تو کبھی نہیں بتایا ہوگا تیری بیگم نے، لگ گیا نہ اس کے پیچھے۔ خود معصوم بنی جی جی کرتی رہے گی، تجھے برا بنانے کے لیے میرے پاس بھیج دیتی ہے۔''

''امی اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ میں خود کہہ رہا ہوں۔''

''ہاں ہاں بس سب پتا ہے مجھے۔ جن سے شروع کے معاشقے چل رہے ہوں ناں وہ آتے ہی پہلے ماں بیٹے کو لڑواتی ہیں، تاکہ الگ ہوں، میکے والوں کو بسائیں۔ اُسے اپنی اکیلی ماں کا خیال ہے۔ تجھے شرم نہیں آتی، اپنی ماں سے لڑتے۔۔ عشق نے پٹی باندھ رکھی ہے۔ پتا نہیں کیا گھول کے پلا دیا۔''

اس دن ہائم نے صرف اتنا کہا۔

''امی کھانا سب کا الگ الگ کردیں، جسے جب سہولت ہو، جیسا کھانا ہو، اپنا بنالے۔''

اس بات پر نعیمہ نے اتنے لتے لیے کہ وہ خود ششدر رہ گیا، ردابہ نے الگ ہاتھ جوڑے تھے۔

''خدا کے واسطے ہائم، میں اپنے ساتھ اپنی ماں کی توہین برداشت نہیں کرسکتی۔ اور میرے کریکٹر پر انگلی اٹھے یہ تو بالکل بھی نہیں آپ مجھے بہت اچھی طرح اور بہت پہلے سے جانتے ہیں۔''

بے چارہ کیا کہتا۔ جانتا تو ماں کو بھی تھا، مگر کر کچھ نہیں سکتا تھا۔ کس مصیبت سے تو شادی کے لیے راضی کیا تھا۔ نعیمہ عادتاً بہت ضدی فطرت کی تھیں، اپنی بات ہمیشہ اوپر رکھنے کی عادی۔ جب ہائم نے پہلی بار ردابہ کا ذکر کیا تھا، اس کے منہ سے اس کی پسند کا سن کر ہکا بکا رہ گئی تھیں۔

''کیا مطلب ہے۔ تو یونیورسٹی پڑھنے جاتا ہے یا لڑکیاں تاڑنے۔''

''اوہو امی، اب آنکھیں بند تھوڑا ہوتی ہیں، آپ ایک بار جائیں تو سہی، وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف ہے۔''

''کیوں۔ ناک منہ کے بجائے ماتھے پر لگی ہے، یا چار پانچ بازو ہیں اس کے۔''

''استغفر اللہ امی۔ ایسا خطرناک نقشہ تو مت کھینچیں۔''

زارا بھابھی کی پھس پھس ہنسی تانیہ کو ناگوار لگی تھی۔ اس نے بھائی کی طرف داری کھل کے کی تھی۔

''بھائی کہہ رہے ہیں ایک بار جا کر دیکھ آئیں، ہوسکتا ہے آپ کو بھی پسند آجائے۔''

''نہ کیوں جاؤں میں۔ کیوں دیکھوں۔'' وہ اپنی ضد پر قائم تھیں۔

''اس لیے کہ شادی بھائی کی ہے، زندگی انہوں نے گزارنی ہے، ان کی مرضی شامل ہونی چاہیے۔''

''اچھا!!!!.....''

نعیمہ کو اچنبھا ہوا۔ ''جب ذرا سا تھا، لنگوٹ اس سے پوچھ کر بدلتی تھی، اس سے رائے لے کر نہلاتی تھی، دھونا دھلانا، کھانا پینا اس کی مرضی سے کرتی تھی۔ تب اس کی زندگی نہیں تھی کیا، جو اب اپنی زندگی کا مالک بن گیا۔''

''حد کرتی ہیں آپ بھی امی۔'' وہ کھسیا گیا۔

''تب میں چھوٹا تھا، مگر اب بڑا ہوگیا ہوں۔''

''کتنا بڑا ہوگیا، مجھ سے بڑا ہوگیا یا سارے کنبے سے بڑا ہوگیا۔ جو اپنے لیے لڑکی بھی خود پسند کرلی، باقی سب تیرے بڑے تو مر گئے۔'' بہت دیر بحث کے بعد وہ تپ کر بولا تھا۔

''میں شادی کروں گا تو صرف ردابہ سے..... نہیں تو.....''

''جا پھر نہیں تو، والی بات کرلے۔''

نعیمہ نے اس کے ہاتھوں بلیک میل ہونے کے بجائے کہہ کر صاف ہاتھ جھاڑ لیے۔

''ٹھیک ہے، پھر میں شادی نہیں کروں گا۔'' اس نے اٹل انداز میں کہا تھا۔ ''میرے لیے رشتے دیکھنے بند کردیں۔''

نعیمہ نے زارا کو غیر برادری سے مگر خود پسند کیا تھا،

ضماد نے فرماں برداری کے ساتھ اسے قبول کیا، حماد (دوسرے نمبر والا بیٹا) آسٹریلیا میں اپنی فیملی سمیت سیٹل تھا۔ شادی سے پہلے بھی وہاں گئی سال سے تھا، مگر شادی اپنی ماں کی پسند سے کی، اور بیوی کو ساتھ لے گیا۔ بڑی بیٹی ثمرین کا برانہوں نے خود ڈھونڈا تھا۔ اب ہائم کی دفعہ ماں کی پسند میں کیڑے پڑ گئے تھے یا آنکھوں میں جالا اتر آیا، جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں یونی جاتے اور چلا ہے لومیرج کرنے۔ نعیمہ کو بمشکل دونوں بیٹیوں نے راضی کیا تھا، اور جب پتا چلا ردابہ عباس حسین کی بیٹی ہے نعیمہ کو ایک بار پھر طیش آیا تھا، دل چاہتا تھا گن گن کر سارے بدلے لیں۔

☆☆☆

عباس حسین اور انصر (ہائم کے والد) دور پار کے رشتہ دار تھے، بہترین دوست اور کولیگ بھی۔ گھروں میں بے تکلفی سے آنا جانا تھا۔ عباس حسین کو شہر میں نئی بننے والی آبادی کا پتا چلا تھا۔ خاصی کم قیمت میں پلاٹ مل رہے تھے۔ ان کے پاس اتنی رقم نہیں تھی، اکیلے دس مرلے کا پلاٹ خرید لیتے۔ ڈاک کے محکمے میں کلرک ہی تو تھے، انہوں نے انصر سے بات کی تھی۔ تب انصر کے بچے بھی کچھ بڑے ہو رہے تھے، گھر میں تنگی کے سبب ذاتی گھر کی خواہش ایک فطری عمل ہے، دونوں نے مل کر پلاٹ لے لیا۔ انصر کو عباس پر پورا اعتماد تھا۔ پلاٹ کی رجسٹری کے وقت انصر کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی سو انہوں نے خود ہی عباس سے کہہ دیا تھا۔

''فی الحال تم اپنے نام پر کروالو۔ جب تعمیر شروع کریں گے تب دیکھ لیں گے۔''

وقت گزرتا گیا، اس علاقے میں تیزی سے ترقیاتی کام ہوئے، خوش قسمتی سے ہائی وے سڑک کی منظوری بھی قریب سے ہوگئی، پلاٹ کی قیمت دو سالوں میں چار گنا بڑھ گئی، تبھی عباس نے انصر کو بتایا تھا۔

''میں سوچ رہا ہوں اپنا پلاٹ بیچ کر بنا بنایا گھر خرید لوں، تمہاری رقم بھی ادھار لے رکھی ہے اس کی بھی ادائیگی ہو جائے گی۔''

انصر سن کر ششدر رہ گئے

''ادھار۔ ہمارا تو آدھا آدھا حصہ تھا۔''

''آدھے آدھے کی کب بات ہوئی تھی۔''

عباس بالکل ہی انجان بن گئے۔ ''میں نے تو کہا تھا، رقم کچھ کم پڑ رہی ہے، تم ڈال دو، میں بعد میں پوری کر دوں گا۔ اسی لیے رجسٹری میرے نام ہوئی تھی۔ اب تم عجیب بات کر رہے ہو۔ اچھے دوست ہو بھئی۔''

عباس کے وثوق پر انصر کو بہت دکھ ہوا تھا، دونوں میں تھوڑی بہت بحث ہوئی، انصر کی نسبت عباس کچھ جھگڑالو فطرت کے تھے۔ انصر وضع دار، چپ کر گئے۔ بات نعیمہ تک بھی پہنچ گئی۔ میاں تو چپ ہو گئے، مگر ان سے اپنی، اپنے بچوں کی حق تلفی کسی صورت برداشت نہیں تھی۔ وہ عباس کے گھر جا کر خوب لڑ جھگڑ کر آئی تھیں۔ فریدہ خود اپنے میاں کی اس حرکت پر بہت شرمندہ تھیں۔ فریدہ کے سمجھانے اور نعیمہ کے روز فون پر لڑنے بھڑنے کا عباس پر اتنا سا اثر ہوا پلاٹ سیل کرنے کے بعد بھلے قسطوں میں مگر آدھے حصے کی جائز رقم بمشکل دے دی تھی۔

تعلقات میں بے اعتباری کا ننھا بیج پہلے اعتماد کو گھائل کرتا ہے، پھر تلخ کلامی رنجش کی راہ ہموار کرنے لگتی ہے۔

ایسا ہی تب ہوا تھا، زبان سے رنجش کا اظہار پھوٹا آنکھوں میں ناراضی اجنبیت کو جگہ دینے لگی، جب کبھی ملاقات ہوتی دونوں اجنبی بن کر بیٹھ جاتے۔

ایک ٹریفک حادثے میں انصر کا انتقال بہت جلد ہو گیا تھا، نعیمہ اپنے بچوں کو لے کر میکے چلی گئیں، کبھی کبھی کی ملاقات بھی ختم ہو گئی بچے جوان ہونے پر واپس اسی شہر میں آ گئیں، جب تک سب اپنے کاروبار زندگی میں مصروف ہو گئے تھے۔ نازیہ کے بیٹے کے ولیمے پر بہت عرصے بعد سب سے ملاقات ہوئی، اور وہی ملاقات ہائم کے پرپوزل کا سبب بنی تھی۔ مگر اس سب کے لیے نعیمہ کو جیسے ہائم نے راضی کیا تھا وہ ہی جانتا تھا۔

ردابہ نے بہو بن کر آنگن میں جگہ تو بنالی تھی، مگر

نعیمہ کے دل پر جو پُر خاش عباس کی ٹوٹی پھوٹی ادائیگی نے ڈالی تھی۔ وہ اپنی جگہ آج بھی موجود تھی، اوپر سے اُسی بے اعتبار شخص کی بیٹی کو دیکھ کر سب سے لاڈلے بیٹے کی آنکھوں کے جلتے محبت کے الاؤ اُن سے کیسے چھپ سکتے تھے۔ ضماد، حماد بھی اپنی بیویوں کا بہت خیال رکھتے تھے مگر ہائم.....

ایک تو ضد پر اڑ کر مخالف کی بیٹی لایا، اوپر سے بچہ بچہ جانا۔ اور وہ بھی سج سنور کر ہمہ وقت مسکراتی رہے، نعیمہ کی برداشت کا امتحان تھی۔ ہائم چھوٹا ہونے کے سبب ماں بہنوں کے سب سے زیادہ قریب تھا، ہر بات ماں سے شروع ہو کر ماں پر ختم کرنے والا، شادی کے بعد ردابہ ہی ردابہ۔ آفس سے آ کر ماں کے پاس بیٹھ جاتا سامنے اُسے بٹھا لیتا۔ دس میں سے سات نگاہیں ردابہ کے لیے اٹھتی تھیں۔ خاموش مگر پُر شوق سراہتی ہوئی۔ حماد ملک سے باہر تھا مہینوں بعد فون کرتا، سالوں بعد آمد ہوتی، ضماد فطرتاً خاموش تھا، اگر بولو نہ تو وہ کسی کو بلائے نہ، اس کی بلا سے جو جیسے زندگی گزارے۔ ایک ہائم ہی تھا جو درد سے پہلے دوا حاضر کر دیتا تھا۔ بڑھاپے کا سہارا۔ اس کی محبوبہ بیوی نعیمہ کو ہر وقت خطرے کی طرح لگتی۔ بس ڈھیل دینے کی دیر تھی، بیٹا تو پہلے ہی لٹو بن کر گھومنے کو تیار تھا، ڈگڈگی کے بنا ہی اشاروں پر ناچنے ہی لگتا۔ انہوں نے اپنے رعب سے دونوں کو قابو رکھنا تھا۔ کچھ ردابہ کی ڈری سہمی فطرت نے ان کا رعب چوگنا کر دیا۔

انہوں نے آہستہ آہستہ ردابہ کے ذمہ تمام وہ کام لگا دیے کہ ہائم کی موجودگی میں اسے کم ہی فارغ وقت ملتا۔ اتوار کو وہ گھر ہوتا مکمل پوری نیند، ساتھ ناشتا، دو تین بار دن ڈھلتے ہی دونوں تیار ہو باہر گھومنے نکل گئے۔ شاپنگ، ڈنر، عیاشی، نعیمہ نے خاموشی سے سب برداشت کیا، پھر حل نکال ہی لیا، انہوں نے ہفتے کے بجائے واشنگ مشین اتوار کو لگوانا شروع کر دی۔ زارا بھابھی شروع سے ہی اتوار کو اپنے میکے کا چکر لگانے جاتی تھیں۔ بہت پہلے ضماد نے ہی نعیمہ سے کہا تھا۔

''امی بچے خواہ مخواہ تنگ کر رہے ہیں۔ سنڈے کو چھٹی ہے، تو کے جانا ہے۔ تفریحی جانا چاہیے۔ میری تو مان نہیں رہے آپ ہی سمجھا دیں۔''

''تو کیا ہوا بچے ہیں، روز کی روٹین سے تھک جاتے ہوں گے۔ بہت کوسوں دور جانا ہے، اسٹور پر جاتے چھوڑ آ۔ آتے وقت لے آنا۔''

امی کو بڑا بنا کر بہت طریقے سے آنا جانا اٹل ہو گیا۔

ردابہ اتوار کو ناشتا بنا کر فارغ ہوتی فوزیہ آجاتی وہ صرف کپڑوں کا پانی نتھارنے اور چھت پر پھیلانے کے لیے لگی تھی۔ مشین میں ڈالنا نکالنا، اس کا دھیان رکھنا سب ردابہ کے ذمہ تھا۔ ادھر ہائم کے اٹھنے کا وقت اُدھر مشین کی افراتفری، امی سے کچھ کہہ کر دس جواب میں سنتا تھا۔ بحث بڑھنے کے چکر میں ردابہ ہی اس کی منتیں کرتی، کہ رفع دفع کرے۔ اتوار کو اس کے پاس ذرا وقت نہیں ہوتا تھا پہلے کپڑے، پھر دوپہر کا کھانا، شام کپڑے سمیٹنے کی نظر ہو جاتی، پھر ایک ایسکیپنج پالیسی شروع ہو گئی۔ ادھر زارا بھابھی جاتیں اُدھر ثمرین آپی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ حاضر، کسی بچے کو فیڈر، کسی کو نوڈلز، پھر داماد کی آمد پر اہتمامی کھانا۔ اس کی مصروفیت دیکھ دیکھ کر ہائم اندر تک کلس جاتا تھا۔ گھر میں جلنے کڑھنے سے بہتر تھا بندہ کسی کولیگ کو مل آئے، وہ کچن میں جھانک کر صرف اتنا کہہ دیتا۔

''میں الیاس کی طرف جا رہا ہوں۔''

جواباً وہ تاسف بھری نگاہ ڈالتی رہ جاتی، کیوں کہ اسے پتا تھا اس بدمزگی میں ہونا کچھ بھی نہیں سوائے نعیمہ کی باتیں سننے کے، اور ویسے بھی ہائم ہی نے پہلی رات بہت امید سے اس کی جانب دیکھتے صرف ایک ہی فرمائش کی تھی۔

''مجھے امید ہے میری امی کی بات تم کبھی نہیں ٹالو گی۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں راضی کیا تھا، پلیز میرا مان مت توڑنا۔''

اور وہ پہلی رات کے عہد پلو سے باندھ کر بیٹھ گئی، نا چاہتے ہوئے سب برداشت کرتی رہی۔ یہ بھی شروع کی بات تھی، جب اس کی طبیعت میں واضح فرق آنے لگا تھا، چہرے پر قنوطیت، قدموں

میں نقاہت، جب اس کی طبیعت سب پر واضح ہوگئی تو ہائم کو اچھی خاصی فکر ہوئی تھی۔

''ردابہ کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، ڈاکٹر نے اسے ریسٹ کا کہا ہے، آپ فوزیہ سے فل ڈے کی بات کرلیں۔ پے میں کردوں گا۔''

''واہ.....'' نعیمہ تندی سے اسے دیکھنے لگیں۔

''صفائی فوزیہ کرتی ہے، کپڑے فوزیہ دھوتی ہے، پیچھے کام ہی کتنا رہ جاتا ہے، صرف کچن کا۔ وہ بھی اکیلی نہیں کرتی تیری بیگم۔ زارا برابر اس کے ساتھ کرتی ہے، میں نے پانچ بچے پیدا کیے، سارے گھر کے کام، بچوں کے الگ، میاں کی الگ فرمائشیں۔ کہیں تیرے باپ نے نوکر نہیں رکھے، زارا کے تین بچے ہوئے، ثمرین کے دو ہیں، کس نے باندیاں رکھ کر دیں۔''

زارا بھابھی کا تو اُسے خود بھی بہت اچھی طرح سے یاد تھا، ایسی حالت میں اکثر میکے چلی جاتی تھیں، اسی بات کے دکھڑے نعیمہ ہائم کے آگے روتی رہتیں، اور ثمرین کے طور طریقے، بہترین معاشی حالات کسی سے چھپے نہیں تھے، عام حالات میں فل ٹائم ملازمہ رہتی تھی پھر مجبوری میں کیا نہ کرتی ہوگی، اس سے پہلے ہائم یاددہانی کرواتا، نعیمہ نے اگلا جملہ مکمل کردیا۔

''بہت احساس ہو رہا ہے ناں اپنی لاڈو کا تجھے، جا اُسے کہہ آرام کرے۔ تو پاؤں دبا اس کے، گود میں لے کر بیٹھ جا۔ جب ثمرین نے آنا ہو۔ اسے طبیعت یاد آجاتی ہے..... کرلوں گی میں خود۔''

وہ شرم سے پانی پانی ہوگیا کیوں کہ ثمرین آپی وہاں ہی بیٹھی تھیں، اور کچھ فاصلے پر تانیہ کھڑی بالوں کو برش کر رہی تھی۔ نعیمہ کے انداز پر تانیہ کا بھی لمحہ بھر کو ہاتھ تھما پھر پہلو بدل کر سنی ان سنی کا تاثر دینے لگی۔

اس وقت ہائم کے چہرے پر دوڑتی سرخی صرف شرمساری ہی کی نہیں تھی بلکہ غصے اور بے بسی کی بھی تھی، اب ماں کو پلٹ کر کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا لب کچلتا، ماربل کے فرش کا ڈیزائن گھورتا رہا۔

''تم پریشان مت ہوا کرو ہائم۔''

یک لخت ثمرین کے لہجے میں ہمدردی جھلکی۔

''سنڈے کو کام زیادہ ہوتا ہے، تو میں آجایا کروں گی۔ اب اگر زارا بھابھی کو منع کریں گے، تو وہ برا مانیں گی۔ امی بھی کیا کریں بے چاری۔''

ثمرین نے بولنے کے دوران نگاہ ماں کی جانب اٹھاتے ان کا گھٹنا بھی نرمی سے دبایا تھا جیسے کہا ہو ''بات ختم کرو، اب۔''

اس کا سمجھانا بھی ٹھیک ہی تھا ایک ہی بیٹا دم بھرتا ہے، خواہ مخواہ اس سے بگاڑ رہی ہیں، اس طرح ثمرین کی آمد ہر سنڈے کو یقینی ہوگئی۔ شروع میں تو وہ چھوٹے بڑے کاموں میں ہاتھ بٹا دیتی، پھر منہل کی آمد کے بعد سب کچھ بدل گیا۔ ناختم ہونے والے کاموں کا سلسلہ.....

صبح ہوتے ہی نعیمہ اسے گود میں لے کر بیٹھ جاتیں ''فیڈر بنادو، میں پلا دوں گی، ڈائپر بدل دو، دودھ نکال رہی ہے، گرائپ واٹر پکڑا دو۔'' ایک سانس آوازیں لگاتی رہتیں۔

ہر کام چھوڑ، بھاگ کر آنا پڑتا، اس وقت نعیمہ کا واحد مشغلہ ہر وقت منہل کو گود میں جھلانا تھا، یہاں تک کہ سوئی ہوئی کو گود میں دبکائے بیٹھی رہتیں، بچی کو ایسی عادت پڑ گئی جب نعیمہ گھر نہ ہوتیں وہ رو رو برا حال کرلیتی۔ اسے جھلا جھلا، ردابہ کے کندھے رہ جاتے، گھر کے کام الگ۔

منہل کچھ بڑی ہوئی یہ مسئلہ بھی حل ہوگیا تھا، مگر ثمرین آپی کی آمد جوں کی توں فکس ہوگئی تھی، اپنے کاموں کے ساتھ ان کے بچوں کے کام بھی، اس کی کچن سے لاؤنج تک کی پریڈ ہائم کو کلسائے رکھتی تھی۔ ایسے میں واحد فرار احباب ہی تھے، اس دن وہ باہر جاتے ہوئے آہستگی سے کہہ گیا تھا۔

''میں ایک کام سے جا رہا ہوں، جب آؤں کام نبیڑ کر رکھنا۔''

ردابہ تاسف سے دیکھ کر رہ گئی۔

''گھور کیوں رہی ہو؟''

آئندہ نہیں گھوروں گی۔'' وہ پلٹ کر کاؤنٹر پر

بکھرا پھیلا وا سمیٹنے لگی۔
''کچھ منگوانا ہے۔''
اس نے بنا مڑے کہا تھا۔
''نہیں۔''
''او کے، گڈ گرل۔'' کندھا تھپک کر وہ باہر جانے کو مڑا تھا تب رک کر کہا۔ ''تیار رہنا، کچھ دیر کو آنٹی کی طرف چلیں گے۔''
وہ کہہ کر باہر کی جانب نکلا وہ کچن کی ونڈو سے اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔
''مانا میں مصروف ہوتی ہوں، لیکن تم تو فری ہو۔ گھر میں ٹکو، کم از کم مجھے احساس تو ہو کوئی ہے میرا، کس کے لیے کر رہی ہوں یہ سب۔''
دل میں آئے خیال کو اس نے بے دردی سے جھٹکا، اور اٹھا پٹخ شروع کر دی۔

☆☆☆

وہ ٹی وی پر اپ ڈیٹس دیکھ رہا تھا، منہل اس کی گود میں سر رکھے موبائل پر گیم کھیل رہی تھی، فریدہ کو ہاسپٹل سے آئے چند دن گزرے تھے، ردابہ ابھی اُن کے پاس ہی تھی، کیوں کہ طبیعت اگر بہت خراب نہیں تھی تو کچھ خاص بہتر بھی نہیں تھی، اتنے سالوں میں پہلی بار ہائم سے ضد کر کے ادھر رکی تھی، منہل کو ہائم نے اپنے پاس صرف ردابہ کی طبیعت کی وجہ سے روک لیا تھا۔ ردابہ ایک بار پھر امید سے تھی،، وہ شام کو منہل کو لے کر ملنے چلا جاتا اس لیے بچی نے تنگ بھی نہیں کیا، گیم کھیلتے کھیلتے وہ یک دم کہنے لگی۔
''بابا! ماما کب آئیں گی۔''
''آجائیں گی۔ کیوں آپ کو یاد آرہی ہیں؟''
اس نے بال سہلاتے پوچھا وہ زور سے ہاں میں سر ہلانے لگی۔
''لاؤ فون ادھر دو۔ بات کرتے ہیں ان سے۔''
وہ گیم بیک کرتے اُسے فون پکڑانے لگی تب ہی عابس صاحب کی کال آنے لگی تھی، اس نے فوراً سے اٹینڈ کی۔
''آفس کب آرہے ہو؟'' سلام کے بعد وہ بہت عجلت میں بولے۔
''سر بس ایک دو روز میں، میری مجبوری ہے ورنہ میں.....''
''میں جانتا ہوں۔ مگر ایسا ہے، مجھے ارضا فارما کی فائل فوراً چاہیے، اُسے اسکین کر کے کسی طرح آج ہی بھجواؤ۔''
''او کے سر۔ ویسے ابھی مس رابعہ آفس آرہی ہیں، اگر آپ انہیں.....'' وہ توقف سے بولا۔ ''بلکہ میں خود انہیں کہتا ہوں، ابھی بھیجتی ہیں، وہ.....''
''ہاں ٹھیک ہے پھر..... یاد رکھنا میری کل واپسی ہے، مجھے وہ آج ہی چاہیے، ہر صورت، دیر مت کرنا، ہائم.....او کے۔''
ان کی یاددہانی پر وہ پوری فرماں برداری سے بولا۔
''ڈونٹ وری سر۔ میں ابھی کہہ دیتا ہوں، کچھ دیر میں فائل آپ کے پاس ہوگی۔''
اس نے فون بند کرتے ہی مس رابعہ کو کال ملائی تھی، ڈیوٹی آور ختم ہو رہے تھے رابعہ سب سمیٹتے اٹھ رہی تھی۔ اسے یہاں سے مارکیٹ جانا تھا۔ موبائل بیگ میں ڈالا ہی تھا کہ بولنے لگا اس نے نمبر دیکھ کر جلدی سے پک کیا۔
''اوہ شکر ہے ہائم! آپ کا فون آگیا۔ میں کرنے ہی والی تھی۔''
''خیریت؟'' اسے اچنبھا ہوا۔
''لو بھئی۔ ابھی بھی خیریت، تین دن کا کہا تھا، ایک ہفتہ ہو گیا ہے تمہیں چھٹیاں کرتے ہوئے۔ میری شادی ہے، میں ریزائن کر چکی ہوں، مجھے بھی گھر پر سو کام ہیں۔ ویسے بھی آپ کی مدر ان لاء گھر شفٹ ہو گئی ہیں، پلیز اب آفس آجائیں۔''
''او کے.....او کے.....میں کل آجاؤں گا۔''
اس نے جب اسے فائل کا کہا مس رابعہ چونک ہی گئی۔
''کون سی فائل؟''

☆☆

(باقی آئندہ ماہ، ان شاءاللہ)

صبا بہار

کالی ٹی

نوشابہ بیاہ کر سسرال آئی تو ہر عورت کی طرح آنچل میں ہزاروں سپنے سجا رکھے تھے۔ ماں باپ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے والد صاحب ایک یونیورسٹی میں سپرنٹنڈنٹ تھے تو والدہ محترمہ ایک سرکاری اسکول میں ٹیچر۔ دولت کی گر بہت فراوانی نہ تھی تو تنگ دستی بھی نہیں تھی۔ جو خواہش کی ماں باپ نے فرض سمجھ کر پوری کی، اچھی طرح پالا پوسا، پڑھایا لکھایا اور پوری کوشش کی اچھی تربیت کر سکیں۔

محمد عادل، نوشابہ کا شوہر ایک سرکاری محکمے میں ساتویں، آٹھویں گریڈ کا ملازم تھا آمدنی کم تھی۔ اوپر سے تازہ، تازہ شادی کے بھاری اخراجات کا بوجھ سر پہ تھا۔ دو لاکھ ادھار اٹھا کر ہوٹل میں نمائش دنیا سے مجبور ہو کر شاندار ولیمہ تو کر لیا مگر اب شادی کے سنہرے دن صبح و شام کے حساب کتاب میں بدمزا سے ہو گئے تھے۔

ابھی، بھی وہ ڈائنگ ٹیبل پہ بیٹھا اپنی چھوٹی سی ڈائری اور بال پوائنٹ اٹھائے کھپ رہا تھا۔

''چار ہزار وہ منہ میں بڑبڑایا، پچھلے مہینے تو یہ خواہ مخواہ کا اضافی خرچا ہی سر پڑا ہے۔''

''کون سا اضافی خرچا؟''نوشابہ جو پاس ہی بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی۔ نظریں اٹھا کر اپنے شوہر کو بلبلاتے ہوئے دیکھا۔

''یہی جو تم نے شاپنگ کی تھی خواہ مخواہ۔''

''خواہ مخواہ۔'' سبزی کاٹتے، کاٹتے نوشابہ کا ہاتھ اچانک رک گیا۔

''ضرورت تھی مجھے کپڑوں کی۔''

''ابھی، ابھی تو شادی ہوئی ہے پوری الماری تمہارے کپڑوں سے بھری پڑی ہے۔ میری ماں نے بیس جوڑے تو میرے سامنے تمہارے لیے درزی کو بٹھا کر سلوائے تھے۔ اپنے گھر سے بھی تم چار اٹیچی کیس بھر کر لائی ہو۔ اگر اگلے چھ سال بھی تم کپڑے نہ خریدو تو بھی تو تمہارا گزارا ہو جائے گا۔''

''گزارا ہی تو کر رہی ہوں۔'' دانتوں میں غصہ دباتے ہوئے، اس نے اپنے شوہر کی تنقید کا انتہائی رکھائی سے جواب دیا۔

شادی کے بعد نوشابہ شوہر سے دو لفظ پیار اور محبت کے تو نہ سنے البتہ روز بجٹ و بچت کی تکرار سن سن کر اکتا سی گئی تھی۔ اگر عادل ایک سمجھ دار شوہر ہوتا تو اپنی بیوی کے حساس جذبات کا خیال کرتے ہوئے اسے مناتا، اس کی بیزاری اور جھنجلاہٹ کو سمجھنے اور دور کرنے کی کوشش کرتا مگر وہ اسے نوشابہ کی بدتمیزی سمجھ کر خود اس سے ناراض ہو گیا۔

اب اکثر میاں بیوی کے درمیان ناراضی ہی رہنے لگی تھی۔ زندگی کے حسین لمحات خواہ مخواہ کی بدمزگیوں میں کھونے لگے تھے چھوٹی چھوٹی بات پہ بحث و مباحثہ اور تلخ کلامی روز کا گویا معمول ہی بن گیا تھا۔

اپنے خوابوں میں جو حسین گلستان اس نے سجا رکھے تھے ان پہ زندگی کی تلخ حقیقت کی خزاؤں اور پت جھڑ کا اثر روز بہ روز بڑھنے لگا تھا۔ رکھائی صرف اس کے لب و لہجے میں نہ تھی۔ روکھا پن اس کے اندر ڈیرے ڈال کر بیٹھ چکا تھا۔

شروع، شروع میں نوشابہ کی اپنی نند اقراء سے بھی بہت بنتی تھی۔ سگی بہنوں جیسا ہی رشتہ تھا۔ ایک دوسرے کا خیال بھی تھا اور احساس بھی، مگر بہن اور سہیلی جیسے اس رشتے کی مٹھاس بھی اب کڑواہٹ میں بدلنے لگی تھی اور پہل اکثر نوشابہ خود ہی کرتی تھی۔ شوہر کے روکھے پن کا حساب وہ اس کی ماں اور بہنوں سے پورا کر لیتی تھی۔ بھلا ہو اقراء کا جس نے بات کو بڑھنے نہیں دیا اور گھر کا ماحول مزید خراب ہونے سے بچ گیا۔

☆☆☆

انہی حالات میں نوشابہ کا پاؤں بھاری ہو گیا، یعنی خزاں کے بے رنگ موسم میں خوب صورت تھی سی کونپل کی آمد آمد متوقع ہوئی۔ عادل کے رویے میں کچھ بہتری تو آئی مگر نوشابہ کے دل کا کیا..... وہ تو اب اس سبزہ زار کی مانند تھا جو اوس سے جل گیا ہو۔

نوشابہ کی خوش خبری کی خبر آسیہ بیگم کو ملی تو فوراً

بیٹی کے پاس آگئیں۔ نوشابہ کی طبیعت خاصی خراب تھی تھکاوٹ، نقاہت اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے..... آسیہ بیگم آئی تو تھیں خوشی بانٹنے مگر بیٹی غم بانٹنے بیٹھ گئیں۔ بیٹی کے اداس چہرے نے ماں کو بھی اداس کردیا۔ اپنی دانست میں وہ نوشابہ کی طرف سے مطمئن ہی تھیں کہ بیٹی اپنے گھر میں خوش ہوگی مگر یہاں تو قصہ ہی مختلف تھا۔

ماں کو یوں اچانک دیکھ کر جو خوشی نوشابہ کی ہورہی تھی عادل نے اسے محسوس کرتے ہوئے ساس کو دو دن یہیں رکنے پر رضامند کرلیا۔

آسیہ بیگم تو نوشابہ سے زیادہ اس کے بدلتے رویے پہ حیران ہورہی تھیں۔ صرف اس کا رویہ ہی نہیں اس کی شخصیت بھی بہت بدل گئی تھی اگر یہ تبدیلی مثبت ہوتی تو شاید آسیہ بیگم کو خوشی ہوتی مگر وہ دیکھ کر حیران ہوگئیں کہ وہ عادل کی محض چھوٹی سی بات کو کیسے اٹھا کر آسمان کو لگا دیتی۔ کسی بات سے تو وہ خوش ہی نہ ہوتی، اس کا یہ نامناسب رویہ صرف عادل تک محدود نہ تھا۔ ساس اور نندوں کی بھی کوئی بات اسے برداشت نہ ہوتی۔ وہ اپنے سسرالیوں کی برائیوں میں ہی مصروف تھی کہ اس کی ساس حمیدہ بی بی اس کے لیے سوپ لے کر آئیں۔

''نوشابہ! اقراء نے خاص تمہارے لیے سوپ بنایا ہے۔ صبح سے موبائل اٹھائے، ارے کیا کہتے ہیں اسے ہاں نیٹ، نیٹ کھول کر بیٹھی ہے کہ بھابھی کے لیے ہیلدی ریسیپز ڈاؤن لوڈ کررہی ہوں۔'' ظاہر ہے ہر ماں کی طرح دادی بننے پر وہ بھی پھولے نہیں سمارہی تھیں۔

''فریدہ اور عاصمہ کو بھی فون کیا تھا۔ کیا بتاؤں کس قدر خوش تھیں۔ یہ خبر سن کر۔'' سوپ کا ڈونگا، سائڈ ٹیبل پہ رکھتے ہی وہ اپنی سمدھن آسیہ بیگم سے مخاطب ہوئیں۔

''کیوں نہیں خوش ہوں گی، ظاہر ہے بھئی، بھائی کے گھر کی پہلی خوشی جو ہے۔ انہوں نے بھی مروتاً مسکراتے ہوئے جواب دیا۔''

''ارے۔ نوشابہ۔ بیٹی تم نے تو سوپ کی طرف دیکھا تک نہیں چکھو تو سہی کس قدر لذیذ ہے بڑی محنت سے بنایا ہے اقراء نے۔''

''نہیں، ابھی میرا بالکل جی نہیں چاہ رہا اس کی تو بو تک برداشت نہیں ہورہی۔ لگتا ہے ابھی الٹی آجائے گی۔''

''اچھا بچے، جیسے تمہاری مرضی۔'' ان کا چہرہ کچھ بجھ سا گیا۔ ''میں اقراء سے کہے دیتی ہوں کہ عادل کے لیے رکھ دے۔ وہ شام کو آکر پی لے گا۔''

''ارے نہیں۔'' معاملے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے آسیہ بیگم فوراً آگے بڑھیں اور ان کے ہاتھوں سے سوپ کا ڈونگا لے کر دوبارہ سائڈ ٹیبل پہ رکھ کر ڈھانپ دیا۔

''اقراء نے اتنی محنت سے نوشابہ کے لیے بنایا ہے تو نوشابہ ہی پیے گی ذرا اس کی طبیعت ٹھیک ہو تو میں اپنے ہاتھوں سے اسے پلاؤں گی۔''

''ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے تم آئی ہو تو، تم ہی دیکھ لو اپنی بیٹی کو۔'' انہوں نے ذومعنی بات کرتے ہوئے شکایتی نظروں سے آسیہ بیگم کی طرف دیکھا۔

''ہمیں تو ابھی تک اس کی پسند ناپسند کے بارے میں بھی نہیں پتا۔ یہ خود بھی اپنا خیال نہیں رکھتی، کھانے پینے کے معاملے میں بھی بہت لاپروا ہے۔ اسے ایسے دیکھ کر پریشانی سی ہوتی ہے۔''

''آپ پریشان نہ ہوں میں اسے سمجھاتی ہوں۔''

''اچھا بیٹی تم آرام کرو۔ کوئی چیز چاہیے ہوئی تو اقراء سے کہہ دینا کچن میں ہی ہے۔'' نوشابہ کا ٹھنڈا مزاج دیکھ کر وہ پلٹ گئیں۔

''یہ کیا طریقہ ہے نوشابہ؟'' ان کے جاتے ہی آسیہ بیگم اس کی طرف سیدھی ہوئیں۔

''آپ بتائیں یہ کیا طریقہ ہے۔ کیا ضرورت تھی فریدہ اور عاصمہ باجی کو بتانے کی۔''

''انہیں تو بس بہانہ چاہیے یہاں آنے کے لیے۔''

''تو، یہ ان کی ماں کا گھر ہے۔''

''اور جو ساتھ پوری بارات ہے بچوں کی، آتے ہی پورے گھر میں اودھم مچا دیتے ہیں اور عادل نے تو اس قدر سر پہ چڑھا رکھا ہے ان بچوں کو۔''

''تو وہ ماموں ہے ان کا۔''

''اف! امی آپ نہیں جانتیں، کس قدر بدتمیز بچے ہیں خاص طور پر اس عاصمہ باجی کے، ذرا تمیز نہیں سکھائی۔ یہ عورت خود تو ہر وقت سیر سپاٹے میں رہتی ہے۔ یہ نہیں کہ بچوں کو تھوڑی تمیز سکھا دیتی۔ ہدایت نام کو نہیں۔''

''اچھا، چھوڑو ان باتوں کو، تھوڑا سا سوپ پی لو۔'' ماں کے اصرار پر نوشابہ نے ایک چمچہ سوپ پیا تو بدمزا کہہ کر دوبارہ ایک طرف رکھ دیا۔ آسیہ بیگم نے جب سوپ چکھا تو تنقیدی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اچھا خاصا تو ہے بلکہ، بہت مزے کا ہے۔ پی لو تمہاری صحت کے لیے اچھا ہے۔''

''نہیں پینا امی، کہاں کا بہت بدمزا ہے۔'' وہ چڑ کر بولی۔

''آہستہ بولو کسی نے سن لیا تو برا لگے گا۔ تمہاری ساس کتنے پیار سے لے کر آئی ہیں تمہارے لیے۔''

''میں نے تو ان سے کوئی فرمائش نہیں کی کہ پیار بھرے سوپ لے کر آئیں میرے لیے۔''

''کس قدر اچھی اور خیال کرنے والی ہے یہ عورت قدر کرو۔ ورنہ ساس کس بلا کا نام ہے میری بچی تمہارا تو پالا ہی نہیں پڑا۔ اپنی دادی تو تمہیں یاد ہی ہوں گی۔ خیر چھوڑو، مرے بندے کے پیچھے بات نہیں کرنی چاہیے۔ اللہ انہیں بخشے، ان کے لیے آسانی کرے بس میں تم سے صرف اتنا کہوں گی نوشابہ ناشکری مت کرو۔ ناشکری اللہ کو بھی پسند نہیں ایک بات بتاؤں، ناقدری کرو تو انسان بہت سی نعمتوں اور رشتوں سے محروم ہو جاتا ہے اپنا رویہ بدلو۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنی ساس کی اس توجہ کو ترس جاؤ۔''

''مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' اس نے بے زاری سے کہا۔

''جب کوئی چیز انسان کے پاس ہو ناں، تو انسان کو واقعی فرق نہیں پڑتا اصل فرق تو اس وقت پڑتا ہے جب وہ چھن جائے۔''

''میرے پاس ہے ہی کیا جو چھن جائے گا۔''

''میں تو حیران ہو رہی ہوں۔ بلکہ سچ کہو تو مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے تمہیں ایسے دیکھ کر تم تو بہت احساس کرنے والی عزت کرنے والی اور خیال کرنے والی بچی تھیں میں تو اپنی تربیت سے بہت مطمئن تھی۔''

''ہاں۔ میں بہت احساس کرنے والی عزت کرنے والی اس وقت میرا واسطہ اس کنجوس شوہر اور اس فضول قسم کے سسرال سے جو نہیں پڑا تھا۔ میں تو پچھتا رہی ہوں اس بندے سے شادی کر کے۔ اتنی گندی فطرت ہے اس عادل کی کیا بتاؤں اگر گلاب کا ایک پھول بھی لے کر آئے گا ناں تو ساتھ میں قیمت بتائے گا بھئی پوچھے ضرورت ہی کیا تھی پینتیس روپے خرچ کرنے کی۔ ساتھ ہی چائے پیتے ہوئے موصوف فرماتے ہیں ویسے پینتیس روپے میں دودھ کا ڈبا ہی آجاتا۔ اور اوپر سے میری یہ ساس صاحبہ ہیں سارا دن دماغ کی دہی بنا کر رکھ دیتی ہیں۔ بچے پانی مت گراؤ، پانی بھی اللہ کی نعمت ہے قیامت کے دن اس کا بھی حساب دینا پڑے گا۔ نل ٹھیک سے بند کیا کرو ایسے پانی ضائع ہوتا ہے۔ یہ بلب دن کے ٹائم کیوں جلا رکھا ہے، کھڑکی سے پردے ہٹا دو کیا ہی پیاری دھوپ نکلی ہے باہر۔ اور یہ پانی کی موٹر سارا دن چلتی رہے گی تو تنخواہ تو بجلی کے بل میں ہی نکل جائے گی۔ سالن میں گھی ذرا کم ڈالا کرو، ایک تو پیسے کا ضیاع اور دوسرا صحت کا۔ دودھ پاس کھڑے ہو کر ابالا کرو، دودھ گر جائے تو بہت نحوست ہوتی ہے۔ صبح جلدی اٹھ جایا کرو اس میں صحت بھی ہے اور برکت بھی۔'' شکایتوں کی ایک لمبی داستان اس نے سنانا شروع کر دی۔

''تو ان میں سے کون سی بات غلط ہے؟''

''کیا تو ان میں سے کون سی بات صحیح ہے؟''

ماں کے جواب سے اس کا موڈ کچھ اور آف ہو گیا۔ "اور اوپر سے میری یہ چھوٹی نند سونے پہ سہاگہ بھابھی اسکول پارٹی ہے اپنا نیلے والا سوٹ دے دیں مجھے بہت پسند ہے۔ بھابھی، یہ لپ اسٹک کتنی پیاری ہے میں لگا لوں۔ بھابھی میرا پرفیوم ختم ہو گیا ہے آپ کا پرفیوم استعمال کر لوں۔ بھابھی ہماری جو سر مشین جل گئی ہے آپ کی نکال لوں۔ میں بھی اپنی کوئی چیز نہیں دیتی کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر لوٹا دیتی ہوں مگر ایسی کوئی ڈھیٹ لڑکی ہے جانتی بھی ہے کہ جان بوجھ کر نہیں دے رہی پھر بھی مسکراتے ہوئے کہتی ہے کہ بھابھی آپ بہت اچھی ہیں۔ یقیناً طنز ہی کرتی ہو گی۔" اس نے ماں کو الجھے ہوئے انداز میں دیکھا۔

"نوشابہ، تم اب ماں بننے والی ہو یہ رویہ تمہیں سوٹ نہیں کرتا تمہیں نہیں لگتا کہ تمہیں کوئی میچور یا سنجیدہ قسم کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔"

"آپ بھی میرا مسئلہ نہیں سمجھ پا رہیں۔ آپ میری ماں ہیں آپ کو تو سمجھنا چاہیے۔ اس نے شکایتی نظروں سے آسیہ بیگ کی طرف دیکھا۔ آپ بھی میرا احساس نہیں کریں گی تو اور کون کرے گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے سوچتے ہیں کچھ اس کے متعلق ابھی تم آرام کرو۔"

"اس دنیا میں کون سی عورت ہے جس کو سسرال میں آرام نصیب ہے جو میں کر لوں۔" کمبل کے نیچے کھسکتے ہوئے بھی اس کی شکایتوں کا سلسلہ بند نہ ہوا۔

شام کو عادل آیا تو آسیہ بیگم نے اپنے داماد کو پاس بٹھا کر سمجھایا کہ وہ اپنے رویے پہ کچھ نظر ثانی کرے۔ حالات کی تنگی کا یہ مطلب نہیں کہ گھر کا ماحول ہی تنگ کر دیا جائے۔ بغیر پیسوں کے بھی چھوٹی چھوٹی خوشیاں خریدی جا سکتی ہیں۔ ایک دوسرے کو سمجھنا اور سمجھ کر زندگی گزارنا ہی ازدواجی زندگی کا اصل امتحان ہے۔ اور یہ کہ فی الحال نوشابہ کچھ ڈسٹرب ہے اگر اجازت دو تو میں اسے اپنے ساتھ راولپنڈی لے جاؤں۔ وہاں وہ کچھ سکون محسوس کرے گی اس کی طبیعت جونہی بہتر ہوئی تو وہ خود اسے لاہور چھوڑنے آ جائیں گی۔ عادل نے بخوشی اجازت دے دی تو وہ بیٹی کو کچھ دماغی سکون کے لیے اسے ساتھ لے آئیں۔

☆☆☆

میکے آتے ہی نوشابہ کی طبیعت میں واضح تبدیلی آئی۔ اس کی ہشاش بشاش طبیعت دیکھ کر ماں کو بھی تسلی ملی۔

"تمہارے لیے اپنے ہاتھ سے چائے بنائی ہے۔ تمہیں ہمیشہ سے بہت پسند تھی ناں۔"

"واہ! امی، دل خوش کر دیا ہے میرا۔ چائے ہو تو بس آپ کے ہاتھ کی، ویسے آپ کو کیسے پتا چلا کہ میرا چائے پینے کو دل چاہ رہا تھا۔"

"ماں ہوں ناں، ماں کو تو سب پتا ہوتا ہے۔"

"شکر ہے۔ سکون سے چائے تو پینا نصیب ہوا۔" اس نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ ایسی بھی کیا بے سکونی تھی تمہیں وہاں۔"

"اس کو چھوڑیں مجھے سارے حساب برابر کرنے اچھی طرح آتے ہیں۔" اس نے عجب شوخی سے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور چائے پیتے پیتے مسکرا دی۔

"ایسے کیوں مسکرا رہی ہو؟"

"ویسے ہی کوئی بات یاد آ گئی تھی۔"

"کیا بات؟"

"آپ کو پتا ہے دو ماہ پہلے اقراء کو دیکھنے کچھ لوگ آئے تھے۔ بڑی ہی محنت سے تیار ہوئی تھی، خیر مجھے آ کر کہنے لگی۔ بھابھی آپ کے پاس کوئی اچھا سا ٹی سیٹ ہے۔ وہ مہمانوں کو چائے دینی ہے۔" نوشابہ بڑے مزے سے ماں کو اقراء کے لہجے کی نقالی کرتے ہوئے بتا رہی تھی۔

"خیر...... مجھے بھی پتا تھا کہ محترمہ کی میرے سلور وائٹ ٹی سیٹ پہ نظر ہے۔ جو شادی پہ ماموں نے گفٹ کیا تھا۔ میں نے بھی سستی والی پیالیاں اٹھا کر آگے رکھیں کہ یہی لے جاؤ۔ شوکیس کے برتن تو

ابھی میں نے خود بھی استعمال نہیں کیے۔ امی آپ اس کی اتری ہوئی شکل دیکھتیں، سچ میں دیکھنے لائق تھی۔ وہ منہ لٹکائے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔'' ایک فاتحانہ قہقہہ لگایا نوشابہ نے۔ وہ تو ابھی تک اقراء کی حالت سے محظوظ ہو رہی تھی۔ آسیہ بیگ نے اپنی لاڈلی کا بغور جائزہ لیتے ہوئے چائے کی پیالی میز پہ رکھی پھر چند لمحے کے توقف کے بعد بولیں۔

''نوشابہ..... تمہیں میری وہ سہیلی یاد ہے ریحانہ عذرا خالہ کی بیٹی جو اقبال ٹاؤن میں ہمارے ہمسائے میں رہتی تھی۔''

''ہاں، ہاں، کیوں نہیں، ان کا تو بہت آنا جانا تھا ہمارے گھر۔''

اس کی منگنی خالہ کے گھر ہی ہوئی تھی۔ بہت ہی پیار تھا دونوں بہنوں میں۔ اور عذرا خالہ تو اپنی بڑی بہن عارفانہ باجی کی بہت عزت بھی کرتی تھیں۔ ریحانہ کی تیز زبان کے باوجود انہوں نے بہن کی خوشی کا خیال کرتے ہوئے اس کا رشتہ لے لیا۔ حالانکہ سامنے نظر آ ہی رہا تھا کہ ریحانہ کس قسم کی بہو ہو سکتی ہے۔ ریحانہ تو اس قدر خوش تھی اپنی منگنی سے، سارا دن میرے پاس بیٹھی بس اپنے منگیتر کی ہی باتیں کرتی رہتی تھی۔ بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی ریحانہ اور اسد میں۔ دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے۔ اس کی بڑی نند شاہدہ کی شادی اس کے بھائی اظہر سے ہی ہوئی تھی۔

''اچھا، اچھا..... وہ شاہدہ بھابھی ملی تھی میں ان سے بڑی ہی ملنسار طبیعت کی عورت تھیں۔''

''تمہیں ریحانہ کی وہ چھوٹی نند سونیا یاد ہے۔''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں جس کے بڑے ہی لمبے بال تھے۔ کتنا خوب صورت ہیئر اسٹائل بنایا ہوا تھا اس نے شادی پر۔''

''بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی اس لیے سب کی لاڈلی تھی۔ گھر میں اسے پیار سے گڑیا ہی کہتے تھے۔ تھی بھی بہت پیاری گڑیا جیسی۔'' آسیہ بیگم کچھ لمحے کے لیے خاموش ہو گئیں۔

''تھی، مطلب؟'' نوشابہ کو ماں کے لہجے کی افسردگی نے بے چین کر دیا۔

''بس، شادی کے بعد ریحانہ کی اپنی نند، سونیا سے کچھ بنی نہیں، اکثر ان کی نوک جھوک چلتی رہتی۔ سونیا تینوں بھائیوں سے چھوٹی تھی سارے بھائی بہت پیار کرتے تھے اسے۔ اکثر اسد ریحانہ کا شوہر بھی اپنی بہن کی ہی طرف داری کرتا۔ ریحانہ کو یہ بات برداشت نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ انہوں نے سونیا کو بگاڑ رکھا ہے۔ شادی کے بعد مجھ سے ملنے آئی تو بھی یہی شکوہ کر رہی تھی کہ ''فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہے۔ کالج میں پہنچ چکی ہے پھر بھی باپ بھائی ایسے اسے گڑیا، گڑیا کہتے ہیں جیسے پانچ سال کی بچی ہو۔'' ریحانہ تو ویسے ہی فطرتاً ایک تنگ دل قسم کی عورت تھی اوپر سے مادہ پرستی کی دیمک بھی اس کے دل کو لگ گئی۔ شادی کے بعد وہ ان عورتوں کی صف میں کھڑی ہو گئی جن کے لیے یہ چیزیں اور سامان ہی سب کچھ ہوتا ہے اوپر سے سونیا سے حسد جلتی پہ تیل۔

ایک دن ریحانہ کی ساس کپڑے دھو رہی تھیں تو سونیا ریحانہ کو بغیر بتائے اس کی بالٹی اٹھا کر لے گئی۔ بھئی استعمال کی چیز تھی یوں تو کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مگر ریحانہ، وہ تو ویسے ہی سونیا سے خار کھاتی تھی اس کے ہاتھ میں اپنی بالٹی دیکھی تو فوراً جھپٹ لی اور کہا کہ ''یہ تو میرے جہیز کی بالٹی ہے میرے ماں باپ نے میرے استعمال کے لیے دی ہے خبردار جو ہاتھ لگایا۔'' بس پھر کیا دونوں نند بھاوج میں تکرار شروع ہو گئی۔ سونیا نے بدتمیزی کی تو ریحانہ نے بھی سیدھا تھپڑ اس کے گال پہ جڑ دیا۔''

''استغفار اللہ۔'' اتنی معمولی بات پہ.....''

''باتیں معمولی ہی ہوتی ہیں مگر اکثر بڑے حادثات کا سبب بن جاتی ہیں۔''

''پھر کیا ہوا؟'' نوشابہ تجسس ہو رہی تھی۔

''سارے گھر والے شور شرابا سن کر جمع ہو گئے۔ اتنے میں ریحانہ کے سسر بھی کام سے تھک ہار کر گھر آئے۔ گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو دیکھا، نیا مسئلہ

چھڑا ہوا تھا۔ خیر بہو پہ کیا مان، مان تو اپنی بیٹی پہ ہی ہوتا ہے لہٰذا انہوں نے ریحانہ کو تو کچھ نہ کہا، کیونکہ ایک تو وہ تھی بھی خوش خبری سے دوسرا وہ بات کو مزید بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا اپنی گڑیا کو ہی ڈانٹ دیا مگر ان کی گڑیا اپنی غلطی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی اپنے ابو سے بحث کرنے لگی۔ صابر صاحب جو پہلے ہی کام سے تھکے سر کا درد لیے بیٹھے تھے انہوں نے اسے خاموش کروانے کے لیے ایک چپیڑ اس کے سر پہ مار دی۔''

''پھر.....''

''پھر وہ خاموش تو ہوگئی مگر، روتی روتی اندر چلی گئی۔ صابر صاحب نے سوچا ہوگا بعد میں منالیں گے اپنی گڑیا کو مگر سونیا، جسے گھر میں کبھی غصے سے کسی نے ریکٹ تک نہ ہو! ایک بھابھی کی چپیڑ دوسرا باپ کا تھپڑ اس وقت اس کے دل پہ کیا گزری وہی جانتی ہوگی۔ چند ہی لمحے گزرے تو اندر سے سونیا کے چیخنے کی آوازیں آئیں سب کچن کی طرف بھاگے مگر وہ خود پہ مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا چکی تھی۔ اگر کچن کا دروازہ وہ لاک نہ کرتی تو شاید اسے بچانا آسان ہوتا۔ اسد نے مشکل سے دروازہ توڑا۔ اس کی آگ بجھائی اور اسے ہسپتال ایمرجنسی میں پہنچایا مگر ڈاکٹر نے یہ کہہ کر سب پہ قیامت گرا دی کہ اسے وارڈ میں نہیں مردے خانے شفٹ کردیں۔''

''اللہ'' نوشابہ کے دونوں ہاتھ بے اختیار اس کے منہ تک آئے۔ ''واقعی قیامت ہی گزری ہوگی ان پر۔''

''نہیں، اصلی قیامت تو اس کے بعد بدبخت ریحانہ اور بے چاری شاہدہ پہ گری ریحانہ کو اب اس گھر میں کوئی برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔ سارے اس واقعے کا ذمہ دار اسے ہی سمجھ رہے تھے۔ خاص طور پر ریحانہ کی ساس اور اس کا شوہر جسے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی بہن کو جلتے دیکھا جلد ہی ریحانہ کو بھی احساس ہو چکا تھا کہ اسے پیار کرنے والا دل بھی گڑیا کے ساتھ جل چکا ہے۔ لہٰذا ریحانہ میکے آ گئی ریحانہ کے آتے ہی شاہدہ کی زندگی سسرال میں تنگ ہوگئی وہ اپنے تینوں بچے چھوڑ کر ماں کے گھر چلی گئی۔ ریحانہ اور اس کے شوہر کو اس قدر خواہش تھی بیٹے کی..... بیٹا پیدا ہوا، خود تو نہ آیا البتہ طلاق نامہ بھیج دیا۔ ایک بالٹی کی قیمت تھی تین سو مگر تین گھر تباہ ہوگئے۔ ریحانہ کا شاہدہ کا اور وہ دو بہنیں جو ایک دوسرے کے بغیر کوئی خوشی نہ کرتی تھیں..... جنازے تک چھوڑ دیے۔''

''ہائے کتنا برا ہوا'' نوشابہ تو اک لمحے کے لیے سکتے میں آ گئی۔

''برا تو ہوا مگر برا کیوں ہوا؟'' اس کی ماں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''جب معمولی چیزوں کو انسانوں اور رشتوں سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے تو پھر کچھ اچھا کیسے ہو سکتا ہے۔'' وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوگئیں اور پھر بولیں۔ ''بے وقوف انسان پہلے غلطی کرتا ہے پھر سیکھتا ہے مگر عقل مند دوسروں کی غلطی سے ہی سیکھ لیتا ہے۔ میں اکثر سوچتی ہوں چیزیں قیمتی ہوتی ہیں یا رشتے.....! انسان سے قیمتی کیا چیز ہو سکتی ہے مجھے افسوس ہوتا ہے ان عورتوں پہ، جو چیزوں کو سنبھالتی ہیں مگر رشتوں کو کھو دیتی ہیں۔ کیا تمہیں افسوس نہیں ہوتا؟''

وہ یہ سوال اور چائے چھوڑ کر اندر چلی گئیں اور نوشابہ بس بت بنی چائے کی پیالی کو ہی تکتی رہ گئی۔

اس کی ماں واقعی اچھی ماہر اور قابل استاد تھی۔ وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے انتہائی بروقت انہوں نے سچائی کا آئینہ اس کے سامنے رکھا تھا۔ وہ جو زندگی کی فضول الجھنوں میں بھٹک رہی تھی ان کی چند باتوں نے اسے سچائی کے دھانے پہ لا کھڑا کیا تھا۔

''وہ کیا تھی؟ اور کیا ہوگئی تھی؟ اس نے کیا چاہا؟ اور اسے کیا ملا؟ اور چونکہ اس نے جو چاہا اسے نہ ملا ایک خیال رکھنے والا، محبت کرنے والا، کھلے دل سے خرچ کرنے والا شوہر۔'' عادل کے روکھے سوکھے رویے اور سرد مزاجی نے اسے بھی بنجر کر دیا تھا اور بنجر

انسان بھی بنجر زمین جیسا ہی ہوتا ہے۔ اور بنجر زمین یقیناً کسی کو فائدہ نہیں دیتی اور بالآخر تنہا اور ویران ہو جاتی ہے؟ کیونکہ بنجر ہوتی زمین کو سب سے پہلے، اس کے مکین اور باسی ہی چھوڑ کر جاتے ہیں۔ فطری سی بات ہے زرخیز اور سرسبز و شاداب زمین ہی آباد رہتی ہے۔ اسے سمجھ میں آ گیا تھا۔ اسے خود کو بچانا تھا بنجر ہونے سے.....''

☆☆☆

ایک ہفتے بعد جب نوشابہ سسرال لوٹی۔ تو اس کی صحت اور مزاج میں مثبت تبدیلی نے سب کو حیران کر دیا۔ جن چھوٹی چھوٹی باتوں پہ وہ گھر سر پہ اٹھا لیتی تھی۔ جان بوجھ کر اس نے نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ ہر کوئی اس کے بدلے رویے پہ ششدر تھا مگر اصل حیرانی تو سب کو اس وقت ہوئی جب اقراء کے رشتے کے لیے آنے والے مہمانوں سے نوشابہ انتہائی خوش اخلاقی سے پیش آئی۔ نہ صرف اس کے لیے خود چائے بنائی بلکہ اپنے جہیز کے سلور وائٹ ٹی سیٹ میں پیش بھی کی۔

''ماشاء اللہ..... آپ کی بہو کا اخلاق تو بہت اچھا ہے۔'' مہمان عورت بھی تعریف کیے بنا نہ رہ سکیں۔

''امی بھی، اخلاق کی بہت اچھی ہیں میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔'' نوشابہ نے اپنی ساس کو چائے پکڑاتے ہوئے کہا۔ تو حمیدہ بی بی کا تو جیسے ایک کلو خون بڑھ گیا۔

''ہاں بھئی، خاندانی لوگ اپنے اخلاق سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔'' زبیدہ خالہ (رشتے والی آنٹی) نے فخر سے مہمان عورت کی طرف دیکھا (جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں جتلایا ہو۔ دیکھا تمہیں صحیح خاندانی لوگوں میں ہی لے کر آئی ہوں۔)

''بھئی مجھے تو اس رشتے پہ کوئی اعتراض نہیں، بھلا ایسے خاندانی لوگ آج کل ملتے ہی کہاں ہیں۔ اگر آپ کو ہمارا بیٹا پسند ہے تو بسم اللہ کرتے ہیں، نیک کام میں دیر کیسی۔''

''ہماری اقراء بہت ہی سگھڑ بچی ہے۔ ان شاء اللہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دے گی۔'' نوشابہ نے خلاف توقع اپنی نند کی تعریف کی تو اس کی ساس کی آنکھیں بے یقینی میں پھیل گئیں۔ شاید وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ نوشابہ نے یہ تعریف مروتاً نہیں کی تھی بلکہ دل سے کی تھی۔ کیونکہ اقراء واقعی ایک تعریف کے لائق لڑکی تھی جو ہمیشہ دوسروں کا احساس کرتی تھی۔

وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا۔ چار، پانچ سال کیسے گزرے، خبر ہی نہ ہوئی۔ اقراء کی شادی ہو گئی۔ نوشابہ دو خوب صورت بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ عادل کا گریڈ اپ ہو چکا تھا۔ قرضا بھی اتر گیا تھا۔ اب تو، گھر کے حالات بہت بہتر ہو چکے تھے۔

گھر کیسے چلنا ہے خاندان کیسے بنایا جاتا ہے۔ خاندان کو کیسے سنبھالا جاتا ہے اور ایک عورت کی کیا ذمہ داری ہوتی ہے۔ اپنی ساس اور ماں سے وہ سب شعوری و لاشعوری طور پہ سیکھ چکی تھی۔ اب تو پانی کا نل صحیح بند نہ کرنے پر وہ خود بھی بچوں کو ڈانٹ دیتی تھی۔ زندگی میں اپنوں کا کیا مقام ہوتا ہے وہ سمجھ گئی تھی۔ جو ہر غم کا بوجھ بانٹتے ہیں وہ اپنے ہوتے ہیں ورنہ خوشی بانٹنے کے لیے تو غیر بھی چلے آتے ہیں۔''

اور تین نندیں اور ان کے بچوں کی پوری کابینہ اب بھی ویک اینڈ اور عید وغیرہ پہ وہ..... شور شرابا اور اودھم کہ سارا گھر الٹ پلٹ جاتا بلکہ اب تو اس کے بچے بھی بہت شرارتی ہو گئے تھے..... اوپر سے اماں..... ان کی وہ روک ٹوک وہ نصیحتیں، اکثر اس کا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا مگر جب بھی اس کی نظر کسی بالٹی پہ پڑتی تو اسے اپنی ماں کی وہ نصیحتیں یاد آ جاتیں تو وہ ایک لمحے میں سنبھل جاتی۔

''چیزوں کو نہیں رشتوں کو سنبھالنا ہے۔ کیونکہ جو انسان رشتے سنبھالتا ہے وہ کبھی تنہا نہیں رہتا۔''

☆☆

فرح بخاری

کنارِ خواب جزیرہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ:

سوار حسن کو کچھ عجیب سے حالات میں ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑنا پڑا اور وہ خالی جیب منتشر دماغ لیے پنا سوچے مری کی کوسٹر میں بیٹھ گیا۔ مری میں ایک معمولی ڈھابے کے مالک میاں نذر اسے پہلے مہربان دوست کی صورت میں ملے، میاں جی کے توسط سے سوار کو ایک ہوٹل میں مہینے بھر کے لیے ریسپشنسٹ کی جاب مل گئی۔ ہوٹل کے منیجر رفیق احمد کی بیٹی کنعان کالج میں پڑھتی ہے۔ ماضی کے کسی واقعے نے اسے محبت سے سخت بدگمان کر رکھا ہے۔ لیکن سوار سے پہلی ملاقات ہی اس کے دل کی دنیا کو پریشان کن حد تک تبدیل کر دیتی ہے۔

ثمامہ ایک طرح دار جوان بیوہ ہے جس نے مرحوم شوہر کی جائیداد سے مری میں نیا فائیو اسٹار ہوٹل کھولا ہے۔ وہ بھی مری میں نووارد ہے۔

شازمہ جس نئے محلے میں اپنے شوہر کے ساتھ شفٹ ہوئی ہے وہاں تنہائی اور اکیلا پن اس کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا کیونکہ شوہر اپنی مجبوریوں کی وجہ سے اس کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں۔

ثمامہ کو ہوٹل کے افتتاح میں کچھ مسائل کا سامنا ہے۔

رفیق احمد کے پیر میں سیڑھیاں اترتے شدید فریکچر آ گیا۔ سوار نے ان کی بہت مدد کی۔ شازمہ کی محلے میں آمنہ بھابی سے دوستی ہوئی جو کہ مولوی فیض الحسن کی بہو ہیں۔

ثمامہ نے مری کے راستوں پر سوار کو دیکھا، یہ اس کا سوار سے دوسرا سامنا تھا اور معلوم نہیں کیوں لیکن وہ اسے بہت خاص لگا۔

کنعان کی رابعہ پھوپھو ان کے گھر آئیں تو کنعان کے پکائے بدمزا کھانوں کی وجہ سے دیا اور کنعان دونوں کا داخلہ کوکنگ اسکول میں کروا آئیں کنعان نے وہاں پر سوار کو دیکھ کر خوشی محسوس کی۔

پانچویں قسط

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

مکمل ناول

سوار کے مضبوط ہاتھوں میں عمران کی کلائی تھی۔ کنعان کا سانس رُکا۔
''چلو یار۔ سب کے لیے چائے بناتے ہیں۔ کچن کیبنیٹ میں کوکیز بھی رکھی ہیں کل والی۔ موسم کا مزا دوبالا ہو جائے گا۔'' کلائی پر دباؤ اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے ''وہی'' تھا جو پل میں عمران کو منظر سے غائب کر گیا تھا، کنعان کچھ نہ سمجھتے پورا مڑ کر اُن دونوں کو دیکھ رہی تھی جب ہال کمرے میں داخل ہوتے سوار نے پلٹ کر کنعان کو دیکھا، بظاہر کچھ بھی نہیں تھا اُن آنکھوں میں۔ یا شاید بہت کچھ۔
محبت کا بھی اپنا جزیرہ ہوتا ہے دل میں اَنجانی زبان کے نغمے گنگناتا، انہوں نے پھولوں کے پیرہن سے سجا، ان دیکھے خوابوں سے دل کو بہلاتا من کا انتہائی اپنا، خاموش، پرسکون جزیرہ۔ وہاں جو چاہے محسوس کرو، جیسا چاہے معانی و مطلب نکالو، سب جائز ہے۔
محبت کا گنگناتا احساس بارش کی ٹپ ٹپ میں شامل ہو کر پھر سے نئے سُر بکھیرنے لگا۔ وہ دور بھاگنا چاہتی تھی اس احساس سے۔ لیکن وہ اسکی پہلی محبت، ساون کی پہلی جھڑی جیسا تھا۔ مسحور کن، بسیط، نس نس میں پھیلا ہوا۔ گریز ناممکن ہونے لگا۔

☆☆☆

ماہ رمضان کے بابرکت مہینے کا آغاز عام معمولات میں چند ایک چھوٹی موٹی تبدیلیوں کے ساتھ ہوا۔ اکیڈمی کی ٹائمنگ افطار کو مدنظر رکھتے ہوئے تھوڑی سی اِدھر اُدھر کی گئی۔ سیکھنے کا عمل نسبتاً خاموشی کے ماحول میں انجام پایا جانے لگا۔ کھانے کی مقدار میں قدرے اضافہ کیا گیا اور روزہ کھلنے سے پندرہ منٹ پہلے مدرسے کے بچوں کا کھانا سب مل کر جھٹ پٹ پیک کر کے مسجد بھجوا دیا کرتے اور افطاری وہیں اکیڈمی میں سب مل کر کیا کرتے۔
سوار کی اپنی روٹین بھی قدرے تبدیل ہوئی تھی۔ ہوٹل کے افتتاح کی خوشی میں افطار پارٹی دی گئی تھی۔ ہوٹل کے رش میں کچھ اور بھی اضافہ ہوا تھا۔ بھلے گزرے سالوں میں مری کے رمضان المبارک۔ برف پوش چوٹیوں جیسے سرد ہوا کرتے تھے۔ پر اب ایسا نہیں تھا۔ روزے دار گرم موسم کی وجہ سے اب مری کا رُخ زیادہ کرنے لگے تھے۔ اوپر سے کچھ ہوٹلز میں باقاعدہ رمضان پیکج بھی اسٹارٹ ہو چکا تھا۔ فکس ریٹس پر ہفتہ وار، دس روزہ، پندرہ دن اور مہینے کے حساب سے رومز بک ہو رہے تھے۔ روزے دار ٹھنڈے، خوش گوار اور پرسکون ماحول میں روزہ کی عبادت انجام دینے کو ترجیح دے رہے تھے۔ پیٹرا اِن میں ایسا کوئی باقاعدہ پیکج تو اناؤنس نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن مصروفیت بہرحال بڑھ گئی تھی۔ سوار کا کام بھی پہلے کی نسبت بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ عملے کو چھوٹی سے چھوٹی بات سمجھاتے۔ ثمامہ سے مشورے طلب کرتے، سیاحوں کی سہولت اور آرام کا خیال رکھتے محدود سی لائف کا دائرہ کچھ اور محدود ہو گیا تھا۔
میاں جی بڑے دنوں سے اُسے افطار کے لیے بلا رہے تھے۔ لیکن وہ وقت اکیڈمی کی نذر ہو جاتا۔ میاں جی سے سنڈے کا وعدہ کرتے اب تو وہ رمضان کے تین سنڈے گزار بیٹھا تھا۔ عید کچھ اور نزدیک آئی تو ہوٹل کی رونقیں ماند پڑ گئیں۔ روزے دار عید کی تیاریوں کے لیے گھروں کو واپس جانے لگے تھے۔ کوکنگ کلاس میں البتہ جوش و خروش سے عید کے حوالے سے پروگرام بن رہے تھے۔
''سوار یار! تم ہی کوئی اچھا سا مشورہ دو۔ کتنے دن ہو گیا باجیاں تو کچھ بی طے نہیں کر پایا۔'' دلیر بھائی کا اپنا اسٹائل تھا اور خوب تھا۔ سوار ٹشو پیپر سے منہ صاف کرتے رسان سے مسکرایا۔
''کیوں بھئی باجیوں۔ کون سا معمہ ہے جو حل ہونے میں نہیں آ رہا؟''
''دیکھوناں سوار۔'' سیما باجی نے فوراً ہی رُخ سوار کی طرف پھیرا۔ ''ہم چاہتے ہیں کہیں آؤٹ ڈور پکنک منانی چاہیے۔ لیکن سب ایسا نہیں چاہتے۔ یہ کہتے ہیں یہیں اکیڈمی میں ون ڈش کرتے ہیں۔''

''پتا ہے سوار۔ ہم سب بھور بن جانا چاہتے ہیں۔'' مریم پر جوش ہوئی۔

''ہم سب نہیں۔'' آنسہ نے تنبیہی انگلی اٹھائی۔ ''بھور بن کے لیے پورا ایک دن کیسے نکال پائیں گے ہیں۔ وہ بھی عید کے موقع پر۔''

''ایک منٹ بھئی۔'' سوار نے ہاتھ اُٹھایا۔ ''یوں تو بحث کبھی ختم نہیں ہوگی۔ سب سے پہلے یہ بتاؤ ناظمہ میم سے کسی نے بات کی؟''

''ہاں۔'' بشریٰ اور ندرت بیک زبان بولیں۔ ''انہوں نے کہا کہ عید کا تیسرا روز رکھ لو اور پروگرام جو بھی چاہو آپس میں مل کر بنا لو۔''

''ہوں گڈ..... اور ہم میں سے انٹرسٹڈ کون کون ہے۔ یہ بحث چھوڑ کر کہ کہاں اور کیا..... عید پارٹی کے حق میں؟'' سوار نے آج ہی مسئلے کو حل کرنے کا تہیہ کرلیا۔ تقریباً سب ہی نے ہاتھ بلند کیے تھے۔

''او کے۔ تو اب آؤٹ ڈور پکنک والے اپنے ہاتھ کھڑے کریں۔'' اس نے باری باری سب پہ نظر ڈالی۔ سترہ میں سے چھ ہاتھ بلند ہوئے۔

''اور اکیڈمی کے اندر ون ڈش کے لیے؟'' سوال اس کے منہ میں تھا اور باقی کے گیارہ افراد نے ہاتھ اُٹھا دیے۔

''ہوں، یعنی کے تیسرے کسی آپشن کی بحث ہی کوئی نہیں۔''

''اور تم سوار؟'' سیما باجی کو خیال آیا۔

''میں بھی ون ڈش والوں کے ساتھ ہوں۔ عید کے رش میں سے ایک گھنٹہ بھی بہت مشکل سے نکلے گا سیما باجی۔ پکنک کے لیے پورا یا آدھا دن دینا قطعی مشکل ہے۔''

''تو یعنی ووٹنگ سے فیصلہ ہوگیا؟'' ندرت خوشی سے چہکی۔

''فیصلہ تو ہوگیا لیکن پکنک کے حامی لوگوں کو بائیکاٹ کی بالکل اجازت نہیں ہے۔'' سیما باجی نے انعم اور مریم کو گھورا۔

''ہاں..... اور اُن کو دل چھوٹا کرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ سیشن اینڈ کے موقع پر پکنک کے لیے بھی ضرور جائیں گے۔ تب سیزن بھی آف ہوگا۔ پکنک کافی پرسکون ماحول میں ہوپائے گی۔'' سوار کے اضافے نے سب میں خوش گوار تھلبلی پیدا کی۔

''تھینکس سوار۔ تم نے تو منٹوں میں بحث سمیٹ لی۔'' انعم نے شوخ نگاہ ڈالتے سوار کا خصوصی شکریہ ادا کیا اور دیا نے دُور بیٹھی کنعان سے محض معنی خیز نظروں کا تبادلہ کیا جو جواباً مسکرا کر رہ گئی تھی۔ سب کی متفقہ رائے سے عید کے تیسرے روز اکیڈمی ٹائم میں پارٹی رکھی گئی تھی کیونکہ عید کے پہلے دو روز سب کی اپنی ذاتی مصروفیات تھیں۔

☆☆☆

''ہم کہاں جارہے ہیں باجی؟'' شازمہ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے سکینہ نے معصومانہ نگاہ اُٹھائی، جو قدرے نروس سی ایک ایک دروازے کو دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی۔

ایڈریس کا حصول تو نہایت ہی آسان ثابت ہوا تھا۔ ہفتہ کی رات وقاص آیا تو شازمہ نے موقع پاکر اس کے موبائل میں سے دو تین نمبرز نوٹ کرلیے تھے۔ ایک نمبر کارخانے کے اہم ملازم ہدایت اللہ کا تھا دوسرا فیاض بھائی اور تیسرا ابھا بھی کے نام سے محفوظ تھا۔ اس نے اپنی نئی خفیہ سم استعمال کرتے ہوئے ملازم ہدایت اللہ سے باتوں باتوں میں فیاض کے کارخانے کا پتا اگلوا لیا تھا۔ خود کو اُس نے ایک غریب عورت ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ وہ بیٹے کی ملازمت کی سفارش کرنے کے لیے فیاض سے ملنا چاہتی ہے۔ ہدایت اللہ نے اسے کارخانے اور گھر دونوں جگہ کا پتا دے دیا تھا۔

ہدایت اللہ کے بے احتیاط رویے پر ایک بار تو غصہ بھی آیا کہ وقاص نے یہ کیسے ملازم پال رکھے ہیں۔ ایسے غیر ذمہ داروں کی موجودگی میں آگ تو لگنی ہی تھی۔ حالانکہ اگر ہدایت اللہ ایڈریس دینے کے لیے تیار نہ ہوتا تو اُس کے پاس دو آئیڈیے اور

بھی تھے۔ لیکن عورت کی آواز پر ریجھ جانے والے ہدایت اللہ نے اس کی نوبت ہی نہیں آنے دی۔

اور اس کا اصل امتحان تو اب شروع ہوا تھا۔ مقصد محض گھر کے اندر جانا ہی نہیں تھا۔ اندر جا کر باتوں باتوں میں اہم معلومات لینا بھی بہت ضروری تھا۔ اور ایک اجنبی عورت کو کوئی گھر میں گھسنے بھی دیتا یا نہیں۔ گھر کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ بڑے سے لان اور اونچے کشادہ برآمدوں والا وہ ایک شان دار خوب صورت مکان تھا۔ ظاہری حالت سے ہی مالکوں کی خوش حالی جھلک رہی تھی۔

سامنے برآمدے میں فرہی مائل تیس بتیس کی عمر کی ایک عورت نومولود بچے کو گود میں لیے تھپک رہی تھی۔ شازمہ نے قریب جا کر خود ہی مصافحہ کیا

''جی، میں نے پہچانا نہیں آپ کو؟'' عورت اپنے چہرے پر ایک فارمل سی مسکراہٹ لاتے اسے اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ لہجے میں ہلکی سی بیزاری کی جھلک بھی نمایاں تھی جیسے دروازہ کھلا رہ جانے پر اندر ہی اندر پچھتا رہی ہو۔

''معافی چاہتی ہوں بلا اجازت اندر تک چلی آئی۔'' شازمہ نے چہرے سے نقاب اُلٹتے سب سے پہلے معذرت کی۔

آج اس نے اپنے ظاہری حلیے پر خوب دھیان دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی اسے انجان سمجھتے دروازے سے ہی دھتکار دیا جائے۔ حلیے کا رعب داب بعض دفعہ ہمیں اجنبیوں سے بھی سلیقے کے برتاؤ پر مجبور کر دیتا ہے۔ سامنے بیٹھی عورت کا بھی کچھ ایسا ہی ملا جلا ردعمل تھا۔ مزید یہ کہ نقاب اُلٹنے پر شازمہ کے حسن بے مثال نے بھی مرعوب کر دیا۔

''دراصل ہم کرائے کے مکان کی تلاش میں ہیں۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ ہوں، وہ باہر ہیں۔'' شازمہ نے آمد کا مدعا بیان کیا تو اس بار عورت نے اسے سامنے کی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سکینہ کو اُس نے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ دورانِ گفتگو وہ بالکل خاموش رہے۔

''میرے شوہر کالج میں پروفیسر ہیں۔ ہم لوگ ٹیکسلا سے آئے ہیں۔ کالج میں فی الحال کچھ عرصہ فیملی کے لیے کوارٹرز خالی نہیں ہیں اس لیے ہم باہر مکان تلاش کر رہے ہیں۔'' شازمہ نے اپنی گھڑی ہوئی کہانی فوراً اُس عورت کے گوش گزار کی۔ وہ اس کے خدشات کم کرنے کے لیے پورا زور لگا رہی تھی۔ عورت کے چہرے پر اُترتا اطمینان بتاتا تھا کہ اب وہ بھی قدرے ریلیکس ہوگئی ہے۔

''یہ بچی؟''

''میری بیٹی ہے۔'' شازمہ نے مسکراتے ہوئے سکینہ کو اپنے ساتھ لگایا۔

''ارے۔ پر آپ تو اتنی عمر کی نہیں لگتیں۔'' وہ حیرت سے ہنسی۔ شازمہ بھی مسکرانے لگی۔

''جی ہاں بہت چھوٹی عمر میں شادی ہوگئی تھی۔''

''بس یہی ایک لڑکی ہے؟'' عورت اب حیران تھی کہ دس سالہ بس ایک ہی لڑکی؟

''جی نہیں۔ ایک بیٹا بھی ہے۔ پانچ سال کا، وہ باہر اپنے بابا کے ساتھ ہے۔ وہ لوگ آگے کوئی اور گھر دیکھنے نکل گئے شاید۔'' شازمہ اپنی فرضی کہانی کو ہر اینگل سے حقیقت سے دور رکھا تھا۔ تاکہ کل کو کسی وجہ سے مشکوک ہو کر وہ لوگ اسے وقاص کے سامنے ڈسکس کریں تو وقاص کو اُس پر شک نہ ہو۔

''ہمارا کس نے بتایا'' عورت اب اصل مدعے پر آئی۔

''جی خاص طور پر تو کسی نے نہیں۔ اصل میں میرے شوہر کو کسی نے بتایا کہ اس ایریا میں اچھے گھر مناسب ریٹ پر کرایے کے لیے دستیاب ہیں۔ پیچھے ایک دو گھر ہم نے اور بھی دیکھے ہیں۔ آپ کے مکان کا تو یہیں نکڑ پر ایک آدمی نے بتایا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ آپ کے کچھ مکان کرایہ کے لیے خالی ہیں۔'' شازمہ نے یونہی ہوا میں تیر چلا دیا۔ لہجے کا اعتماد البتہ اس نے ڈانوں ڈول نہیں ہونے دیا۔

''اچھا۔ اچھا۔'' عورت مزید مطمئن ہوئی۔

''ہمارے پیچھے دو مکان ہیں تو سہی لیکن آج کل دونوں ہی کرائے پر گئے ہوئے ہیں۔ فی الحال تو اور کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''اوہ۔ اچھا.....'' شازمہ تیزی سے آگے کے متعلق سوچنے لگی۔ مکان کی لایعنی گفتگو تو سمجھو ٹھپ ہوگئی۔ اسے اب کسی بہانے بات کو اور آگے بڑھانا تھا۔ اپنے متعلق بولتے رہنے کا کچھ فائدہ نہیں تھا۔ اسے تو یہاں کے متعلق جاننا تھا۔

''ایک گلاس پانی مل سکتا ہے۔''

''جی۔ ایک منٹ۔'' اُس نے پہلے ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر ذرا سا پیچھے کو ہو کر ایک کھڑکی کا پٹ زور سے بجایا۔ چند سیکنڈز میں ہی ایک کام والی لڑکی دروازے سے باہر آئی۔

''فوزیہ، دو گلاس ٹھنڈا پانی لے آؤ۔''

''جی بھابھی۔'' وہ اندر لوٹ گئی تو شازمہ نے اونچی چھت اور باہر لان کی طرف دیکھتے دوبارہ عورت کی طرف نگاہ کی۔

''اتنے بڑے گھر میں آپ اکیلی رہتی ہیں؟'' سوال اگرچہ بے تکا تھا لیکن پوچھے بنا چارہ نہیں تھا۔

''اکیلی نہیں ہوں۔ میرے ساتھ جیٹھ اور ان کی فیملی رہتی ہے۔''

''جیٹھ کی فیملی۔'' وہ زیرلب بڑبڑا کر رہ گئی۔ اِس جواب کی تو کم از کم وہ بالکل توقع نہیں کر رہی تھی۔ وقاص کے مطابق وہ اور فیاض دو ہی بھائی تھے۔ تو پھر یہ دیورانی جیٹھانی۔ کہیں وہ کسی غلط گھر میں تو نہیں آ گئی۔

''آپ کے شوہر کا شاید لکڑی کا کارخانہ ہے۔ وہ نکڑ والا آدمی بتا رہا تھا۔'' شازمہ کے سوال کے دوران لڑکی پانی لے کر آ گئی۔

''جی ہاں میرے شوہر اور جیٹھ دونوں کے اپنے اپنے کارخانے ہیں۔''

''بھابھی۔'' وہ شمع بھابی پوچھ رہی ہیں دوپہر کے لیے کیا بنانا ہے۔ لڑکی نے مداخلت کی تو وہ عورت اپنے بچے کو لیے فوراً وہاں سے اُٹھ گئی۔

''یا اللہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔'' شازمہ کا دم گھٹنے سا لگا۔ دو بھائی۔ دیورانی، جیٹھانی۔

''معافی چاہتی ہوں۔ میری جیٹھانی مجھے بلا رہی ہے۔'' وہ عورت اجازت کے انداز میں شازمہ سے ہاتھ ملانے لگی۔ ''آپ لوگ آگے چوک سے دائیں مڑیں، وہاں رضوی صاحب کا مکان ہے، ان لوگوں کے کرائے والے بہت مکان ہیں۔'' عورت نے اب صاف صاف اسے یہاں سے جانے کا عندیہ دیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس لڑکی فوزیہ کو وہیں رُکنے کا اشارہ کرتے اندر بڑھ گئی۔ اور شازمہ تو تھی ہی اسی انتظار میں۔ اس کے اندر غائب ہوتے ہی وہ فوزیہ کی طرف پلٹی۔

''میں تو اِن سے نام ہی پوچھنا بھول گئی ان کے شوہر اور جیٹھ کا۔ باہر میرے شوہر کھڑے ہیں۔ ان کو بتانا ہے۔''

''جی یہ نائلہ بھابھی وقاص بھائی کی بیوی ہیں اور شمع بھابی فیاض بھائی۔''

''وقاص کی بیوی۔'' شازمہ کی آنکھوں کے آگے صحیح معنوں میں چاند تارے گھومنے لگے۔ جس عورت کو وہ اتنی دیر سے فیاض کی بیوی سمجھتے اپنی جیٹھانی تصور کر رہی تھی وہ تو اس کی سوتن نکلی تھی..... اور..... اور وہ بچی..... جو اس کی گود میں سوئی تھی وہ وقاص کی بیٹی۔

شازمہ کو لگا برآمدے میں زلزلہ سا آ گیا ہے۔ جانے دماغ گھوم رہا تھا یا آنکھیں۔ ہر چیز گول گول گھومتی سی محسوس ہونے لگی۔ بمشکل سکینہ کی کلائی تھامتے وہ ڈولتی حالت میں گیٹ سے باہر آئی۔ کالی نقاب چہرے پر سرکا کر اپنے حسین چہرے کا درد دنیا سے مخفی کیا اور گہرے گہرے سانس لیتے وہ بیرونی دیوار کے ساتھ کسی ضعیفہ کی طرح سہارا لینے کو ٹھہر گئی۔

''شازمہ باجی۔ آپ ٹھیک تو ہیں۔'' سکینہ کو لگا وہ گرنے والی ہے۔

''کک..... کوئی ٹیکسی، رکشہ روکو سکینہ.....'' وہ اب پیشانی ہاتھوں پہ گرائے دیوار سے ٹیک لگائے

ہوئے تھی۔

رکشہ روک کر سکینہ نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے اندر بٹھایا۔ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگاتے شازمہ نے کرب سے لب چبائے۔ آنکھوں سے بیک وقت کئی آنسو ٹوٹ گرے۔ بڑی تکلیف دہ حقیقت کا پردہ چاک ہوا تھا۔ خود کو سنبھالنا اب اس کے بس میں نہ تھا۔ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح لٹی پٹی سی اپنا آپ خود اپنی آنکھوں سے برباد ہوتا دیکھ رہی تھی۔

وقاص کی بیوی..... وقاص کی بیوی..... ایک ایسی چیختی بازگشت تھی جو، اب تاعمر اس کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔

☆☆☆

ٹی وی پر اگلے روز عید کا اعلان ہوا تھا۔ روشن چمکتے چہروں پر چاند رات کی خوشی چاند بن کر چمک رہی تھی۔ آخری افطاری کے بعد نئے دن کے استقبال کے لیے ایک پرمسرت سی کھلبلی مچ جایا کرتی ہے۔ سوار نے ریسیپشن پر موجود چند سیاحوں اور نوریز، کامران کے کھلتے چہروں پر ایک نظر ڈالتے سیڑھیوں کا رُخ کیا۔ تھکے قدموں سے اوپر جاتے وہ معمول سے زیادہ اداس اور خاموش تھا۔ حالانکہ خود کو گئے دنوں کی یاد سے نکالے اب بڑے دن ہو گئے تھے۔ وہ بیتے دنوں کے اچانک کسی پل یاد آجانے پر سر جھٹک کہ دانستہ خود کو حال میں حاضر کیا کرتا کہ یہ سب اختیاری چیزیں ہیں۔ خود کو پرانی یادوں سے ہلکان کرنا ہے تو بے شک جان بوجھ کر سوچے جاؤ اُن دنوں کو۔ لیکن اگر آپ تہیہ کر چکے ہوں اُن یادوں اور باتوں سے پیچھا چھڑانے کا تو آپ کو اس کے لیے خود کوشش کرنی پڑتی ہے۔ وہ بھی کامیاب رہتا تھا خود کو اُس خرابے سے نکالنے کے لیے۔ پر آج جانے کیوں عید کا اعلان ہوتے ہی کیفیت ڈوبنے اور ہارنے والوں جیسی ہونے لگی تھی۔ رہ رہ کر وہ سب چاند راتیں اور عیدیں یاد آنے لگی تھیں جن میں ہنستے کھلکھلاتے سوار کا دل باقیوں کی نسبت کہیں زیادہ ہوا کرتا۔ گھر میں ہر طرف اسی کے نام کی پکار گونجتی۔ سب کے مسئلوں کا حل، سب کے درد کی دوا جس ایک بندے کے پاس تھی، وہ ایک وہی تو تھا۔۔ اور آج۔ اُداس آنکھوں میں آج بڑے دنوں بعد اپنے گھر کا نقشہ پھر گیا تھا۔ کیا بھاگتے دوڑتے اگلے دن کی تیاریاں کرتے کسی نے بے ساختہ اسے بھی آواز دی ہوگی۔ اس کے بنا اس پہلی عید پر کیا وہ بھی آج اسی کی طرح اداس ہوں گے یا پھر وہ بھی اپنے دلوں کو ٹھیک اسی طرح سمجھا چکے ہوں گے کہ یادیں تکلیف دینے لگیں تو سر جھٹک کر پیچھا چھڑا لینا چاہیے۔ تو کیا وہ بھی اب گھر والوں کے لیے محض ایک تکلیف دہ یاد سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ اور..... فون کی بیل نے اسے حال میں کھینچا۔

''ہیلو۔''

''یار اب چاند رات کو تو ملنے آجاؤ۔ افطاریاں تو خوب کیں ناں میرے ساتھ۔'' میاں جی نے بنا سلام جواب شکوے بھری فرمائش کرتے سوار کو یک لخت ماضی کے سب ہی دریچے مسکرا کر بند کرنے پہ مجبور کر دیا۔

''آپ کا ڈھابا لگتا ہے چاند رات کو بھی ٹھنڈا ہی پڑا رہتا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے ریلنگ سے ہٹ کر دوبارہ نیچے کی طرف بڑھا۔

''اوئے۔ کالی زبان والے۔ دیکھ لے آکر۔ مری کی ٹھنڈ سے بھی زیادہ ٹھنڈا پڑا ہے۔ دیہاڑی والے مزدور بھی چند دنوں کے لیے گھروں کو نکل گئے۔ رب نواز بھی دھوکا دے گیا۔ اب میں بھی آنے جانے والے اکا دُکا مسافروں کو چائے پر ٹرخا رہا ہوں۔''

''اور اب مجھے بھی اپنے ہاتھ کی چائے پلوانا چاہتے ہیں۔'' وہ اب ہنستے ہوئے سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔

''پی کر دیکھو، چاند رات کا مزا دوبالا نہ ہو جائے تو کہنا۔''

''کل عید نماز کے بعد آؤں گا میاں جی، ابھی نکلنا بہت مشکل ہے۔'' سوار ریسٹورنٹ سے گزرتے

اپنے آفس میں داخل ہوگیا۔ اب وہ سنجیدگی سے میاں جی کو اپنے پروگرام سے آگاہ کررہا تھا۔

''صبح پھر کوئی بہانہ بنا دو گے۔'' ان کا موڈ آف ہوا۔

''سچی نہیں بناؤں گا۔ بزرگوں کی دعا لیتے عید کا آغاز کرنے کی برسوں پرانی عادت ہے۔ یہاں بھی اسے جاری رکھوں گا۔'' وہ پھر انہیں چھیڑنے لگا تھا۔

میاں جی بھی ہنس کر سر ہلانے لگے۔

''میں انتظار کروں گا۔''

سوار موبائل آف کرتے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ میاں جی کی کال نے بڑی حد تک دل کے بھاری پن کو کم کردیا تھا۔ اور ہری پور سے مری واپس لوٹ آنے کی راہ میں ایک میاں جی ہی نہیں پڑتے تھے۔ یہاں کی پہلی عید کی صبح اگر میاں جی کی چائے سے آغاز ہونی تھی تو آگے کے دن میں کہیں نہ کہیں کنعان کا ذکر بھی ضرور ہونا چاہیے۔ وہ مسکراہٹ لبوں میں دبائے اب کھلی آنکھوں سے تصور کررہا تھا کہ عصیلی شہزادی بھی چاند رات کی خوشی منا رہی ہوگی۔ عید کی تیاریوں میں مصروف جانے کل کا دن کس انداز میں گزارنے والی تھی۔

''ایک نظر دیکھنا تو بنتا ہے۔'' شرارتی دماغ نئے پلانز ترتیب دینے لگا تھا وہ بھی اُس لمحے دل و دماغ کو کھلی چھٹی دینے کے موڈ میں تھا، کنعان کی ایک جھلک دیکھنے کا خیال دل میں پوری طرح جاگزیں ہوچکا تھا۔ پھر مری میں اس کے درد کا درماں دو ہی تو جگہیں تھیں۔ سوار نے وہیں بیٹھے بیٹھے پختہ ارادہ کرلیا کہ میاں جی کے ڈھابے سے وہ سیدھے ازمیر ہوٹل جائے گا۔

☆☆☆

مسٹرڈ، مہندی اور براؤن کلر کی مکس پرنٹ والی فراک کے ساتھ مسٹرڈ دوپٹا گلے میں ڈالے آج وہ ہال اسٹریٹ کیے کو پرکلر کا لائٹ میک اپ اور لپ اسٹک لگائے ہوئے تھی۔ جبکہ دیا سبز پری بنی تیز پنک میک اپ میں تھی۔ گھر میں فوٹو گرافی کے بعد دونوں کا مال روڈ گھومنے کا ارادہ تھا۔

''حیرت ہے۔ آج ''تمہارا'' مال روڈ گھومنے کا دل چاہ رہا ہے۔'' دیا نے لفظ تمہارا پر بطور خاص زور دیا۔ وہ جو رش سے سخت گھبراتی تھی۔ کل شام سے ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھی۔ معاملہ دیا کے کچھ خاص پلے تو نہیں پڑا لیکن بجائے اس پر غور وخوض کرنے کے اس نے باسط کو اپنے پروگرام سے آگاہ کردیا۔ عید کے دن اگر مال روڈ پہ سہی باسط سے اس کا سامنا ہوسکتا تھا تو اسے کسی اور جگہ جانے کی کیا ضرورت تھی۔

اور اب وہ دونوں تیار ہوکر گھر سے نکل رہی تھیں۔ صبح سویرے تیار ہوکر کنعان پہلے دیا کے گھر اس کی امی اور بھابی کو عید مبارک کہنے گئی تھی۔ اس کے ابو بھی عید نماز کے بعد دیا کے والد اشفاق انکل کے ساتھ ان ہی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ اسے اور دیا کو چونکہ گھومنے پھرنے کی جلدی تھی اس لیے فوراً نکل آئے۔ گھر واپس آکر کنعان نے ایک نظر دوبارہ اپنی یتاری کو بغور دیکھا اور اب اپنے دوپٹے کو پن کی مدد سے سر پر سیٹ کرکے دونوں مال روڈ کی واک کو نکل گئیں۔ مال روڈ پر لوگوں کا رش معمول سے قدرے کم ہی تھا لیکن بہرحال رونق تو تھی۔ رنگ رنگ کے لوگوں پر تبصرے کرتے دونوں ملینئم مال تک آگئیں۔ کچھ دیر مال کے اندر گھومتے رہنے کے بعد باہر نکلنے پر دیا نے واپسی کی راہ اختیار کی تو کنعان نے بے ساختہ روک دیا۔

''تھوڑا اور آگے تک چلتے ہیں۔''

''آگے؟'' دیا ٹھٹکی۔ ''ناظمہ میم کو عید مبارک کہنا ہے کیا؟''

''نہیں بھئی۔ کسی کو عید مبارک نہیں کہنا۔ یونہی ذرا مزید واک کا موڈ ہے۔'' وہ نظریں چُرا کر آگے بڑھ گئی۔

دیا نے بے ساختہ درآتی ہنسی چھپا کر ہم قدم ہونے کی کوشش کی۔ کنعان پیٹرا ان کے سامنے سے گزرنا چاہتی تھی لیکن صاف کہنے میں بڑی معصوم سی

جھجک مانع تھی۔ دیا نے بھی آج تنگ کرنے کا ارادہ دل میں دبا لیا۔ گفٹ والی غلطی کے بعد وہ خود ہی کافی محتاط ہوگئی تھی۔ عید کے اس خاص موقع پر وہ شاید سوار کو ایک نظر دیکھ لینے کی خواہش مند تھی۔ اب، بھلا دیا سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا محبت کی ایسی مجبوریوں کو۔

اکیڈمی والے روڈ تک چلتے ہیں۔ وہاں فوٹوگرافی بہت اچھی ہوگی۔ اور موسم بھی کیا شاندار ہو رہا ہے۔ دیا نے قطعی طور پر انجان بنتے اپنے قدم اس سے آگے کیے۔ پیٹرا اِن بس اب چند قدموں کی دُوری پر تھا۔ دیا چاہتی تھی وہ جس قدر تسلی سے چاہے خوب ڈھونڈ ڈھونڈ کر سوار کو تلاش کر لے۔ موبائل اسکرین پر جھکے وہ خود کو اردگرد سے بے نیاز ظاہر کرتے آگے نکل گئی۔

کنعان نے کسی اُمید پر شیشے کے پار دیکھا۔ بڑی گلاس ونڈو سوار کے آفس کا منظر صاف صاف دکھاتی تھی۔ ذرا آگے جانے پر مین ڈور سے ریسیپشن ایریا بھی سامنے دکھائی دیتا لیکن نہ تو آفس میں، نہ ہی ریسیپشن پر۔ کنعان کی آس بھری نگاہیں خالی ہی لوٹ آئیں۔ چپ چاپ چلتے وہ اکیڈمی جانے والے راستے کو مڑ گئی۔ تصویروں کے شغل میں زبردستی خود کو خوش ظاہر کیا جبکہ دل بری طرح اُچاٹ ہوگیا تھا۔ دس پندرہ منٹ میں ہی وہاں سے واپسی بھی کر لی۔ واپس آتے بھی دُرِ مراد حاصل نہ ہوا۔ جانے دل نے کیوں امید باندھ لی تھی کہ عید کے دن وہ سوار کو ضرور دیکھ لے گی، پر ایسی اُمیدیں اتنی آسانی سے کہاں پوری ہوا کرتی ہیں۔ دل نے تو بلکہ اور بھی کچھ کہا تھا۔ نا اُمید ہونے پر وہ احساس بھی وہم کی طرح اندر گھر کرنے لگا۔

چاند رات کا اعلان ہوتے ہی تیاریوں وغیرہ کے دوران، وہ خیالوں ہی خیالوں میں جانے کہاں تک ہو آئی تھی۔ معلوم نہیں کیوں پر اس کا دل بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ کل اگر سوار سے اس کا اتفاقاً کہیں سامنا ہوگیا تو ضرور اِس تعلق میں کچھ خاص بات ہے۔ ان دونوں کا ملنا، کنعان کی اس کے لیے محبت۔ عام اور معمولی قصہ نہیں ہو سکتے۔ لیکن..... تھکے قدموں سے واپس جاتے وہ خود ہی اپنے الفاظ و خیالات پر پشیمان ہونے لگی۔ کہاں تو اتفاقاً سامنے کی باتیں سوچ رہی تھی اور یہاں شعوری کوشش کے نتیجے میں بھی فقط مایوسی کا سامنا کیا تھا۔

دوسری طرف عین انہی لمحوں میں سوار کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ میاں جی کے ڈھابے پر نماز کے فوراً بعد پہنچ کر اس نے حسبِ وعدہ ان کے ہاتھوں کی مزیدار چائے پی اور سیدھا ازمیر ہوٹل آ گیا۔ لیکن یہاں اس کی ریسیپشن پر صرف حبیب اللہ سے ملاقات ہو پائی۔ قاسم کے متعلق پتا چلا کہ وہ دو روز کی چھٹی پہ گھر گیا ہے، صدیق کچھ دیر پہلے کہیں نکلا تھا اور رفیق سر کے بارے میں قاسم نے کہا کہ گھر پر کچھ مہمانوں کی آمد کے باعث انہیں جانا پڑا۔ سوار کو صدیق سے عید نہ مل سکنے پر اگر افسوس ہوا تھا تو رفیق سر کے گھر چلے جانے نے بے تحاشا خوشی بھی بخشی تھی۔ وہ اب اُن سے ملنے کے بہانے ان کے دروازے پر جا سکتا تھا۔ حبیب اللہ سے کچھ ہی دیر میں اجازت لے کر وہ رفیق سر کے گھر کی طرف چل پڑا۔ کنعان کو دیکھ لینے کی راہ کچھ اور آسان ہو رہی تھی۔ لیکن افسوس کہ یہ محض اس کا خیال ثابت ہوا کیونکہ دروازہ اماں نے کھولا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ رفیق احمد ابھی کچھ دوستوں کو لیے کسی کیفے ٹیریا گئے ہیں۔ گھر پر کوئی نہیں ہے۔ وہ سخت مایوس سا پیچھے کے پرسکون راستے سے واپس اپنے ہوٹل چلا گیا۔ قسمت شاید اُس لمحے واقعی ساتھ دینے کو تیار نہ تھی۔ ورنہ اگر وہ پچھلے راستے کے بجائے مال روڈ سے واپسی کرتا تو وہاں سے واپس آتی کنعان سے سرِ راہ ضرور ملاقات ہو جاتی۔ لیکن اگر وہ یہ بات جانتا ہوتا تب ناں۔

☆☆☆

امی نے آج اسے سختی سے منع کیا تھا کہ عید والے دن وہ ہرگز ہوٹل نہیں جائے گی لیکن ثمامہ اسی خیال سے آج ضرور جانا چاہتی تھی کہ جانے ہوٹل کا

...لے حوالے سے معاملات کو کیسے ہینڈل کر رہا ... لیکن امی کا رعب بہرحال سر پہ اتنا سوار تھا کہ ... ے دوران اس کی ہمت ہی نہیں ہوئی امی سے اجازت لینے کی اور اب رات کو آٹھ بجے، وہ بھی خوب ضد کر کے گاڑی نکال لے گئی۔ پچھلی شام کے بعد وہ آج اس وقت واپس آ رہی تھی۔ باقی سب کچھ تو ثمامہ کو معمول کے مطابق ہی لگا لیکن سوار کو دیکھتے ہی جانے کیوں احساس ہوا کہ وہ بہت خاموش اور بجھا بجھا سا ہے۔ ثمامہ نے بس چند ہی سیکنڈز لیے سوچنے میں اور آدھے گھنٹے بعد واپس گاڑی میں بیٹھتے ہی کال کر کے سوار کو بھی باہر بلا لیا۔

"میری رسٹ میں کچھ پین محسوس ہو رہا تھا۔ آپ ڈرائیونگ کر لیں گے سوار۔" ہوا سے اڑتے بالوں کو ماتھے سے ہٹاتے اس نے اعتماد سے جھوٹ کا سہارا لیا۔

"جی میم آئیے۔" سوار نے آگے بڑھ کر اس کے لیے فرنٹ ڈور کھولا۔

"تھینکس سوار۔" فرنٹ سیٹ پر اس کے قریب بیٹھتے وہ آج بے تحاشا خوش تھی۔ جانے یہ خیال پہلے کیوں نہ آ گیا، آفس میں تو ہمیشہ ہی وہ اتنا ریزرو رہتا تھا۔ آئندہ کے لیے کسی نہ کسی بہانے اسے باہر لے جانا یقیناً بڑا سودمند ہو سکتا تھا۔ دوستی کی فضا آخر یونہی تو نہیں قائم ہو جاتی، کچھ ایفرٹ تو ڈالنی ہی پڑتی ہے۔

"اور......؟" وہ قدرے رخ ترچھا کر کے سوار کو دیکھنے لگی۔ "کیسا رہا عید کا پہلا روز؟"

"ایز یوژول میم۔" وہ سامنے دیکھتے فارمل سا مسکرایا۔

"کہیں گئے نہیں آپ؟ میں تو کہہ گئی تھی کہ باری باری ہی سہی، عید بھی سب ضرور انجوائے کریں۔"

"جی میم۔ سب کو موقع دیا تھا۔ مجھے بھی بس ایک، دو دوستوں سے ملنا تھا۔ پھر واپس آ گیا تھا۔ نوریز اور آصف نے بھی جانا تھا۔" وہ آہستہ روی سے گاڑی معمول کے رش سے گزارے لے جا رہا تھا۔ "کہاں جانا ہے میم؟" مؤدب لہجہ اپناتے سوار نے بالآخر پوچھ ہی لیا کہ ثمامہ تو اس دھیان میں لگتی ہی نہ تھی

"اوہ سوری۔" سخت خفت زدہ ہوتے ثمامہ ہنس پڑی۔ "ذرا آگے ایک کافی شاپ ہے۔ بس وہیں تک چلتے ہیں۔" سوار جواباً سر ہلا کر رہ گیا۔ بڑے لوگوں کے بھی کیا کہنے تھے۔ اپنے ہوٹل کی کافی چھوڑ کر مال روڈ کا انتخاب فرما رہی تھیں۔

"تو اوور آل۔ دن آپ کا کچھ خاص اچھا نہیں گزرا۔"

"جی؟" سوار نے کچھ نہ سمجھتے تعجب سے گردن گھمائی۔ ایسا تو اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ نظر ملنے پر وہ مسکرا دی۔

"یہ میرا اندازہ ہے۔ آپ کو دیکھتے ہی مجھے کچھ ایسا لگا کہ...... کہ......" وہ کوئی مناسب لفظ ڈھونڈ رہی تھی

"سم تھنگ از مسنگ؟" سوار نے مسکرا کر جملہ مکمل کیا۔

"رائٹ۔" ثمامہ نے ڈیش بورڈ پہ انگلی بجائی۔ "بالکل یہی۔"

"ایکچوئلی دوستوں سے ملاقات نہیں ہو پائی۔ جہاں بھی گیا، بنا ملے ہی واپس آنا پڑا۔" اس نے متانت سے وضاحت کر دی۔

"تبھی مجھے بار بار لگ رہا تھا کہ آپ کو ایک کپ کافی کی سخت ضرورت ہے، وہ بھی کسی دوستانہ ماحول میں۔ آؤٹ ڈور۔" ثمامہ نے اس بار باہر نکلنے کا مقصد بھی سہولت سے اس پر ظاہر کر دیا۔ سوار البتہ دل ہی دل میں حیران ہو کر رہ گیا کہ ثمامہ نے یہ اہتمام محض اس کی خاطر کیا تھا۔ وہ دونوں کافی ہاؤس پہنچ چکے تھے۔ پارکنگ میں کار روک کر دونوں ایک ساتھ ہی اندر داخل ہوئے، ثمامہ شاید پہلے بھی یہاں آ چکی تھی۔ آگے بڑھ کر سیڑھیاں چڑھتی خود ہی اوپری منزل پر چلی گئی۔ سوار نے تو ظاہر ہے پیش

قدمی ہی کرنی تھی۔

''بہت دنوں سے ایک سوال نے اندر ہی اندر خوب بے چین کر رکھا ہے۔ آپ کی اجازت ہو تو پوچھ لوں۔'' ثمامہ شوخ نگاہوں کا تبادلہ کرتے سراپا سوال تھی سوار کی آنکھوں میں واضح تعجب کی لہر اُبھری۔ لیکن بنا کوئی جواب دیے اُس نے محض دیکھنے پر اکتفا کیا تھا۔

''کبھی آپ کو یہ لگا کہ ہم اِس سے پہلے بھی مل چکے ہیں؟''

''پہلے؟'' سوار نہ جانے کیوں بے ساختہ ہنس دیا تھا۔

''ارے بھئی، میرا اشارہ کچھ پچھلے جنموں وُنموں کی طرف نہیں ہے۔'' اس بار ثمامہ بھی اس کی ہنسی کا مفہوم سمجھتے کھلکھلا دی تھی۔ ''دراصل ہم سچ مچ پہلے مل چکے ہیں۔ کچھ دن پہلے..... نہیں.....'' وہ سوچنے کے لیے رکی۔ ''اب تو غالباً کچھ ماہ ہو چکے ہیں۔ آپ کو وہ دن یاد نہیں جب ایک لڑکی نے آپ کو جوس والا سمجھ کر اپیل جوس کا آرڈر دیا تھا۔ بلکہ متوجہ کرنے کے لیے کندھے پر پاؤچ بھی بجایا تھا۔

''اوہ۔'' سوار نے پیچھے پشت ٹکاتے بالوں میں انگلیاں گھمائیں۔ ''بالکل یاد ہے۔ لیکن چہرا واقعی ذہن میں نہیں تھا۔ لڑکیاں دراصل روزانہ ہی الگ گیٹ اپ میں ہوتی ہیں۔ معذرت کے ساتھ۔'' ہاتھ اٹھا کر سوار نے اپنے تبصرے پر قبل از وقت معافی چاہی۔ ثمامہ نے سریلا سا قہقہہ لگا کر گویا اس کے کہے کی تائید کی۔

بالوں کے نت نئے اسٹائل اور کپڑوں کے فیشن ہمیں کہاں ایک جیسا نظر آنے دیتے ہیں۔ آپ نے بالکل درست کہا۔ بہرحال آپ کو اکیڈمی میں دیکھتے ہی مجھے یاد آ گیا تھا کہ یہ وہی غصیلا لڑکا ہے۔ وہ اب شرارت سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ سوار نے تبصرہ محفوظ رکھتے مسکرا کر کافی کا کپ اُٹھا لیا۔

اوپری منزل سے نیچے مال روڈ کا منظر دُور تک بڑی وضاحت سے دیکھا جا سکتا تھا۔ سوار اپنی چیئر پہ یوں بیٹھا تھا کہ رُخ پنڈی پوائنٹ کی طرف تھا۔ نظر بے ارادہ اِس بار سامنے گئی تو واپس پلٹنا ہی بھول گئی۔ مسٹرڈ کلر کی فراک میں بلاشک وشبہ وہ کنعان ہی تھی جو اپنے بابا کے ساتھ چلتے اب غالباً گھر کو واپس جا رہی تھی۔ چند ہی قدم مزید آگے آنے پر اس نے کافی شاپ کے نیچے سے گزر جانا تھا۔ سوار کے اندر شدت سے خواہش مچلی کہ وہ بھی ایک نظر اوپر اٹھا کر اسے دیکھ لے۔ لیکن کیسے..... رفیق سر تھوڑا سا آگے تھے اور ہاتھ میں پکڑے شاپرز میں سے کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ موقع اچھا تھا۔ سوار نے سامنے رکھے واز میں سے سورج مکھی کا نقلی پھول نکال کر کنعان کا نشانہ لیا۔

ثمامہ سوار کو تو دیکھ رہی تھی لیکن نیچے کون تھا وہ دیکھ نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ اس کے مقابل بیٹھنے کے بجائے بائیں ہاتھ والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ نیچے روڈ کا منظر دیکھنے کے بیچ میں میز حائل تھی۔ سوار کے لبوں پر بڑی میٹھی، دوستانہ سی مسکراہٹ تھی، پرانداز بے فکرا سا۔ وہ اطمینان سے کافی پیتی رہی۔

کنعان کے کندھے سے پھسل کر پلاسٹک کا پھول سامنے آنچل پہ آ گرا۔ اُس نے بے ساختہ نگاہ اوپر کی۔ اور وہ عید کا چاند تو کس قدر نیچے اُتر آیا تھا۔ چھوٹا سا دہانہ بے یقینی سے کھولے وہ قطعی طور پر اردگرد سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ سوار نے ہلکا سا ہاتھ ہلایا تو کنعان نے مسکرا کر سر کو خفیف سا آگے کرتے دُور کی اِس ہیلو کا جواب دیا۔

''چاہیں تو مل آئیں اپنے دوست سے۔''

ثمامہ نے فراخدلی سے بڑی ہی پرکشش آفر دی تھی لیکن سوار اگلے مرحلے کے معاملے میں قدرے محتاط سا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ثمامہ کنعان کو دیکھ لے۔ حالانکہ رفیق سر سے ملنے کے بہانے جا سکتا تھا لیکن ثمامہ اگر رفیق سر کو دیکھ لیتی تو دوست کہنے اور پھول پھینکنے کے معاملے پر مشکوک ہو سکتی تھی اور اُسے کنعان کی عزت بہرحال ہر چیز سے زیادہ

پیاری اور کسی بھی جذباتی اقدام پر مقدم تھی۔ بمشکل خود پر جبر کرتے کچھ دور تک گھر کو جاتی کنعان کو دیکھا جس نے جاتے جاتے ایک بار پھر مُڑ کر اُوپر دیکھا تھا۔ نظروں کے اِس آخری تبادلے نے دونوں کو ہی بھینچ کر مسکرا دینے پہ مجبور کیا تھا۔ ''فرینڈز'' بننے کے بعد یہ پہلی دوستانہ مسکراہٹ تھی جس کا تبادلہ اُن دونوں کے درمیان بے شمار سماجی پابندیوں کے بیچ ہو پایا تھا۔ اور ہاتھ آئی تھی ایک انہونی خوشی جس نے چاندرات سے اندر طوفان مچا رکھا تھا۔ سوار اگر اُس لمحے شامہ کا مشکور تھا کافی ہاؤس لے آنے پر تو کنعان سوار کے پھول پھینکنے پر خوش تھی۔ اگر جو بے دھیانی میں بنا اُسے دیکھے وہاں سے گزر جاتی تو جانے کیسے کیسے وہم ستاتے رہتے۔

تو کیا واقعی یہ رشتہ خاص تھا۔ پہلی عید اور ایک اتفاقی ملاقات۔ معلوم نہیں ایک معصوم پری کا خود ساختہ خیال حقیقتاً بھی کوئی معنی رکھتا تھا یا نہیں۔

☆☆☆

''وہ چھ راتیں جن میں آپ میرے ساتھ نہیں ہوتے وقاص۔ آپ کہاں گزارتے ہیں؟''

''ہوں؟'' صوفے پر سہولت سے پھیل کر بیٹھتے وقاص کی انگلی ریموٹ پر کانپی۔ شازمہ کے کھوئے کھوئے انداز تو جب سے وہ آیا تھا محسوس کر ہی رہا تھا لیکن طبیعت کی خرابی پہ محمول کرتے نظر انداز کر دیا تھا۔ پر اب ایسا سوال۔ صحیح معنوں میں وجود ڈگمگا سا گیا تھا۔ شازمہ یقیناً سکینہ کے جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ گھنٹہ بھر پہلے جب وہ یہاں آیا تو سکینہ کو ابھی اس کا بھائی لینے نہیں آیا تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ اپنے گھر کے لیے نکلی تھی۔

''کیا مطلب شازمہ۔ کیا پوچھ رہی ہو؟'' اُس نے بمشکل خود کو سنبھالا۔ ''اچھا یہاں آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔'' اُس نے مسکرا کر اشارے سے شازمہ کو قریب بلایا۔

''میں تمہارے گھر گئی تھی وقاص۔ برف لہجہ اور یخ ٹھنڈا جملہ۔'' وقاص کو لگا وہ پورا جم گیا ہے اپنی جگہ پر۔''

''گھر..... یو مین بڑے گھر..... فیاض بھائی.....''

''ہاں فیاض بھائی کا گھر جو دراصل صرف فیاض بھائی کا نہیں ہے، جہاں تم بھی باقی کے چھ دن گزارتے ہو، جہاں صرف تمہاری بھابھی شمع اور بھتیجے بھتیجیاں ہی نہیں، تمہاری بیوی نائلہ اور تمہاری ایک بچی بھی رہتے ہیں۔'' برف پگھلنے لگی تھی۔ شازمہ کی آنکھوں میں درد تیرنے لگا۔

وقاص کو لگا صوفے سے آکٹوپس کے لاتعداد بے شمار بازو نکل کر اُسے جکڑنے لگے ہیں۔ کیا کچھ ہو چکا تھا، کیا ہونے والا تھا۔ وہ کب گئی تھی دوسرے گھر۔ کیا بات ہوئی نائلہ سے۔ اُف کیا قیامت آ چکی ہوگی وہاں۔ وہ تو ابھی سیدھے کارخانے سے یہاں آیا تھا..... اور نائلہ..... وقاص کی آنکھیں جیسے آکٹوپس کے جکڑنے سے باہر اُبل پڑنے کو تیار تھیں۔

''وہاں کیا کرنے گئی تھیں۔ کس کی اجازت سے۔'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر شازمہ کے قریب آیا تھا اور خوں خوار نظروں سے دیکھتے اُس کی چوٹی کو پکڑا۔

''کب گئیں تم وہاں، بولو شازمہ۔ کیا تماشا کھڑا کر آئیں۔ بولو.....'' وہ اسے بری طرح جھنجوڑ رہا تھا۔ ''کیا کہا نائلہ سے؟''

دھواں دھواں چہرا لیے وہ اس وقت شدید اضطراب میں تھا اور اس کے مضبوط ہاتھوں میں جکڑی حیرت سے گنگ شازمہ بے یقینی سے وقاص کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ جسے پہلا شاک لگا بھی تھا تو صرف نائلہ کا۔ اور وہ۔ وہ کیا تھی وقاص کے لیے، سامنے کھڑی اس کی محبوب بیوی، شوہر کی پہلی شادی کے صدمے سے دوچار۔ اُسے بھی تسلی کی ضرورت تھی۔ جانے پچھلی شام رات اور اب وقاص کے یہاں آجانے تک کے بیچ اپنے غم کی شدت کو ہلکا کرنے کے لیے وہ کتنا کچھ فرض کر چکی تھی۔ وہ پیار سے اُسے منائے گا، پچکارے گا۔ اپنی مجبوریوں کا

احوال، پہلی بیوی سے بیزاری، منانے کے طریقے، چاؤ، حیلے بہانے پر۔ پر ایسا کچھ تو اُس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ شازمہ کے ریشمی بالوں کی چوٹی ہاتھ میں لیے وہ کیسی نفرت بھری نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ سراسر خود قصوروار ہوتے وہ کس بنیاد پر شازمہ پہ چلا رہا تھا۔ وہ اِس وقت کس دکھ، کس کیفیت سے دوچار تھی وقاص کو اِس سے کچھ سروکار ہی نہ تھا۔

''بکو شازمہ۔ کس نے بتایا تمہیں اِس بارے میں۔ اور کب گئیں تم اُدھر؟''

''ہونہہ۔'' آنسوؤں کو زبردستی پیچھے دھکیلتے ہوئے وہ خود کو چھڑوا کر دُور ہوئی۔ ''کچھ نہیں بتاؤں گی، جاؤ خود معلوم کرلو۔''

''تمہیں تو میں آکر دیکھتا ہوں۔'' اُس نے بھی فی الفور میز سے چابی اٹھاتے یہ آخری جملہ پھینکا اور باہر نکل گیا۔

دوسرے گھر جا کر حالانکہ کچھ اس کے ہاتھ آنے والا نہیں تھا کہ قیامت بہرحال ابھی صرف شازمہ کے دل پر ٹوٹی تھی۔ جانے وہاں کا تسلی بھرا ماحول دیکھ کر وقاص کا کیا ردعمل ہوتا لیکن فی الوقت جو کچھ شازمہ نے دیکھا اور محسوس کیا تھا وہ وقاص کی پہلی شادی کے متعلق جان لینے کے دُکھ سے کہیں بڑھ کر تھا۔ وہ شخص جس کے ساتھ کی خاطر جانے اُس نے کتنا کچھ خود پر جھیلا تھا تنکے برابر بھی اس کے درد کو اپنے دل پر محسوس نہیں کر پایا تھا۔ حالانکہ اس کی آمد سے وہ کیسی کیسی خوش گمانیوں کا شکار تھی۔ حتیٰ کہ تصور میں اس نے وقاص کو اپنے پیروں میں بیٹھا دیکھا تھا جو اس کی دلجوئی کرتے کسی بھی حد تک جاسکتا تھا۔ اُس کی تمام شرائط ماننے کو تیار، بس کسی طرح اُس کے دُکھی دل کو خوش کرنے کے جتن کرتا اُس کا اپنا وقاص۔ لیکن..... خوش گمانی کی پٹی تو ایک پل میں ایسے اتری تھی کہ سلگتے دشت میں وہ ببول کے بوٹے سی یکا و تنہا کھڑی رہ گئی تھی۔ بے مول، بے کار!

''ہاہ۔'' یخ ٹھنڈی آہ بھرتے اُس نے خالی در و دیوار کو ایک نظر دیکھا۔ سکینہ بھی چلی گئی تھی اور وقاص بھی کہاں واپس آنے والا تھا۔ لیکن تنہائیوں سے لڑتے اِس ایک رات کی صبح کرنا اب قدرے آسان لگ رہا تھا کہ اب تو شاید ساری زندگی اِن مہیب سایوں کی نذر ہونے والی تھی۔ تسلی فقط اتنی تھی کہ ذرا سا درد اب اُس نے اس کے حصے میں بھی ڈال دیا تھا جس نے دھوکا دہی کی انتہا کر دی تھی۔

☆☆☆

پارٹی کے لیے چار بجے کا ٹائم دیا گیا تھا۔ سوار کو پیٹر اِن سے نکلتے ساڑھے چار ہو گئے۔ ڈھلان چڑھ کر وہ کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوا تو اکیڈمی کا ماحول بے اختیار میاں جی کے ڈھابے کی یاد دلا گیا۔ جانے میوزک سسٹم کس شوخے کا آئیڈیا تھا۔ ہال کمرے سے گانے کی آواز آرہی تھی۔

پیار کے لیے چار پل کم نہیں تھے
کبھی تم نہیں تھے، کبھی ہم نہیں تھے
پیار کے حسیں کب یہ موسم نہیں تھے
کبھی تم نہیں تھے، کبھی ہم نہیں تھے

وہ اندر آیا تو سوائے مریم، فاطمہ کے باقی سب ہی آچکے تھے دلیر بھائی بھی دکھائی نہیں دیے۔ سیما باجی سے پتا چلا کہ وہ ابھی ہنگو سے ہی واپس نہیں آئے۔ عید کے لیے گاؤں جانے سے قبل انہوں نے پرامس یہی کیا تھا کہ تیسری عید کو پارٹی کے ٹائم تک ضرور آملیں گے لیکن وعدہ کسی وجہ سے پورا نہیں کر پائے۔ عمران بلیک اور براؤن کے امتزاج میں بلاشبہ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا اور میوزک سسٹم بھی وہی اپنے ساتھ لایا تھا۔ لڑکیاں باوجود تمام تر تیاری کے غیر مطمئن سی ہینڈ بیگز میں گھسی کبھی آئینہ تو کبھی لپ اسٹک نکال کر اپنے آپ میں مگن تھیں۔ سوار کا استقبال کافی پُرشور قسم کی ہائے ہیلو سے کیا گیا۔ وہ مسکرا کر سر خم کرتے عمران کی طرف بڑھ گیا۔ ریفریشمنٹ کے متعلق یہی طے پایا تھا کہ رقم اکٹھی کر کے ریڈی میڈ کھانا منگوایا جائے گا جس کی ذمہ داری مومنہ میم اور بشریٰ باجی نے اکیڈمی میں کام کرنے والے سلیم اور خاور پر لگائی تھی۔ اِس لحاظ

سے کرنے کو آج واقعی کچھ نہیں تھا سوائے گپ شپ، ہلا گلہ اور مستی کے۔

سوار نے سی ڈیز کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ غلام علی کی غزلیں۔ اُس نے ہنس کر سرگنی میں ہلایا۔ اورنج، گرین لہراتا آنچل آج کم از کم اُداس غزلوں پر تو قطعاً آمادہ نہیں کر رہا تھا۔ کچھ اور..... اُس نے دوسری سی ڈی اُٹھائی کہ عمران نے گانا تبدیل کیا۔

دل کے کہانیاں۔ پہلی دفعہ
ارمانوں میں روانیاں۔ پہلی دفعہ
ہو گیا بیگانہ میں ہوش سے پہلی دفعہ
پیار کو پہچانا احساس ہے یہ نیا.....
سنا ہے سنا ہے
یہ رسم وفا ہے
جو دل پہ نشہ ہے
وہ پہلی دفعہ ہے

دھیما سوفٹ میوزک اور عاطف اسلم کی آواز۔ سوار کا ہاتھ رُکا۔ ویڈیو سسٹم سے ہٹ کر وہ لان میں کھلنے والی کھڑکی کی طرف آیا۔ دونوں پٹ پورے کھول کر تازہ ہوا کا راستہ وا کیا۔ دھوپ اور بادلوں کی آنکھ مچولی صبح سے جاری تھی۔ اِس وقت بادل کا کوئی ٹکڑا عین لان کے اوپر تن کے کھڑا تھا۔ سیما اور بشریٰ باجی خاور کے ساتھ ٹیبل سیٹ کر رہی تھیں۔ لڑکیوں کا گروپ تیاری سے شاید کسی قدر مطمئن ہوتے باہر نکل آیا تھا۔

کنعان کے کالی ڈریس پر اورنج اور سبز کڑھائی تھی اس لیے لہراتا آنچل تین رنگوں کی بہار دکھا رہا تھا۔ کھلی ریشمی زلفوں اور گولڈن اورنج لائٹ سے میک اپ میں معلوم نہیں واقعی آج وہ سب پر حاوی تھی یا سوار کو لگ رہی تھی۔ اپنے آپ میں مست مگن، ہر جانب سے لاپروا، صرف عید کی خوشیوں سے مزے لیتی۔ بے فکری سے قہقہے لگاتی۔ مہک کے کان میں جھک کر اس نے شوخی سے کوئی بات کی اور گال کے ڈمپل چمک کر معدوم ہوتے بادلوں کی اٹھکیلیوں سے میچ کرنے لگے۔ سوار نے مسکرا کر نظر ہٹالی۔

چناروں کے سایے تلے آج وہ ضرور کچھ ایسا کہہ بیٹھنے کے موڈ میں آ گیا تھا کہ جس کے بعد نینڈوں کا روٹھ جانا یقینی تھا۔ اور نینڈوں کی اِس حسین محرومی سے قطعاً خائف نہ ہوتے وہ رت جگوں کے سفر پر اس رنگ برنگی تتلی کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے اُفق کے پار تک ہو آنے کو تیار تھا۔ کچھ بے اختیار سی کیفیات میں دل یونہی بے پتوار سا ڈولنے کو بے تاب ہونے لگتا ہے۔ محبت کے موسموں میں جب گھڑی کی ٹک ٹک بھی صرف تم تم کا راگ الاپتی ہے، وہ بے خود ہو کر آگے بڑھنے اور پہل کرنے کو بچے سا مچل اٹھا تھا۔

انعم نے ہاتھ لہرا کر اُسے باہر آنے کو کہا۔ کنعان نے انعم کی نظروں کے تعاقب میں اِسی طرف دیکھا۔ نظریں سوار سے چار ہوئیں اور اسے دیکھتے پا کر وہ دوسری جانب دیکھنے لگی، یونہی معمول کے مطابق بنا کسی تحریر کے خالی خالی نگاہ۔ سوار نے ایک تھکی تھکی آہ خارج کرتے اپنے جذبوں کو سرد پڑتا محسوس کیا۔

جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہو۔ شاید کچھ بھی نہیں۔ ناظمہ میم کی برتھ ڈے والی شام بھائی کہنے کی ریکوئسٹ پر کنعان کے چہرے پہ چھپی وہ بے یقینی یوں تھی جیسے کسی بے قصور پہ رکیک الزام دھر دیا جائے۔

''آؤ سوار۔'' کام نمٹا کر بشریٰ اور سیما باجی بھی اب باہر جانے لگی تھیں۔

''تمہاری عید اچھی نہیں گزری کیا؟'' بڑے چُپ چُپ ہو سیما باجی مسکرا کر اُسے دیکھ رہی تھیں۔

''دلیر بھائی کو مس کر رہا ہے شاید۔'' سیما باجی کا انداز چھیڑنے والا تھا۔ بشریٰ اور وہ بیک وقت ہنس دیے۔

''ارے ایسا ویسا۔'' آہیں بھرنے کو دل چاہ رہا ہے۔ وہ بھی موڈ میں آ گیا۔

بشریٰ اور سیما کے مشترکہ قہقہے پر سب نے گردن موڑی۔ کنعان نے تعجب سے سوار کی بدلتی

کیفیت کو دیکھا۔ سرخ شرمایا چہرا لیے جانے کس بات سے محظوظ ہو رہا تھا۔ بلیک سوئیٹر کی گرین دھاریوں میں کنعان کا دل ڈوبنے سا لگا۔

''توبہ یہ ڈریس میچنگ تو کس قدر پلان شدہ لگ رہی ہے۔ کوئی کچھ سوچ نہ لے۔'' اس نے گھبرا کر نظر چرائی۔

انعم اور سعدیہ کسی گیم کی منصوبہ بندی کر رہی تھیں جو کسی صورت ترتیب پاتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ندرت، مہک، آنسہ اور دیا دُور موبائل فوٹو گرافی میں مصروف تھیں۔ سوار نے ایک سرسری نگاہ جنگلے کی طرف اٹھائی، عمران بھی موبائل میں گم تھا۔ بشریٰ اور سیما باجی سب کے درمیان بیٹھ گئیں اور وہ عمران کی طرف بڑھ گیا۔

''دلیر بھائی کے بغیر تو واقعی مزا نہیں آ رہا۔'' اُس نے جنگلے سے پشت ٹِکا کر ہاتھ سینے پر باندھے۔

''ہاں یار۔ اُن کے اپنے چٹکلے ہوتے ہیں۔ آجاتے تو مزا دوبالا ہو جاتا۔'' وہ ہنوز موبائل میں سر دیے ہوئے تھا۔ کچھ دیر بعد گردن اور موبائل دونوں کو سیدھا کرتے سامنے بیٹھے گروپ کا فوکس لیا۔ سوار نے بھنویں اکٹھی کرتے سخت تعجب سے عمران کو دیکھا۔

''تم تصویریں بنا رہے ہو؟''

''ہیں؟'' وہ لاپروائی سے سر کھجاتے اس کی طرف مڑا۔ ''سب لے رہے ہیں۔''

''ہاں لیکن وہ لڑکیاں ہیں۔ بنا کسی کی اجازت لیے تم موبائل میں ان کی تصویریں نہیں رکھ سکتے۔'' سوار کا لہجہ قطعی اور مستحکم تھا ہمیشہ کی طرح، عمران لمحے کو گڑبڑا سا گیا۔

''میرے نزدیک تو کوئی ایسا سیریس ایشو نہیں ہے۔ وہ سب بھی یہی کر رہے ہیں۔'' اُس نے دیا وغیرہ کی طرف اشارہ کیا۔

''اُن کے موبائل میں ہم دونوں یا باقی خواتین کی تصویروں کا ہونا واقعی کوئی ایسا ایشو نہیں ہے۔ لیکن مرد ہونے کی حیثیت سے ہم پر کچھ حدود ضرور لاگو ہوتی ہیں۔ رُک جاؤ۔'' سوار نرمی سے اس کا کندھا چھوتے اس سے کہیں زیادہ سختی آنکھوں میں لیے اب واضح منع کر رہا تھا۔ عمران کا ہاتھ ڈھیلا پڑا اور بنا کچھ کہے موبائل اس نے جیب میں ڈال لیا۔

''تھینکس۔'' کندھا تھپک کر تعریف کرتے اس بار وہ مسکرا دیا۔ ''تمہارے بھلے کے لیے کہا ہے۔ امید ہے مائنڈ نہیں کرو گے۔''

عمران نے بھی اس مرتبہ محض سر ہلانے پہ اکتفا کیا۔ ظاہر ہے کہ سبکی تو اسے محسوس ہوئی تھی۔ لیکن سوار کو کچھ بھی کہنے کی ہمت نا معلوم کیوں..... پر نہیں ہوتی تھی۔

''جو تصویریں لے چکے ہو۔ وہ ہٹا دو۔'' تاکید مزید کرتے وہ مسکرا کر لان کے سینٹر میں پہنچ گیا۔ دل یک لخت ہی ساری شوخی لپیٹ کر واپس اپنی جگہ پہ جا بیٹھا تھا۔ سر جھٹک کر اس نے آپ اپنی ملامت کی۔ لمحے لمحے پہ اس باغی دل کو سرزنش کی ضرورت پڑتی ہے۔ کس بنیاد پر وہ کنعان سے اظہارِ محبت کرنے چلا تھا۔ دل، جذبات، ماحول کا اثر تو ہر شخص پر ایک طرح ہوتا ہے۔ عمران نے اپنے انداز سے اس شوخی کا مظاہرہ کرنا چاہا تھا۔ اگر وہ اسے باز رکھ سکتا ہے تو پھر اس منہ زور دل کو بھی آپ ہی روکنا ہوگا۔ بے لگام کہیں کا۔

کمال شوق کا حاصل تو بس یہی ہے۔ تم پاس ہو، دوست دار لہجے میں ہم کلام ہو، دل کی تسکین اس کا پڑاؤ ہو۔'' سوار علی کی زندگی سنور گئی، دل آباد ہوا۔ یہی بہت ہے کنعان۔

☆☆☆

اتوار کے دن اکیڈمی کی چھٹی ہوتی تھی۔ سوار نے پچھلے پہر میاں جی کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا۔ ہوٹل کا کام اس کے پیچھے اب آصف اور نوریز بہت اچھی طرح دیکھ لیتے تھے۔ ریسیپشن پر کام کرنے والے یہ دونوں لڑکے ہی کافی سمجھ دار اور محنتی تھے۔ وہ

انہیں جانے کا بتا کر باہر نکلا تو مال روڈ پر صدیق سے ملاقات ہوگئی۔ سوار بھاگ کر اُس سے بغل گیر ہوا۔ جب سے آیا تھا نہ اُس سے کوئی رابطہ ہوا تھا نہ ہی کبھی ملاقات۔۔ وہ بھی ہوٹل کے کسی کام سے نکلا تھا۔ سوار بنا مزید مہلت دیے زبردستی اُسے پیٹرا ان واپس لے آیا

''ایک بار تمہیں اپنا ہوٹل اور رہائش دکھادوں اُس کے بعد بھی تم ملنے نہ آئے تو لمبی چوڑی ناراضی اور گلے کا کم از کم حق تو رکھتا ہوں۔'' وہ اُسے اپنے کندھے سے لگائے آفس کے اندر لے آیا۔ صدیق اس دوران بڑی متاثر کن نظروں سے اس کے ہوٹل کو دیکھ رہا تھا۔ سوار کی حیثیت بھی جس میں پچھلی جاب کی نسبت زیادہ اونچی اور بڑی تھی۔

''تب تو پچھلے ڈیڑھ دو ماہ کے دوران میرے پاس شکووں کا پہاڑ کھڑا ہو جانا چاہیے۔'' صوفے پر پھیل کر بیٹھتے اس نے کھینچ کر سوار کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔

''اپنے شکووں کے پہاڑ کو تھوڑا چھوٹا کرو کیونکہ میں عید کے دن تم سب سے ملنے آیا تھا لیکن تم تھے نہیں۔''

''ہاں یار۔ حبیب اللہ نے بتایا تھا۔ بس سارا مسئلہ نمبر نہ ہونے کا ہے اگر تم اسی وقت موبائل سے رابطہ کر لیتے تو میں فوراً واپس آجاتا۔ اور تمہارے پاس تو موبائل بھی نہیں تھا ناں۔'' صدیق کو اچانک خیال آیا۔

''ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی لیا ہے۔ اچھا سب سے پہلے تو نمبر دو ناں۔'' سوار نے فوراً جیب سے موبائل نکالا۔ صدیق نے بھی جیب پہ ہاتھ مارا دونوں نے اسی وقت ہی نمبرز ایکسچینج کیے۔

''والد صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے؟ اُن کا چلنا پھرنا؟''

''مصنوعی پیر لگوانا ہے۔ اب ویسے بہت بہتر ہیں۔ پہلے پہل زخم بھرنے کا بڑا مسئلہ تھا۔ اب شکر ہے مندمل ہو گیا ہے۔''

''چلو شکر ہے۔ شوگر میں سب سے بڑی کامیابی ہی زخم کا نیل اپ ہونا ہوتا ہے۔ اللہ انہیں مزید تکلیف سے بچائے۔''

''آمین۔'' صدیق نے زور سے سانس کھینچی۔ ابا جی کی تکلیف کا وقت یاد کر کے اس کی کیفیت ایسی ہی ہو جاتی تھی۔

''اور سناؤ جاوید سر کیسے ہیں۔ اور رفیق صاحب؟ اُن کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''جاوید سر تو ٹھیک ہیں۔ رفیق سر کی طبیعت پچھلے دنوں کچھ خراب تھی۔ اُن کا بڑا مسئلہ کولیسٹرول کی زیادتی ہے۔ تم آؤ کسی دن۔ بڑا یاد کرتے ہیں تمہیں۔ ہم ذرا سی کام میں سستی یا کوتاہی کریں تو جھاڑ پلاتے فوراً تمہاری مثال دیتے ہیں۔''

''کہ میں بگاڑ گیا ہوں تم لوگوں کو؟'' سوار نے برجستہ لقمہ دیا تو صدیق کا قہقہہ بلند ہوا۔

''کہنا تو قسم سے یہی چاہیے تھا لیکن وہ تو تعریفوں کے پُل باندھ کر ہمارا کلیجہ کباب کرتے رہتے ہیں۔'' سوار اس دوران ذرا دیر کے لیے دروازے تک گیا اور کامران کو آواز دے کر جوس لانے کو کہا۔

''یار وہ کوکنگ کلاس کا کیا بنا۔ چھوڑ دی ہے کیا؟''

''نہیں۔ کہاں چھوڑی۔'' مسکرا کر واپس پلٹتے جانے کیوں آنکھ کے پردے پر کنعان کی ہنسی چمکی۔ ''دو گھنٹے کی چھٹی مانگ رکھی ہے یہاں بھی۔''

''لیکن اب اُس کی کیا ضرورت ہے۔ اب تو ماشاء اللہ پکی اور کہیں زیادہ اچھی نوکری لگ گئی ہے۔ تنخواہ بھی ضرور چار رمنگ ہوگی۔''

''ہاں یار۔ وہ سب تو ہے۔ بس اب شروع کر چکا تھا تو بیچ میں چھوڑنا اچھا نہیں لگا۔ اب تو دو ماہ رہ گئے ہیں۔''

''محنتی تو ہو۔ کیا شک ہے۔ آخر رفیق سر کے فیورٹ یونہی تو نہیں ہو۔''

''رفیق سر کی مہربانی ہے۔ اور سناؤ۔ قاسم

کیسا ہے۔خوش تو ہے؟''
''ارے ایسا ویسا۔'' صدیق نے مضحکہ اُڑایا۔
''اُسے تو اب ہفتہ وار کشمیر کی یاد آنے لگی ہے۔''
''اوہ......'' سمجھ آنے پر سوار بھی ہنس دیا'' تو چھٹی مل جاتی ہے۔ہفتہ وار؟''
''کہاں یار۔ سیزن پیک (peak) پر ہے اِن دنوں، اتنی آسانی سے کہاں ملتی ہے۔لیکن جاوید سر نے وعدہ کیا ہے کہ جشن آزادی کے بعد رش میں جب کمی ہو جائے گی تو ہفتہ وار بھیج دیا کریں گے۔''
''اور......تمہاری مصروفیات؟'' سوار کا مسکرانا انداز کافی معنی خیز تھا۔صدیق ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔''چلو راستے میں بتاتا ہوں۔تم بھی شاید کہیں جا رہے تھے؟''
''ہاں۔آج کوکنگ کلاس نہیں ہے تو میاں جی سے ملنے جا رہا تھا۔''
''تو آؤ پھر۔میں نے مال روڈ سے کچھ سامان خریدنا ہے۔'' دونوں باتیں کرتے باہر نکل آئے کہ کینٹ مارکیٹ تک دونوں کا ساتھ رہنا ہی تھا۔

☆☆☆

''واپسی پر آج کیا پکاؤں کنعان۔آج رابعہ بی بی آرہی ہیں ناں۔'' کنعان اماں کے ساتھ صبح گھر سے نکل کر اونچے روڈ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ عین اسی وقت پیچھے سے دیا نے آواز دے کر روکا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی تیز قدموں سے ساتھ آملی۔ کنعان کا فوری طور پر دھیان اُدھر ہوا۔اُس کے بعد وہ پھر اماں کی طرف متوجہ ہوئی۔
''آج پھوپھو آرہی ہیں؟ مجھے تو نہیں پتا۔''
''مجھے بھی صاحب نے رات ہی بتایا۔تم شاید سو چکی تھیں۔''
''ہاں لیکن ناشتے پر بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔'' وہ ابھی بھی حیران تھی۔
''بتادیں گے۔'' اماں جانے کیوں مسکرائی تھیں۔ ''کسی مناسب موقع کے انتظار میں ہوں گے۔''
''جی؟'' کنعان نے کچھ نہ سمجھتے دیا کو دیکھا اُس نے بھی۔
لاعلمی سے کندھے اُچکا دیے۔
اماں ڈھلان چڑھتے ہی اپنے راستے مڑ گئیں اور وہ دونوں ہوٹل کی طرف بڑھ گئے۔رفیق احمد سامنے ریسپشن پر ہی بیٹھے تھے۔لیکن مسافروں کا خوب رش لگا ہوا تھا۔وہ چابی دے کر ایکھی الجھی سی کالج روانہ ہوگئی۔
اماں کے انداز پر دل سارا دن بے چین سا رہا۔اور پھر دوپہر کو پھوپھو کی آمد پر یہ عقدہ بھی حل ہو گیا کہ اُن کی غیر متوقع آمد یونہی نہیں تھی۔اماں نے ہی کھانے کی تیاری کے دوران بتایا کہ وہ اس کے لیے کوئی رشتہ لائی ہیں۔ابو کی خاموشی پر البتہ کنعان کو تعجب تھا۔معلوم نہیں وہ خوش تھے یا اُداس۔کچھ ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔وہ تو ہر موقع پر ہر بات سب سے پہلے کنعان سے ڈسکس کرتے تھے۔
پھوپھو سے پتا چلا کہ اگلے دن کو ہالہ سے ماہین بھی آرہی ہے۔اللہ جانے کیا کھچڑی پک رہی تھی۔ اِدھر پھوپھو تھیں کہ صبح شام نت نئی ڈشز پکوا کر کوکنگ کلاس میں اس کی توجہ کے ٹیسٹ لے رہی تھیں۔پھر اگلی شام ماہین باجی کی سواری بھی آن پہنچی
''واہ کنعان۔تم تو ابھی سے لال گلابی ہوئی جا رہی ہو۔ابھی تو رشتہ بھی طے نہیں ہوا۔'' ماہین نے اُس کے کھلے گلاب سے چہرے کی شادابی سے کچھ اور ہی مطلب اخذ کیا۔کنعان کا سلگتا کھولتا دل چولہے پہ رکھے پانی سا اُبلنے لگا۔
''حد کرتی ہیں باجی۔یہاں کوئی کچھ بتانے کو تیار نہیں۔آپ کو میری رنگت بھی لال گلابی لگنے لگی۔کچن میں برتن دھوتے اماں کسی نامعلوم رشتے کی اطلاع دیتی ہیں۔آپ کے آنے کا پھوپھو سے پتا چلتا ہے۔آپ سب کے سرپرائز میں مجھے تو اب چکر آنے لگے ہیں۔'' وہ جو کب سے بھری بیٹھی تھی، موقع ملتے ہی پھٹ پڑی۔ماہین اس دوران بھی

صرف مسکراتی رہی

''سب پتا چل جائے گا۔ آؤ یہاں آرام سے بیٹھو اور بتاؤ کہ تمہاری کوکنگ کلاس کیسی جارہی ہے۔ تمہیں تو چائے کا ایک کپ بناتے بھی ہول اٹھتے تھے۔'' ماہین نے پیار سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کوکنگ کلاس کے نام پر تصور میں درآتی سوار کی صورت نے کنعان کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھیر دی۔

''بہت اچھی۔ بہت مزا آتا ہے وہاں۔ اب تو کوکنگ کرنا بھی برا نہیں لگتا۔''

''چلو شکر ہے۔ پھوپھو نے بروقت بڑا اچھا اسٹیپ لیا۔''

''اچھا اب آپ بتائیں باجی کہ یہ سب کیا چل رہا ہے۔'' وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

''تمہیں تو واقعی کچھ نہیں پتا۔ بھئی پھوپھو اپنے جیٹھ کے بیٹے زبیر کا رشتہ لائی ہیں۔ نجی بینک میں منیجر کی جاب کرتا ہے۔ بہت اچھی سیلری ہے۔ دیکھنے میں بھی خوش شکل ہے۔ تمہیں یاد بھی ہوگا ایک بار.....''

''رحم کریں باجی۔'' کنعان نے بات کاٹ کر دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ''اُنیس سال چار مہینے کی معصومیت پر ہی ترس کھالے کوئی۔ آپ کی تو اپنی شادی کچھ بیس اکیس کے درمیان۔ کنعان روانی میں کہتے کہتے یک دم رُکی۔ ماہین کے چہرے کے یک لخت رنگ بدلے اور اُس نے ایک سرد آہ کھینچی۔

''ہاں۔ میری شادی.....'' اُس نے اتنا کہا اور کنعان گڑبڑا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں چائے کا پتا کرتی ہوں۔'' وہ قالین میں الجھ کر ٹھوکر کھاتے، کسی طرح خود کو سنبھالتے تیزی سے باہر آئی۔ ایک واقعہ، بلکہ ایک حادثہ جسے پچھلے تین سالوں کے دوران وہ روزانہ دن میں بیسیوں مرتبہ ذہن میں دہرا کر امی سے کیے عہد پر پابند رہنے کا خود کو یقین دلاتی تھی۔ آج..... آج جانے کتنے دنوں، ہفتوں یا شاید مہینوں بعد بر سبیلِ تذکرہ یاد کر رہی تھی۔

تو کیا وہ امی سے کیے وہ وعدے خود کو سمجھائی وہ ساری نصیحتیں ریت کا گھروندا تھیں کہ سوار کی محبت نے کسی طوفانی موج کی طرح ایک ہی پل میں سب مسمار کر دیا تھا۔

وہ کیسے بھول سکتی تھی اُس حادثے کو۔ کیسے توڑ سکتی ہے خود سے کیے سبھی عہد و پیمان۔ کیسے پڑ سکتی ہے کسی اجنبی کی محبت میں۔ کیسے؟

شاید یہی ہوتا ہے وہ جنون، جو راستے بھٹکا دیتا ہے، یہی ہے وہ عشق کی اندھی پٹی، جسے آنکھوں پر باندھتے ہی سب اچھا برا دکھائی دینا بند ہو جاتا ہے۔ تو یہی ہوا ہے میرے ساتھ۔ اور یہ ہو چکا ہے کنعان۔ رات کو بستر میں اوندھے لیٹے وہ اپنی چیخوں کا گلا گھونٹتے تکیے میں منہ دبائے بے آواز روئے جارہی تھی۔

پچھلے کچھ عرصے میں یاد رہا تھا تو ایک بس سوار کو دیکھنا، اُسے تلاش کرنا، اُس سے ہم کلام ہونے کے بہانے ڈھونڈنا، اُس نے کیا پہنا، وہ کیسا لگ رہا تھا، آج سوار نے اُس سے یہ بات کی۔ وہ لمحے کو ہنسا بھی تھا۔ اُس کے ایک ایک جملے کو ذہن میں دہرانا، کوکنگ کلاس کے ایک ایک منظر کو بار بار یاد کرنا، اگلے روز کے حوالے سے بلاوجہ فرضی منظر تخلیق کرنا۔ اُسے چاہنا، ڈھونڈنا، سوچنا۔ بس یہی رہ گیا تھا زندگی کا مقصد۔ اب تو شروع شروع کی عارضی ندامت اور پشیمانی بھی عرصہ ہوا دامن چھڑوا گئی تھی۔ اب کہاں آتا تھا یہ خیال کہ کیوں، کب اور کیسے وہ اس مصیبت کو گلے لگا بیٹھی۔ اب تو.....

نہیں۔ وہ روتے روتے نفی میں سر ہلانے لگی'' سوار اُن وعدوں کی راہ میں کہیں نہیں آتا، کہیں نہیں، کبھی بھی نہیں۔ ہماری زندگیوں میں دوبارہ وہ تاریک دن نہیں آئے گا، کنعان نے جاگتی آنکھوں سے دانستہ اُس وقت کو یاد کرتے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

''میں آپ کے لیے اور ابو کے لیے کبھی

شرمندگی کا باعث نہیں بنوں گی امی...... ابو نے میرے لیے کچھ اچھا ہی سوچا ہوگا اور اب یہ میری محبت کے امتحان کا وقت ہے۔ میرے دل کو قربانی اور صبر کا مفہوم سمجھنا ہوگا۔ یہ دل اب بھی بھٹکے گا نہیں۔ کبھی مجبور و بے بس نہیں ہوگا۔ میں وہی کروں گی جو ابو چاہتے ہیں، میں اُنہیں شبہ بھی نہیں ہونے دوں گی کہ میرا دل کبھی باغی ہوا تھا۔ نہ ہی میں اپنے دل کو سوچنے کی مہلت دوں گی۔ وہ مہلت جو میری زندگی کو کسی طوفان سے ٹکرا دے، اُس سے کہیں بہتر ہے وہ رخصتی جو سب کی رضا کے آگے سر جھکاتے شرافت سے انجام پا جائے۔ میں ہاں کر دوں گی اِس رشتے کے لیے۔ اور چلی جاؤں گی ہمیشہ کے لیے اِس گھر سے، اس شہر سے سوار سے دُور۔ اِس گمراہ کرنے والی بلا اِس محبت سے ہمیشہ کے لیے پیچھا چھڑا کر۔

☆☆☆

''اُٹھو شازمہ۔ ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ شازمہ......'' وہ دھیرے دھیرے گال تھپکتے فکرمندی سے اُس کی مُندی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ تھرمامیٹر سائڈ پر رکھتے اب وہ اُس کا ہاتھ تھام کر قریب بیٹھ گیا۔

''بخار بہت تیز ہے شازمہ۔ اٹھو شاباش تھوڑی سی ہمت کرو۔''

''مر جانے دو وقاص۔'' وہ نیم غنودگی میں بھی روئے جا رہی تھی۔ گرم آنسو اس کی کنپٹیاں بھگو رہے تھے۔ وقاص نے زبردستی بازو کے گھیرے میں لے کر بٹھانے کی کوشش کی۔

''تمہاری بیوی نے دیکھ لیا تو برباد ہو جاؤ گے۔'' وہ اس کے کندھے پر جھولتے قطعاً اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

اس بار وقاص نے ان سنی کرتے اٹھا کر اسے گاڑی میں ڈالا اور نزدیکی کلینک لے آیا۔ اللہ جانے کب سے بھوکی پیاسی نڈھال پڑی تھی۔ کلینک سے واپسی پر اسے چائے اور سلائس کھلا کر دوا شروع کروائی۔ شازمہ اس پورے دورانیے میں مکمل چُپ اوڑھے ہوئے تھی۔ وقاص کی جانب اس نے نظر اٹھا کر ایک بار دیکھا تک نہیں تھا۔ حالت البتہ اب پہلے سے کافی بہتر لگ رہی تھی۔

''آئی ایم سوری شازمہ۔ میں نے تمہارا دل دُکھایا، تم سے جھوٹ بولا۔ لیکن میرا یقین کرو۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا، سچ بتا کر تم سے دُور نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اور پرامس کرتا ہوں کہ ہم پہلے سے بھی زیادہ محبت اور پیار سے رہیں گے۔ آئندہ ہمارے بیچ یہ موضوع بھی کبھی نہیں آئے گا۔ بس تم ٹھیک ہو جاؤ ایک بار۔ اور کھلے دل سے مجھے معاف کر دو۔''

''ہمارے درمیان یہ موضوع نہ آنے سے نائلہ تو ہمارے درمیان سے نہیں نکل جائے گی۔ وہ پہلی بار استہزائیہ ہنسی'' اور نکلے بھی کیوں۔ اِس معاملے کی سب سے کمزور کڑی تو میں ہوں۔ چاہو تو اگلا سچ بھی بتا دو وقاص۔ آج کے بعد تمہاری زندگی کس ڈگر پر چلے گی، میری اُس زندگی میں گنجائش بھی نکلتی ہے یا نہیں۔ میں ہر فیصلے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوں۔ بولو وقاص۔'' وہ بھرائے گلے پر بمشکل قابو پاتے ایک بار پھر آنکھیں صاف کر رہی تھی۔

''بس کرو شازمہ۔ کیوں تکلیف دے رہی ہو ایسی باتیں کر کے۔ ہمارے درمیان کسی فیصلے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ تمہیں خود سے جدا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہم ساتھ رہیں گے ہمیشہ۔'' وقاص نے بے اختیار اُسے اپنے قریب کیا لیکن وہ ویسے ہی پتھر جیسی ایک جگہ جمی تھی۔

''اور وہ چھ دن۔ چھ راتیں وقاص۔''

شازمہ کی خالی خالی آنکھوں میں جو شکوہ درد بن کر تیر رہا تھا، وقاص کے لیے اُس سے نگاہیں ملانا دوبھر ہو گیا۔ جن چھ دن اور چھ راتوں میں وہ شازمہ کے پاس نہیں ہوتا تھا اب سے پہلے اُن کے متعلق شازمہ کا یہ خیال تھا کہ اس کا محنتی شوہر گھر کے آرام

دسکون کو تیاگ کر اپنی ڈیوٹی بجا رہا ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ اُن چھ دنوں میں بھی وہ آرام و سکون سے اپنے بیوی بچوں کے پاس رہتا تھا۔ اور وہ ایک رات جو وہ شازمہ کے پاس گزارتا تھا اس کے متعلق وقاص نے نائلہ کو یہ بتا رکھا تھا کہ ہفتے کی شام کو بھی ورکرز چھٹی کر جاتے ہیں اِس لیے کارخانے کی حفاظت کے لیے اسے وہیں رہنا پڑتا ہے۔ لیکن آج کے بعد نائلہ تو نہیں پر شازمہ کے لیے ضرور کٹھن وقت آنے والا تھا۔ اب سے پہلے محض خوف کے لمبے سائے تھے جو اُس کے وجود کے گرد گھیرا تنگ کیے رکھتے تھے، لیکن آج کے بعد وہ کیسے چین پائے گی اُن راتوں میں، کیسے سمجھائے گی اپنے دل کو، وہ بھی عمر بھر کے لیے۔

دوسری طرف وقاص تھا جس کی پریشانیاں شاید شازمہ سے بھی سوا بڑھ کر تھیں۔ خفیہ شادی کا پھندا تو گلے میں ڈال ہی چکا تھا پر زیادہ دن اِسے پردے میں رکھنا اب کچھ مشکل ہی لگ رہا تھا۔ فی الحال تک تو یہ خیریت رہی تھی کہ صرف شازمہ کو اس کی پہلی شادی کا علم ہوا تھا۔ نائلہ کے لیے اس کی دوسری شادی کی خبر تو اِس سے بھی بڑا بم دھماکا ثابت ہوتی۔ شازمہ نے اب اس کا دوسرا گھر دیکھ لیا تھا۔ کسی بھی غصے یا فرسٹریشن کے نتیجے میں وہ اس کا بھانڈا پھوڑنے وہاں تک آسکتی تھی۔ فی الحال اس کے لیے شازمہ کی دلجوئی ہر شے سے بڑھ کر اہم تھی۔ اور اُس سے بھی کہیں اہم تھا اُسے مستقبل کے کچھ ایسے حسین خواب دکھانا جن پر آسانی سے نہ صرف وہ یقین کر لیتی بلکہ جذبات میں آکر پھر اُس کے خلاف کوئی اُلٹا سیدھا قدم بھی نہ اُٹھاتی۔ فی الحال وہ اپنے پچھلے رویے کی معافی مانگتے اُس کا غصہ کم کرنے کی کوشش میں تھا۔

میری زندگی، میرے دل میں جو محبت اور جگہ تمہاری ہے شازمہ، وہ کبھی نائلہ کی نہیں ہو سکتی۔ نائلہ سے نباہ سراسر میری مجبوری ہے۔ میری اصل خوشی اور سکون صرف تم ہو۔ نائلہ کے علم میں اِس شادی کا آنا کہیں مجھے ہمیشہ کے لیے تم سے دُور نہ کر دے، اِس لیے رات اتنا بے چین ہو گیا تھا۔ وہ اس کا گرم ہاتھ آہستہ آہستہ تھپکتے اُسے اپنے جذبوں کی گہرائی کا یقین دلا رہا تھا۔ شاید وہ نہیں جانتا تھا سچ کے چہرے میں کتنی طاقت ہوتی ہے، وقاص کی اندرونی کیفیت کا غماز وہ اجنبی چہرا شازمہ سے بھی چھپا نہیں رہ پایا تھا۔ وہ اُس ہتک اور نفرت کے اثر سے ابھی تک باہر آنے میں ناکام رہی تھی۔ محبت کی یقین دہانی کے سب ہی الفاظ اُس ایک لہجے کے آگے اپنا اثر کھو چکے تھے۔ وقاص کے لہجے کی مٹھاس اور یہ تمام الفاظ اب سوائے لفاظی اور چاپلوسی کے کچھ نہیں تھے۔

☆☆☆

''سوار آپ فارغ ہیں؟'' وہ ایک میگزین کی ورق گردانی میں مصروف تھا جب ثمامہ کچھ بے وقت ہی آفس میں داخل ہوئی۔

''جی میم۔ بالکل فری ہوں۔'' وہ مؤدب سا اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ایکچوئلی مجھے اوپر کشمیر پوائنٹ کی طرف جانا تھا۔ مسز ہاشمی کے ہاں ہاؤس وارمنگ پارٹی ہے۔ ڈرائیور تو آپ جانتے ہیں گاؤں گیا ہے تین روز کے لیے۔ اب جانتو میں خود بھی سکتی ہوں لیکن راستے کے معاملے میں کچھ کنفیوژ ہوں۔ وہ ہینڈ بیگ ٹیبل پہ رکھ کے بال درست کرتی تیز تیز مسلسل بولے چلی جا رہی تھی۔

''مال روڈ تو اِس وقت گاڑیوں وغیرہ کے لیے بند ہوگی، نہ بھی ہوئی تو رش سے نکلتے لازمی شام ہو جائے گی۔ نواز (ڈرائیور) سے میری فون پر بات ہوئی وہ کہہ رہا تھا کینٹ مارکیٹ سے پیچھے کا ایک راستہ ادھر نکلتا ہے۔ مجھے تو سچی بات ہے بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔''

''میں لے چلتا ہوں میم۔'' وہ جو محض خاموشی سے بس اُسی کو سنے جا رہا تھا مسکراہٹ دباتے یک لخت سنجیدہ سا آگے بڑھا اور میز سے اپنی ضروری چیزیں سمیٹ کر جیب میں رکھنے لگا۔

ثمامہ نے ایک تعجب کی نظر اس کے کھل کر بند ہوتے لبوں پر ڈالی اور ہینڈ بیگ لٹکا کر اس سے پہلے ہی باہر نکل آئی۔

سوار نے گاڑی اسٹارٹ کی تو وہ فرنٹ ڈور کھول کر اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

''آپ کو کچھ کنفیوژن ہو سوار تو میں آپ کی نواز سے بات کروا دیتی ہوں۔''

''نو میم۔ کوئی کنفیوژن نہیں ہے۔'' وہ بے ساختہ اُمڈ آتی اپنی میٹھی مسکان کو ایک بار پھر روکنے کی کوشش میں تھا۔ ثمامہ کے اندر پہلی مرتبہ ایک نامعلوم سی کھد بد ہوئی۔

''میں سوچ رہی تھی آپ بھی نو وارد ہیں مری میں شاید راستہ.....''

''اِس راستے پر تو میں آنکھیں بند کر کے آپ کو لے جا سکتا ہوں۔'' وہ اب کھل کر مسکرا رہا تھا۔ ثمامہ کی گہری آنکھوں میں تجسس بھری حیرت اُتری۔

''اچھا۔ وہ کیسے؟''

''دراصل آپ کے ہاں جاب پر آنے سے پہلے میں نے ڈیڑھ ماہ جس ہوٹل میں کام کیا ہے، یہ راستہ سیدھا اُدھر کو جاتا ہے۔ تب پرانے ہوٹل سے کوکنگ کلاس کے لیے اِسی راستے سے آیا جایا کرتا تھا۔'' وہ اب تفصیل میں جاتے سنجیدگی سے وضاحت دے رہا تھا۔

''ویری نائس۔ تو یعنی آپ بھولتے نہیں ہیں، پرانے لوگوں، پرانے تعلقات کو؟'' ثمامہ کے دل کو اُس کی میٹھی مسکان کچھ اس بری طرح چھو گئی تھی، شاید اس کے اثر سے نکلنا بہت دیر تک ممکن نہیں تھا۔

''اچھے لوگوں اور مضبوط تعلقات کو کبھی بھولنا نہیں چاہیے۔ ہاں بس یہ رشتے کبھی درد کا باعث نہ بنیں، پھر انہیں چھوڑنا بہت تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔'' اُس نے ایک بھاری سانس بے ساختہ ہواؤں کے سپرد کی۔

ثمامہ نے بھی قائل ہوتے سر ہلا دیا۔ یہ بات بھلا اُس سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا کہ تعلق درد دینے لگے تو ناچار چھوڑنا ہی پڑتا ہے، چاہے کتنے ضبط، کتنے کرب سے یہ کٹھن فیصلہ کرنا پڑ جائے، خود کو کیسی اذیت کے سپرد کرنے کا نام ہے ایک من چاہے تعلق کو بس ایک جھٹکے سے توڑ دینا۔ وہ بھی بے ساختہ ایک آہ بھر بیٹھی۔ پھر دھیان بٹانے کو سوار کی طرف دیکھا۔

''سوار آپ نے عید پر چھٹی نہیں مانگی۔ اگرچہ میں دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔'' وہ خود ہی ہنس پڑی ''لیکن بہرحال مانگی تو سب نے تھی۔

''بس اِسی لیے نہیں مانگی۔'' وہ ہلکا سا مسکرایا تو ثمامہ اس کی حاضر جوابی پر قہقہہ لگا کر ہنسی۔

''بہت خوب۔ یعنی مجھے مشکل میں نہیں ڈالا، چلیں پھر تو شکریہ بنتا ہے میری طرف سے۔''

''ارے نہیں میم۔ شرمندہ مت کریں۔'' وہ جھینپ گیا۔ ''جاب کی باریکیوں کو سمجھنا تو ہمارے فرض میں شامل ہے۔''

''آپ بہت ذمہ دار بہت میچور سوچ رکھتے ہیں سوار، آپ کی ذہانت ہمیشہ بہت متاثر کرتی ہے۔''

''کسی کی ذہانت سب سے زیادہ اُسے متاثر کرتی ہے میم جو خود ذہین ہو۔'' سوار نے حساب چکایا۔

''آپ مجھے صرف ثمامہ کہہ سکتے ہیں سوار۔''

وہ اب قدرے رُخ موڑ کر پوری اُس کی طرف متوجہ تھی۔ بلیک ڈریس میں سرخ میک اپ کیے وہ حقیقتاً آگ لگانے کی حد تک شاندار لگ رہی تھی۔ بالوں کو لوز کرل کیے اُس نے شانوں پر پھیلا رکھا تھا۔ چہرے پر البتہ اُداسی سی ٹھہری لگ رہی تھی۔ سوار نے بس لمحے کو اُسے نظر پھیر کر دیکھا اور بنا ردعمل ظاہر کرتے کار چلاتا رہا۔

''یہاں کی لائف میں بہت تیزی ہے، وقت ہے کہ برق رفتار گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑتا چلا جا رہا ہے۔ کہنے کو بظاہر اپنے لیے بھی وقت نہیں۔ لیکن باوجود تمام تر مصروفیت کے یہ چیز چبھتی ضرور ہے کہ

اپنے لیے وقت کیوں نہیں۔ اور کب آئے گا وہ موقع جب خود اپنے لیے کچھ گھڑیاں میسر آئیں گی۔'' وہ دھیمے دھیمے جیسے خود کلامی کے انداز میں بولے جارہی تھی اور ظاہر ہے کہ مخاطب سوار ہی تھا جو گفتگو کا حصہ بننے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔

''ایسے بیزار کن شب و روز میں ایک ساتھی کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے، کوئی دوست جس سے کم از کم روٹین کے معاملات سے ہٹ کر کچھ بات کی جاسکے۔ کیا ہم دوست بن سکتے ہیں سوار؟'' بالآخر ثمامہ نے اپنی اتنی لمبی گفتگو کا نچوڑ سامنے رکھا سوار کی آنکھیں تعجب سے گھوم کر واپس ایک نقطے پر آئیں۔

''ایک اور فرینڈ؟ سوار تمہارے امتحان کبھی ختم ہوں گے۔'' وہ دل ہی دل میں اپنا استہزاء اڑا کر رہ گیا۔ ''کیوں نہیں میم، میرے لیے خوشی اور اعزاز کی بات ہے۔''

''پھر میم؟'' وہ مصنوعی خفگی سے منہ پھلا کر دیکھ رہی تھی۔

''اِسے آپ میری جاب کی مجبوری سمجھ لیں۔'' اُس نے کنی کترانے کی اپنی سی کوشش کی۔ ''عام پبلک ڈیلنگ کے دوران سہولت رہتی ہے۔'' اس بار سوار کا انداز کچھ مبہم اور ہلکا جتاتا ہوا سا تھا۔ لیکن وہ بھی ثمامہ تھی۔ اشارتاً کہی باتیں زیادہ آسانی سے سمجھنے والی

''چلیں ٹھیک ہے، تو پبلک میں میم اور اکیلے میں صرف ثمامہ۔'' اُس نے بے ساختہ بہت بڑا جملہ بول دیا تھا، وہ بھی کافی آرام اور سہولت سے۔

ایک طرح سے یہ پہلا باضابطہ جملہ تھا اُس کی جانب سے جو سوار کو موصول تو ضرور ہوا لیکن اُس نے بڑا اَن ایزی محسوس کیا، رشتے اور دوستیوں کو اگر حیثیت اور مرتبے کے ترازو میں تول کر زبردستی مسلط کرنے کی کوشش کی جائے تو مقابل کی بے بسی لائق دید ہوتی ہے۔ بظاہر ثمامہ کی کوشش اُسے قریب لانے کی تھی لیکن اعتماد کا حاکمانہ رنگ صاف بتاتا تھا کہ سوار کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن خواہش چونکہ صرف دوستی کی سامنے رکھی گئی، لہٰذا سوار نے اپنی صاف گوئی کو کسی اور وقت پر موقوف کرتے خاموشی اختیار کرنے کو ترجیح دی۔

ازمیر ہوٹل کے سامنے سے گزر ہوا تو کسی معصوم تتلی کی یاد سے دل بے طرح دھڑک کر رہ گیا۔ اعتماد اگر خوب صورت محسوسات کا ہو تو کیا ہی بات ہوتی ہے، پر افسوس کہ دوستی کی یہی آفر کنعان کے سامنے رکھ کر سوار بھی وہ اعتماد حاصل کرنے میں ابھی ناکام رہا تھا۔ کنعان نے دوستی کی دعوت قبول کرتے جتادیا تھا کہ اکیڈمی کے ماحول کو مدِنظر رکھتے یہ ضروری ہے۔

سوار نے گردن پھیر کر نیچے جاتی گلی کو دیکھا۔ رفیق سر کے گھر کو جاتا یہ ڈھلوانی راستہ جانے کیا کچھ یاد دلا جاتا تھا۔ ذرا آگے آنے پر ازمیر ہوٹل آگیا اُس نے ایک نظر شیشے کے پار دیکھا۔ صدیق کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا کسی کے ساتھ باتوں میں مصروف نظر آیا۔

''یہی ہوٹل ہے؟'' ثمامہ نے ازمیر کا سائن بورڈ پڑھ کر تائیدی نظروں سے دیکھا تو سوار نے سر ہلا دیا۔

''آپ چاہیں تو مجھے چھوڑ کر واپس یہیں آجائیں۔ مجھے گرلز کالج کے روڈ پر بس تھوڑا سا ہی آگے جانا ہے۔ میرا قیام وہاں گھنٹہ بھر کا ہوگا۔ آپ کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تو واپسی اکٹھے کی جاسکتی ہے۔'' ثمامہ نے پل میں پروگرام ترتیب دیتے سوار کی طرف دیکھا۔

''جی میم۔ ایسا ہی کر لیتے ہیں۔ مجھے بھی بہت دن ہوگئے سب سے ملے۔ یہاں میں آرام سے ایک گھنٹہ گزار سکتا ہوں۔'' وہ دل میں بھرپور خوشی محسوس کرتے گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔

ثمامہ کو مطلوبہ جگہ چھوڑ کر اس کی کچھ ہی منٹوں میں واپسی ہوگئی۔ صدیق اور قاسم تو موجود تھے اور بڑے تپاک سے ملے لیکن رفیق سر کے متعلق پتا چلا

کہ ابھی کچھ دیر پہلے اپنے گھر گئے ہیں۔ سوار کو اُن سے ملاقات نہ کر سکنے کا بہت افسوس ہوا۔ بھلا روز روز کہاں نکلنا ہوتا تھا۔

''یار۔ ذرا سر کا نمبر دینا۔ فی الحال تو یہیں بیٹھا ہوں، فون پر ہی اُن سے گپ شپ کر لوں۔'' صدیق سے سر کا نمبر لے کر وہ کال ملاتے صوفے پر جا بیٹھا۔

''السلام علیکم سر۔'' مسکراتے ہوئے سوار نے آغاز لیا اور وہ بھی فوراً پہچان گئے۔

''ارے سوار۔ وعلیکم السلام۔ بھئی ہماری یاد کیسے آ گئی۔''

''یاد تو اکثر آتی ہے سر، آج ملاقات کا شرف بھی حاصل کرنا چاہا لیکن ملنا فی الحال شاید نصیب میں نہیں۔''

''اچھا؟'' انہیں تعجب ہوا۔ ''کہاں ہو؟''

''یہیں۔ آپ کے ہوٹل میں ہوں۔ صدیق نے بتایا آپ ابھی گھر کے لیے نکلے ہیں۔ مجھے بھی آرام نہیں آیا۔'' کال ملا کر آپ کے آرام میں خلل ڈال دیا۔

''یہ لو..... تو وہاں کیوں بیٹھے ہو میاں۔ سب سے مل لیا ہو تو یہاں آؤ، چائے پیتے ہیں مل کر۔''

''سر آپ کو زحمت ہوگی۔ میں تو.....''

''چل نہ کر یار۔ فوراً آؤ شاباش۔'' وہ پیار بھری دھونس جما کر باقاعدہ کال کاٹ گئے اور سوار ہنستے ہوئے اٹھا۔

''سر سے مل کر آتا ہوں۔'' صدیق کو انفارم کر کے وہ باہر نکل آیا۔

''اوہ۔'' ایک خوش گوار سی گہری طویل سانس دل کے سبھی تاروں کو انگلی کے پَور سا چھوتی باہر نکلی۔ لطیف محسوسات کا پورا ایک جہان آباد تھا گرد و پیش میں۔ وہ بے اختیار آگے بڑھتے جنگلے کے نزدیک آیا۔

وہ پہلی اضطراب آگیں صبح۔ کنعان سے پہلی جھڑپ کے بعد اندر پیدا ہوئی بے چینی اور نامعلوم سے احساس کے بعد دوپہر کو یہیں جنگلے کے نزدیک کسی سیاح کو ایڈریس سمجھاتے وہ ہوٹل جانے کے لیے واپس پلٹا تو سی گرین ہاف چادر اوڑھے یونیفارم میں ملبوس وہ کالج سے واپس آتے اپنے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سوار کی سرسری نظر نے پل بھر کے ٹھہراؤ میں عمر بھر کا قیام پالیا۔ آٹھویں رنگ سے آگہی کے اُس لمحے میں اضطراب نے جگہ بدلی۔

پچھلے پانچ گھنٹے وہ کیوں بے چین رہا، اُس دوسرے سامنے کی ایک سرسری نظر نے صاف کر دیا۔ اور دوسری اُس سے بڑی بے چینی نے اس کی جگہ اِس لیے لے لی کہ یہ نہیں ہونا چاہیے تھا، ایسا کیوں ہوا۔ پنیاں کے ہرے بھرے میدانوں میں سوار علی کے سوار علی سے باندھے وعدوں کا کہیں یہ پہلا امتحان تو نہیں۔

''نہیں۔'' سر جھٹک کر سوار مسکراتے ہوئے حال میں آیا۔ وہ حسین صبح اندیشوں بھری ضرور تھی پر آج مہینوں بعد جبکہ اس کا اپنی ذات پر اعتماد مکمل بحال ہو چکا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ یہ آٹھواں رنگ بڑا ہی پکا تھا۔ محبت کی قوس قزح وادی میں بکھری اپنے استحکام کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

کنعان کی محبت سے پُر وہ پورا منظر نامہ زندگی بن کر سانس لے رہا تھا۔ پتے پتے میں دھڑک رہا تھا۔ جانے یہ قدم کیسے کیسے راستوں پر بے دھیانی سے چلتے چلے جاتے ہیں۔ پرانہی قدموں تلے جب کوئی راستہ یاد بن کر بچھتا ہے تو ایک ایک ذرہ کسی جانی پہچانی سی خوشبو سے مہک اُٹھتا ہے۔ پھر چاہے وہ وادی کی حد بندی کا جنگلا ہو، چنار کے درخت ہوں، خشک پتوں سے اٹا راستہ ہو، گلی میں اُترتی ڈھلان، یا گلاس ڈور کا ہینڈل۔ دل کے لطیف تاروں سے جُڑتے کسی اور ہی دنیا میں لے جاتا ہے۔

تم اِس تنہا شخص کی زندگی میں نہ ہوتے ہوئے بھی اُس کا پورا عالم ہو کنعان۔ یہ خالی پن بھی عطیہ خداوندی ہے کہ سوار کے دل کو اِس نے استحکام،

سکون اور خوشی ہی بخشی ہے۔ خوش رہو۔ وہ مسکراتے ہوئے ڈھلان اُتر کر رفیق سر کے دروازے پر آیا

''آؤ یار۔ تم تو سچ مچ ہی بھول بیٹھے تھے۔'' وہ اُسے بازو کے گھیرے میں لیے بیٹھک والے کمرے میں آئے۔ یہ کمرا داخلی دروازے کے عین داہنے ہاتھ پر تھا۔

''تمہارا حال احوال تو اب کنعان سے ہی پوچھا کرتا ہوں۔ بیٹھو۔'' وہ ہاتھ سے اشارہ کرتے سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئے۔

''سر اب میرا نمبر سیو کرلیں، ان شاءاللہ رابطے میں رہیں گے۔'' نئی جگہ کی مصروفیت نے وقتی طور پر باقی ہر جانب سے دھیان ہٹا دیا تھا لیکن آپ اِسے میری بے حسی اور لاپروائی پہ محمول نہ کریں۔''

''جانتا ہوں سوار۔'' یونہی دل لگی کر رہا تھا۔ تم نہ خود بھولتے ہو اور نہ بھولنے دیتے ہو۔'' وہ اپنے خاص دوستانہ انداز میں اُسے چھیڑ رہے تھے، سوار جھینپ گیا۔

رفیق سر اِس دوران اُٹھ کر ذرا دیر کو باہر گئے۔ چال میں پہلے جیسی چستی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ سست روی سے واپس آ کر نشست سنبھالی تو سوار نے اِس دوران بغور ان کی حالت کا جائزہ لیا تھا۔

''سر۔ آپ ٹھیک تو ہیں؟ پہلے سے بہت ویک لگ رہے ہیں۔ چلنا پھرنا بھی معمول سے ہٹ کر ہے۔''

''بس یار۔ اب جوں جوں دن بڑھیں گے انرجی لیول میں کمی تو آئے گی۔''

''سر۔ کہیں وہ پیر کی چوٹ تو؟''

''وہ بات نہیں ہے۔'' اُنہوں نے فوراً نفی کی۔ ''پچھلے دنوں گھٹنوں کے جوڑ اور مہروں کی تکلیف ذرا زیادہ ہوئی ہے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں جسم کا وزن ٹانگوں پر زیادہ ہے۔ اب تم ہی بتاؤ اِس عمر میں کیا خاک ڈائیٹنگ کرسکتا ہوں۔ اُٹھا کر عجیب اُلٹا سیدھا سا مینو دے دیتے ہیں۔ یار اب کھاتا تو بندہ اپنے جسم کی ضرورت کے مطابق ہی ہے ناں۔'' رفیق سر کے شکوے ڈاکٹر حضرات سے کچھ زیادہ ہی تھے۔ سوار نے مسکرا کر تائید کی۔

''لیکوئڈ اور فروٹس زیادہ لیا کریں سر، اور روٹی کسی ایک ٹائم کھایا کریں۔''

''ہاں۔ کوشش تو میری بھی یہی ہے، اور اب تو کنعان بھی کوکنگ کلاس کی وجہ سے ہیلدی ڈائٹ پر تقریریں کرتی نظر آتی ہے۔ سارے گھر کا مینو اُتھل پتھل کر کے رکھ دیا ہے۔ اماں بے چاری بھی زیرِ عتاب آئی ہوئی ہیں۔''

''اوہ۔'' وہ ہنس پڑا۔ کنعان ایسی ہی تھی۔ ایک دم جذباتی، جوشیلی اور جھٹ پٹ اثر قبول کرنے والی۔

''تم سناؤ۔ نیا کام اور جگہ راس آگئے؟ کنعان بتاتی رہتی ہے کہ کیسے شاندار ہوٹل میں کام کرتے ہو۔''

''آپ آئیں ناں سر۔ آپ دیکھیں گے تو بہت خوش ہوں گے۔''

''ایک روز بڑے جوش سے تیار ہوا۔'' وہ کچھ یاد کر کے مسکراتے ہوئے پہلو بدل کر سیدھے ہو بیٹھے۔ ''تمہاری کوکنگ کلاس آف ہونے کا ٹائم تھا۔ میں نے سوچا واپس ہوٹل آچکے ہوگے، لیکن اچانک ہی موسم خراب ہوگیا اور میری بھی ہمت کمزور پڑ گئی۔ کنعان کو بتایا تو کہنے لگی، اب وہ کیوں ملے گا آپ سے، اب تو وہ بھی منیجر ہوگیا ہے۔

''کنعان تیری ایسی کی تیسی۔'' وہ منہ ہی منہ میں سُنا کر رہ گیا۔ پیٹھ پیچھے بولتی ہے۔

''بیٹھک کے گھر والے دروازے پر ہلکی دستک ہوئی اور کھلے کو دل یک دم بے سُرا ہوا لیکن دروازہ کھول کر اندر آنے والی لڑکی اُس کے لیے بالکل اجنبی تھی۔ سلام کر کے ہاتھ میں اٹھائی ٹرے ٹیبل پر رکھی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں رفیق سر سے کچھ کہا۔

''میں بنالوں گا۔'' وہ تھوڑا سا آگے ہوئے اور لڑکی کمرے سے باہر چلی گئی۔

''میری بڑی بیٹی ہے ماہین۔ کوہالہ میں بیاہی ہوئی ہے۔'' رفیق سر نے اس کے جانے کے بعد خود ہی تعارف کرایا۔

''اچھا اچھا..... میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ غالباً کم کم آتی ہیں۔ میری جاب کے ڈیڑھ مہینے کے دوران بھی اتفاق نہیں ہوا شاید۔''

''ہاں بہت ہی کم۔'' وہ آگے بڑھ کر چائے بنانے لگے۔ ''اب بھی کنعان کے رشتے کی وجہ سے رابعہ آپا نے بُلوا بھیجا، ورنہ تو عید میلاد پر بھی کم ہی کبھی بھیجا ہے میرے داماد نے۔ وہ اُس کی حالت سے بے خبر اپنی لہر میں بولے جا رہے تھے۔ جس کا دل یک لخت کہیں گھنوں میں جا پڑا تھا۔ کنعان کا رشتہ۔

''کنعان بی بی کا رشتہ طے ہوا ہے۔'' پوچھے بنا تو وہ رہ نہیں سکتا تھا، لہجہ البتہ خوب سرسری رکھا۔

''طے نہیں ہوا ابھی۔'' اُنہوں نے چائے کا کپ سوار کی طرف بڑھایا۔ ''میری آپا پیغام لے کر آئی ہیں اپنے جیٹھ کے بیٹے کے لیے، ماہین کو بھی مشورے کے لیے بلایا ہے۔ بس اِسی سوچ بچار میں ہیں۔'' اپنا کپ ہاتھ میں لے کر انہوں نے صوفے کی پشت سے پیٹھ ٹکائی۔ چہرے پر ایک نامعلوم سی اُداسی اور ماتھے پر تفکر کی واضح لکیر اُبھر کر معدوم ہوئی۔

''سر۔ خرابی طبیعت کی اصل وجہ کہیں یہ تو نہیں۔'' سوار نے اُن کی کیفیت سے جو اخذ کیا۔ پوچھے بنا رہ نہیں سکا۔ جواباً رفیق احمد بھی ہلکا سا مسکرا دیے۔

''ماہین کی شادی کے وقت اِن کی ماں حیات تھیں۔ جانے یہ مائیں اِس قدر بھاری ذمہ داری کا بوجھ کیسے اتنی آسانی سے اُٹھا لیتی ہیں۔ اب وہ نہیں ہے تو خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہا ہوں۔''

''رشتہ طے کرنے میں کچھ ہچکچاہٹ ہے یا شادی کی تیاری اور بجٹ وغیرہ۔'' سوار ابھی بھی سمجھنے سے قاصر تھا کہ سر کی اُلجھن کس معاملے میں ہے۔

''بجٹ کا معاملہ نہیں ہے۔ بیٹی گھر میں ہو تو یہ انتظام کھانے پینے سے بھی زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ اصل فکر تو بیٹیوں کے نصیب کی ہوتی ہے۔''

''تو اِس رشتے کے حوالے سے کیسے خدشات لاحق ہیں آپ کو۔ سوری سر۔ میں نہیں جانتا مجھے پرسنل ہونا چاہیے یا نہیں، میں بس آپ.....''

''جانتا ہوں سوار۔ نہ تمہاری سمجھ پر کوئی شک ہے نہ نیت پر۔ تمہارا کنسرن مجھے اچھا لگ رہا ہے اور شاید پہلی بار میں بھی اِس موضوع پر بات کرنے کے لیے خود کو تیار محسوس کر رہا ہوں۔ اب سے پہلے ایک عجیب سی خاموشی اور گریز طاری تھا طبیعت پر۔ جبکہ بات کر لینا واقعی بہت اچھا بہت مددگار ثابت ہوتا ہے۔ تم سے خود بخود بات کرنے کو دل چاہا بھی کہہ بیٹھا۔''

''تو سر۔ آپ کے خیال میں اس رشتے کی اچھی باتیں کون سی ہیں۔ یعنی وہ وجوہات جن کی بنا پر آپ اس رشتے کے لیے حامی بھر سکتے ہیں؟'' سوار نے اس مرتبہ واضح انداز میں ایک سوال سامنے رکھا تاکہ سر کو بات کرنے میں آسانی ہو۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ سر خود بھی بری طرح کنفیوژ ہیں۔ شاید اِس طریقے سے انہیں فیصلہ کرنے میں کچھ مدد ملتی۔

''ہوں۔'' رفیق احمد نے تفہیمی انداز میں سر ہلاتے رُک کر کچھ دیر سوچا۔ ''پہلی اچھی بات تو لڑکے کی اچھی جاب ہے۔ نجی بینک میں منیجر کی پوسٹ پر کام کرتا ہے۔ اور.....'' وہ لمحے کو رُکے۔ ''دوسری وجہ تو بس یہی ہے کہ آپا بڑے مان سے رشتہ لائی ہیں، کیسے منع کر دوں۔''

''اور رشتے کے منفی پہلو؟'' سوار نے پچھلی بات پہ تبصرہ محفوظ رکھا۔

''دُوری۔'' انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ''کنعان کی کم عمری، اُن لوگوں کا مزاج۔ غصے کے ذرا زیادہ تیز ہیں خصوصاً اُن کے مرد۔ آسان الفاظ میں کہا جائے تو میری بہن کا صبر تھا ایسے غصہ ور آدمی کے ساتھ زندگی گزار گئی۔ اب یہ لڑکا زبیر کیسا ہے، زیادہ تو نہیں جانتا، لیکن دیکھ رکھا ہے، بظاہر تو سب

ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔ ہوسکتا ہے میرا وہم ہو، کبھی سوچتا ہوں کسی نہ کسی پہ تو بھروسا کرنا ہی پڑے گا تو یہی کیوں نہیں، کبھی لگتا ہے ابھی انتظار کروں۔'' وہ ایک تھکی تھکی سانس بھرتے بالآخر اپنے دل کی بات کہہ بیٹھے۔

''سر رشتوں..... خصوصاً بچیوں کے رشتوں کے حوالے سے دو پوائنٹ آف ویو ہمیشہ نقصان کا باعث بنتے ہیں..... سوار نے پُرسوچ انداز میں آغاز لیتے خود کو بولنے کے لیے تیار کیا۔ ''پہلا تو ہر آنے والے رشتے میں مین میکھ نکال کر ریجیکٹ کرتے بالآخر لڑکیوں کو بوڑھا کر دینا، اور دوسرے یہ سوچ کر کہ ہمارے بعد اِن کا کیا بنے گا، وقت سے پہلے بیٹیوں کو بیاہ دینا۔ جہاں تک میری رائے ہے آپ کو سب سے پہلے کنعان بی بی کی مرضی کو مدِ نظر رکھنا چاہیے، ہوسکتا ہے فی الحال وہ گریجویشن کمپلیٹ کرنے کو ترجیح دیں، باقی دل رضامند ہوتا ہے تو رشتہ طے کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ ہوسکتا ہے سال، دو سال کی مہلت مل جانے پر اُن لوگوں کو جاننے سمجھنے کا موقع مل جائے، کیونکہ رشتہ ٹوٹنا۔ خدانا خواستہ..... شادی ٹوٹنے سے بہرحال کم تکلیف دہ ہے۔

قدرے اعتماد سے ہر پہلوان کے سامنے رکھتے اندر سے اس کا دل بری طرح کانپا تھا۔ اللہ جانے اس کی رائے کے نتیجے میں سر کا جھکاؤ کس سمت میں ہو۔ بہرحال مشورہ اس نے خالص نیک نیتی سے دیا تھا بنا اپنے مفاد کو بیچ میں لائے۔

''ماہین کے ٹائم میری بیگم نے خاصی عجلت سے کام لیا تھا۔ میرا داماد غیر خاندان سے ہے، مالی حیثیت بس مستحکم تھی اِس لیے رشتہ کر دیا، لیکن سوائے اس ایک خوبی کے کسی حوالے سے میں اعجاز کو ایک آئیڈیل داماد نہیں مان سکتا۔''

''ضروری نہیں سر کہ غیروں کے رشتے ہمیشہ غلط اور اپنوں کے صحیح ثابت ہوتے ہیں۔'' سوار نے فوری طور پر بے ساختہ ان کا خیال رد کیا پھر خود ہی وضاحت کے انداز میں گلا کھنکارا۔ ''میرا مطلب ہے سر۔ صرف اِس بُنیاد پر اپنوں کو پریفر کرنا کہ بڑی بیٹی غیروں میں خوش نہیں ہے، اسٹینڈرڈ قائم کرنے والی بات ہوگی۔''

''یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں۔'' وہ ہلکا سا مسکرائے۔ ''کنفیوژن بھی ساری یہی ہے کہ معیار قائم نہ کریں تو رِسک بھی کس بنیاد پر لیں۔ پھر یہاں معاملہ میری بہن کا ہے۔ وہ کس محبت اور مان سے رشتہ لائی ہے۔''

''سر۔ معذرت کے ساتھ۔'' محض یہ سوچ کر رشتے کے لیے ہامی بھرنا کہ بہن کتنے مان سے آئی ہے، میرے نزدیک اور بھی زیادتی ہے۔ گھر میں رکھے سامان اور ایک انسان میں فرق بہرحال اتنا تو ہوتا ہی ہے کہ اُسے کسی کا دل رکھنے کی بھینٹ نہیں چڑھایا جاسکتا۔

''تو پھر کیا کریں سوار۔ بیٹیوں کو تجربے کرنے کے لیے بھی جھونک نہیں سکتے۔''

''اللہ کے کرم کا انتظار کریں۔ جہاں دل مطمئن ہوتا دکھائی دے سمجھ جائیں یہ استحکام اللہ کی خاص مہربانی ہے۔ اِس مرتبہ سوار نے جھیلوں سے رواں لہجے میں بڑی سہولت اور اعتماد سے کہتے چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگایا۔

رفیق احمد نے کسی قدر بے یقینی سے سوار کے اعتماد کو دیکھا اور لاجواب سا ہو کر ہنس پڑے۔ بھلا اس سے جامع اور تسلی بخش جواب اور کیا ہوسکتا تھا۔ اگر ایک دن اللہ پاک انہیں کسی ایک فیصلے پر جم جانے میں مدد فرمائیں گے، تو وہ کیسے اس دن کا انتظار نہ کریں۔

''تھینک یو سوار۔ میں کسی ایسے ہی شخص سے مشورہ کرنا چاہتا تھا جس سے کھل کر ہر پہلو ڈسکس کیا جاسکے۔ میری اندرونی کیفیت کو بھی ایک تم ہی سمجھ پائے ہو۔ تم سے شیئر کر کے میں دلی خوشی اور سکون محسوس کرنے لگا ہوں۔''

''اللہ آپ کے سکون آپ کی خوشی میں اور اضافہ فرمائے سر۔ میں نے تو ایک ادنیٰ سی کوشش کی

ہے۔''

''میں اپنی صحت سے پریشان ضرور ہوں سوار لیکن اللہ کے کرم سے مایوس نہیں ہوں۔ اُس نے کنعان کے لیے یقیناً کچھ اچھا سوچ رکھا ہوگا۔ مجھے گریجویشن تک کم از کم بالکل اسے ڈسٹرب نہیں کرنا چاہیے۔ آخر میں وہ بتا کم اور اپنے آپ سے بول زیادہ رہے تھے۔'' سوار نے ایک بھاری گھڑ سا سر سے اُترتا محسوس کیا۔ دل ہی دل میں سر سے معذرت بھی کہ بہر حال ایسے بظاہر نیوٹرل نظر آتے مشورے کے پیچھے کہیں نہ کہیں اس کا ذاتی مفاد بھی ضرور کارفرما تھا۔

☆☆☆

مکافاتِ عمل کسی گھات لگائے شکاری جیسا تھا۔ پر اُسے تو کچھ زیادہ ہی جلدی آلیا تھا۔ اب تو نہ دن کو سکون تھا نہ رات کو آرام۔ جانے کیسا دل دُکھا بیٹھی تھی کسی کا۔

آئینے میں اپنی ویران آنکھوں کو دیکھتے وہ بارہا خود سے سوال کر بیٹھتی۔ ملامت ندامت کے کالے بچھو ڈس ڈس کر بے دم کرنے لگتے۔

''بھاگ جاؤ یہاں سے۔ بھاگ جاؤ شازمہ۔ یہاں اب نرا درد ملے گا۔

زندگی مستقل چبھنے والا کانٹا بنتی جارہی تھی۔ وقاص قریب نہ ہوتا تو کچھ اور طرح کے وہم، خدشے اور بے چینیاں دل کو لاحق رہتیں۔ وہ آجاتا تو وہموں خدشوں، شکوؤں کی شکل کچھ اور رنگ میں ڈھلنے لگتی۔ وہ دن پانی کی مچھلی جیسی تڑپ رہی تھی۔ پل پل سلگتی۔ پل پل مرتی۔

''عبدل بھیا آئے ہیں باجی۔'' سکینہ نے باقاعدہ اُس کا کندھا ہلایا۔

''ہوں۔ ہاں۔'' وہ بری طرح چونکی۔ ''اچھا۔ اندر بلالو۔''

''جی باجی۔'' وہ فوراً دروازے کی طرف دوڑ گئی اور کچھ ہی دیر میں عبدل کو لیے واپس گھر میں داخل ہوئی۔ شازمہ نے اپنے آبشاروں سے گھنے لمبے بال ہاتھ پر لپیٹے اور ڈھیلے ڈھیلے ہی سامنے کندھے پر آگے کی طرف ڈال دیے۔

عبدل نے گھبرا کر نظر چُرالی۔ بھابی آج اپنے ہی کسی دھیان میں لگتی تھیں۔ سر پر دوپٹا بھی نہیں لیا تھا۔ یونہی باریک سا گلے میں رسی جیسا لٹک رہا تھا۔ عبدل نے بمشکل ناگواری چھپا کر آنکھوں کا زاویہ تبدیل کیا۔

''آپ نے کچھ سی ڈیز منگوائی تھیں۔ یہ آپ دیکھ لیں۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا شاپر سامنے کیا۔'' ابھی تک وہ دروازے سے دو قدم آگے آکر صحن کے بیچوں بیچ ہی کھڑا تھا۔

''اوہاں۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔'' چہرے پر ثبت اپنی خزاں سی اُداسی کو اُس نے پھیکی بے رونق مسکراہٹ سے چھپانے کی سعی کی۔

''کچھ سی ڈیز گانوں کی ہیں۔ کچھ مزاحیہ فلموں وغیرہ کی۔ آپ دیکھ لیں۔ اور بچوں کی سی ڈیز ہیں۔ ایک دوست سے لے کر آیا ہوں۔ خریدنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ جو آپ کو پسند آئیں وہی ڈاؤن لوڈ کرلیں گے۔ باقی رہنے دیں۔ بلاوجہ جگہ گھیریں گی۔''

''اندر آجاؤ آدی۔ ابھی کرلیتے ہیں۔'' شازمہ بھی سی ڈیز کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے دھیان بدلنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اندر آکر لیپ ٹاپ آدی کے حوالے کیا اور خود بھی ساتھ والے سنگل صوفے پر آبیٹھی۔ جس روز سے عبدل نے سنگل صوفوں کو کام سمجھانے کے لیے منتخب کیا تھا تب سے یہی جگہ مخصوص ہوگئی تھی۔

''مجھے یہ بھی سکھاؤ ناں آدی۔'' وہ تھوڑا سا آگے کو ہوئی۔

''جی؟'' عبدل نے لحظے کو چہرا شازمہ کی طرف موڑا۔ ''کیا؟''

''بھئی یہ جو سی ڈیز کو تم لیپ ٹاپ میں ڈالتے ہو۔ مجھے بھی پتا ہونا چاہیے۔''

''جی جی۔'' مسکرا کر سر ہلاتے وہ دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوا۔ ''یہ گانوں والی سی ڈی کاپی کرنے لگا ہوں۔ آپ دیکھتی جایئے۔ میں ساتھ ساتھ سمجھاتا بھی ہوں۔ پھر اگلی سی ڈی آپ کاپی کر کے مجھے دکھائیں گی۔'' وہ اب قدرے آہستگی سے ہاتھ چلاتے اسے سمجھانے بھی لگا۔

''جی اب آپ کوشش کریں۔'' اس نے کام مکمل کر کے لیپ ٹاپ شازمہ کے سامنے رکھا اور کور سے نئی سی ڈی نکال کر اس کے ہاتھ میں دی۔ شازمہ نے پہلی بار میں ہی کامیابی سے سی ڈی سے کاپی کر لی اور ایک گانے پر کلک بھی کر دیا۔

''دل کیا کرے جب کسی سے کسی کو پیار ہو جائے

جانے کہاں کب کسی سے کسی کو پیار ہو جائے

''گڈ۔ اب تو آپ آرام سے کر لیں گی۔'' عبدل شاپر میں سامان سمیٹنے لگا۔

''تم نے کبھی محبت کی ہے آدی؟'' وہ ہلکا سا رخ موڑ کر اب صوفے کے ہتھے پر کہنی ٹکائے بیٹھی تھی۔

''جی نہیں۔'' وہ مسکرا کر نیچے دیکھتے اپنے کام میں لگا رہا۔

''تب تو کرنا بھی مت۔'' وہ ایک آہ بھر کر سیدھی ہوئی۔ ''بڑا درد ہی ملتا اس مصیبت کے ہاتھوں۔

''وقاص بھائی تو آپ سے بہت پیار کرتے ہیں بھابھی۔'' عبدل نے آگے بڑھ کر والیوم کم کیا۔ مسکراہٹ کی جگہ چہرے پر اب متانت جھلکتی تھی۔

''ہفتے میں ایک روز کی آمد کو اس کا پیار کہہ رہے ہو آدی۔'' وہ پھر سے غم میں ڈوبنے لگی۔

''آپ سے بہتر ان کی مجبوریاں کون سمجھ سکتا ہے۔'' آدی نے دانستہ کنی کترائی۔ کسی سے بلاوجہ پرسنل ہونا اسے کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔

''پہلے مجھے کبھی ایسا لگتا تھا۔'' شازمہ کی بے اختیار ایک تھکی تھکی سی آہ نکل گئی۔ پلکیں تو برسنے کو تیار رہتی تھیں آج کل۔ شازمہ نے دوپٹے کے پلو سے آنکھوں کے نم گوشے صاف کیے تو عبدل نے اچنبھے سے دیکھا۔

''کچھ ہوا ہے بھابھی؟'' پوچھنا اس لمحے کچھ اخلاقی تقاضا محسوس ہوا۔

''کچھ ایسا ہوا ہے آدی کہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتی۔'' لہجہ بری طرح بھرایا اور وہ ہاتھوں میں چہرا دے کر رونے لگی۔ عبداللہ نے ایک دم بڑی گھبراہٹ محسوس کی۔ وہ جانا چاہتا تھا یہاں سے لیکن سراسر بے مروتی تھی، اسی لیے مجبوراً جما رہا۔

''وقاص بھائی سے کوئی جھگڑا ہو گیا ہے؟'' عبدل نے پھر استفسار کیا اور شازمہ نے ہولے سے پہلے نفی میں سر ہلایا پھر ایک دم مسکرا دی۔

''بہت جذباتی ہوں میں، ویسے ہی گانے سن کر دل بھر آیا۔''

''اوہو۔ پھر تو پیچھے آپ مسلسل روتی ہی رہیں گی، میں بھی ڈھیروں کے حساب سے گانے بھر کر لے آیا۔'' آدی نے ماحول کی سنجیدگی کم کرنے کی غرض سے ہلکے پھلکے کہہ دیا ساتھ ہی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''آمنہ بھابھی کو کچھ مت بتانا آدی۔''

''کیا نہیں بتاؤں۔'' وہ واقعی نہیں سمجھا۔

''یہی میری پریشانی اور رونے کے بارے میں۔''

''اب یہ بھی کوئی بتانے والی بات ہے کہ آپ گانے سن کر رونے لگتی ہیں۔'' وہ ہنس کر دروازے کی طرف چل پڑا۔

''اپنا نمبر تو دیتے جاؤ آدی، تمہیں بلانے کے لیے مجھے سکینہ کو بھیجنا پڑتا ہے، کبھی آمنہ بھابھی کو کال کرنا پڑتی ہے۔''

''جی بھابھی، لکھ لیں۔'' وہ اب مڑ کر دروازے تک چلا گیا تھا، شازمہ نے اپنا موبائل نکال کر سوالیہ نظر اٹھائی تو عبدل نے نمبر نوٹ کروا دیا۔

''ایم ایس ورڈ میں بھی کچھ کام کیا تھا بھی؟''

''بالکل نہیں۔'' وہ شرمندہ سی ہنس دی۔ ''پچھلے دنوں کسی معاملے کی وجہ سے بہت اپ سیٹ رہی تو بس دل ہی نہیں کیا۔''

''خود کو مصروف رکھا کریں، پریشانی زائل کرنے کے لیے خود سے کوشش کرنا پڑتی ہے، تکلیف دیتی باتوں سے دھیان ہٹانا پڑتا ہے۔'' اس نے اپنی طرف سے سمجھانے کی کوشش کی اور شازمہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتے دیکھتے گم صم سی ہوگئی۔

''کیا ہوا؟'' عبدل نے اپنی بات کا ایسا خاموش رسپانس بڑے چونک کر دیکھا اور شازمہ بھی ہنس کر حال میں واپس آئی۔

''کاش یہ اتنا آسان ہوتا۔ لیکن......'' وہ ایک لمبی آہ بھر کر رہ گئی اور عبدل خدا حافظ کہتے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''سر۔ آپ کی کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے ناں، آپ جائیں میں دیکھ لیتا ہوں۔'' نوریز نے اسے کمپیوٹر پر بزی دیکھ کر یاد دلایا۔

''اوہ۔'' سوار نے گھڑی کی طرف دیکھ کر تاسف سے لب دبائے۔ ''بیس منٹ اوپر ہوگئے تھے، جاتے جاتے بھی دس منٹ تو لازمی لگ جائیں گے، یعنی میم کی کلاس تو مس ہو جائے گی۔''

''ہوں۔'' وہ جیسے حتمی نتیجے پر پہنچا۔ ''اب تو مشکل ہے، بس کل ہی جاؤں گا۔'' اس نے نوریز کو دیکھا تو وہ سر ہلاتا باہر کی طرف مڑ گیا۔

''نوریز یار۔ ایک کپ چائے کا بھجوا دو، سر میں درد ہو رہا ہے۔'' لیپ ٹاپ آف کرتے اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکایا اور دونوں بازو پیشانی پہ رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

کوکنگ اسکول سے چھٹی کا آج یہ دوسرا دن تھا۔ پچھلے روز اسلام آباد سے میڈم کے کچھ مہمان آئے تھے۔ ان کو ریسیو کرنے کا ٹائم عین وہی اکیڈمی والا بنا تو وہ جا نہیں پایا لیکن آج تو سراسر اسی کی کوتاہی تھی۔ عملے کی سیلریز وغیرہ کا ریکارڈ کمپیوٹر میں ڈالتے وہ ٹائم سے بالکل غافل ہو گیا تھا۔ سر تو مسلسل کام کرنے کی وجہ سے بھاری ہوا، کوکنگ کلاس مس کرنے پر من بھی بوجھل ہونے لگا۔

آج دو روز ہو گئے تھے اس نے کنعان کو نہیں دیکھا تھا۔ رفیق سر سے مل کر آنے کے بعد سے ملاقات ہی نہیں ہوئی، جانے کیا بنا تھا اس کے رشتے والے معاملے کا۔ وہ چائے پینے کے دوران بھی لگاتار اسی کو سوچتا رہا تھا۔ چائے پی کر طبیعت قدرے بحال ہوئی تو پہلے اس نے اپنا ادھورا کام مکمل کیا پھر لیپ ٹاپ بند کر کے پہلی منزل کی سیڑھیوں سے سڑک پر کھلتی ونڈو میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ کوکنگ کلاس کا ٹائم اب ختم ہو چکا تھا۔ کنعان کسی بھی وقت دائیں ہاتھ سے آتی دکھائی دیتی۔ وہ جس گلاس وال کے اندر کھڑا تھا اس سے باہر کا منظر تو باآسانی دیکھا جا سکتا تھا لیکن باہر سے اندر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اور وہ بھی تو آج جی بھر کے بس اسی کو دیکھنا چاہتا تھا جو اس کی موجودگی سے بے خبر کسی بھی وقت سامنے سے گزرنے والی تھی۔

سوار نے دائیں جانب دور تک نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کنعان وہاں سے اکیلی چلتی ہوئی آ رہی تھی۔ دیا آس پاس آگے پیچھے کہیں دکھائی نہیں دی، پہلے تو سوار کا دل بڑی مدھر دھن پہ لہکا اور پھر سوچنے میں بس لمحہ بھر لگاتے تو اُس نے جست لگا کر آن کی آن میں سیڑھیاں پھلانگیں اور ہوٹل کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ کنعان ابھی بھی ہوٹل سے کافی پیچھے تھی۔ سوار تیز قدموں سے چلتے خود ہی اس تک جا پہنچا ہوٹل کے عین سامنے وہ اسے روکنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کنعان ابھی تک نظریں نیچی کیے اپنے کسی دھیان میں گم تھی۔

''ہیلو فرینڈ۔'' اس نے اپنے تیز قدموں کو ٹھیک کنعان کے سامنے بریک لگائی۔

''آ......آپ......'' وہ ایک دم ٹھٹک کر اب حیران حیران نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اکیلی ہیں آج۔ دیا نہیں آئی؟"

"جی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"

"او...... تو اکیلی چلی جائیں گی؟" سوار کو اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

"جی۔ آئی بھی اکیلی تھی۔" اس نے ذرا کی ذرا آنکھ اٹھائی۔

"بے مروت دوست، دو دن سے غیر حاضر ہوں، وجہ تک نہیں پوچھی۔" وہ اب بات لمبی کر رہا تھا۔

"شاید اکیڈمی چھوڑ دی ہو۔" اس نے اپنا دوروزہ انداز بنا لگی لپٹی کے فوراً بتا دیا۔

"طبیعت بھی تو خراب ہو سکتی ہے۔"

"وہ تو دکھائی دے رہی ہے۔" کنعان کا جواب بہت بے ساختہ تھا۔ "بظاہر ٹھیک ہی لگ رہے ہیں۔"

"صحیح کہہ رہی ہیں، طبیعت بالکل ٹھیک ہے لیکن اکیڈمی بھی نہیں چھوڑی، کل سے آؤں گا ان شاء اللہ۔ آئیں ساتھ چلتے ہیں۔" اس نے ہاتھ سے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہم قدم ہونے کی کوشش کی لیکن قدم آگے بڑھاتی کنعان اسی لمحے دوبارہ رک گئی اور اس مرتبہ بجائے نظریں چرانے کے اعتماد سے سوار کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں خود چلی جاؤں گی، آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور پلیز آئندہ اس طرح راستے میں یوں نہ روکا کریں۔" سنجیدہ لب ولہجہ اور چہرے کی کرختگی اس کا انداز نہیں تھا لیکن وہ ایسا کر گئی تھی۔

سوار کو یقین کرنے کے لیے شاید ایک مدت یہیں رُکے رہنا تھا۔ سخت سردی میں جیسے کسی پر یخ ٹھنڈا پانی اُنڈیل دیا جائے۔ تیز قدموں سے وقار کے ساتھ چلتی وہ آگے بڑھ گئی تھی اور اس کے قدموں کو گنتے وہ حد درجہ بے یقین سا وہیں پتھر ہو گیا۔ آج وہ کس بری طرح ہرٹ کر گئی تھی۔ کتنی غیریت، کتنی اجنبیت تھی اس کی آنکھوں میں۔ اور کتنی بے مول تھی سوار کی ذات اس لمحے۔ بہت دیر اور بہت دور تک نظر آتے رہنے کے بعد بالآخر وہ لوگوں کے ہجوم میں اس کی نظروں سے اوجھل ہوئی تو سوار کو ہوش آیا۔

تھکے قدموں سے ہوٹل واپس آتے کچھ سوچا، ریسیپشن پر نوریز اکیلا بیٹھا تھا۔ سوار نے اسے اپنے ایک گھنٹے کے لیے کہیں جانے کا کہہ کر دوبارہ باہر کی راہ لی۔ مرض جب شدت اختیار کرتا ہے تو قدم خود بخود طبیب کی طرف اٹھتے ہیں، وہ جب ڈھابے پر پہنچا شام کو جمع ہو جانے والوں کا رش لگا ہوا تھا۔ لوگ ہنسنے بولنے اور کھانے پینے میں مگن تھے۔ میاں جی۔ کے ڈھابے کے پیچھے والی بلڈنگ اب بن کر تیار ہو چکی تھی۔ ڈھابے پر اب دیہاڑی کے مزدوروں کی جگہ عام لوگ دکھائی دیتے تھے۔ میاں جی بڑی کھاٹ پر بیٹھے کسی کے ساتھ باتوں میں مشغول تھے۔ سوار کو دیکھا تو فوراً اُٹھ کر قریب آئے۔

"ارے آؤ سوار، ماشاء اللہ لمبی عمر ہے، ابھی رب نواز کے ساتھ تمہارا ہی ذکر چل رہا تھا۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے ایک ذرا دور رکھی خالی چارپائی کی طرف لے آئے۔

"میاں جی یہاں سے چلے تو نہیں جائیں گے؟" وہ بنا ان کی بات سنے سرخ آنکھوں میں عجیب گہری سی سنجیدگی لیے انہیں دیکھ رہا تھا۔

میاں جی بری طرح ٹھٹکے۔

"کہاں چلا جاؤں گا؟"

"پہلے روز میں جب آیا تو آپ نے کہا تھا کہ پیچھے کی زیر تعمیر بلڈنگ کے مزدوروں کی وجہ سے آپ نے ڈھابا کھولا ہے، اب تو بلڈنگ تیار ہو گئی، مزدور بھی چلے گئے۔ کیا آپ بھی......" وہ ابھی بھی خالی خالی نظریں نئی تعمیر شدہ عمارت پر ڈالے ہوئے تھا۔

"ارے نہیں یار۔" انہوں نے ہنس کر سوار کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "تب تو قدم جمانے کے لیے کوئی بہانہ کوئی سرا چاہیے تھا، اب تو آگے نکل آئے ہیں۔ مزدور نہیں تو کیا ہوا، بیسیوں راہ گیر اور مسافر آجاتے ہیں۔"

"کہیں جانا بھی مت میاں جی۔ میں بہت

اکیلا ہو جاؤں گا۔'' سوار کی آنکھوں میں پانی تیر رہا تھا۔ اس نے بے ساختہ کہنی سے ناک رگڑی۔ میاں جی کا دل کسی انہونی کے خیال سے دھڑکا، پھر بھی ضبط سے کام لیا۔

''اکیلا پن کیسا سوار۔ اب تو ماشاء اللہ بہت ترقی کر لی ہے۔ بہت آگے تک کا سفر کر لیا ہے، جہاں نہ سہاروں کی ضرورت رہتی ہے نہ مدد کی..... پھر.....''

''کیا بچوں کو اپنی ماں کی ضرورت بھی نہیں رہتی جب وہ دنیا میں نام بنا لیتے ہیں؟'' سوار نے ان کی بات کاٹ کر گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

میاں جی چونک کی اس کی صورت دیکھنے لگے۔ پھر ایک گہری سانس لیتے اچانک ہی اس کا بازو پکڑ کر ہوٹل کی مخالف سمت والی ڈھلان کی طرف لے آئے اور وہ بھی کسی معمول کی طرح کھنچا چلا گیا۔ یہ جنگل جیسا راستہ دور کسی ریسٹ ہاؤس کو جاتا تھا۔ یہاں سکون تھا خاموشی تھی۔ سوار کی ذہنی حالت دیکھتے میاں جی کے لیے اس کی بات اتنے رش میں سننا ممکن نہیں تھا۔ درختوں کے جھنڈ سے ذرا پہلے گھاس پر ایک کھلی جگہ پر اسے بٹھاتے وہ خود بھی سامنے بیٹھ گئے۔

''کیا ہوا ہے سوار۔ کھل کر بات کرو۔'' وہ اب گھٹنوں کو اکٹھا کیے ان کے گرد اپنے دونوں بازو لپیٹے اسے دیکھ رہے تھے۔

''میں بہت برا انسان ہوں میاں جی، جھوٹا، بے ایمان۔ جسے نہ اپنے آپ سے کیے وعدوں کا پاس ہے نہ کسی اور کی عزت کا پاس لحاظ۔ میں تنگ ہوں اپنے آپ سے میاں جی۔ مر جانے کی حد تک بیزار۔'' وہ دونوں ہاتھوں میں چہرا دیے ہولے سے سسک اٹھا، میاں جی نے دھیرے سے اس کا کندھا دبایا۔

''تمہاری جذباتیت تمہاری عمر کا حصہ ہے، ہو جاتی ہیں بے ایمانیاں بھی، نادانیاں بھی، اتنے سخت کیوں ہو جاتے ہو اپنے معاملے میں، اگر تم جینا سیکھ رہے ہو، نئی چیزوں سے دل لگانا، نئی دنیا میں قدم جمانا، تو فطری سی بات ہے، زندگی کے ہر آگے کو کھسکتے پل کے ساتھ ہر گزرتے دن کے ساتھ پرانی تلخیاں مدھم ہوتے بالآخر مٹ جائیں گی۔ ہونے دو وہ سب کچھ جو عین فطرت ہے۔ کب تک یاد رکھو گے پرانے دنوں کو، کب تک جیو گے پرانی یادوں میں۔ آگے بڑھ کر گلے لگاؤ اس زندگی کو جو تمہارے استقبال کو کھڑی ہے۔''

''وہ نہیں چاہتی ایسا۔'' سوار نے سر نفی میں ہلایا۔ کسی ضدی بچے کی طرح اس کی تانیں ایک ہی مدعے پر اٹکی تھیں۔ میاں جی مسکرا دیے۔

''کون نہیں چاہتی ایسا۔ ہوا کیا ہے، اب بتا بھی دو تا کہ میں بھی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنا بند کروں۔''

''میں نے دھوکا دیا ہے اسے اور اس کے ابو کو گمراہ کیا ہے۔''

''دوست بنا کر اُسے خود سے قریب کرنے کی کوشش کی کیونکہ بنا اس سے بات کیے، اس کی طرف دیکھے مجھے چین نہیں پڑتا تھا۔ خود کو اظہار محبت سے بچانے کے لیے دوستی کا سہارا لیا تا کہ کسی بہانے سے اس کے قریب رہوں۔ پھر اس کے ایک اچھے گھر سے آئے رشتے کی راہ میں رُکاوٹیں ڈال کر رفیق سر کا دل برا کیا۔ لیکن اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ شاید وہ اس رشتے سے خوش تھی، اور شاید وہ جان گئی ہے کہ وہاں میں نے سر کو بدگمان کیا تبھی آج وہ اتنے غصے میں تھی۔''

''وہ تمہیں پسند نہیں کرتی؟'' میاں جی بے یقین تھے۔

''ہرگز نہیں میاں جی، آج تو اس کے لہجے میں سوائے نفرت کے کچھ نہیں تھا۔''

''اوہ۔ یعنی تب تو تم سیدھے سبھاؤ اس کا رشتہ بھی نہیں مانگ سکتے۔''

''رشتہ..... میرا.....؟'' سوار نے کچھ عجیب انداز میں دہرایا، میاں جی ٹھٹکے۔

''ہاں بھئی، تم نے جو اس کے رشتے کی راہ میں روڑے اٹکائے تو مطلب تم خود اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ اور.....''

''ایسا تو میں نے نہیں سوچا۔'' وہ کچھ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا تو میاں جی اپنا سر نوچنے کو آ گئے۔

''کیا اول فول کہے جا رہے ہو سوار۔ تم اس سے محبت کرتے ہو تو شادی بھی کرو گے ناں۔''

''میں کہاں اس کے قابل ہوں میاں جی۔'' وہ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح بیٹھا تھا۔ ''میں کبھی اس کے قابل نہیں ہو سکتا، وہ بہت معصوم بہت سیدھی ہے اور میں.....''

''کیا ہوا ہے تمہیں، اچھے خاصے تو ہو، ماشاء اللہ ایسی پیاری صورت، پھر اچھا کمانے لگے ہو، اس کے والد کو پسند بھی ہو۔''

''لیکن میرا ماضی میاں جی۔ وہ کسی کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا، اور جھوٹ بولوں تو زیادہ دیر شاید قائم نہ رہے، وہ جیسے خود کلامی کرنے لگا۔'' میاں جی بھی چپ بیٹھے سنتے رہے۔ سوار نے کچھ دیر بعد سر اٹھایا۔

''آپ بھی نہیں پوچھیں گے میاں جی؟''

''اونہوں۔'' انہوں نے بے ساختہ سر نفی میں ہلایا۔ ''بہت پیار کرتا ہوں تم سے، اور جن سے پیار کرتے ہیں ناں سوار، ان کے لیے دل ڈرتا ہے۔''

''وہ تو پھر بالکل برداشت نہیں کرے گی۔'' سوار مایوس ہوا۔

''لیکن وہ تو پیار نہیں کرتی ناں۔'' میاں جی بے ساختہ بولے تو سوار ہنس پڑا۔

''ہاں لیکن رشتہ مانگوں گا تب تو اس نقطۂ نظر دیکھے گی کہ جس سے شادی ہو رہی ہے وہ کیسے کریکٹر کا ہے، تو جب پیار کرنے والے ہضم کرنے کو تیار نہیں، جسے محبت نہیں ہے، اس سے اعلا ظرفی کی کیا امید لگاؤں۔''

''کبھی بہت ہمت آ گئی سوار تو جی کڑا کر کے یہ بھی پوچھ لوں گا۔'' میاں جی مسکرائے اور پھر ہاتھ آگے بڑھا کر سوار کا کندھا تھپکا۔ ''پریشان مت ہو یار، وہ اوپر والا مہربان ہے ناں، سب کو معاف کرنے والا، سب کو بخشنے والا، اس کے حضور تو قاتل بھی رحم کی بھیک مانگ سکتا ہے، تم تو پھر.....'' وہ ایک دم کہتے کہتے رک گئے کہ بہرحال سوار کا جرم تو وہ بھی نہیں جانتے تھے۔

سوار ان کے آخری جملے پر حیرانی سے بس انہیں دیکھ کر رہ گیا۔ گلے کی خشکی نے بے ساختہ تھوک نگلنے پر مجبور کیا۔ انتہا کی بے بسی محسوس کرتے وہ بس یہی سوچ پایا کہ کاش میاں جی بھی کبھی جان نہ پائیں۔ کیسے بتائے گا وہ انہیں کہ سوار علی پولیس کو ایک قتل کے جرم میں مطلوب ہے۔ تصور میں سوار نے وانٹڈ کے پوسٹر مری کی دیواروں پر لگے دیکھے اور اُن تصویروں کو بے یقینی سے دیکھتے میاں جی۔ سوار نے حقیقت سے نظریں چرانے کو سختی سے اپنی آنکھیں بھینچ لیں، گویا آنکھیں بند کر لینے سے وہ اس سچ سے نجات پا لے گا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

صدف آصف

بیسن کی روٹی

ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ حسین چہرے پہ گرتی بوندوں نے آیت کے گداز لبوں پر بڑی پیاری سی مسکان بکھیر دی۔ بہت دنوں بعد وہ بینک سے ہاف ڈے لے کر جلدی گھر لوٹ آئی تھی، اب ریلیکس موڈ میں کافی کے کپ کے ساتھ موسم کا مزا لوٹتے ہوئے اس مزاج ایک دم خوش گوار ہو گیا۔ رات سے جاری ہلکی اور کبھی تیز بارش نے موسم کو دلکش بنا دیا۔

آیت نے جھاگ دار کافی کے کپ سے ایک سپ لیتے ہوئے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ چہار سو سبزہ نکھر اٹھا تھا، پرندے چہچہانے لگے، موسم نے جیسے لوگوں کے مزاج کو بھی رنگین بنا ڈالا تھا۔ اس نے چونک کر سامنے والے احسن بھائی کی صاحب زادی عنایا کو کمپاؤنڈ میں بارش کی بوندوں سے کھیلتے ہوئے کئی بار چوری چوری اوپر کی جانب دیکھتے پایا، جہاں قریشی بھائی کا بیٹا فہد سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ یہ عمر کا کیسا دور ہوتا ہے ہر شے میں رومانس دکھائی دیتا ہے۔ مگر جب عملی زندگی میں قدم رکھا جائے تو تلخ حقیقتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اسے اپنا اور سمیع کا وقت یاد آ گیا، ایسی ہی ایک بارش میں اس نے آیت کو اس کی من پسند چاکلیٹ کا بڑا سا پیکٹ دیتے ہوئے پرپوز کیا تھا، پہلے تو وہ ششدر رہ گئی، پھر انکار کرتی بھی تو کس برتے پر۔ سمیع اس کی زندگی میں آنے والا وہ پہلا مرد تھا، جس کے سامنے اس نے اپنے دل کے سارے دکھ درد کھول کر رکھ دیے۔ آہستہ آہستہ ان دونوں کے بیچ میں اعتماد کا ایسا رشتہ پروان چڑھنے لگا کہ وہ جب تک اسے دن بھر کی روداد نہ سناتی چین ہی نہیں ملتا۔

سمیع صرف شکل وصورت ہی نہیں سیرت میں بھی یکتا تھا۔ اس کا تعلق سندھ کی ایک معزز فیملی سے تھا۔ وہ اعلا تعلیم حاصل کرنے کی خواہش لے کر شہر آ گیا، اپنی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کے لیے اس نے یہاں ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا۔ آیت اور اس کی کزن رانیہ بھی سمیع سے ٹیوشن پڑھنے لگے۔ دبلی پتلی تیکھے نین نقوش کے ساتھ گلابی رنگت کی حامل آیت کے والدین کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا، چاچا چاچی نے پال پوس بڑا کیا، پڑھایا لکھایا اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا۔ چاچی اس سے زیادہ کی روادار نہ تھیں۔ انہوں نے چاچا کے دوست سے کہہ سن کر بہت جلدی ہی آیت کی ایک اچھے بینک میں جاب لگوا دی۔ ٹیوشن تو ختم ہو گئی مگر رابطے نہ ٹوٹے۔ چاچا چاچی اپنے امریکا میں رہائش پزیر بیٹے کے پاس ہمیشہ کے لیے شفٹ ہونا چاہتے تھے، اسی لیے اب وہ لوگ جلد از جلد آیت کے بوجھ سے چھٹکارا چاہتے تھے۔ سمیع نے حالات کو سمجھتے ہوئے ساری عمر کے لیے اس کا ہاتھ تھامنے کی خواہش کا اظہار کر ڈالا۔ یوں ان دونوں کی شادی میں کوئی بہت بڑی رکاوٹ حائل نہ ہو سکی۔ یہ ضرور ہوا کہ سمیع کو اپنی ماں سے اس شادی کے حوالے سے کچھ جھوٹ بولنے پڑے۔

کوئل کی کوک پر وہ ماضی سے حال کی طرف لوٹ آئی چاروں جانب اندھیرا چھانے لگا تھا، اس نے لاؤنج کی بتی جلائی تو آنکھیں چندھیا سی گئیں۔

"سمیع ابھی تک آیا نہیں؟" آیت نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور فکر نے آ گھیرا۔ "آج تو شاید اس کا کہیں انٹرویو تھا"۔ اس نے موبائل اٹھا کر نمبر ملایا مگر بیل جانے کے باوجود دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں کی گئی۔

☆☆☆

"اب کیا ہوا، اتنے پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو؟" آیت نے سمیع کو تولیہ سے بال جھاڑتے ہوئے بغور دیکھا۔

"کچھ نہیں یار ماں جی کا فون آیا تھا، وہ کچھ دن

ہمارے پاس آکر رہنا چاہتی ہیں۔'' سمیع نے فکرمندی سے کہا۔

''اوف..... نہیں..... پلیز..... تم کسی طوران کو منع کردو.....'' آیت نے سر تھامتے ہوئے بے اختیار انکار میں سر ہلایا۔

''منع کردوں؟۔ مگر۔ کیسے؟'' ناراضی سے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

''یہ لو کال ملاؤ..... اور کوئی بہانہ بنادو۔'' آیت نے بستر پر نیم دراز ہوتے ہوئے سیل فون اس کی طرف بڑھایا۔

''مجھ سے یہ نہیں ہوگا..... کچھ تو سوچو آخر ہماری شادی کے بعد وہ پہلی بار یہاں آنا چاہ رہی ہیں۔'' سمیع نے برا مانتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

''چلو ٹھیک..... آنے دو..... ویسے بھی میں تو آج کل جاب میں بہت بزی ہوں، تمہیں خود ہی ان کا خیال رکھنا ہوگا۔'' آیت نے جمائی لیتے ہوئے آرام سے جتایا۔

''اور..... وہ جو ہم نے ان سے اتنے سارے جھوٹ بولے ہیں، اس کا کیا؟'' سمیع بھنایا۔

''تم جانو اور تمہاری ماں..... مجھے صبح جلدی اٹھنا ہے..... پلیز لائٹ آف کردو، مجھے سونا ہے!'' اس نے جان چھڑانے والے انداز میں تکیہ منہ پر رکھا۔

''مگر.....'' سمیع مزید بحث کے موڈ میں تھا مگر بیوی کی بند ہوتی آنکھوں کو دیکھ کر چپ چاپ بستر سے اتر کر باہر کی طرف بڑھا۔

''کہاں جارہے ہو، سونے کا موڈ نہیں ہے کیا؟'' آیت نے گھبرا پیچھے سے آواز لگائی، کچھ بھی تھا وہ اس کو پاگلوں کی طرح چاہتی تھی۔

''کھانا فریج میں رکھنے جارہا ہوں، ورنہ خراب ہوجائے گا۔'' اس کے لہجے میں سگھڑ عورتوں جیسی فکرمندی ابھری۔

''اچھا ہے خراب ہوجائے، سالن میں اتنی مرچیں ڈال دیں، مجھ سے تو کھایا ہی نہیں گیا۔'' وہ نیند میں بڑبڑائی تو سمیع کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی، اسے پتا تھا کے آیت کو مرچیں پسند نہیں پھر بھی چکن کڑھائی بناتے ہوئے جانے کیسے مرچیں تیز ہوگئیں۔

☆☆☆

''کیا ہوا؟..... کس کا فون تھا؟'' سمیع نے کافی کا کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بیوی کو موبائل کو گھورتے پایا تو گھبرا کر پوچھا۔

''ماسی کا فون تھا، اس نے ایک ہفتے کی چھٹی مانگی ہے؟'' آیت نے چڑ کر جواب دیا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ میری مشکلات میں مزید اضافہ۔'' سمیع نے کوفت بھرے انداز میں کہا۔

دونوں کے درمیاں خاموشی کا وقفہ آ گیا، آیت سر جھکا کر کانٹے سے کھیلنے لگی۔ گھڑی کی طرف نگاہ پڑی تو چونک کر کھڑی ہوگئی۔

''کافی تو پی لو.....'' سمیع نے سکوت توڑا۔

نہیں..... مجھے دیر ہو رہی ہے، تم پی لو۔'' انکار میں سر ہلایا۔

''اچھا..... سنو..... جب تک ماں جی یہاں ہیں، ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ تم چھٹی لے لو؟'' سمیع نے کافی کا کپ اپنی طرف کھسکاتے ہوئے لجاحت سے پوچھا۔

''سمیع..... پلیز صبح صبح۔ یہ ٹاپک نہ چھیڑو..... تمہیں پتا ہے کہ کلوزنگ چل رہی ہے، میرے لیے چھٹی لینا بہت مشکل ہوگا۔'' آیت کے چہرے کے حسین نقوش بگڑنے لگے۔

''افوہ..... تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟ ماں جی ذرا پرانے خیالات کی عورت ہیں، ان کے لیے یہ سب باتیں ہضم کرنا مشکل ہوگا۔'' سمیع کے لہجہ میں بیزاریت ابھری۔

''یہ سب تمہاری غلطی ہے، سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم نے انہیں یہاں بلوالیا، اب بھگتو۔'' آیت نے بھنا کر اپنا پرس کاندھے پر ٹانگا اور پیر پٹختی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔

سمیع نے بھی اسے نہیں روکا، منہ بگاڑ کر میز پر سے ناشتے کے برتن سمیٹنے لگا۔ باہر نکلتے ہوئے آیت نے پلٹ کر دیکھا تو اسے اپنے رویے پر افسوس ہوا۔ اس نے طویل سانس اپنے اندر کھینچی اور واپس پلٹی۔ سمیع کا بازو تھام کر اس کو منانے کی کوشش کی مگر وہ بالکل بھی اس کی جانب متوجہ نہیں ہوا۔ منہ پھلائے کاموں میں مصروف رہا، اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تھک ہار کر آیت باہر کی طرف چل دی۔

☆☆☆

''تمہاری تنخواہ اکاؤنٹ میں نہیں آئی کیا؟'' سمیع نے چھٹی والے دن دیر سے ناشتا کرنے کے بعد پوچھا۔

''نہیں اس بار تھوڑی لیٹ ہوگئی ہے، ہوسکتا ہے کل تک آجائے۔'' آیت نے واشنگ مشین میں کپڑے ڈالتے ہوئے نرمی سے جواب دیا۔

''اوہ..... میں سوچ رہا تھا، جا کر تھوڑی گروسری لے آؤں.....'' سمیع نے اس کے روشن چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ٹھیک ہے اور یاد سے ..... بیسن بھی لانا.....'' آیت نے شوہر کو کپڑے کا تھیلا تھماتے ہوئے کہا۔

''کیوں بیگم کیا پکوڑے بنانے کا نیک خیال ہے؟'' سمیع کے دل میں لڈو پھوٹے۔

''نہیں میاں ایسی نیکی سے تو میں باز آئی۔'' اس نے مصنوعی انداز میں بھنویں اچکا کر غصہ دکھایا۔

''کیوں..... جی..... موسم ہے عاشقانہ..... اے دل کہیں سے ان کو، پکوڑے کی پلیٹ کے ساتھ لانا۔'' وہ بھونڈے انداز میں گنگنایا۔

''افوہ..... میرا نہیں تو کچھ اپنا خیال کرلو..... وزن دیکھا ہے کتنا بڑھ گیا ہے،'' آیت نے شوہر کے پیٹ پر انگلی رکھ کر جتایا۔

''اچھا..... تو ظالماں..... پھر بیسن کیوں منگوایا؟'' وہ ہنستے ہوئے گنگنایا۔

''بھول گئے ..... ہاں جی..... کو شوگر ہے، وہ گندم کی نہیں بیسن کی روٹی کھاتی ہیں۔'' آیت کے یاد دلانے پر اسے بیوی پر پیار آ گیا۔

☆☆☆

''کیا ہوا جانہیں رہے۔'' اندر سے میلے کپڑوں کا گٹھر اٹھائے آیت باہر آئی تو سمیع کو ٹی وی

کے سامنے ڈٹے دیکھ کر پوچھ بیٹھی۔

''نہیں..... کل مجھے بھی ٹیوشن کے پیسے مل جائیں گے، پھر لے آؤں گا۔'' اس نے دبے لہجے میں جواب دیا۔

''ارے،، دراز میں پیسے رکھے تو ہیں، وہاں سے نکال لو۔'' آیت نے سمیع کی جینز کے پائنچے رگڑتے ہوئے جواب دیا۔

''وہ تو تم نے اپنے کپڑوں کی شاپنگ کے لیے رکھے تھے۔'' وہ اٹھ کر آیت کے قریب گیا اور پیار بھرے انداز میں موی ہاتھوں کو چومتے ہوئے جواب دیا۔

''کوئی بات نہیں تم جاؤ، جب پیسے مل جائیں تو مجھے دے دینا میں ان سے شاپنگ کرلوں گی۔'' اس کے لہجے کا اطمینان چہرے کے گلابی پن پر سمیع کا دل ڈولا، قریب ہوکر گھنے بالوں میں انگلی کلپ نکال دی، سیاہ رنگ کی آبشار سی بکھر گئی۔

''کیا ہوا؟'' وہ اس کے دیکھنے کے انداز پر تھوڑا شرمائی اور ہاتھوں سے بالوں کا جوڑا دوبارہ بنالیا۔

''کچھ نہیں یار..... تم بھی میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی؟'' اس نے سرد آہ بھری۔

''کیا۔ سوچتی ہوں گی..... مطلب؟'' آیت نے اس کی چمک دار آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اظہار حیرت کیا۔

''ہماری شادی کو ایک سال ہو گیا ہے، مگر کوشش کے باوجود مجھے ڈھنگ کی ایک جاب نہ مل سکی، گھر کے زیادہ تر خرچے تمہاری تنخواہ سے ہی ادا ہوتے ہیں..... کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تمہیں لے کر گاؤں چلا جاؤں۔'' اس کے لہجے میں شرمندگی در آئی۔

''او..... میرے شوہنا۔ پریشان کیوں ہوتے ہو؟۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ تھوڑی ہیں، پھر تم گھر پر تو نہیں بیٹھے رہتے ہو، مسلسل کوشش تو کرتے ہو۔ ویسے بھی کئی جگہ ٹیوشن پڑھا کا اچھے خاصے پیسے کما لیتے ہو۔ اور ہاں..... ایک بات یاد رکھنا ہم گاؤں گھومنے پھرنے جائیں تو ہی اچھا ہے۔ اگر ہمیشہ کے لیے جانا ہوتا تو اتنا کھڑاگ پالنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔'' اس نے شوہر کے کاندھے پر گیلے ہاتھ رکھ کر اچھی بیویوں کی طرح دلاسا دیا۔

''ا..... اچھا.....'' سمیع نے مسکرا کر آیت کی انگلی میں موجود شادی کی انگوٹھی کو چھوا۔

''اور..... سب سے بڑھ کر اگر تمہارا تعاون نہ ہوتا تو بھلا کیا میں جاب کرسکتی تھی؟ تم جو میری غیر موجودگی میں گھر کے بہت سارے کام سنبھال لیتے ہو۔ اس کا کیا.....؟ اگر تم بھی عام مردوں کی طرح ہر بات کو انا کا مسئلہ بنالیتے پھر ہماری زندگی بہت مشکل ہوجاتی۔ یہ اور بات ہے کہ میرا ہی حوصلہ ہے جو تمہارے محنت سے پکائے ہوئے اس قدر بدمزا کھانے چپ چاپ کھا لیتی ہوں۔'' مشین کے جھاگ دار پانی میں میلے کپڑے ڈالتے ہوئے وہ آخر میں تھوڑی شرارتی ہوئی۔

''شکر ادا کرو..... جاب سے گھر آتی ہو تو پکا ہوا کھانا مل جاتا ہے، بدمزا ہی سہی، ویسے بھی میاں بیوی کے بیچ میں انا کا مسئلہ نہیں ہونا چاہیے، اگر تم ہمارے اچھے مستقبل کے لیے دن بھر باہر محنت کرتی ہو تو کیا میں گھر میں ہوتے ہوئے اپنے تھوڑے سے ہاتھ پیر نہیں چلا سکتا۔ مجھے تو اس میں کوئی برائی نہیں دکھائی دیتی..... ویسے بھی میری سوچ معاشرے سے تھوڑی جدا ہے، میں بیوی کو ''سپر ہیومن'' نہیں ''انسان'' سمجھتا ہوں، جو تھکتی بھی ہے۔'' سمیع کی سچائی پر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''تم سچ کہتے ہو..... میاں بیوی کے بیچ میں انا نہیں ہونی چاہیے..... اچھا ایک منٹ..... رکو.....'' وہ بولتے ہوئے ہاتھ دھو کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ اور ہاتھ میں کافی سارے نوٹ دبائے واپس چلی آئی۔

''جاؤ اور جاکر سارا سامان لے آؤ.....'' آیت نے اس کی شرٹ کی جیب میں بہت سارے پیسے رکھتے ہوئے پیار سے کہا۔

''او کے باس..... ویسے تم بھی میرے ساتھ

چلتیں۔ باہر موسم کافی خوش گوار ہے.....'' سمیع نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''نہیں میں اتنی دیر میں بریانی کی تیاری کے ساتھ ساتھ، کمروں میں ویکیوم بھی کرلوں گی، ماسی کے جانے سے جو تمہاری مشکلات میں اضافہ ہوا ہے شاید اس میں کچھ کمی واقع ہوجائے.....'' آیت نے مڑ کر اسی کی بات یاد دلائی

''اوہو.....مشکلات۔'' وہ ہنسا تو آیت نے شرارتی انداز میں دھلی ہوئی شرٹ زور سے جھاڑ دی پانی کے چھینٹوں نے سمیع کو شرابور کردیا۔

''ایک منٹ رکنا تو ذرا'' وہ ایک آنکھ بند کرکے کھلکھلایا اور سامنے رکھے گلاس میں موجود پانی کو بیوی کی جانب اچھال دیا۔ دونوں نے پیار بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور ہنس دیے۔

☆☆☆

''کیا ہوا آیت؟'' سمیع نے رات کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے خیالوں میں گم آیت کو دیکھا تو قریب بیٹھ کر پوچھا۔

''سمیع مجھے ماں جی.....کے آنے سے ڈر لگ رہا ہے.....تم کسی طور پر انہیں یہاں آنے سے روک لو۔'' اس نے شوہر کا ہاتھ کس کر تھام لیا۔

''یار.....وہ میری ماں ہیں۔'' اس نے دکھ بھری نظروں سے دیکھا۔

''تم سمجھ کیوں نہیں رہے، مجھ سے شادی کے لیے تم نے ان سے کتنے جھوٹ بولے ہیں۔ اب جو وہ سچائی اپنی آنکھوں سے دیکھیں گی تو کہیں خفا ہوکر تمہیں ساتھ نہ لے جائیں۔'' وہ بلبلائی۔

''میری ماں .....ایسی نہیں.....میں انہیں سمجھادوں گا'' اس نے بیوی کو تسلی دینا چاہی۔

''اگر وہ نہ مانیں تو؟'' اس کا وجود لرزا۔

''یار ابھی وہ آئیں نہیں اور تم روایتی بہو بن بیٹھیں.....ویسے بھی یہ آئیڈیا تمہارا ہی تھا۔'' وہ چڑ گیا۔

''میں نے تو تمہاری عزت بنانے کے لیے ایسا کرنے کو کہا۔ کہ تم ان سے جھوٹ بول دو کہ بینک میں مجھے نہیں تمہیں جاب ملی ہے۔'' وہ تیز لہجے میں بولی۔

''یار۔اب اس ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔'' سمیع نے سر پکڑ لیا۔

''ہاں۔۔تو اگر ہم انہیں سچ بتادیتے کہ تمہیں ابھی تک کوئی ڈھنگ کی جاب نہیں ملی اور تم یہاں ٹیوشن پڑھاتے ہو تو وہ ہمیں کبھی بھی اس شہر میں شفٹ ہونے نہیں دیتیں بلکہ کھیت کھلیان سنبھالنے کے لیے گاؤں شفٹ ہونے پر زور دیتیں۔'' وہ بھنا کر اسے دیکھنے لگی۔

''ہاں.....تو کیا لوگ گاؤں میں نہیں رہتے ہیں مگر اس وقت تو تم پر مجھ سے شادی کا بھوت سوار تھا کسی بھی طرح پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھیں اور اس شہر میں تمہارا بچپن گزرا یہاں سے جا کر کہیں اور رہنا بھی تمہارے لیے سوہان روح ہے۔'' اس کے منہ سے غصے میں الٹا سیدھا نکل گیا۔

''او مائی گاڈ۔اب تم مجھے پسند کی شادی کے طعنے دو گے.....ویسے کیا یہ یکطرفہ محبت تھی؟۔ میں نے سوچا کہ تمہیں جلدی ہی جاب مل جائے گی.....اب قسمت کی خرابی۔۔شادی کا ایک سال گزرنے کے باوجود تمہیں ڈھنگ کی ایک جاب نہ مل سکی۔'' وہ بستر پر کھڑی ہوگئی اور کمر پر ہاتھ رکھ چلائی۔

''ہاں سارا قصور میرا ہی ہے۔'' وہ بھی اس کے مقابل کھڑا ہوکر چلایا۔

''تمہیں پتا ہے نا کہ ماں جی روایتی خاتون ہیں، بیٹے کو گھر کے کام اور بہو کو جاب کرتے دیکھنا انہیں بھلا گوارا ہوگا۔ وہ تو ہماری شادی کے بھی خلاف ہوجائیں گی۔'' آیت نے تلخ سچائی اس کے سامنے رکھی۔

''ٹھیک ہے وہ میری ماں ہیں نا.....میں خود انہیں سمجھالوں گا۔'' اس نے تھک ہار کر بستر پر لیٹتے

ہوئے آنکھیں بند کیں۔

''سمیع تم غلط سمجھ رہے ہو۔میں ماں جی..... کے آنے پر نہیں۔انہیں سب کچھ پتا چلنے پر پریشان ہوں۔بات چیت سے اس مسئلہ کو حل کرتے ہیں نا۔'' آیت کو بھی احساس ہوا تو اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے نرمی سے سمجھایا۔

''ایک منٹ یہ کوئی تمہارے بینک کا کلائنٹ نہیں میری امی جی..... ہیں.....'' اس نے پٹ سے آنکھیں کھولیں اور اس کا ہاتھ بالوں سے ہٹایا۔

''تم.....امی جی کو لے کر اوور ری ایکٹ کر رہے ہو۔'' وہ غصہ ہوگئی۔

''ہونہہ.....اوور ری ایکٹ۔ایک بات یاد دلاؤں۔تمہیں میں نے ہی ٹیوشن پڑھا پڑھا کر اس قابل بنایا کہ تم آج شان سے کرسی پر بیٹھ کر قلم چلاتی ہو.....'' وہ بھنایا تو آیت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''مگر.....افسوس.....تم نے مجھ سے کچھ نہیں سیکھا۔ایک سالن تک ڈھنگ سے نہیں بنا سکتے۔'' اس کے طعنہ دینے پر سمیع کی ہنسی نکل گئی۔بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا۔

☆☆☆

آیت گھر میں داخل ہوئی، پورا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا دکھائی دیا۔لائٹ جلائی تو لاؤنج کے صوفے پر سمیع جوتوں سمیت لیٹا دکھائی دیا۔

''کیا ہوا۔سب خیر ہے نا؟ ،اتنا اندھیرا کیوں کر رکھا ہے؟'' وہ گھبرا گئی، اس کے قریب بیٹھ کر پوچھا۔

''ہاں سب۔ٹھیک ہے''۔اس نے آنکھوں پر بازو رکھے رکھے جواب دیا۔

''سمیع.....پلیز اٹھو نا.....میرے پاس بہت اچھی خبر ہے۔'' وہ کافی ایکسائیٹڈ دکھائی دے رہی تھی، مگر سمیع نے ذرا جو اثر لیا ہو۔

''سمیع پلیز زززز.....سنو تو۔'' اس نے شوہر کا بازو کھینچا۔

''کیا مصیبت ہے.....اس گھر میں انسان چند لمحے سکون سے لیٹ بھی نہیں سکتا۔'' وہ ایک دم چلایا اور اس کے ہاتھ پرے کر دیے۔آیت ہکا بکا سی رہ گئی پھر چپ چاپ بیگ اٹھا کر سر جھکائے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

سمیع نے آنکھیں کھول کر اسے جاتا دیکھا، آیت کی افسردگی محسوس کی جانے والی تھی دل کو کچھ ہوا، ابھی تک نوکری نہ ملنے کا غصہ، اس پر ماں جی کی کل یہاں آمد نے اسے چڑچڑا بنا دیا کہ وہ ان کا سامنا کیسے کرے گا؟'' سرد آہ بھر کر بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے خود کو ملامت کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

سوری.....جان.....پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے شاید ناکامیوں نے میرے مزاج میں کڑواہٹ بھر دی ہے۔'' اس نے آیت کا ہاتھ تھام کر پیار سے منانے کی کوشش کی۔

''کوئی بات نہیں۔میں بھی تو آتے ہی شروع ہوگئی۔یہ بھی نہیں پوچھا کہ، تمہارا تو آج انٹرویو تھا کیسا رہا؟'' آیت نے گیلی آنکھوں کو چھپاتے ہوئے مصنوعی بشاشت لہجے میں سموئی۔

''وہ.....ہی جو ہمیشہ ہوتا ہے، میں اس جاب کے لیے اوور کوالیفائڈ نکلا۔'' اس نے غصے سے ہونٹ چباتے ہوئے بتایا۔

''چلو کوئی بات نہیں، ویسے بھی مجھے یہ جاب پسند نہیں تھی۔میں نے چند دن پہلے اپنے مینجر شفیق صاحب سے تمہاری جاب کے سلسلے میں بات کی تھی۔تم یہ کارڈ رکھ لو۔ان کے دوست عابد علی کی کمپنی میں مارکیٹنگ مینجر کی ضرورت ہے، تم انٹرویو کے لیے سلیکٹ ہوگئے ہو۔'' اس کے چہرے پر خوشی ابھری۔

''اچھا.....مگر ایسے اچانک؟'' وہ خوشی سے اچھل پڑا۔

''اچانک نہیں پروسیس تو کئی دنوں سے چل رہا تھا مگر میں نے تم سے چھپا کر تمہارے ہی ای میل

سے انہیں سی وی بھی بھیج دیا۔ ویسے مجھے پورا یقین ہے کہ قسمت اس بار تم پر مہربان ثابت ہوگی اور یہ جاب تمہیں مل جائے گی۔'' آیت کی حوصلہ افزا مسکراہٹ اور یقین نے اس کے درد پر پھائے رکھ دیے تھے۔

''تھینک یو..... اچھا..... تم نے یہ خوش خبری سنائی تھی؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔ یہ تو ہے مگر ساتھ میں میری پرموشن بھی ہوگئی ہے۔'' اس نے مسکرا کر بتایا۔

''اوہ..... رئیلی..... چلو اس بات پر باہر ڈنر کرتے ہیں.....'' سمیع بیوی کی ترقی پر دل سے خوش ہوا۔

''نہیں..... رہنے دو.....'' اس نے نخرا دکھایا۔

''اچھا..... اب فورا اٹھ جاؤ.....'' اس نے آیت کا ہاتھ کھینچا اور بائیک کی چابی اٹھائی۔

''اوہ..... بابا..... رکو تو میں ذرا فریش تو ہو جاؤں.....'' آیت نے خوش دلی سے کہا۔

''سمیع۔۔ وہ کیا امی جی کا پروگرام کینسل ہوگیا؟'' اس نے نازک لبوں پر لپ اسٹک لگاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں وہ کل دوپہر کی ٹرین سے پہنچ رہی ہیں نا.....'' سمیع نے سر پہ ہاتھ مار کر بتایا۔

''کیا..... مگر کل تو تمہارا انٹرویو ہے۔'' اس نے یاد دلایا۔

''اوہ..... مائی گاڈ! میں تو بھول ہی گیا.....'' سمیع نے پریشانی سے سر پہ ہاتھ مارا۔

''دیکھو..... میں نے تمہاری اس جاب کے لیے بہت پاپڑ بیلے ہیں پلیز..... انٹرویو ضرور دینا۔'' آیت بولی۔

''آیت۔ ایسا کرو..... تم پلیز کل کی چھٹی کرلو۔ اور کیب میں جا کر۔ امی جی کو اسٹیشن سے لے آنا۔'' سمیع نے کچھ سوچ کر التجا کی۔

''واٹ.....! میں تمہیں کتنی بار بتاؤں میرے لیے چھٹی کرنا آسان نہیں.....'' اسے غصہ آگیا۔

''چلو۔ ٹھیک ہے پھر میں کوشش کروں گا۔ کہ انٹرویو دیتے ہی سیدھا اسٹیشن پہنچ جاؤں۔'' سمیع نے تھک ہار کر حامی بھری۔

☆☆☆

سمیع اتنی اچھی نوکری ملنے کی نوید لیے خوشی خوشی بڑی سی بلڈنگ سے باہر آیا، تو کچھ یاد آیا گھڑی پر نظر دوڑائی۔ اس کے پیروں تلے زمین ہی نکل گئی۔ ماں جی کی ٹرین کو آئے ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو بائیک دوڑاتا ہوا اسٹیشن پہنچا۔ سارے راستے اس کے دل نے دعا مانگی کے ٹرین لیٹ ہوگئی ہو، مگر اس بار دعا قبول نہ ہوسکی۔

سمیع صبح ٹائم سے پہلے ہی انٹرویو دینے پہنچ گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں سے ایک دو گھنٹے میں فارغ ہو کر ماں جی کو لینے چلا جائے گا، مگر اس کا دل یہ سن کر ڈوب گیا کہ ڈائریکٹر صاحب پہلے کسی سائٹ کا وزٹ کرنے چلے گئے ہیں۔ اس لیے انٹرویو کا ٹائم بڑھا دیا گیا۔ اس نے جا کر ریسپشنسٹ کو اپنی مجبوری بتانا چاہی مگر اس نے لاپروائی سے کہا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتی ہے۔

پورے پینل کے سامنے انٹرویو دینے کے بعد بھی اسے جاب ملنے کی خوش خبری ملنے میں کئی گھنٹے صرف ہوگئے۔

سمیع نے دھڑکتے دل سے انکوائری آفس جا کر مطلوبہ ٹرین کی آمد کے بارے میں پوچھا تو پیروں تلے زمین نکل گئی۔ ٹرین ٹھیک ٹائم پر آگئی تھی۔ ماں جی کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آیا تو خود کو کوسنے لگا۔ ادھر ادھر ڈھونڈا، پلیٹ فارم پر تلاش کیا مگر ماں جی دکھائی نہ دیں۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس نے سوچا کے ایک بار کال کر کے آیت سے پوچھوں مگر پھر سوچا وہ تو اس وقت جاب پر ہوگی۔ مرتا کیا نہ کرتا سر جھکا کر بائیک کی طرف چل دیا۔ چپکے سے آنکھ میں آئے آنسو کو ہتھیلی میں چھپا لیا۔ سارے راستے وہ خود کو ملامت کرتا رہا کہ ایک نوکری کی خاطر ماں کو اس بڑے شہر میں بھٹکنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔

☆☆☆

سمیع مردہ قدموں سے فلیٹ کے دروازے تک پہنچا۔اندر داخل ہوا تو خوش کن آوازوں نے جیسے اس کے مردہ وجود میں زندگی کی نئی لہر دوڑادی..... آیت گھریلو حلیہ میں بیسن کا آٹا گوندھنے کی سر توڑ کوشش کررہی تھی اور وہ تھا کہ ہاتھوں پر چپکے جارہا تھا۔ پاس کھڑی ماں جی ہری دھنیا کی چٹنی پیسنے کی تیاریوں میں مگن بہو کو مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔ سمیع کو اندر کا منظر خواب سا لگا۔اس نے یقین دلانے کے لیے خود کو زور سے چٹکی کاٹی کہیں سپنا تو نہیں دیکھ رہا۔

''آؤچ!'' چٹکی پر منہ سے نکلنے والی آواز پر ساس بہو نے ایک ساتھ مڑ کر اسے دیکھا۔

''آپ۔ آفس سے جلدی آگئے.....؟'' آیت نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔

''ماں جی.....'' وہ ماں کو صحیح و سلامت اپنے سامنے دیکھ کر خوشی سے نہال ہوا جارہا تھا۔

''آگیا میرا بچہ!'' سلطانہ بیگم کی پیاسی نگاہیں اس کے چہرے کی بلائیں لینے لگ گئیں۔ سمیع دوڑ کر چھوٹے سے بچے کی طرح ان سے لپٹ گیا۔

''میں ماں جی کو یہ ہی بتارہی تھی کہ آپ میٹنگ میں بزی تھے ،اس لیے مجھے اسٹیشن لینے آنا پڑا۔'' سمیع بیوی کی بات پر اسے حیرت سے تکنے لگا۔

''بیٹا۔ مجھے اعتراف کرنے دے کہ..... ماشااللہ سے میری بہو تو بہت سگھڑ اور سمجھ دار ہے تیرے گھر آکر تو میری ساری فکریں، خوشیوں میں ڈھل گئیں۔''

سمیع نے ان کے چہرے پہ پھیلی خوشی دیکھی پھر مسکرا کر بیوی کو دیکھا، اس کی سمجھ داری نے بات سنبھال لی تھی۔

''جاؤ بیٹا۔ جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر آجاؤ پھر ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔'' سلطانہ بیگم نے کافی دیر بعد سمیع کو خود سے الگ کیا۔

''میں ان کو کپڑے دے کر آتی ہوں۔ وہ کمرے کی طرف بڑھا تو پیچھے سے آیت بھی ساس کو بتاتی ہوئی داخل ہوئی۔

''یہ سب آخر ہوا کیسے؟'' سمیع نے دروازے بھیڑتے ہوئے دھیرے سے پوچھا۔

''مجھے اندازہ تھا کہ تم ٹائم پر نہیں پہنچ سکو گے ،اس لیے ہاف ڈے لے کر ماں جی کو لینے اسٹیشن پہنچ گئی۔'' وہ وارڈروب سے اس کے کپڑے نکالتے ہوئے بڑے سکون سے بولی۔

''شکر ہے میرے رب کا.....ورنہ میرا دل تو یہ ہی سوچ کر پریشان تھا کہ ماں جی کہاں چلی گئیں۔'' اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔

''آیت آج تو بات بن گئی۔ مگر کل سے کیا ہوگا..... ماں جی اکیلے کیسے رہیں گی ،ان لوگوں کو مینیجر کی فوری ضرورت ہے مجھے بھی کل سے ہی وہاں جوائننگ دینی ہے۔'' سمیع نے تولیہ ہاتھ میں تھامتے ہوئے پریشانی سے آیت کی طرف دیکھا۔

''ڈونٹ وری .....ماں جی..... جب تک یہاں ہیں میں نے بینک سے چھٹی لے لی ہے۔تم اپنی جاب سنبھالو..... مجھے میری ساس کو سنبھالنے دو۔'' وہ کھلکھلائی۔

''تم نے مجھے بے مول خرید لیا ہے۔'' وہ آیت کے دونوں ہاتھ تھام کر پیار سے تکتے ہوئے بولا۔

''ایک اعتراف مجھے بھی کرنے دو۔تم نے مجھ جیسی یتیم لڑکی کا ساتھ نبھانے کے لیے کتنا کچھ سہا ،میرے اندر کے خوف تمہیں خود سے دور کرنے سے ڈرتے تھے، اسی وجہ سے گاؤں جانے سے ہمیشہ ڈرتی رہی، تم نے میرا مان رکھا، میری وجہ سے، ماں جی سے بھی سچ چھپایا۔'' آیت کا لہجہ نم ہوا۔

''شکر کرو۔ مجھے سچ مچ میں بہت اچھی بہو مل گئی ہے۔اب مجھے ماں سے کچھ چھپانا نہیں پڑے گا۔'' سمیع نے اسے اپنے ساتھ لگا کر ماتھا چومتے ہوئے سرگوشی کی تو جیسے آیت کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔

☆☆

میمونہ صدف

جاہل

"یہ لو سیب کھاؤ۔ روزانہ کھایا کرو کہ یہ جو پیلی رنگت ہے نا یہ سرخی میں ڈھل جائے۔ سیانے کہتے ہیں روزانہ سیب کھانے سے ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ تو جب قدرت نے اتنی تاثیر کسی پھل میں رکھی ہو تو وہ کھاتے رہنا چاہیے بھلے پسند ہو یا نہ ہو۔"

وہ اپنے ہاتھوں سے سیب کی قاشیں اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ وہ منہ میں ڈالتے، یک ٹک اس کی صورت تکتی جا رہی تھی۔ گندمی رنگت کے حامل اس شخص کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی کہ وہ پہروں بھی اسے دیکھتی تو کم تھا۔

"ایسے کیا دیکھتی رہتی ہو میری طرف چپ چاپ جیسے ہر روز پہلی بار دیکھ رہی ہو...... کہتی بھی کچھ نہیں ہو۔ کہہ دیا کرو...... چاہے اچھا ہو یا برا بس کہہ دیا کرو۔ دل ہلکا ہو جاتا ہے۔ مجھ سے نہیں کہو گی تو کس سے کہو گی۔"

اور وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ کیا دیکھتی ہے، کیا سوچتی ہے؟

پھر وہ خود ہی کسی خیال کے تحت ہنس دیا۔

"پتا ہے، سامنے والی آپا نرگس اس روز مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ دلہن امید سے ہے کیا؟ میں نے کہا کہ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ انہیں کیوں لگا ایسا؟ تو کہنے لگیں کہ اس روز میں نے چھت سے دیکھا تھا، تو اپنے ہاتھوں سے اسے پھل کاٹ کاٹ کر کھلا رہا تھا۔ ایسے ہتھیلی کا چھالا تو کوئی اپنے ہونے والے بچے کی ماں کو ہی بناتا ہے جیسا تو نے دلہن کو بنا رکھا ہے۔" پھر وہ قہقہہ لگا کر خود ہی ہنس دیا جیسے اس بات سے بہت محظوظ ہوا ہو۔

"لو بھلا یہ کیا بات ہوئی؟ کیا بیویوں کا ایسا خیال نہیں رکھا جاتا۔ انہیں ہتھیلی کا چھالا نہیں بنایا جاتا؟ جیون ساتھی ہوتی ہیں تو جتن سے لگا کر ہی رکھی جانی چاہئیں۔ سر آنکھوں پہ بٹھائی جانی چاہئیں۔ لوگ بھی نا ایویں الٹی سیدھی ہانکتے ہیں۔ خدا کے حکم کو بھول ہی جاتے ہیں کہ بہتر میں بہترین تو وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ بہترین ہے۔ یہ تو دل کا رشتہ ہوتا ہے، محبت سے سینچے جانے کا، دل سے لگا کر رکھنے کا۔ اس میں پھر کیسی بھول چوک؟" وہ خود سے بولتے بولتے مسکراتا ہوا سر جھٹکتا کہہ رہا تھا۔ وہ بھی مسکرا دی تھی۔

آپا نرگس اپنی جگہ ٹھیک ہی تھیں۔ ایسے بیوی کو کوئی کوئی شوہر ہی بسا کر رکھتا ہے جیسے وہ اسے رکھتا تھا۔ جیسے وہ اسے چاہتا تھا۔ جیسے وہ اس کے ناز اٹھاتا تھا۔ اس کی کمائی اتنی نہ تھی کہ اسے کل وقتی ملازم رکھ کر دے سکتا ورنہ وہ تو اسے بستر سے پیر تک نیچے اتارنے نہ دیتا۔ اور جس دن وہ سچ مچ میں اسے اولاد دینے کی نوید سنائے گی اس روز وہ کیا کرے گا۔ اسے سر آنکھوں پہ ہی تو بٹھا ڈالے گا۔ کیسے کیسے اس کے ناز نہیں اٹھائے گا۔ وہ بیوی ہو کر اتنی محبوب تھی تو ماں بن کر اسے کتنی پیاری ہو جائے گی۔ وہ معصومیت بھرے اس چہرے کو دیکھنے لگی جہاں سچے جذبوں کا ایک جہاں آباد تھا۔

"ارے ماں جی...... آپ وہاں کھڑی کیا کر رہی ہیں؟" وہ فوراً سے دہلیز پہ کھڑی جہاں آرا کی جانب لپکا تو اس نے بھی اس جانب دیکھا جہاں اس کی ماں ہاتھ میں بہت سے تھیلے تھامے خاموش کھڑی تھی جیسے سوچتی ہو کہ آگے بڑھے یا پلٹ جائے۔

داماد کو اپنی طرف متوجہ پا کر چونکیں۔ ان کا داماد اب ان کے ہاتھوں سے وہ سب تھیلے اور سامان تھام کر انھیں عزت کے ساتھ اندر لے کر آ رہا تھا۔

دونوں ماں بیٹیاں ایک دوسرے کی جانب دیکھتے ایک دوسرے کی نظروں کی تحریر بخوبی پڑھ سکتی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں کیا دیکھ رہی ہے، کیا سوچ رہی ہے اور کیا کہنا چاہتی ہے۔

☆☆☆

''کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ مجھے آگے پڑھنے کی اجازت اس لیے نہیں دے رہیں کہ آپ میرا تعلیمی خرچا نہیں اٹھا سکتیں؟'' اس نے اپنی کتابوں کو سینے سے کسی متاعِ حیات کی طرح لگا رکھا تھا۔

''نہیں..... بلکہ تم یہ سمجھو کہ تمہیں آگے پڑھنے کی اجازت اس لیے نہیں مل رہی کہ میں اس ان پڑھوں کی دنیا میں تمہارے لیے اتنے پڑھے لکھے لڑکے نہیں ڈھونڈ سکتی۔''

امی کے جواب پہ وہ غش کھاتے کھاتے رہ گئی تھی۔ اس دور میں بھی امی جیسی مائیں پائی جاتی تھیں جب لوگ پی ایچ ڈی سے بھی آگے پڑھنے دوسرے ممالک میں جاتے ہیں، ایسی مشکل مشکل ڈگریاں لے کر بھی جنہیں چین نہیں آتا اور وہ مزید پڑھتے رہنا چاہتے ہیں۔ اس دور میں اُس کی ماں محض اِس سوچ کے تحت اُسے ایم فل نہیں کرنے دے رہی تھی کہ اسے شادی کے لیے پڑھا لکھا لڑکا پھر کہاں سے ملے گا؟

''تو کس نے کہا کہ آپ میرے لیے زیادہ پڑھا لکھا لڑکا تلاش کریں۔ آپ کم پڑھا لکھا ہی ڈھونڈ لیں مگر مجھے میرا شوق تو پورا کرنے دیں۔ آپ ایک خدشے کے لیے ایک حقیقت کو جھٹلا رہی ہیں۔ کم پڑھا لکھا لڑکا ملنے کے خوف سے مجھے بھی ان پڑھ رکھنا چاہ رہی ہیں۔'' وہ قریباً چلا ہی اٹھی تھی۔

''جتنا پڑھ لیا اتنا کافی نہیں ہے کیا؟ اب مزید کون سے جھنڈے گاڑھنا چاہتی ہو؟ کون سے کے ٹو، ماؤنٹ ایورسٹ سر کرلو گی تم ایم فل کر کے۔ اتنے ایم فل اس ملک میں رُلتے پھرتے ہیں، اس فہرست میں تمہارا اضافہ کوئی ایسا ضروری تو نہیں ہے۔''

''آپ کے لیے کافی ہوسکتا ہے میرے لیے ناکافی ہے۔ اور میں صرف ایم فل نہیں کرنا چاہتی، میں تو اس سے بھی آگے پڑھنا چاہتی ہوں۔ دنیا کہاں سے کہاں جارہی ہے اور آپ نجانے کس دور میں جی رہی ہیں۔''

امی پہ تو گویا اس کی کسی بات کا کوئی اثر ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ حسبِ معمول اپنا من پسند ساگ کاٹ رہی تھیں جو وہ سردیوں کی دوپہر میں ہفتے میں دوبار کاٹتیں اور چار بار بناتی تھیں۔

''میں کچھ کہہ رہی ہوں امی۔ کیا آپ سننا پسند کریں گی؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ماں کی بے حسی چلانے پہ مجبور کررہی تھی۔

''بہری نہیں ہوں کہ تمہیں اتنا چلانا پڑ رہا ہے۔ تمہاری ساری بات سن لی ہے۔ اب تم میری بھی سن لو اور بہتر ہے کہ چپ رہو۔ مرد ہمیشہ عورت سے زیادہ پڑھا لکھا ہونا چاہیے ورنہ احساسِ کمتری کا شکار ہوجاتا ہے۔ نہ خود خوش رہتا ہے نہ بیوی کو رہنے دیتا ہے۔ زندگی مشکل ہو جاتی ہے بس ایک اس زیادہ پڑھی لکھی عورت کی ادنیٰ سی ڈگری سے جو وہ شوق شوق میں حاصل کرلیتی ہے اور پھر کسی طاقچے میں سجا کر بھول جاتی ہے۔ لیکن مرد اس ایک ڈگری کو نہیں بھولتا، طاقچے سے اٹھا کر دل سے لگا لیتا ہے۔ وہ ڈگری اس کی ازدواجی زندگی کو دیمک کی طرح اندر سے کھانے لگتی ہے۔ بظاہر کچھ نہیں دکھتا، مگر اندر سے سب کھوکھلا ہو رہا ہوتا ہے۔'' اس نے ماں کی بات پہ انھیں تاسف سے دیکھا۔

''چلو زیادہ نہ سہی، مرد کو برابر کا ہی سہی مگر پڑھا لکھا ہونا چاہیے۔'' انھوں نے بیٹی کے اس طرح دیکھنے پہ فوراً اپنے جملے میں مناسب ترمیم کر ڈالی جو کہ ابھی بھی اس کے لیے نامناسب ہی رہا تھا۔

''میں حیران ہوں کہ آپ کس دور کی بات کر رہی ہیں امی؟ آج کل بھی ایسا ہوتا ہے کیا؟'' وہ واقعی جی بھر کر حیران ہوئی تھی۔

''میں اسی دور اور اسی دنیا کی بات کر رہی ہوں۔ تم بھلے سوچو کہ لوگ بدل گئے اور ان کی سوچ بھی اب پہلے سی نہیں رہی لیکن سچ یہی ہے کہ لوگ بھی وہی ہیں اور سوچ بھی۔''

''آپ آٹے میں نمک کے برابر لوگوں کو آٹا بنانے پہ تلی ہوئی ہیں۔''

''میں آٹے میں نمک کے برابر کی ہی بات کر رہی ہوں لیکن تم یہ بھول گئی ہو کہ آٹے میں نمک ڈل جائے تو اپنے ہونے کا احساس دلاتا ضرور ہے۔ یہ نہیں کہ اس کے ہونے کا پتا نہیں چلتا۔'' وہ بھی اس کی ماں تھیں۔ بھلے کم پڑھی لکھی سہی لیکن ایسے جواب دیتی تھیں کہ اسے لاجواب ہی کر جاتی تھیں۔

''لوگ تو کہتے ہیں کہ لڑکے کی صورت اور پڑھائی کے بجائے، شرافت اور کمائی دیکھنا چاہیے۔ بیٹی کی تو چھوڑیں لیکن آپ تو لوگوں کی بھی نہیں سن رہیں۔'' وہ ماں کو ہر طرح سے منا لینا چاہتی تھی۔

''فروا کو بھول گئی۔ اور طیبہ..... رضوانہ بھی تو تھی۔'' اور وہ طے کر کے بیٹھی تھیں کہ کسی صورت نہیں مان کر دیں گی۔ اس لیے اب وہ اسے خاندان سے مثالیں دے رہی تھیں۔ ''فروا کا میاں کتنا کماتا تھا، شریف بھی تھا لیکن پھر بھی بیوی کا پڑھا لکھا ہونا اس سے برداشت کہاں ہوتا تھا۔ بات بات پہ طنز اور طعنے۔ جینا عذاب کر ڈالا تھا اس کا۔''

اور نہ اسے فروا میں دلچسپی تھی نہ اس کے میاں میں۔ امی اب اسے طیبہ اور رضوانہ کی کہانیاں بھی سنانا چاہتی تھیں لیکن وہ اپنا وقت ان فضول قصے کہانیو ں میں برباد کرنے کے حق میں بالکل نہیں تھی۔

''امی میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں۔'' وہ بے چارگی سے ان کی بات کاٹ کر اپنی بات پہ زور دے کر بولی۔

''اور میں تمہارا بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔'' انھوں نے بھی جتا دیا بس.....

''کیا یہ بہتر نہیں کہ آپ پڑھا لکھا ہونے کے بجائے باشعور انسان ڈھونڈیں۔ جو انسان کا بچہ ہو اور انسان بن کر ہی میرے ساتھ زندگی گزارے اور مجھے بھی معمولی درجے کا ہی سہی لیکن انسان سمجھے۔''

''کیا یہ بہتر نہیں کہ تم اپنا منہ بند رکھو اور مجھے میرا کام کرنے دو۔''

''آپ ڈگریوں کی بات کیوں کر رہی ہیں، تربیت بھی کوئی شے ہے کہ نہیں۔''

''ڈگریوں کی بات تو تم بھی کر رہی ہو۔ میں نے کر دی تو کیا برا کیا؟''

''مجھے کسی بہت پڑھے لکھے سے شادی نہیں کرنا امی۔ مجھے بس خود پڑھنا ہے۔ مجھے شوہر چاہیے، کوئی ایمپلائی نہیں کہ میں اس کی ڈگریاں دیکھتی پھروں۔ ایک انسان کا بچہ ہو اور کچھ نہیں۔''

''تعلیم سے ہی تہذیب آتی ہے۔''

''تہذیب تربیت سے آتی ہے ورنہ تو ڈگریوں کے ڈھیر تلے بھی جاہل بیٹھے ملتے ہیں۔''

''مجھے تم سے بحث نہیں کرنا۔ جو میرا فرض ہے مجھے وہ پورا کرنا ہے۔'' وہ مزید کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھیں۔

اب وہ آصفہ آنٹی کو کال ملا رہی تھیں جنھوں نے کسی رشتے کی بابت انھیں بتایا تھا تاکہ وہ شام کی چائے پہ ان لوگوں کو مدعو کر سکیں۔ لڑکا انجینئر تھا وہ بھی باہر سے پڑھ کر آیا تھا اور نجانے کون کون سی ڈگریاں ساتھ لایا تھا۔ انہیں بس خوب صورت لڑکی درکار تھی اور آصفہ آنٹی کو ایسے میں ارفع ہی پہلی ترجیح دکھائی دی تھی۔

ارفع کے کئی رشتے آتے رہے تھے لیکن امی کی بس ایک ہی رٹ تھی کہ لڑکا جب تک ارفع سے زیادہ یا اس جتنا پڑھا لکھا نہیں ہوگا وہ کسی صورت ہامی نہیں بھریں گی۔ اسی مقصد سے وہ ارفع کو ایم فل بھی نہیں کرنے دے رہی تھیں کہ اس دور میں پڑھے لکھے لڑکوں کا یوں بھی کال پڑا تھا اور اوپر سے وہ اسے مزید پڑھا کر پھر کہاں سے اس کے لیے پڑھا لکھا لڑکا ڈھونڈتیں۔

آنٹی آصفہ شام کو ہی رشتے والوں کو لانے کی ہامی بھر چکی تھیں۔

''آپ بہت غلط کر رہی ہیں امی۔'' وہ روہانسی ہو کر امی کو دیکھنے لگی کہ شاید تھوڑا بہت ہی سہی انھیں اپنی بیٹی پہ ترس آ جائے اور وہ اسی وقت اپنا ارادہ تبدیل کر لیں لیکن امی کا ایسا کوئی موڈ نہیں تھا۔

''لڑکا پڑھا لکھا ہے اور کمائی بھی اچھی ہے۔ یہاں رشتہ ہو گیا تو پھر کرتی رہنا میاں کی مرضی سے شادی کے بعد پڑھائیاں۔ میں جتنا پڑھا سکتی تھی پڑھا دیا۔ اب مزید پڑھانے کے حق میں، میں نہیں ہوں۔'' اس کا جی، جی بھر کر سڑا کر اب امی پھر سے ساگ کاٹنے میں محو ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

آصفہ آنٹی نے لڑکے والوں سے اس کی تعریفوں کے وہ وہ پُل باندھ دیے تھے کہ اس پُل پہ سے گزر کر ان کی امیدوں پہ پورا اترنا مشکل ہو گیا تھا۔ بھلا کیا ضرورت تھی اس کی اس سگھڑاپے کی کہانیاں سنانے کی جو اس میں موجود ہی نہ تھا۔ ویسے بھی کون سا رشتے والے اس کا سگھڑاپا دیکھنے آئے تھے، انہیں محض خوب صورت لڑکی درکار تھی تو وہ اس

کی خوب صورتی ہی دیکھنے آئے تھے۔

''شانی ارفع سے الگ سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

سامنے بیٹھی آنٹی میٹھی نظروں سے اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ ان کی میٹھی نظریں اسے صاف بتا رہی تھیں کہ وہ انھیں پسند آئی ہے۔ نہ صرف پسند آئی ہے بلکہ وہ بری طرح اسے اپنی بہو بنانے کے لیے تیار بیٹھی ہیں۔ باقی کہانی شانی کے گرد گھومتی تھی۔ وہ اسے بیوی بنانے پہ آمادہ ہے یا نہیں۔ تھوڑا بہت ہی سہی اس کے حسن سے مرعوب ہوا ہے یا نہیں۔ کیونکہ سامنے صوفے پہ بیٹھے شانی صاحب کے تاثرات ایسے سخت اور کلف شدہ تھے کہ کوئی نتیجہ اخذ کرنا ہی مشکل ہو رہا تھا۔

اپنی ماں کی بات پہ شانی نے ماں کو یوں دیکھا جیسے ان سے پوچھنا چاہتا ہو کہ یہ کس نے کہا کہ میں اس لڑکی سے کوئی بات کرنے میں دلچسپی رکھتا ہوں یا اس سے علیحدگی میں ملنے کے لیے مرا جا رہا ہوں۔ لیکن ماں کی سمجھا دینے والی مسکراہٹ اسے چپ کرا دینے کے لیے کافی ثابت ہوئی تھی۔ وہ باہر سے پڑھ کر آیا تھا اور اس بات کا زعم اور گھمنڈ اس کی آنکھوں، کانوں، ہاتھوں، پاؤں ہر عضو سے ٹپک رہا تھا کہ مجھ سے ملیے، میں ہوں شانی ولایت خان جو انگلینڈ سے انجینئرنگ کی ڈگری لے کر آیا ہوں اور ساتھ اپنی اس ڈگری کے اپنی گردن میں سریا بھی فٹ کروا کر لایا ہوں۔

تو شانی صاحب کو اپنے زیادہ پڑھا لکھا ہونے کا اتنا گھمنڈ تھا کہ یاں کے آنکھیں دکھانے پہ بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئے تھے۔ تبھی آنٹی نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پہ سجاتے ہوئے بیٹے کو آنکھیں دکھائیں۔

''شانی۔ جاؤ بیٹا۔ جو بات کرنا ہے کر لو ارفع سے۔'' ماں کی باقاعدہ آنکھیں باہر ابلنے کو آ گئیں تو وہ اس کے ساتھ اوپر چھت پہ جا کر بات کرنے پہ آمادہ ہوا تھا۔ اوپر تو وہ آ گیا تھا لیکن اس سے زیادہ اس کے گھر کی چھت اور چھتوں سے نظر آتی دوسری چھتوں کو دیکھنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔

''شانی صاحب تو سو فیصد اس رشتے سے انکار کرنے والے ہیں۔ شاید کسی اور لڑکی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ شاید باہر کی کسی گوری میں جس کی خوب صورتی سے بے حد متاثر ہو کر وہ پاکستان آئے ہوں گے اور ماں نے اسی گوری کے سحر کا توڑ ایک اور گوری یعنی حسین لڑکی کی صورت سوچا ہوگا اور نشانہ جا کر مجھ پہ لگا ہوگا۔'' وہ دل ہی دل میں اس کلف شدہ شانی کا معائنہ کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ تھا بھی کمبخت بہت ہینڈسم اور ایسا نخرہ کرنا اسے بہت جچ بھی رہا تھا۔ وہ ابھی سے خود کو کچھ کچھ دبا دبا سا محسوس کرنے لگی تھی۔

''میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں، شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' شانی نے تو کیا ہی بات کرنا تھی، اسی نے اپنی خواہش کا اظہار کر ڈالا۔ اچھا تھا کہ وہ اس کی جانب سے انکار سن کر اب اسے بتا دے گا کہ وہ بھی اس جیسی کسی لڑکی سے شادی میں دلچسپی نہیں رکھتا ہے۔ یہ تو ماں کا لحاظ کرتا وہ وہاں چلا آیا ہے بالکل ویسے ہی جیسے وہ امی کا لحاظ کر لی وہاں آئی تھی۔ پھر وہ اس سے معذرت کرتا ہوا چلا جائے گا اور نیچے جاتے ہی اپنی والدہ ماجدہ سے کہے گا کہ اسے اس لڑکی سے شادی نہیں کرنا۔ پھر وہ دھمال ڈالے گی اور امی سے معصوم بن کر کہہ دے گی کہ اسی نے رشتے سے انکار کیا ہے ورنہ وہ تو اس انگلینڈ پلٹ نوجوان سے شادی پہ آمادہ ہی تھی۔ اور یہ سلسلہ یہیں ختم ہو جائے گا۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' اب وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ نجانے اچھی بات کیا تھی، اس کا آگے پڑھنا یا شادی نہ کرنا۔

''میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتی ہوں۔ باہر جانا چاہتی ہوں۔'' وہ مزید چوڑی ہوئی۔ مطلب مزید بہادری دکھائی۔ مزید اپنی مرضی اسے بتائی۔

''ضرور جائیں۔'' وہ تو یوں اسے اجازت دے رہا تھا جیسے ابھی اس کی ٹکٹ کٹوا کر جہاز میں بٹھا دے گا، وہ بھی اپنے خرچے پہ۔

''یہ شادی امی کروانا چاہتی ہیں۔'' وہ بھی اب بنا لحاظ کے بول رہی تھی۔ بھلا اب وہ کیوں رکھتی یہ لحاظ وحاظ جب وہ اس کی خواہش کو سراہ رہا تھا۔

''ہمم.....'' ایک لمبی سی 'ہم' کر کے وہ خاموش تھا

جیسے کہہ رہا ہو کہ میری امی بھی یہی چاہتی ہیں، میں نہیں۔اب وہ کیا بات کرے اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سامنے کھڑا شخص تو ایک سے دوسرے بات کرنے کا عادی نہیں لگتا تھا یا شاید اسے قابل نہیں سمجھتا تھا۔

''تو پھر چلیں؟''

''کہاں..... باہر.....؟'' وہ چونک کر پوچھنے لگا۔

''نیچے.....'' اس نے دانت کچکچا کر اسے دیکھا۔

وہ جس خاموشی سے اس کے ساتھ اوپر گیا تھا، اسی خاموشی سے نیچے بھی چلا گیا تھا۔ وہ جو اس کی ماں کے بقول اس نے بات شات کرنا تھی وہ شاید کرنا بھول گیا تھا یا اس کی بات سن کر ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

وہ دل ہی دل میں بڑی خوش تھی کہ اس رشتے سے پکا انکار ہی ہوا اب۔ ہاں کرنے کی کوئی گنجائش پہلے بھی نہیں تھی اور اب تو بالکل بھی نہیں لگ رہی تھی۔ ادھر امی خوش تھیں کہ ان لوگوں کو ارفع پسند آئی تھی۔ اب اس نے امی کو یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ لڑکے کو وہ ہرگز پسند نہیں آئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ نہ ہی اوپر جانے میں انٹرسٹڈ تھا نہ ہی بات کرنے میں اور شادی کرنے میں تو بالکل بھی نہیں۔ امی خوش فہمی کا شکار تھیں تو ہوتی رہیں، وہ بھی ان کی خوش فہمی کا یہ غبارہ اتنی جلدی پھاڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تو اب ایم فل کی تیاری کرے گی اور اس کے بعد باہر جا کر پی ایچ ڈی کرے گی۔

دو دن کے بعد امی نے خوشی خوشی اسے بتایا تھا۔

''ان لوگوں کا فون آیا تھا، رشتے کے لیے نہ صرف ہاں کر ڈالی ہے بلکہ وہ تو دو ماہ بعد شادی بھی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی بڑی بیٹی دو ماہ بعد آ رہی ہے باہر سے، شادی اسی لیے جلدی کرنا چاہ رہے ہیں۔''

اور ارفع ماں کی شکل دیکھ رہی تھی کہ یہ کیا ہو گیا۔ وہ تو پکا انکار سمجھے بیٹھی تھی۔ اس کلف شدہ، گردن میں نصب سریے والے شانی نے کیسے انکار کرتے کرتے ارادہ تبدیل کر لیا تھا اس کی خاک سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''میں اس شانی نامی رشتے سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اب کی بار اس نے امی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

''کیوں اب تم اس سے کیوں ملنے پہ بضد ہو؟ کر لیں نا جو بھی باتیں کرنا تھیں۔ اب باقی کی باتیں شادی کے بعد کے لیے بچا کر رکھو۔'' امی اس کی کسی خواہش کو خاطر میں لائی تھیں آج تک جو اب لاتیں۔

''مجھے اس سے مل کر کچھ پوچھنا ہے۔ پہلے کی ملاقات اس کی مرضی سے ہوئی تھی، اب میری مرضی سے ہوگی۔ پہلے کی باتیں شاتیں اس نے کی تھیں، اب میں کروں گی۔ اگر میں اس سے مل نہیں سکتی تو پھر میں اس سے شادی بھی نہیں کر سکتی۔''

امی نے اس کی اس بکواس کو بخوبی سنا تھا اور اسے زبردست سا گھورا تھا لیکن وہ اس وقت امی کی کسی گھوری کو خاطر میں نہ لانے والی ڈھیٹ بن گئی تھی۔

امی نے اس کی یہ فرمائش شانی کے گھر والوں تک پہنچا دی تھی اور اگلی شام وہ اس کے ساتھ اسی چھت پہ موجود تھا جہاں اس کی آنکھیں، کان، ناک چیخ چیخ کر پکار کر گئے تھے کہ میں تم سے شادی نہیں کرنے والا۔ فضول میں میرا وقت برباد مت کرو اور میری جان چھوڑ دو۔

''یہ بیٹھے بٹھائے آپ نے میرے لیے ہاں کیسے کر دی؟ آپ تو غالباً انکار کر کے گئے تھے نا۔'' چھوٹتے ہی اسے طیش آ گیا اور وہ شانی کو کھانے کو ہی دوڑ پڑی تھی۔

''میں نے تو انکار نہیں کیا تھا۔ انکار تو آپ کر رہی تھیں۔'' بڑے ٹھنڈے لہجے میں کرارا جواب ملا۔

''تو آپ کون سا اس رشتے کے لیے مرے جا رہے تھے۔ آپ بھی تو یہ شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔''

''میں نے ایسا کچھ کہا؟'' وہ جیسے سوچ کر پوچھ رہا تھا۔

''آپ نے کہا نہیں تھا کہ میں پڑھنے کے لیے باہر چلی جاؤں؟''

''تو اس سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ میں نے انکار کیا تھا۔ رشتے کے حوالے سے تو آپ نے کہا تھا کہ آپ یہ شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ میں نے نہیں۔''

وہ اپنی جگہ درست تھا۔ اس نے تو محض ہنکارا

بھرا تھا اور بات ختم۔ اور ارفع کو لگا کہ بات ختم ہی ہو گئی ہے۔ یہ تو سراسر اس کی اپنی حماقت تھی۔

''آپ کا ہر انداز کہہ رہا تھا کہ آپ یہ شادی نہیں کرنا چاہتے۔'' وہ کسی بھی طرح اس کو شادی نہ کرنے پہ منا لینا چاہتی تھی۔

''آپ پہلی ملاقات میں ہی میرے انداز پہچاننے لگ گئیں؟ بہت خوب.....'' یہ پہلی بار تھا کہ وہ ہولے سے مسکرایا تھا، اس کی ایسی احمقانہ گفتگو پہ محظوظ ہوا تھا۔ ارفع کا بس نہیں چل رہا تھا کہ یا تو اس کے سر پہ گملا پھوڑ دے یا اپنا ہی سر دیوار سے مار دے۔

''دیکھیں مسٹر ایکس وائی زی۔'' وہ جھنجھلاہٹ میں اس کا نام تک بھول گئی تھی۔ یہ کوئی آنے والا پہلا رشتہ تھوڑا ہی تھا کہ وہ ہر ایک کا نام یاد رکھتی۔ امی تو آئے دن کسی نہ کسی کو بلائے رکھتی تھیں۔

''شافی ولایت خان نام ہے میرا۔ اور میں بہت پسند کرتا ہوں کہ سب مجھے میرے نام سے پکاریں۔'' اس نے فوراً منہ بگاڑ کر تصحیح کی۔

''جو بھی ہے..... میں نے آپ کو صاف بتایا تھا کہ میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتی تو آپ کو کیا ضرورت تھی شادی کے لیے ہامی بھرنے کی؟''

''کیونکہ شادی آپ نہیں کرنا چاہتیں..... میں نہیں۔''

''تو آپ انکار کر دیتے نا۔'' اتنی سی بات اس انگلینڈ پلٹ لڑکے کی سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی تھی۔

''شادی آپ نہیں کرنا چاہتیں تو انکار بھی آپ کریں۔''

''میں امی کو لاکھ بار انکار کر چکی ہوں لیکن وہ میری سننے کو تیار نہیں ہیں۔'' اب کی بار وہ یک دم بے چاری سی بن گئی تھی کہ شاید اسے اس کی بے چارگی پہ ترس آ جائے۔

''تو سمجھیں کہ میں بھی سننے کو تیار نہیں ہوں۔ شادی آپ نہیں کرنا چاہتیں تو انکار بھی آپ کو کرنا چاہیے۔ مجھے اس معاملے سے دور رکھیں کیونکہ میں تو یہ شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ امی کا ہی جانشین نکلا تھا۔

''آپ کو مجھ سے بہت اچھی لڑکیاں مل سکتیں ہیں تو میں ہی کیوں؟ میں کون سا حور پری ہوں جو آپ کو اور نہیں مل سکتی۔''

''کیونکہ ان بہت سی اچھی لڑکیوں کو میں نہیں مل سکتا اور حور پری تو آپ میری ماں کے لیے ہیں بھی تو اتنی ساری اچھی لڑکیوں میں آپ انھیں اچھی لگی ہیں۔'' وہ اب ہولے سے مسکرا رہا تھا جیسے اس ساری صورت حال کا اسے مزا آ رہا ہو۔

''میں عین نکاح کے وقت انکار کر دوں گی۔'' وہ اب دھمکانے پہ آ گئی۔

''شوق سے کیجیے گا۔ مجھے ایسی لڑکی کو دیکھنے کا بہت شوق ہے جو عین نکاح کے وقت انکار کرنے کی جرات رکھتی ہو۔'' اس کے جواب نے ارفع کی ساری ہوا نکال ڈالی تھی۔

''دیکھیں شافی ولایت خان صاحب۔''

اس کا نام پورا لینے پہ شافی کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔ وہ ایکس وائی زی سے بالآخر شافی ہو ہی گیا تھا۔

''میرا ایک ہی خواب ہے، بہت سارا پڑھنا۔ میں اسے پورا کرنا چاہتی ہوں۔ ابھی میں نے شادی کر لی تو میرا خواب کیسے پورا ہوگا؟ اگر آپ اس رشتے سے انکار کر ڈالیں گے تو میرا کام آسان ہو جائے گا۔'' وہ پھر سے منت سماجت پہ اتر آئی تھی۔

''دیکھیں ارفع صاحبہ۔ آپ کا خواب آپ کا مسئلہ ہے..... میرا نہیں۔ میرا خواب میری ماں کی خواہش کا احترام ہے اور وہ آپ کو پسند کر چکی ہیں۔ اس لیے اس رشتے سے انکار میرے لیے کم از کم اس زندگی میں ممکن نہیں ہے۔''

''تو مطلب میں نا سمجھوں؟'' وہ رو دینے کو تھی۔ رو بھی دیتی اگر وہ ماننے پہ آمادہ دکھائی دیتا۔

''بالکل نہیں۔ میں تو ہاں کر رہا ہوں اس رشتے کے لیے۔''

ارفع نے اسے سختی سے گھورا اور پیر زمین پہ پٹخ کر چلی گئی۔ پیچھے کھڑا شافی یک دم کھل کر مسکرا دیا تھا۔

☆☆☆

وہ اگر اپنی ماں کی وجہ سے اس سے شادی کر رہی تھی تو وہ بھی کچھ ایسا ہی کر رہا تھا۔ اگر وہ اس سے شادی

کی خواہش مند نہیں تھی تو وہ بھی نہیں تھا۔اس شادی میں ان دونوں کی مرضی کے بجائے ان کی ماؤں کی مرضی شامل تھی۔لیکن نکاح کے فوراً بعد ہی وہ اسے کچھ کچھ اچھا لگنے لگا تھا اور شافی کو تو وہ اسی وقت کچھ اچھی لگی تھی جب وہ منتیں ترلے کرتی اس سے شادی سے انکار پہ اکسا رہی تھی۔ایسا نہیں تھا کہ وہ اس کی خوب صورتی سے متاثر ہوا تھا، اس نے زندگی میں اس سے کہیں زیادہ خوب صورت لڑکیاں دیکھی تھیں۔اس سے کہیں زیادہ ماڈرن، پڑھی لکھی، مہذب اور چھا جانے والی۔لیکن وہ لڑکیوں کی ایسی قسم کو پسند کرتا تھا جو مرد کے سامنے دب کر رہے۔اپنی بات منوانے کے لیے گھنٹوں منتیں کرے اور پھر چپ چاپ ہو کر بیٹھ جائے اور وہی کرے جو ان سے کہا جا رہا ہو۔جن میں بغاوت نام کی کسی شے کا مادہ نہ ہو اور ارفع سے دو ملاقاتوں میں ہی وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ ایک ایسی ہی لڑکی ہے جو اسے شادی کے لیے درکار ہے۔

"مجھے بلیو کلر بہت پسند ہے اور مجھ پہ سوٹ بھی بہت کرتا ہے۔" اپنے بلیو تھری پیس پہ وہ ٹائی باندھ رہا تھا۔وہ اس کی کیا تعریف کرتی۔اس کام کے لیے اسے کبھی موقع ہی نہ ملتا، وہ خود ہی شروع ہو جاتا تھا۔

"سب میری چوائس کو سراہتے ہیں کہ میں ہمیشہ لاجواب پسند رکھتا ہوں۔" آئینے میں خود کو دیکھتے وہ مسکرا رہا تھا۔

"جس دن میں کوئی تعریفی جملہ نہ سنوں، مجھے سکون نہیں ملتا۔" یہ "میں نامہ" شادی کے پہلے دن سے جاری تھا اور 'تم نامہ' پہ آ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ کچھ اپنے بارے میں بھی بتاتی۔

"اپریسیشن میرا ایندھن ہے۔اس کے بنا میں چل نہیں سکتا۔"

وہ کہنا چاہتی تھی کہ اسے سب کے لیے ایندھن سمجھا جائے۔خود اس کے لیے بھی۔

"امی نے کہا تھا کہ میں شادی کے بعد آگے پڑھ سکتی ہوں۔" شادی کے مہمانوں سے جونہی گھر خالی ہوا وہ شافی سے اپنا حق مانگنے کھڑی ہو گئی۔جس حق کی اسے یقین دہانی کرائی تھی، اس کی امی نے اور شافی کی امی نے بھی۔

"امی نے کہا تھا، میں نے تو نہیں۔" وہ اپنے کوٹ کے بٹن بند کرتا ہوا آفس کے لیے تیار ہو رہا تھا۔شادی کے تیسرے روز ہی وہ آفس جا رہا تھا۔وہ باہر سے اپنے ساتھ انجینئرنگ کی ڈگری کے ساتھ محنت کی سند بھی اٹھا لایا تھا۔کاش کہ وہ انسانیت کی سند پہ بھی تھوڑی توجہ دے دیتا تو آنے والی زندگی قدرے آسان ہوتی۔

"تو آپ مجھے پڑھنے نہیں دیں گے؟" نئی نویلی دلہن اپنی دل موہ لینے والی ادائیں آزما رہی تھی۔غلط ہوا کہ غلط انسان آزمانے کو ملا تھا۔

"کیا کرو گی اتنا پڑھ کر؟"

وہ آئینے میں دیکھ کر ہولے سے مسکرایا تھا۔یہ اس کا عظیم احسان تھا کہ جو وہ اس نئی نویلی دلہن پہ کر رہا تھا۔اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا، نرمی سے بات کر رہا تھا، غصہ نہیں دکھا رہا تھا۔ورنہ ایسی عنایات وہ باہر والوں پہ کرتا تھا، گھر والوں پہ نہیں خصوصاً بیوی پر۔

"بھلے کچھ نہ کروں لیکن شوق ہے تو پورا کرنا چاہتی ہوں۔"

"لڑکیوں کے جو شوق ہوتے ہیں نا یہ ماں باپ کے گھر پورے ہوتے ہیں۔شوہر کے گھر شوہر کے شوق پورے کیے جاتے ہیں اور مجھے اپنی بیوی کو پڑھانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" کتنی تہذیب میں لپیٹ کر اس نے گولی ماری تھی جو ارفع کے عین دل پہ لگی تھی۔اتنی زور سے کہ وہ دل تھام کر رہ گئی تھی۔

"اب تمہاری شادی ہو گئی ہے۔تمہیں مجھ پہ، اپنے گھر پہ دھیان دینا چاہیے۔جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔میں نے کون سا تم سے نوکریاں کروانی ہیں جو تمہیں پڑھاتا رہوں۔" وہ اب خود پہ ڈھیروں پرفیوم چھڑک رہا تھا۔اپنے آپ کو بڑی لگاوٹ سے آئینے میں دیکھ رہا تھا۔اپنی ہر ادا پہ قربان جا رہا تھا۔اپنا سب سے بڑا عاشق وہ خود تھا اور اس عشق میں وہ بچھ بچھ جا رہا تھا۔

''آپ خود اتنا پڑھے لکھے ہیں۔تو کیا آپ یہ چاہیں گے کہ آپ کی بیوی کم پڑھی لکھی ہو؟'' وہ اندر سے یک دم بجھ گئی تھی پھر بھی وہ معصومیت سے اس کی اچھی بندھی ہوئی ٹائی کو یونہی ٹھیک کرتے ہوئے اب جذباتی طور پہ اسے آمادہ کرنے کی کوڑی لائی تھی۔ لیکن جذبات تو کبھی ایسے چھو کر بھی نہ گزرے تھے، ارفع یہ بات نہیں جانتی تھی۔

''میری بیوی بالکل بھی کم پڑھی لکھی نہیں ہے تو میں یہ کیوں سوچوں؟'' سامنے بھی شافی تھا جو اس کی بے چارگی پہ مسکرایا لیکن اپنی بات سے اینچ برابر بھی نہ ہلا۔

''لیکن میں بہت پڑھی لکھی بھی تو نہیں ہوں نا..... آج کل کے دور میں ماسٹرز ایسا ہے جیسے کسی زمانے میں میٹرک تھا۔'' وہ منہ بسور کر بولی۔کوئی اور مرد ہوتا تو اس کی اس ادا پہ واری واری جاتا لیکن وہ شافی تھا، شافی ولایت خان۔ جو تین دن کی بیاہتا بیوی کے چاؤ اٹھانے کے بھی حق میں نہیں تھا۔ اور اس کے سامنے بچھ جانے کے حق میں تو بالکل نہیں۔

''مجھے بیوی چاہیے، کسی جاب کے لیے ورکر نہیں جو میں اس کی ڈگریاں دیکھتا پھروں۔ امی کو خوبصورت بہو چاہیے تھی جو انھیں مل گئی۔ مجھ پہ فرض تھا کہ امی کی خواہش کو پورا کروں سو میں نے کر دی۔ ڈیٹس اٹ۔'' وہ اسے پیچھے کرتا اب اپنا آفس بیگ اٹھا چکا تھا۔

''اور آپ کو کیسی بیوی چاہیے تھی یہ آپ نے نہیں بتایا۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

بھلے وہ یہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ مزید پڑھنا چاہتی تھی لیکن اب تو شادی ہو چکی تھی۔ وہ اس کی بیوی بن چکی تھی اور دوسری بیویوں کی طرح وہ بھی اپنے شوہر سے توصیف و تعریف چاہتی تھی، محبت اور توجہ چاہتی تھی، چند پیار بھرے جملے اور میٹھی مسکراہٹیں، کانوں میں سرگوشیاں اور لبوں پہ نہ تھمنے والے قہقہے۔

''کم از کم ضد کرتی بیوی تو ہرگز نہیں چاہیے تھی۔'' وہ کچھ جتا کر دروازہ کھول چکا تھا۔''اور نہ ہی اپنے سے زیادہ پڑھی لکھی۔'' اس نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا اور اتنا کہتا باہر نکل گیا تھا۔ ارفع وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

اس کی ماں ٹھیک کہتی تھی، زمانہ بھی وہی اور سوچ بھی۔ آٹے میں نمک کے برابر لوگ اب بھی موجود ہیں اور نمک اپنے ہونے کا احساس ضرور دلاتا ہے۔ اس کا پالا بھی ایسے ہی ایک شخص سے پڑا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک مخلوط محفل میں، وضع وضع کے لوگوں میں گھری کھڑی تھی۔ قہقہے، ہنسی اڑاتے، میک اپ زدہ کھوکھلے اور مصنوعی چہرے۔ ہاتھوں میں مشروب اٹھائے کچھ لڑکھڑاتے قدم۔ لان کی آرائش پہ ہی لاکھوں خرچ کیا گیا پیسہ ہر شے سے واضح تھا۔ ایسی مصنوعی دنیا سے وہ سخت خار کھاتی تھی جس کا اب وہ حصہ بنی کھڑی تھی۔ اس نے قریب کھڑے شافی کو دیکھا جو میک اپ کی تہ میں دبی ایک بے ہنگم ہنسی ہنستی ہوئی لڑکی سے گفتگو میں مگن تھا۔ دونوں میں خاصی بے تکلفی تھی کہ وہ لڑکی بات بے بات شافی کا بازو تھام لیتی تھی، ہاتھ پہ ہاتھ دھر دیتی تھی، اس کے کان میں سرگوشی کرنے قریب ہو جاتی تھی۔ کبھی کسی بات پہ آنکھ بھی مار دیتی تھی۔ ارفع بس پہلو پہ پہلو بدل رہی تھی۔ کاش کہ وہ اس منظر کو بھی بدلنے کی ہمت رکھتی ہوتی یا خود کو اس سب سے دور کر لینے کی طاقت۔

''یور وائف از سو سمپل۔'' ایک نظر اس نے عقب میں کھڑی ارفع پہ ڈالی جس کے چہرے پہ چھائی بیزاریت ہر تاثر پہ حاوی تھی۔''بٹ ویری پریٹی۔''

اس کی اس بات پہ شافی نے مسکراتے، ارفع کو دیکھتے، اسے خود سے قریب کرتے، اس کی کمر کے گرد بازو حائل کرتے جیسے اس پہ اپنی ملکیت کا اظہار کیا تھا۔

''پھر مانتی ہونا میری پسند کو۔''

وہ کب سے اس کی پسند بن گئی تھی جسے وہ کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ ارفع کو اپنی حیثیت ایک جیتی ہوئی ٹرافی سے زیادہ کی نہیں لگ رہی تھی جسے وہ ہاتھ میں تھامے سب میں فخر سے لہرا رہا تھا۔ اپنی فتح کا جشن منا رہا تھا۔ وہ مجبوراً ان سب کے بیچ، اپنے شوہر سے لگی کھڑی تھی۔

''اس میں کیا شک کہ تم ہمیشہ اعلا چیز ہی اپناتے ہو۔'' وہ داد دیے بنا نہ رہ سکی۔

شافی نے خود کو خود ہی خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک جاندار قہقہہ لگایا۔

''اعلا ترین کو اعلا سے کم چنتا بھی نہیں ہے۔''

دونوں ہنس دیے تھے اور ارفع رو دینے کو تھی۔

وہ دونوں اب ملک کی معیشت پہ لکھی کوئی کتاب ڈسکس کر رہے تھے جس میں ارفع کی قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ جبراً بھی مسکرانہ پا رہی تھی جب کہ وہاں موجود ہر شخص عظیم قہقہے لگانے میں مہارت رکھتا تھا۔ ایسے میں اسے اپنا آپ کسی اجنبی سے کم نہ لگا جو انجان دیس کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر اب اپنے دیس اڑان بھرنے کے لیے دیوانہ ہوا جاتا ہے۔

''میں کچھ دیر وہاں بیٹھ جاؤں؟'' اس نے ایک کونے کی جانب اشارہ کرتے شافی سے پوچھا جہاں نسبتاً لوگ کم تھے اور جو تھے وہ خاموشی سے بیٹھے اپنے موبائل فون میں مگن تھے، جیسے وہ سب اسی خاص کام کے لیے وہاں آئے ہوں۔

شافی نے سر کی جنبش سے اسے جانے کا اشارہ دیا تو وہ گہری سانس لیتی وہاں سے گویا بھاگی تھی۔ کونے میں ایک کرسی پہ بیٹھے وہ گہرے سانس لینے لگی جیسے کسی حبس زدہ ماحول سے خلاصی پا کر وہاں آئی ہو اور تازہ ہوا میں ایک عرصے بعد سانس لینے کے قابل ہوئی ہو۔

کسی نے اسے سلام کیا تو وہ چونکی۔ مردانہ کلف لگا کرتا شلوار پہنے، سادہ سی مانگ نکالے وہ لگ بھگ پینتیس برس کا مرد تھا جو اس کے سامنے موجود خالی کرسی پہ ہاتھ رکھے کھڑا اپوچھ رہا تھا۔

''میں شافی کا تایازاد ہوں، برابر والا پورشن میرا ہے۔''

ایسے دیسی لہجے کی اس محفل میں موجودگی پہ اسے حیرت ہوئی تھی۔ وہ بھی گویا اس جیسا کوئی بھولا بھٹکا مسافر تھا جو وہاں دھوکے سے آ گیا تھا۔

''شافی اور میں بچپن میں دوست تھے، اکھٹے پلتے تھے۔''

ایسا سادہ رشتے دار شافی کا ہو سکتا ہے اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ شافی کی امی نے یہ پارٹی ان دونوں کی شادی کے اعزاز میں رکھی تھی۔ ایسے میں برابر کے پورشن سے زکریا جیسے رشتے دار کو بلانا شاید ان کی مجبوری بن گئی تھی۔

''شافی کو میں نے دعوت دی تھی شادی کی لیکن اس نے منع کر دیا کہ وہ بہت مصروف ہے۔'' ارفع نے شافی کی طرف دیکھا جو اپنی ہی دنیا میں مگن تھا۔ زکریا نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور ہولے سے مسکرا دیا۔

''مجھے اچھا نہیں سمجھتا وہ۔ پڑھا لکھا ہے نا تو ان پڑھ رشتے داروں کو پسند نہیں کرتا، اسی لیے ملنا نہیں چاہتا۔'' بے ریا لہجے میں ایک ان دیکھا دکھ اسے چبھ گیا تھا۔

شافی اب اسی سمت دیکھ رہا تھا۔ اس کے سیاہ پڑتے چہرے کو وہ دور سے بھی دیکھ چکی تھی۔ انجام کا سوچ کر وہ کانپ کر رہ گئی۔ اس کے چہرے کے بدلتے رنگ نے ہی زکریا کو کہنے پہ مجبور کیا تھا۔

''چلتا ہوں، کہیں میری وجہ سے تم مشکل میں نہ پڑ جاؤ۔'' وہ سلام کر کے اب دوسری سمت بڑھ گیا تھا۔

ارفع اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے شافی کو دیکھا جو اب اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ارفع پھیکا سا مسکرا دی۔

رات کمرے میں لوٹنے کے بعد شافی نے خود ہی یہ ذکر چھیڑا جس سے وہ اجتناب کر رہی تھی۔

''وہ تم سے کیا کہہ رہا تھا؟''

ارفع نے لاعلمی سے شانے اچکائے۔

''اس جاہل پینڈو کی بات کر رہا ہوں۔''

ماتھے پہ شکنوں کو ارفع نے بغور دیکھا۔ اس کے چہرے پہ اپنے تایازاد کے لیے ناپسندیدگی صاف رقم تھی۔ پھر بھی وہ کہے بنا نہ رہ سکی۔

''بتا رہا تھا کہ وہ آپ کا تایازاد ہے اور اس نے آپ کو دعوت دی تھی شادی کی لیکن آپ نے منع کر دیا۔''

شانی نے تنفر سے سر جھٹکا۔

''میٹرک پاس گنوار انسان سے کون مراسم بڑھانا چاہے گا، اتنا فارغ وقت نہیں ہے میرے پاس جو ایسے بیسوں پہ ضائع کرتا پھروں۔''

''وہ آپ کا کزن ہے شانی۔ کم پڑھا لکھا ہوگا لیکن مہذب تھا۔ کم از کم مجھے تو مہذب لگا۔''

''کزن میرا ہے اور ہمدرد تم بن رہی ہو۔ ساتھ والے پورشن میں رہتا ہے اور جب دل کرتا ہے یہاں آجاتا ہے۔ لیکن تم مجھے اس سے کوسوں دور دکھائی دو..... اور تم کیا جانو مہذب کی تعریف، جو دنیا کو اپنی حماقت کے چشمے سے دیکھتی ہو۔ خود بھی ہونق بنی یوں سب سے مل رہی تھیں جیسے افریقہ کے جنگل سے فلائٹ پکڑ کر سیدھا پارٹی میں قدم رکھے ہوں۔'' اس نے استہزاء سے ارفع کو دیکھا جو اب سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ رخ موڑ گئی تھی۔ جانتی تھی بھلے وہ کتنی ہی خود اعتمادی سے مل لیتی، اس کے شوہر کے نزدیک وہ ایک سی رہتی کیونکہ وہ سراہنا نہیں، تضحیک کرنا جانتا تھا۔

☆☆☆

پڑھائی تو بہت واجبی سی شے تھی جس پہ اس کی ایک نہیں چل سکی اور وہ اسی بات کو دل سے لگائے بیٹھی تھی۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ اسے احساس ہوا کہ شانی اس کی کسی معاملے میں بھی ایک سننے کا روادار نہیں تھا۔ اس کی کوئی مرضی، کوئی پسند، کوئی مشورہ۔ اس کے نزدیک بکواس سے زیادہ کی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ عورت ماں، بہن کے روپ میں اس کے لیے قابلِ محترم تھی لیکن بیوی کے روپ میں قابلِ تضحیک۔ جس سے اس کی انا کو تسکین ملتی تھی۔

''کہیں گھومنے چلیں؟'' سہانا موسم اس کی کمزوری تھا۔

''میں دوستوں کے علاوہ کسی کے ساتھ گھومنا پسند نہیں کرتا۔'' نکا سا جواب۔

''ہم شادی کے بعد کہیں گھومنے نہیں گئے شانی۔'' اتنا شکوہ تو اس نے حق سمجھ کر کیا۔

''میں آدھی دنیا دیکھ چکا ہوں۔ گھوم چکا ہوں۔ اب یہ پاکستان کے تفریحی مقامات جنہیں دنیا کچرا دان کی شکل میں ڈھال چکی ہے میری لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔'' وہ طنزیہ مسکرا کر اب کوئی گیم کھیل رہا تھا۔

''آج کھانا باہر کھائیں؟'' شام ڈھلتے ہی کن من بارش کو دیکھتے دل للچا اٹھا۔

''گھر کی عورتوں کو بغل میں دبائے باہر ہوٹلوں میں گھمانا مجھے ذرا نہیں پسند۔'' نفرت سے اس نے سر جھٹکا جیسے کسی بڑے گناہ کا ذکر اس کے سامنے کر دیا گیا ہو۔

باہر سے پڑھ کر آنے والا اندر سے اتنا ان پڑھ کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ گنگ ہی رہ گئی تھی۔

''میری برتھ ڈے ہے اور آپ نے مجھے وش تک نہیں کیا۔'' اس کا دل کیا وہ روایتی بیویوں کی طرح روٹھ جائے اور وہ اسے جی جان سے منائے۔

''کس بات کے لیے وش کروں کہ تم ایک سال بڈھی ہو گئی ہو۔'' ایک عظیم استہزائیہ مسکراہٹ نے اسے سالگرہ مبارک کہا۔ وہ خود ہی روٹھ گئی اور خود ہی مان بھی گئی۔

''میں امی کے گھر جانا چاہتی ہوں کچھ دن کے لیے۔''

شادی کے بعد وہ مکلاوے کے سوا ماں کی طرف گئی ہی کہاں تھی بھلا۔ دل چاہا ماں سے ملنے کا تو تیار ہو کر کہیں باہر جاتے شانی سے کہہ دیا۔

''بہتر ہے کہ گھر پہ توجہ دو۔ عورت کا بار بار میکے جانا اس کی توجہ گھر سے ہٹا دیتا ہے۔ میکا بسانے والی عورت پھر سسرال نہیں بسا سکتی۔'' مہینے بعد بھی اس جواب کی اسے توقع نہیں تھی۔

''مجھے میکے گئے مہینے سے زیادہ ہونے کو ہے۔''

''بحث کرتی عورتیں مجھے بالکل نہیں پسند، خاص کر بیوی۔'' اس کی بات درشتی سے کاٹ کر وہ کلون لگاتا، خود کو سنوارتا، موبائل پہ کال اٹینڈ کرتا، ہنستا مسکراتا باہر نکل گیا تھا۔

اس نے جو سوچا تھا کہ وہ باہر کی ڈگری کے ساتھ ایک عدد سریا بھی گردن میں فٹ کروا کر لایا

ہے تو اس نے غلط سوچا تھا۔ وہ تو پورے کا پورا پتھر بن کر آیا تھا جس سے سر ٹکرا کر بس زخمی ہی ہوا جا سکتا تھا۔ اور وہ اس روز بری طرح زخمی ہو ہی گئی تھی جب اس نے گھر کی سیٹنگ کچھ تبدیل کرنا چاہی تھی۔

''تم کب سے اتنی خود مختار ہو گئی کہ اپنی مرضی سے اس گھر کے مکینوں سے پوچھے بنا سب تبدیل کر دو گی۔'' اس کا چہرہ ہاتھوں میں جکڑے وہ ناخن ماس میں کھبوتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

ارفع کی آنکھیں مارے خوف کے باہر ابل پڑیں۔

''اس گھر میں اگر کسی کو تبدیل ہونا ہے تو وہ تم ہو۔'' جھٹکے سے اسے پرے کرتا وہ اسے گویا زمین پہ پٹخ گیا تھا۔

''آپ نے دیکھا آنٹی شافی نے میرے ساتھ کیا کیا؟'' وہ بے یقینی سے زمین پہ بیٹھی تیزی سے جاتے شافی کو دیکھ رہی تھی۔ میز کا کونا اس کے بازو پہ لگنے سے بازو پہ ہلکی سی کھروچ آ گئی تھی جسے دیکھتے اور دکھاتے وہ روہانسی ہو گئی۔

''شافی کو اپنی مرضی کے خلاف کچھ بھی پسند نہیں۔ تمہیں سمجھنا چاہیے نا بیٹا۔'' بناوٹی لہجہ، ہمدردی سے عاری۔ وہ جس کی ماں تھی اسی کی طرف دار بھی تھیں۔

کاش کہ وہ ماں کو دکھا سکتی کہ جس پڑھے لکھے شخص کے رشتے میں انھوں نے بیٹی کو بڑے مان سے باندھا تھا، وہ ایک 'پڑھا لکھا جاہل' تھا جس کے پاس ڈگری تو تھی، تربیت نہیں۔ قابلیت تو تھی، انسانیت نہیں۔ تکبر تھا، رحم دلی نہیں۔ وہ انسانوں میں سب سے نچلے درجے کا اور برے انسانوں کے سب سے اونچے درجے کا انسان تھا۔

وہ امی کو بتانا چاہتی تھی کہ مرد کی اعلا ڈگری بھی اکثر اس کے دل کو ایسی لگتی ہے کہ عورت کی زندگی مشکل نہیں جہنم بن جاتی ہے۔ ازدواجی زندگی کو کھانے کا کام ہمیشہ عورت کی اعلا ڈگری ہی نہیں کرتی، کبھی کبھار یہ کام مرد کی اعلا ڈگری بھی کر جاتی ہے۔

شافی ولایت خان مردوں کے اس قبیلے سے تھا جو عورت کو کمتر اور خود کو برتر سمجھتے ہیں۔ نہ صرف برتر بلکہ بہترین سے بھی کسی اگلے درجے پہ جو ان کا خود ساختہ ہوتا ہے۔ عورت کی ذہانت، قابلیت، انا، خود داری، پسندیدگی، خود مختاری انھیں بڑی کھلتی ہے۔ وہ اسے صرف نیچے دیکھنا چاہتے ہیں، پاؤں سے بھی نیچے، جوتی کے مقام پر یا پھر اس سے بھی نیچے۔ زمین تلے، پاتال میں۔

وہ سچ میں ایک ''ان پڑھ'' کے پلے بندھ گئی تھی۔

☆☆☆

اس روز وہ لان میں ٹہلتے ہوئے برابر والے پورشن کی جانب نکل آئی تھی جس کا ایک چھوٹا سا لوہے کا داخلی دروازہ اسی گھر سے ہو کر جاتا تھا۔ اس کو بند کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی زنجیر لگی ہوئی تھی، کسی قسم کا تالا لگا کر اسے باقاعدہ طور سے بند نہیں کیا گیا تھا۔ گھر سادہ سا اور پرانے طرزِ تعمیر کا بنا ہوا تھا، اس کے نئے اور فرنشڈ پورشن کے بالکل برعکس۔ جس حد تک ممکن تھا اسے صاف رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کھلا برآمدہ اور صحن جس میں لگے چند گملے عدم توجہی کا شکار ہوتے سوکھنے کے قریب تھے۔ صحن میں لگے آم کے درخت تلے ایک رنگین بان کی بنی چارپائی دھری تھی جس پہ یقیناً گھر کے مکین بیٹھا کرتے تھے۔ ایک جانب پرندوں کے لیے تازہ باجرہ اور پانی بھر کر مٹی کی کنالیوں میں رکھا گیا تھا۔ اس نے اسی کنالی میں پانی بھر بھر کے پودوں میں ڈالا اور پھر سے کنالی پانی سے بھر کر وہیں رکھ دی۔

داخلی دروازے پہ بڑا سا تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا تو مطلب گھر میں کوئی نہیں تھا۔ بے اختیاری میں وہاں چلی تو آئی تھی لیکن اب احساس ہو رہا تھا کہ بنا اجازت کسی کے گھر میں داخل ہونا تو چوری کے مترادف تھا۔ یک دم اسے جھرجھری سی آ گئی۔ وہ چور نہیں تھی لیکن چوری کی مرتکب تو ہوئی تھی۔ اسے وہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ شافی کو پتا چل جاتا تو نجانے کیا ہو جاتا۔ عام سی بات پہ ایسی عزت کرتا تھا تو اتنی بڑی بات پہ اس کو کس تکریم سے نوازے گا وہ

اچھی طرح سے تصور کرسکتی تھی۔ لیکن اسے بھلا کیسے پتا چل سکتا تھا۔ وہ شام سے پہلے گھر نہیں لوٹتا تھا، عابدہ اس وقت جم جاتی تھیں، گھر میں ملازم کے نام پہ بس صغراں خاتون تھیں جنھوں نے اسے آتے نہیں دیکھا تھا۔

''احتیاط لازمی ہے۔'' خود کو سرزنش کرتے ہوئے وہ واپس اسی پرانے لوہے کے دروازے کو گھسیٹ کر کھولتے ہوئے اپنے پورشن میں چلی آئی تھی۔ دروازہ اس نے ساتھ لگا کر لوہے کی باریک زنجیر سے پھر سے بند کردیا تھا۔

اندر لوٹ کر وہ کچن کی جانب آئی تھی جہاں صغراں خاتون کام میں لگی ہوئی تھیں۔ وہ اس گھر کی پرانی اور اکلوتی ملازمہ تھیں جو کل وقتی وہیں ایک اسٹور نما کمرے میں قیام پذیر تھیں۔

''صغراں خالہ! یہ برابر والے پورشن میں کون کون رہتا ہے؟'' وہ رات کے کھانے کی تیاری میں ان کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ بوریت دور کرنے کا واحد طریقہ یہی سوجھتا تھا۔

''زکریا بیٹا اکیلے رہتے ہیں۔''

''ان کے گھر والے کہاں ہیں؟''

''اماں تو ان کی بھی فوت ہوگئیں جب وہ بارہ برس کے تھے اور ابا تب فوت ہوئے جب وہ میٹرک میں تھے۔ پھر انھیں پڑھائی چھوڑنا پڑ گئی کہ گھر کی واحد آمدن ابا کی دکان تھی جوان کے سوا کوئی سنبھال نہیں سکتا تھا۔ چھوٹی بہن کو پڑھا لکھا کر اس کی شادی کردی۔ تب سے خود اکیلے رہتے ہیں۔ سارا گھر بھی دیکھتے ہیں اور دکان بھی لیکن شادی نہیں کرتے۔''

''دونوں گھر ایک دوسرے سے اتنے مختلف کیوں ہیں؟ یہ پورشن اتنے جدید طرز پہ بنا اور دوسرا اتنا پرانا۔'' وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''بیٹا یہ گھر دوبارہ سے شافی بیٹا کے ابا نے بنوایا تھا۔ ان کا کاروبار خوب چلتا تھا تو پیسہ بھی خوب تھا۔ زکریا بیٹا کے ابا کی دکان بس ماری باندھی ہی چلتی تھی۔ اب تو دوڑتی ہے۔ اس دکان کے علاوہ بھی زکریا بیٹا دو دکانیں اچھے علاقے میں کھول چکا، لیکن بس سادہ مزاج ہے تو ابا کی یادگار کے طور پہ گھر اسی طرح رکھا ہوا ہے۔ کہتا ہے کہ اب ایک بار ہی اپنا بناؤں گا لیکن اسے نہیں چھیڑوں گا۔ کہیں ابا کی روح تڑپ گئی تو مجھے تڑپا ہی نہ دے۔'' صغراں خاتون سارے رازوں کی واقف کار ہونے کے ساتھ پیٹ کی ہلکی اور زبان کی باتونی تھیں جو ایک سوال پہ ساری کہانی کھول کر بیان کررہی تھیں۔

''یہاں اس گھر میں نہیں آتے جاتے وہ؟''

زکریا کو ایک دو بار اس نے عابدہ آنٹی کے ساتھ سلام دعا کرتے دیکھا تھا۔

''آتے ہیں۔ بس ہفتے دو ہفتے بعد ایک آدھ چکر لگا لیتے ہیں باجی سے ملنے۔ ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ شافی بیٹا سے البتہ بات چیت نہیں ہے، وہ زکریا بیٹا کو پسند جو نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے کم ہی ملتے ہیں۔ لیکن بہت ہی بھلے انسان ہیں۔ عزت اور مان دینے والے۔'' ایک ملازم جب مالک کو سراہے تو وہ واقعی سراہے جانے کے لائق ہوتا ہے۔

ارفع سر ہلا کر اب دونوں گھروں کے مکینوں کو سوچ رہی تھی جو ایک دوسرے سے قطعاً مختلف بلکہ متضاد زندگی جی رہے تھے۔

اگلے شام وہ لان میں ہی بیٹھی چائے کا کپ تھامے سامنے دھری مٹی کی کنالیوں پہ اکا دکا چڑیا کو اترتے، پھدکتے دیکھ رہی تھی۔ ایسی ہی کسی چڑیا سی وہ بھی سہمی رہتی تھی جو ادھر ادھر دیکھ کر لک چھپ کرتی کنالی پہ اترتی، ڈر ڈر کر دانہ چگتی، دھک دھک دل سے پانی پیتی۔ بس چڑیا پھر سے اڑ جاتی اور وہ وہیں بیٹھی رہتی۔

''میرے آنگن کو سنوارنے کا شکریہ۔ صحن کے پار اترتے ہی میں جان گیا کہ یہ کام تمہارے سوا کسی کا نہیں ہوسکتا۔'' نجانے کب وہ دو گھروں کے بیچ کی دیوار پار کر کے کسی چھلاوے کی طرح اس کے سر آموجود ہوا۔

وہ سچ مچ کسی چڑیا کی طرح ہی سہم سی گئی تھی

کپ سے چائے تک چھلک گئی۔ ہاتھ جلتے جلتے بچا تھا۔

''وہ..... میں تو.....'' وہ ایک شافی سے ڈر گئی تھی۔ اب اس کا کزن بھی اسے ڈرانے چلا آیا تھا۔

''اس گھر کے مکین میرے گھر نہیں آتے، کوئی آیا مجھے اچھا لگا۔'' وہ مسکرا کر اپنے قد سے اونچے اٹھے اس مغرور سے گھر کو دیکھنے لگا۔ مکینوں کے طمطراق نے در و دیوار تک کو گھمنڈی بنا ڈالا تھا۔

''مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ آپ کا گھر ہے۔ اسی گھر کا حصہ سمجھ کر وہاں چلی آئی۔ پھر کبھی ایسی غلطی نہیں ہو گی۔ مہربانی کر کے شافی یا آنٹی سے ذکر مت کیجیے گا۔'' اپنی غلطی کا اعتراف ضروری تھا۔ بات عابدہ یا شافی تک پہنچ جاتی تو سچ مچ بڑا ہی برا ہوتا۔ وہ مٹی کی کنالیوں کو دیکھنے لگا جو لان کے ایک طرف بنے چبوترے پہ رکھی گئی تھیں اور حال ہی میں رکھی گئی تھیں۔

''میری اماں جان کہتی تھیں کہ بیوی چاہے تو شوہر کو بالکل بدل کر رکھ سکتی ہے۔'' ابا جی نے اماں جی کے جانے کے بعد ان کی ڈھیروں باتیں کی تھیں۔

''اگر شوہر شافی ولایت خان نہ ہو تو.....'' دل ہی دل میں ارفع نے سوچا تھا۔

''ابا جی بہت غصے والے تھے لیکن اماں جی کے ساتھ نے انھیں بہت دھیما کر دیا تھا۔''

''ابا جی کم پڑھے لکھے سادہ مزاج کے انسان، جن کے ماتھے پہ اعلا تعلیم کا غرور کندہ نہیں ہو گا کہ دیکھو میں کتنا قابل ہوں، کیسے کیسے تمغے میرے سینے پہ سجے ہیں۔ اسی لیے وہ دھیمے پڑ گئے ہوں گے۔''

چائے کی پیالی ایک طرف رکھ کر وہ آسمان پہ پھیلتے اندھیرے کو دیکھنے لگی۔ وہ یہ سب بھلا اسے کیوں بتا رہا تھا۔ شاید ابھی وہ پوری طرح سے اپنے کزن کو سمجھا نہیں تھا اسی لیے اس سے امید لگائے بیٹھا تھا کہ وہ اس کے بہت پڑھے لکھے کزن کی جہالت کو دور کر دے گی۔

وہ اسے بالکل خاموش اور گم صم سا دیکھ کر خود بھی خاموش ہو گیا تھا۔ کیونکہ اسے دیکھ کر اور شافی کو جان کر وہ اتنا جان گیا تھا کہ اماں جی بڑی سادہ تھیں، معصوم سی محدود سی سوچ رکھتی تھیں۔ سامنے بیٹھی عورت وہ بیوی نہیں تھی جس کی بات اماں جی کیا کرتی تھیں کیونکہ اس کا شوہر ابا جی جیسا سادہ مزاج نہیں تھا۔

''آنٹی اور شافی آتے ہوں گے۔ آپ کا یہاں آنا انہیں پسند نہیں آئے گا۔''

اس کی بات پہ وہ مسکرایا، اس بات کو بھلا اس سے بڑھ کر کون جانتا اور سمجھتا تھا کہ اس کی یہاں موجودگی شافی پہ کس قدر گراں گزرے گی۔ اس نے ترحم بھری نظروں سے خاموشی سے اٹھ کر اندر جاتی لڑکی کو دیکھا جس کے وجود پہ لرزہ تھا۔ یوں جیسے اندر سے کوئی بہت ڈر گیا ہو۔

شافی جیسے مرد کو ایسی ہی عورت درکار تھی جو پل میں کانپ اٹھے، تھرانے اور کپکپانے لگے۔ ایسی عورت جس سے اس کی بساند زدہ روح تسکین حاصل کر سکے۔ اسے صحیح لڑکی ملی تھی لیکن اس چڑیا سے دل والی کو صحیح مرد نہیں مل سکا تھا۔

زکریا کو اس لڑکی سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ بھی اتنی ہی خاموشی سے پلٹ گیا جس خاموشی سے وہ گئی تھی۔

☆☆☆

امی کی طبیعت اس حد تک بگڑ گئی تھی کہ برابر والی تہمینہ آپا انھیں ہسپتال لے کر گئی تھیں۔ ان کا مکمل علاج کروا کر، دوا دارو ہو چکنے کے بعد گھر لائی تھیں۔ اور وہ اکلوتی بیٹی، ایک ہی شہر میں بیاہی گئی، دو روز بعد آ رہی تھی۔

''اب بس بھی کرنا۔ کمزوری سے بی پی کم ہوا تو گر پڑی۔ اب کیا اس پہ ہفتوں سوگ مناؤ گی؟''

وہ جب سے آئی تھی امی سے لگی رو رہی تھی۔ دل کسی طور ہلکا ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا تو کیسے چپ کر جاتی۔ ابھی وہ خود سے ماں کو فون نہ کرتی تو

اب تک ان کی بیماری سے انجان ہی رہتی۔ لیکن اب جیسے سنا دوڑی آئی تھی اور اس دوڑ میں وہ ساس تو ساس، شوہر کو بتانا تک بھول گئی تھی کہ وہ ماں کی طرف جارہی ہے۔

''اتنا پرایا کر دیا کہ بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا مجھے۔ ایک کال ہی کر لیتیں، میں کیا بھاگی نہ آتی؟''

امی نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔ ارفع ان کی نظروں سے الجھی تھی۔

''بلانے کے لیے فون تو کیا تھا میں نے۔ بتایا بھی تھا کہ میں خالہ کو لے کر ہسپتال جارہی ہوں لیکن.....'' تہمینہ آپا کچن سے امی کے لیے چھڑی بنا کر نکل رہی تھیں۔

''فون کیا تھا.....؟ کسے کیا تھا.....؟'' وہ چونکی اور دونوں کو باری باری دیکھا۔ امی نے تہمینہ کو ان نظروں سے دیکھا جن میں خاموشی کی التجا تھی۔ تہمینہ نے اس التجا کو نہ ماننے کا گویا فیصلہ کرتے وہ صاف بتا رہی تھیں۔

''تمہارے نمبر پہ شافی سے بات ہوئی تھی۔ اسے سب بتایا تھا میں نے۔ مجھے لگا تم دونوں آجاؤ گے لیکن جب نہ آئے تو میں نے اور اسد نے سب دیکھ لیا۔ اب اٹھارہ سالہ ساتھ ہے خالہ کا، چھوڑنے سے تو رہے۔ مجھے بہت غصہ بھی تھا کہ گھر میں گاڑی ہے، ڈرائیور بھی ہوگا پھر بھی بیٹی گھڑی دو گھڑی ماں کا حال پوچھنے نہ آسکی۔ لیکن اب تم سے مل کر لگ رہا ہے کہ تم تو مکمل انجان تھی۔''

ارفع کا رنگ پھیکے مالٹے سا ہو گیا جس کا سارا رس نچوڑ لیا جاتا ہے۔ اب بات کھل ہی چکی تھی تو اس سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ روتے ہوئے سب ماں کو بتانے لگی۔

''اندازہ تھا مجھے کچھ کچھ۔'' امی نے گہری سرد آہ بھری۔ ''بیٹی اپنے گھر خوش نہ ہو تو ماؤں کو خبر ہو ہی جاتی ہے۔ اسی لیے دوبارہ فون نہیں کروایا کہ آکر مل جاؤ۔''

''دیکھ لیا اس پڑھے لکھے جاہل کا حال۔ جوتی کی نوک پہ رکھتا ہے وہ بیوی کو اور زمانے بھر سے چاہتا ہے کہ وہ اس کی تہذیب اور اطوار پہ تالیاں بجائے۔ داد دے کہ شافی ولایت خان کتنا پڑھا لکھا اور قابل ہے۔''

امی کو احساس تھا کہ وہ اپنی جگہ غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ داماد کے معاملے میں چناؤ کسی طور پہ درست فیصلہ نہیں تھا۔ لیکن وہ کیا کرتیں کہ بچیوں کے مقدر کی گارنٹی تو ماں کا دل بھی نہیں دیتا کہ وہ پھونک پھونک کر یہ قدم اٹھاتیں۔ اب جیسا بھی تھا شوہر تھا، دل میں بسا کر رکھتا، سر پہ بٹھا کر رکھتا یا جوتی بنا کر اسے گزارا کرنے کی ہی تلقین کر سکتی تھیں۔

منوں بوجھ لیے وہ ماں کے گھر سے لوٹی تو آگے مزید ایک قیامت اس کی منتظر کھڑی تھی۔

''کس سے پوچھ کر گئی تھی تم میکے؟'' وہ اپنے کیے پہ شرمندہ کہاں ہوتا، وہ تو اگلے کو شرمندگی سے زمین میں گاڑھ دینے کا ہنر رکھتا تھا۔ گونگی بنی ایک طرف کھڑی اس کی زیادتی کا ساتھ دیتی اس کی ماں تھی۔ ایسے ہر موقع پہ وہ ایسی ہی بن جایا کرتی تھی۔

''میری ماں کی حالت اتنی خراب تھی۔ آپ کو فون بھی کیا گیا تو مجھے بتایا تک نہیں۔'' اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑاتی وہ دھاڑی تھی۔

''آواز نیچی رکھو اور نظریں جھکا کر۔ عورت کی ایسی بے خوفی مجھے پسند نہیں۔'' اب اس کا ہاتھ ارفع کی گدی پہ تھا۔

پیچھے کھڑی عورت اب اندھی ہو گئی تھی۔

''میری ماں کو کچھ ہو جاتا تو.....''

''ہوا تو نہیں نا۔'' اس کا جملہ بیچ سے اچک کر وہ چلایا تھا۔

''ظالم، بے رحم انسان۔'' اپنا آپ پرے دھکیلتے وہ اس سے دور ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

''بکواس کرتی ہے۔'' اس کا ہاتھ یوں گالوں کو چھوتا آگ لگا گیا تھا کہ اس آگ میں سب جل گیا۔ وہ بھی اور اس کا رشتہ بھی۔

''شافی..... پاگل ہو گئے ہو کیا؟'' نجانے وہ

کہاں سے بیچ میں آ گیا تھا۔اس نے شافی کو جب تک دور کیا، اس کا ہاتھ اٹھ چکا تھا۔

''تم کون ہوتے ہو ہمارے گھر کے معاملات میں بولنے والے؟'' شافی نے اسے اتنے زور کا دھکا دیا جس کی وہ توقع نہیں کر رہا تھا اسی لیے لڑکھڑا کر صوفے سے ٹکرایا۔

''یہ ہے تیری تعلیم جو عورت پہ ہاتھ اٹھاتی ہے۔ یہ کون سی ڈگری ہے جو مظلوم پہ انتہا کر دینا چاہتی ہے۔کون سی پڑھائی ہے جو یہ سب سکھاتی ہے کہ انسان کو انسان نہ سمجھا جائے بلکہ زمین پہ رینگتا ایک کیڑا یا اس سے بھی بدتر کہ بھلے وہ پیروں میں مسلا جائے، مر جائے، کہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ جیسے اس پہ تھوکرتا تنفر سے سر جھٹک کر عابدہ کی جانب دیکھنے لگا۔

''ماؤں کے گہوارے ہی نسل کی تربیت کے ضامن ہوتے ہیں۔ جو ایسی نسل پروان چڑھائے اس گہوارے کو جہاں والے شک کا چشمہ لگا کر دیکھتے ہیں۔'' زکریا کی ایسی زبان وہ پہلی بار سن رہی تھیں۔

''میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون سا جذبہ ہے، ایسا کون سا رشتہ ہے، وہ ہمدردی کیا ہے جس نے ایک بے زبان کو زبان تھما دی ہے۔ یہ ایک عورت؟ جو تمہارے لیے نامحرم ہے لیکن اس کے لیے اپنوں سے لڑا جا رہا ہے۔'' شافی شک کا زہر اگل رہا تھا۔ زکریا کا دماغ الٹ جانے کو تھا۔ کیسے موقع پہ وہ اپنا پن جتا کر شک کے کوڑے برسا رہا تھا۔

''اور میں بہت اعزاز سمجھتا ہوں یہ بتانے میں کہ وہ ایک رشتہ انسانیت کا ہے جسے حیوان اور شیطان نہیں سمجھ سکتے۔''

شافی کے لیے یہ جملہ تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا تھا۔ اپنی انا کو وہ سب سے مقدم جانتا تھا۔ خود پہ بری طرح فدا اپنی شان میں ایک گنوار کی ایسی توہین وہ کبھی ایک عورت کے لیے، وہ بھی اس عورت کے لیے جو اس کی ہی بیوی تھی، قطعاً برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

''تو پھر اس انسان کو انسانوں کی دنیا میں لے جاؤ کیونکہ میں اسے آزاد کرتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں میں اسے۔''

سفید مجسمہ سی بنی ارفع وہیں ڈھے گئی۔ زکریا نے پتھرائی نظروں سے باری باری سب کو دیکھا۔ وہ اتنی ہمت بھی نہیں کر پایا کہ زمین پہ ریزہ ریزہ بکھری ارفع کو اٹھا کر سمیٹ لیتا۔

عابدہ کا وجود ہنوز ساکت تھا۔ شافی اس پہ تھوک کر جا چکا تھا۔ ارفع زمین پہ مڑی تڑی سی پڑی تھی۔ زکریا ڈھیروں تاسف سمیٹ کر جا چکا تھا۔

وہ گھر جو اس کا کبھی تھا ہی نہیں، وہ گھر ٹوٹ چکا تھا۔ ایک جھٹکے میں تمام ہو چکا تھا۔

☆☆☆

''عورت مرد کے غصے کو ہوا دے کر نقصان اپنا ہی کرتی ہے۔''

''نہ وہ غصے میں تھا اور نہ ہی کوئی نقصان کر کے میں یہاں آئی ہوں۔''

امی نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس کا جھوٹ بے لباس ہو گیا ہو اور وہ شرمسار ہی اسے ڈھانپنے کی کوشش میں مزید برہنہ ہوتی جا رہی ہو۔

اس نے امی کی حالت کے پیش نظر انھیں بس اتنا کہہ دیا تھا کہ وہ ان کے پاس چند دن رہنے آئی ہے۔ چند دن اسے یہ جھوٹ نباہنا تھا۔ چند دن ہی وہ یہ جھوٹ بولتے رہنا چاہتی تھی، پھر کبھی نہ کبھی تو سب خود کھل ہی جانا تھا۔ طلاق کیا معمولی بات تھی جسے وہ چھپا لیتی۔ اور یہ سب بہت جلد کھل گیا جب دو دن بعد عابدہ اسے لینے آ گئیں۔ ارفع نہیں چاہتی تھی کہ سب امی کے سامنے کہا سنا جائے لیکن امی وہیں موجود تھیں۔

''تمہیں وہاں سے یوں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ایک طلاق سے کوئی طلاق نہیں ہو جاتی۔ ایک طلاق پہ عورت کو شوہر کے گھر ہی رہنا ہوتا ہے تاکہ اس کا دل موم ہو، وہ اس کی جانب مائل ہو، اس سے رجوع کر سکے، دوبارہ سے سب پہلے سا کر سکے۔'' امی یوں ان

دونوں کو دیکھنے لگیں جیسے وہ کسی پاگل کدے سے بھاگے ہوں اور یہاں آکر چھپ بیٹھے ہوں۔ وہ کس طلاق کی بات کررہی تھیں اور کیوں کررہی تھیں۔

''لوہے کو پگھلا کر موم کیا جاسکتا ہوگا۔ پتھر کبھی نہ پگھلا ہے نہ موم ہوا ہے۔ وہ محض ٹوٹتا ہے اور شافی ولایت خان شاید ہی کبھی ٹوٹے۔ وہ بس توڑنا جانتا ہے۔ اور وہ پہلے سا کیا کرے گا۔ پہلے کون سا سب بہت اچھا تھا جواب وہ اچھا کردے گا۔''

''عورت کا اصلی گھر اس کے شوہر کا گھر ہوتا ہے۔'' آنٹی کی وہی رسمی باتیں۔

''جب شوہر عورت کا نہ ہو تو اس نے در و دیوار کو چاٹنا ہے کیا۔''

''میں اسے سمجھاؤں گی۔ وہ سمجھ جائے گا۔''

''جو کام پہلے کبھی نہیں ہوا، وہ اب ہوگا؟'' وہ طنزیہ یوں مسکرائی جیسے اس بات پہ داد دینا تو بنتا تھا۔

''سمجھا چکیں آپ اور سمجھ چکا وہ۔'' اٹھ کر وہ اندر چلی گئی تھی۔

عابدہ نے امی کی اس سلسلے میں کیا ذہن سازی کی تھی کہ وہ اسی بات کو پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں کہ وہ واپس جائے، اپنا گھر بچالے، ابھی گنجائش باقی ہے اور اسی گنجائش سے فائدہ اٹھالے۔

''گھر بچالوں اور خود کو تباہ کردوں۔''

''مرد کی انا کو للکارنا نہیں چاہیے۔'' امی ہمیشہ مرد کی انا کا پرچم اٹھائے رکھتی تھیں۔ وہ اس سوچ سے نہ کبھی پیچھے ہٹی تھیں نہ ہٹنا چاہتی تھیں۔

''مانا کہ عورت کی انا نہیں ہونی چاہیے لیکن عزت تو ہونی چاہیے۔ ضد اور ہٹ دھرمی بری شے ہے لیکن حق مانگنا ہر کسی کا حق ہے۔ قربانی کا جذبہ ہونا چاہیے مگر وہاں جہاں قدر دان ہو۔ جھکنا بہت اچھا ہے لیکن ٹوٹنا نہیں۔ حکم ماننا عورت پہ لازم ہے لیکن ظلم سہنا خود پہ ظلم ہے۔''

''یہ سب کتابی باتیں ہیں، کتابوں میں اچھی لگتی ہیں۔''

''انھی باتوں کا زندگی میں ہونا بھی ضروری ہے تاکہ زندگی بھی اچھی لگے۔''

''عورت کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہوتی اگر مرد کا سایہ چھن جائے۔''

''مرد سایہ بھی تو بنے، وہ تو کڑی دھوپ بنا جلا رہا تھا۔''

''اتنا پڑھا لکھا سمجھ دار تھا وہ۔'' وہ ناسمجھی سے اب خود سے کہنے لگیں۔

''پڑھا لکھا سمجھ دار جاہل کہیں۔''

''ارفع۔'' امی نے سر تھام لیا۔

''امی جو بات آپ نہیں سمجھ رہیں وہ یہ ہے کہ وہ اعلا تعلیم یافتہ تھا لیکن اعلا تربیت یافتہ نہیں۔ وہ بہت زبردست ڈگریاں لے چکا ہے لیکن ایک بھی انسانی خوبی نہیں رکھتا۔ میرے گھر کو میری ڈگریاں نہیں اس کی ڈگریاں نگل گئیں۔''

وہ کھل کر رو دی تھی۔ کب تک مضبوط بنی رہتی۔ اتنی مضبوط تو وہ کبھی پہلے بھی نہیں تھی اور اب تو وہ بہت کمزور ہوچکی تھی۔

''میں کہتی تھی نا امی کہ پڑھا لکھا مت تلاش کریں، مہذب تلاش کریں۔ انسانوں کے اس مجمعے میں ایک انسان تلاش کریں۔ جس کی آنکھ میں عورت کی تکریم اور دل میں اس کے لیے محبت ہو۔ جو منہ بنا بنا کر بات کرنا نہ جانتا ہو لیکن ایسے بات کرتا ہو کہ اگلے کا منہ نہ بنے۔ اس کی ذات میں غرور نہ ہو بلکہ وہ دوسرے کا غرور بن سکے۔ آپ نے میری ایک نہیں سنی امی۔ اور اب بھی آپ میری ایک نہیں سن رہیں۔ تب میں نے آپ کی مانی تھی اب آپ میری مانیں گی۔ آپ کی فرماں برداری میں، میں نے اس شخص سے شادی کی تھی اب میری محبت میں آپ مجھے واپس جانے پہ مجبور مت کریں۔''

امی بالکل خاموش ہوگئی تھیں۔

وہ واپس نہیں گئی تھی۔ عابدہ کئی بار اسے منانے آئیں اور شافی ایک بار بھی نہ آیا۔ یوں اس کی معیادِ عدت تمام ہوئی اور وہ ماں کے گھر ہی بیٹھی رہی۔ طلاق رجعی میں اس نے رجوع کرنا خود پہ حرام کردیا

کیونکہ وہ شخص اسے اس قابل نہیں لگا تھا۔
پہلے سے کہیں زیادہ خاموش ہو چکی تھی۔ کوئی دلچسپی اسے دلچسپ نہیں لگتی تھی۔ زندگی جمود کا شکار ہو چلی تھی۔ وہ اسے متحرک کرنا چاہتی تھی۔ اس کی کلاس فیلوز ایم فل کر رہی تھیں۔ اس نے بھی ایڈمیشن لے لیا۔ اس بار امی نے کوئی دلیل نہ گھڑی نہ اسے روکا۔ گھر بیٹھ کر گم صم رہنے سے بہتر مصروف رہنا تھا۔ یوں بھی اپنی وہ کر چکی تھیں اب اسے اپنی کرنے دینا چاہتی تھیں۔
''تمہارے لیے ایک رشتہ آیا ہے۔'' وہ یونیورسٹی سے لوٹی تھی جب امی نے اسے بتایا۔ اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی اس سلسلے کو دوبارہ سے شروع کرنے میں۔ وہ چپ چاپ کھانا کھاتی رہی۔
''پوچھو گی نہیں کون؟''
''آپ جیسے بتائے بنا رہ لیں گی۔''
''شافی کا کزن ہے۔ زکریا۔'' جتنا کھایا تھا سارا اگل دیا۔ پانی کے کئی گلاس وہ اندر لے گئی لیکن اسے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔
''میں نے منع کر دیا۔ جب ایک ایسا تھا تو دوسرا کیسا ہوگا، ہے تو ایک ہی خون نا۔ لیکن وہ کہنے لگا کہ کہیں اس رشتے کے خاتمے میں اس کا نام بھی درج ہے اسی لیے وہ نیا رشتہ جوڑنا چاہتا ہے۔'' امی نے گردن موڑ کر دیکھا تو وہ کمرے سے جا چکی تھی۔
''آپ اسے ہاں کہہ دیں۔'' اگلی صبح یونیورسٹی جانے سے پہلے اس نے امی سے کہا جو اس کی شکل دیکھتی رہ گئیں۔
''اور اس سے کوئی حساب کتاب نہ لیجیے گا۔ کتنا پڑھا ہے، گھر والے کہاں ہیں، کتنا کماتا ہے۔ میرے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ جاہل نہیں ہے۔''
امی اس رشتے کے حق میں بالکل نہیں تھیں لیکن نجانے کیوں وہ خاموش رہیں۔ ٹھیک ہے اب وہ اپنی مرضی پہ آئی ہوئی تھی تو کر لیتی اپنی مرضی۔ ایک تجربہ اس نے ماں کی خاطر کیا، ناکام رہا۔ اب نیا تجربہ چاہے کامیاب ہوتا یا ناکام وہ اپنے لیے کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنا آبائی گھر کرایے پہ دے کر اپنی کمائی سے الگ گھر لے چکا تھا جہاں وہ شادی کر کے اسے رخصت کروا کر لایا تھا۔ شافی کے ہمسائے کے طور پہ اسے اسی گھر میں محض اس لیے رکھنا کہ وہ ابا اماں کا گھر تھا اس کے ساتھ زیادتی ہوتی اور وہ بیوی کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتا تھا۔
''بیوی مرد کی ذات کا قیمتی پہلو ہوتی ہے۔''
اسے کہاں بسانا چاہیے وہ بخوبی جانتا تھا۔ دل میں، ڈھیر ساری محبت اور زیادہ سارے احترام کے ساتھ۔
شافی ایک کڑی تھا، اصل تک پہنچنے کی کمزور کڑی اسی لیے وہ ٹوٹ گئی۔ جس اصل کڑی سے اسے جڑنا تھا وہ بہت مضبوط تھی۔
''ایم فل مکمل ہو جائے تو زکریا مجھے چائنا بھیجیں گے پی ایچ ڈی کے لیے۔'' وہ خوش خوش امی کو بتا رہی تھی۔ امی بے یقین تھیں مگر اس کی خوشی میں بہت خوش۔
''انھوں نے یہ گھر بھی میرے نام کر دیا ہے کہ لوگ کہتے ہیں عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ اب یہ میرا گھر ہے اور میں اس پہ راج کرنے کے لیے بنائی گئی ہوں۔''
امی نے اس کا پرنور اور چمکتا چہرہ دیکھا اور نگاہیں موڑ لیں۔ کبھی کبھی ماں کی نظر بھی بری طرح لگتی ہے۔
''میں یہ کبھی نہیں پوچھوں گی کہ تم خوش ہو کہ نہیں۔ کیونکہ وہ تو تم ہو۔ بس یہ اعتراف کروں گی کہ تم ٹھیک کہتی تھیں کبھی کبھی پڑھے لکھے مرد بھی عورت کو جوتی بنا کر رکھتے ہیں اور کم پڑھے لکھے گھر کی رانی..... آج عین الیقین آ گیا۔'' اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے وہ مطمئن ہو گئی تھیں۔

☆☆

فوزیہ احسان رانا

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں

بہار موسم دستک دے رہا تھا۔ تا حد نظر جیسے کسی نے سبز چادر سی بچھا دی تھی کھیتوں میں ہریالی ہی ہریالی اپنی چھب دکھاتی نگاہوں کو تراوٹ بخش رہی تھی۔ ایسی صناعی پر اس کا دل اللہ کی قدرت پر سجدہ ریز ہو رہا تھا۔ درختوں پر نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں ہر چیز تر و تازہ سی ہو گئی تھی۔ خزاں کا موسم ساری اداسی اپنے ساتھ سمیٹ لے گیا تھا۔

زونی کا دل بلیوں اچھلنے لگا وہ اس موسم کی دیوانی تھی۔ وہ تانگے میں بیٹھی تھی، نوشی اور رامین اس کے ساتھ تھیں شہر کے کالج میں جایا کرتی تھیں اور تانگے میں بیٹھے ہوئے دنیا جہان کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ مگر آج تو وہ مبہوت سی سڑک کے اردگرد پھیلے کھیتوں کو دیکھے جا رہی تھیں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ان کی زلفوں سے کھیل رہے تھے۔ زونی نے لمبی سی سانس لی خوش گواریت اس کے چاند جیسے چہرے پر صاف نظر آ رہی تھی۔

تانگا ایک جھٹکے سے رکا۔ زونی کے خوش کن خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اس نے ایسے کوچوان کو دیکھا جیسے نیند سے جاگی ہو۔ تبھی زونی نے راجو بھائی کو تانگے میں سوار ہوتے دیکھا۔ اسے تانگا رکنے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ راجو اپنی کتابیں گود میں دھرے اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا اور کن انکھیوں سے وہ پیچھے مڑ کے دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات سے زونی کچھ اخذ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

راجو اسی گاؤں کا ہی رہنے والا تھا مگر وہ گاؤں کی حدود شروع ہونے سے پہلے ہی تانگے سے اتر گیا۔ اس کے پیش نظر ان لڑکیوں کی عزت تھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو کوئی شک ہو اور ان پر زندگی کا گھیرا تنگ کر دیا جائے۔ کوئی ان پر انگلی اٹھائے اور ان بے چاریوں کی درگت بن جائے۔ یہ اس کے اپنے من کا چور ہی تھا جو اسے ایسی ویسی باتیں سوچنے پر اکسا رہا تھا ورنہ اس گاؤں میں سب لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ کھیل کر جوان ہوئے تھے۔ کسی کو کسی سے بات کرنے کے لیے ڈرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سب ایک دوسرے کے گھر بغیر دستک ہی گھس جایا کرتے تھے۔ پورا گاؤں ایک دوسرے کے دکھ سکھ کا ساجھی تھا۔ بس راجو کا دل بدل گیا تھا جو دھڑک دھڑک کر اسے بے حال کر رہا تھا اور وہ عجیب کشمکش و پیچ میں خود کو گھرا محسوس کر رہا تھا دل تھا کہ قابو میں نہیں آ رہا تھا اس دشمن جاں کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب کرتا تھا۔

راجو سڑک کنارے چل رہا تھا اور وہ چہرہ موڑ کر اسے دیکھے جا رہی تھی اس بات سے بے خبر کہ زونی اس کی اس بے خودی کو کب سے نوٹ کر رہی ہے۔ زونی نے ایک ٹھوکا اسے دیا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی ٹکٹکی باندھے یوں وارفتگی سے تکے جا رہی تھی جیسے راجو کا چہرہ آنکھوں میں سمو لینا چاہتی ہو۔ زونی کو اس کی اس قدر بے خبری پر جی بھر کر تاؤ آیا اور اس نے کس کے کہنی اس کی پسلیوں میں گھونپ دی۔ وہ بلبلا کر رہ گئی اور پسلی پر زور سے ہاتھ دھرے وہ استفہامیہ زونی کو دیکھنے لگی۔

"آنکھیں بند کر ورنہ دیدے پھٹ جائیں

گے۔'' زونی نے اس کی حیرت سے پھیلی آنکھوں کو دیکھ کر ڈپٹا۔

''کیا ہوا ہے۔'' اس کی لاعلمی عروج پر تھی

''واہ! یہ بھی اب مجھے بتانا پڑے گا کہ کیا ہوا ہے بلکہ کیا ہو چکا ہے مس معصوم۔'' اس کے لہجے میں شرارت کے ساتھ طنز کی آمیزش بھی شامل تھی

''بتا..... راجو کے ساتھ کیا چل رہا ہے۔''

زونی کی بات پر وہ بدحواس ہو کر بوکھلائی کوئی جواب نہیں دے سکی اس کا سر آپ آپ جھک گیا۔ اس کی پلکیں لرز رہی تھیں۔ اس کی لرزتی پلکوں نے سارے رازعیاں کر دیے ہونٹ کے بالائی حصے پر نمی سی پھیل گئی تھی اس کے چہرے پر پھیلتی دھنک رنگوں کی بارش نے کچھ چھپنے دیا بھی نہیں تھا زونی کو بھی سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

زونی نے ایک زور کی چٹکی نوشی کو بھری تو وہ خود میں ہی سمٹنے لگی۔ نوشی شرماتے ہوئے کتنی پیاری لگ

رہی تھی کیسا انوکھا سا روپ تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل نوشی کے سر پر ماری۔

''آرام سکون سے بیٹھو ورنہ گھر میں شکایت کر دوں گا۔''

کوچوان دینو نے دھمکایا تو وہ لبوں پر ہاتھ رکھے بے ساختہ امڈتی ہنسی کو روکنے کی کوشش کرنے لگیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں کو سختی سے لبوں پر جما رکھا تھا اور وہ اب آنکھوں سے باتیں کر رہی تھیں۔ چاچا تانگے والا تو بڑا ہی سخت طبیعت تھا۔ ذرا سا ہنس لو فوراً غصہ ہو جاتا تھا اور دھمکی دینے لگتا کہ گھر شکایت کر دوں گا مگر وہ تھیں کہ کسی بات کو خاطر میں ہی نہیں لاتی تھیں۔

اب بھی جیسے ہی تانگے والا ان کو اتار کے واپس لوٹا ان کے منہ سے جبراً روکی ہوئی ہنسی کا فوارا سا ابلا اور وہ پھر کھل کھل کرتے ہوئے ہنستی چلی گئیں۔

کم عمری بے فکری کے دن۔ اولین نوجوانی میں ایسے ہی ہنسی آتی ہے بات بے بات ہنسنے کو دل کرتا ہے۔ ان باتوں پر بھی ہنسی چھوٹ جاتی ہے جن پر ہنسنے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ سرمستی کا کوئی رنگ نہیں ہوتا کوئی روپ نہیں ہوتا مگر یہ مستی جوانی پر چھاتی ہے تو رنگین کر دیتی ہے۔ رنگ روپ نکھرنے لگتے ہیں جوبن آتا ہے تو کھیتوں میں کوئل کی کوک بھی بہت مدھ بھری اور سریلی لگتی ہے دلوں میں ولولہ جوش اور ارمان جگاتی ہوئی باد صبا سی لڑکیاں آنکھوں میں کاجل لگا کر سپنے سجاتی ہیں اور اپنے محبوب کا انتظار کرتی ہیں۔

☆☆☆

زونی چھوٹے سے برآمدے میں بیٹھی اپنا ہوم ورک کر رہی تھی۔ سارا دن ٹھنڈی ہوا چلتی رہی تھی۔ ہوا کے ساتھ گرد و غبار سے صحن اٹا پڑا تھا۔ ثانیہ نے آج واشنگ مشین لگائی ہوئی تھی اور عمارہ اپنے میکے گئی ہوئی تھی اس لیے کام کافی بڑھ گیا تھا۔ وہ ایک دن کے لیے گئی تھی مگر عمارہ کے خاندان میں کوئی فوتگی ہوگئی تھی اس لیے یاور اور اماں عمارہ کے پیچھے اس کے میکے فوتگی پر چلے گئے تھے۔ پیچھے زونی اور ثانیہ رہ گئے تھے۔

ثانیہ نے مشین سے کپڑے نکال کر صاف پانی سے دھویا اور بالٹی میں نچوڑ کے رکھا۔ بالٹی اٹھا کے چھت پر جانے لگی تو زونی جلدی سے اٹھی اور ثانیہ کے ہاتھ سے بالٹی لے کر اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتی چھت کی طرف جانے لگی۔

''ارے سنبھل کے بیٹا۔ کیا جلدی ہے آہستہ چلا کرو۔'' ثانیہ نے ٹوکا زونی مسکرائی اور چھت پر جا کر کپڑے جھاڑ جھاڑ کر تار پر پھیلانے لگی۔ کپڑے پھیلانے کے بعد نیچے آنے لگی تو اسے راجو نے پکارا۔

''اے زونی..... رکو نا۔'' وہ اپنی چھت پر کھڑا زونی کی چھت کی منڈیر پر اپنے بازو رکھے جھکا ہوا تھا۔

''جی راجو بھائی!'' زونی اس کی جانب آئی۔

''ایک بات کرنی تھی بہنا۔'' وہ ذرا رکا۔

''ہوں۔ بولو۔'' زونی نے اپنی ساری توجہ راجو کی طرف کی۔

''وہ زونی..... وہ نوشی..... وہ نوشی مجھے بہت اچھی لگتی ہے.....'' اس نے ہکلا کے توڑ توڑ کے جملہ مکمل کیا۔

''تو؟ میں کیا کروں۔'' زونی رخ موڑ گئی اس نے جان بوجھ کے تیور بدلے تھے۔

''تم اس کی دوست ہو تو پلیز ہم ہماری ایک ملاقات کروا دو نا۔'' وہ منت بھرے لہجے میں گھگھیایا۔

''تم کو میں ملاقاتیں کروانے والی لگتی ہوں کیا راجو بھائی!'' وہ بگڑی۔

''نہیں۔ میرا یہ مطلب تھوڑی نا ہے۔''

''اور کیا مطلب ہے؟'' زونی نے تیکھے چتونوں نے اسے گھورا۔

''میرا دل کہتا ہے کہ نوشی بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔''

''ایسے ہی خوش فہمی ہے تمہاری۔ کہاں نوشی

جیسی پیاری لڑکی اور کہاں تم کالا کلوٹا نا ہو تو.....''
آخری جملہ زونی نے منہ ہی منہ میں بدبدایا
''مجھے کچھ کہا'' راجو نے زونی کے تیور بھانپ لیے تھے کہ اس نے کچھ کہا ہے اور برا بھلا ہی کہا ہے مگر راجو کے پلے ایک لفظ بھی نہیں پڑا تھا
''پھر.....؟'' راجو کی آنکھوں میں آس کے جگنو جگمگائے۔
''مجھ سے کوئی اچھی امید مت رکھو۔ اتنی اچھی نہیں ہوں میں۔ ٹھیک ہے نا'' زونی جانے کے لیے آگے بڑھی اور پھر کچھ سوچ کر وہ مڑی۔
''راجو بھائی ایک بات کہوں یہ ملنے ملانے والا خیال دل سے نکال دیں۔''
''ایسا نہیں کر سکتا نا'' راجو کی بے بسی دیدنی تھی۔
''روز تو تم نوشی کو دیکھتے ہو۔''
''وہ دیکھنا بھی کوئی دیکھنا ہوتا۔ بس ایک جھلک سے دل کہاں سیراب ہوتا ہے دل کرتا ہے۔''
اس سے پہلے کہ وہ بے تاب دل کی حکایتیں شروع کرتا زونی نے ہاتھ اٹھا کر اسے وہیں چپ ہو جانے کا کہہ دیا۔ وہ بھی وہیں ایسے چپ ہوا جیسے بجلی کا سوئچ آف ہوتا ہے۔
''لگتا ہے آج کل بڑی رومانوی مووِیز دیکھنا شروع کر رکھی ہیں جو اتنے ڈائیلاگ مار رہے ہو۔''
زونی نگاہیں ادھر ادھر گھماتے ہوئے راجو کو تنگ کر رہی تھی۔ راجو کے چہرے کے پل پل بدلتے رنگ کتنے نئے تھے۔
''نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بس نوشی کا صبیح چہرہ تب بھی تصور میں سجتا ہے دل بے قرار ہو جاتا ہے۔'' اس کے چہرے پر محبت کے دھنک رنگ بکھرے تھے۔
زونی نے پہلی بار پوری توجہ سے راجو کو دیکھا۔ راجو کا چہرہ اس کے اندرونی جذبات کی پوری طرح عکاسی کر رہا تھا۔
''تو تم نوشی کو کتنا دیکھنا چاہتے ہو۔'' زونی نے نچلا ہونٹ لبوں تلے بھینچ کر ''کتنا'' لفظ کو کھینچ کر پوچھا۔
''جتنا بھی دیکھوں کا من کہاں بھرے گا۔ تشنگی تو کم ہوگی ہی نہیں۔ بس کچھ تو بے چین آنکھوں کو راحت ملے گی۔''
''ملنا اسی لیے چاہتے ہو کہ جی بھر کر دیدار کر سکیں؟''
''ہاں۔ پلیز۔ میری بہن ہو نا۔ میری مدد کرو۔'' وہ لجاجت سے بولا۔
''تم ایک کام کرو آسان طریقہ بتاتی ہوں۔'' زونی نے تجسس پھیلایا۔
''ہاں۔ ہاں.....'' وہ مرنے والا ہو رہا تھا۔
''سیدھے سیدھے نوشی کے گھر رشتہ دو۔ شادی کر کے اسے اپنی دلہن بنا کر اپنے گھر لے آؤ۔ رائٹ۔'' وہ کہہ رہی تھی راجو سن رہا تھا
''مگر ابھی شادی کی عمر نہیں ہے نا۔''
''اور محبت کی عمر ہے؟'' زونی نے اس کی آنکھوں میں غصے سے جھانکا۔ راجو سٹپٹایا۔
''خود ہی ہو گئی ہے محبت۔'' راجو نے اتنے جذب سے کہا کہ ایک لمحے کے لیے زونی کا دل بھی پسیج سا گیا۔
''اچھا ٹھیک ہے۔ کچھ کرتی ہوں مگر یاد رکھنا میرا احسان۔'' اس نے جتلایا۔
''ساری زندگی یاد رکھوں گا'' راجو ممنونیت سے سر جھکا کر بولا۔
''پکڑے جانے کی صورت میں پتا بھی ہے۔ سب سے زیادہ درگت کس کی بنتی ہے۔ جو پیغام رسانی کرتا ہے مطلب کبوتر کی۔ اس کو عرف عام میں قاصد بھی کہتے ہیں۔ محبت کرنے والے جب پھنس جاتے ہیں سب سے پہلے بیچ کا بندہ ڈھونڈا جاتا ہے۔'' وہ پتا نہیں راجو کو ڈرا رہی تھی یا خود کو باور کروا رہی تھی۔
''کیسی باتیں کر رہی ہو۔ ابھی ہم ملے بھی نہیں اور تم ہو کہ کیا بے کار کی باتیں کرنا شروع ہو گئی ہو۔'' وہ بے زار سا ہو کر سر جھٹکنے لگا۔
''اتنے برے برے منہ بنانے کی ضرورت نہیں۔ پہلے ہی کوئی اتنے خاص نہیں ہو۔'' زونی لگی

لپٹی بغیر کہہ گئی تھی راجو بس دانت کچکچا کر رہ گیا اس کا نوشی کے ساتھ ملنا اس کے پاگل دل کی پکار تھا اور اس کام کے لیے زونی سے زیادہ کوئی کارآمد نہیں ہوسکتا تھا اس لیے وہ مجبور تھا چاہے وہ جتنی بھی کڑوی کسیلی سناتی۔ جتنا بھی زچ کرتی۔

''کچھ کرو نا۔ کوئی راہ نکالو۔ پلیز میری بہن ہونا۔''

''اچھا ٹھیک ہے کچھ دن تک بابا غلام سائیں کا میلا لگنے والا ہے نا اس میں چونکہ بہت رش ہوتا ہے اس لیے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی اور آپ نوشی سے مل لیجیے گا مگر صرف چند لمحے کے لیے۔ ٹھیک ہے نا'' زونی نے پوچھا تو راجو خوش ہوگیا اور زونی کا شکریہ ادا کرتا چلا گیا اور زونی بھی اس کی باتوں پر مسکراتی چھت سے نیچے چلی گئی۔

☆☆☆

زونی نے لوٹے میں پانی بھرا اور کچے صحن میں چھڑکاؤ کرنے لگی۔ سارے کچے صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کر کے زونی نے جھاڑو اٹھالی۔ کچے صحن سے کچی مٹی کی سوندھی سوندھی سی خوشبو اٹھ رہی تھی، پورا صحن اس خوشبو سے مہک رہا تھا۔ زونی نے لمبا سانس لے کر مزا لیا اور صحن میں جھاڑو لگانے لگی۔ گندے سندے سے شاپرز بھی ہوا اپنے ساتھ سمیٹ لائی تھی جو صحن میں ادھر ادھر اڑتے پھر رہے تھے۔ تبھی یاور چاچو کی بائیک کی آواز گلی میں آئی۔

''امی جی۔ چاچو آگئے۔'' زونی نے وہیں سے ہانک لگائی تو ثانیہ کپڑے استری کرنا بند کر کے صحن میں نکلی۔ تب تک یاور اور اماں دروازے سے اندر آچکے تھے۔ ثانیہ نے اماں کو سلام کیا اماں نے حسب عادت برا سا منہ بنا کے حقارت سے ثانیہ کو دیکھا اور ثانیہ نے پھرتی سے چارپائی صحن میں بچھائی تاکہ اماں کو کچھ لمحے بھی کھڑا نہ ہونا پڑے۔ اماں پورے طمطراق سے چارپائی پر بیٹھ گئیں ثانیہ نے ان کے پیروں میں کھیس بچھایا اور سر کی جانب تکیہ رکھا اماں کا تنتنا نجانے کیا اور رنگ دکھانے والا تھا۔

''پڑھی لکھی میڈم جی۔ ذرا پانی بھی پلا دو۔''

ثانیہ کی اتنی تابعداری پر بھی اماں نے کوئی گلہ ڈھونڈ ہی لیا تھا۔ یاور کو برا لگا تھا اور جھاڑو لگاتی زونی نے بھی دکھ سے دادی کو دیکھا اور جھاڑو کو صحن میں زور سے پٹخا تھا۔ بہت مشکل لمحات ہوتے ہیں کسی بھی بیٹی کے لیے۔ جب اس کی آنکھوں کے سامنے دن رات اس کی ماں کو بے عزت کیا جاتا ہے۔ درد ہوتا ہے تو کبھی آنکھوں سے بہتا ہے کبھی دل میں کہیں رک جاتا ہے

''اماں کیا ہوگیا ہے بھابھی کے دو ہاتھ ہی ہیں کوئی چار ہاتھ تو نہیں ہیں۔'' یاور نے کہا تو اماں نے اس کو گھور کر دیکھا۔

''اس کو بہت ہاتھ دکھانا آتا ہے اور اس پڑھی لکھی بہو کے ہاتھ لمبے بھی بہت ہیں۔ کیا تمہیں نہیں پتا اس کے لیے میرا بیٹا میرے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔'' اماں نے یاور کو دیکھا یاور نے اکتاہٹ سے سر جھٹکا ثانیہ کا جگ سے گلاس میں پانی انڈیلتا ہاتھ لرزا تو پانی چھلک گیا۔

''اماں اتنے سالوں کی بات دل میں لیے بیٹھی ہیں، بھول جائیں اب۔ دیکھیں تو بھابھی کتنی اچھی ہیں۔'' یاور ہمیشہ ثانیہ کی حمایت میں بولتا تھا۔ وہ سچ کا ساتھ دینے والوں میں سے تھا بلاوجہ کی کدورتیں پالنا اسے پسند نہیں تھا۔

''اپنے آذر کے لیے میں نے ایسی بہو کا خواب کب دیکھا تھا۔'' ثانیہ کے چہرے پر ایک تاریک سا سایہ آ کے گزر گیا۔

''پھر کیسی بہو کا خواب دیکھا تھا۔'' یاور نے جان بوجھ کر کہا۔

''ایسی سڑی ہوئی شکل کا تو بالکل بھی نہیں۔'' اماں نے نخوت سے ناک سکوڑ کر کہا۔

''کوئی ماورائی مخلوق ہوگی پھر۔''

''یہ کوئی حور پری ہوتی ہے کیا؟'' ان کے پلے کچھ نہیں پڑا تو یہ سمجھ لیا۔

''ہاں ہاں اماں۔ آسمان پر جو چمکتا ہے نہ اس چاند کے جیسی ہوتی ہے۔''

''ہاں۔ ایسی ہی تو چاہیے تھی۔ لمبی ہو گوری ہو اور امیر گھر کی ہو۔ آگے آگے دلہن آتی پیچھے پیچھے جہیز کے سامان سے لدا پھندا ٹرک میرے دروازے پر آ کر رکتا۔''

''تو اماں پھر کیا ہوتا۔''

''شریکوں میں میرا سر فخر سے اونچا ہو جاتا۔ سب دلہن دیکھتے تو دیکھتے ہی رہ جاتے۔ اس کے حسن سے سب کی آنکھیں چندھیا جاتیں اور مہینوں اس سامان کا ذکر پورے گاؤں میں ہر زبان پر ہوتا۔ شریک جل جل کر مرتے میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جاتی۔'' اماں کو ہمیشہ یہی قلق تھا اور وہ بے دریغ اس بات کا اظہار کرتی رہتی تھیں۔

''بس کریں اماں۔ چھوڑیں یہ سب باتیں۔ مل تو گئی آپ کو اپنی پسند کی بہو۔'' یاور نے شرارت سے کہا اس کا اشارہ اپنی بیوی عمارہ کی طرف تھا۔ اماں نے ماتھے پر گھوریاں ڈال کر دیکھا۔

''کہاں ملی۔ میرے خواب تو مٹی ہو گئے۔'' وہ ایسی آہیں بھر رہی تھیں جیسے ان کے جیسا کوئی دکھی تو اس کرہ ارض پر کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔

''عمارہ بہت حسین بھی ہے اماں اور ٹرک بھر کر سامان بھی ساتھ لائی ہے۔'' یاور ہلکے پھلکے انداز میں جتلا گیا۔

''بس بھول گئی جو میں نے عمارہ کے ابا سے اس کا رشتہ مانگ لیا۔ اس کی تیزی طراری مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ پہلے پتا ہوتا نا کہ وہ اتنی زبان دراز ہے تو کبھی ایسی غلطی نہیں کرتی۔'' وہ تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے ایسے کہہ رہی تھیں جیسے یہ حادثہ ابھی ابھی ہوا ہو۔

''بس اماں انسان کسی حال میں بھی خوش نہیں رہتا۔ کفران نعمت کرتا رہتا ہے۔'' یاور کیا کہتا جتنا بھی کہتا پھر بھی کتنا کہہ سکتا تھا۔ مقابل ماں تھی ماں سے مقابلہ بدتمیزی کے زمرے میں آتا ہے اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بعض دفعہ چپ سادھنا پڑتی تھی۔

زونی نے کوڑا کرکٹ سمیٹا اپنے ہاتھوں کی پشت سے اپنی آنسو بھری آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے خوب رگڑا۔ اسے کسی کے سامنے رونے کی عادت نہیں تھی۔ زونی غسل خانے میں گھس گئی۔ خوب رگڑ رگڑ کر منہ دھویا اور باہر نکلی اب اماں اکیلی ہی صحن میں بیٹھی تھیں۔

''سلام دادی۔'' زونی نے بے دلی سے سلام کیا۔

''بڑی مصروف ہو تم تو۔ سلام کرنے اتنی دیر بعد آئی ہو۔'' وہی مخصوص طنزیہ انداز۔

''کام کر رہی تھی۔'' زونی نے بات سمیٹی

''ہاں بھئی۔ سارے کام تو تمہیں کرنی ہو۔'' وہ طنز کرنے سے باز نہیں آتی تھیں۔

''ظاہر ہے گھر میں کوئی نوکر چاکر تو ہیں نہیں۔ کام تو ہمیں ہی کرنا پڑتا ہے۔'' وہ بھی انہی کی پوتی تھی اسی لہجے میں کہہ گئی۔

''زبان بہت چلتی ہے تیری۔'' اماں تنک کر بولیں۔

''ظاہر ہے۔ بیٹی ہوں اس گھر کی۔ بہو تو نہیں جو چپ چاپ سارے ظلم سہتی رہوں گی۔'' زونی نے کاٹ دار لہجے میں دادی کو کہا۔ اس کا چہرہ تپا ہوا تھا اسے اپنی ماں کی حالت بہت تڑپاتی تھیں۔

''میں نے کون سے ظلم کے پہاڑ توڑ ڈالے تیری ماں پر۔ جو تو میرے منہ کو آ رہی ہے۔'' دادی خوب بھڑکی تھی۔

''میرے ہی ابو کی کمائی پر عیش کرنے والوں نے ہم پر ہی زندگی کا دائرہ تنگ کر رکھا ہے۔'' آنکھیں نچاتی زونی نے ہاتھ لہرایا۔

''او تیرا بیڑا غرق۔ ہم نے کیا کھا لیا تیرے باپ کا۔ ستیاناس تیرے نانے کا جس نے ایسی گھٹیا اولاد پیدا کر کے ہمارے گلے منڈ دی۔'' اب وہ بددعاؤں پر اتر آئی تھیں۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کیا کرتی تھیں جب تنگ ہو جاتی تھیں یا آگے سے کوئی ان کی طبیعت صاف کر دیتا تھا تو وہ تلملا جاتی تھیں۔ اور لال بھبوکا چہرہ لیے کوسنے دینے لگ جاتی تھیں۔

''میرے ابو نے آپ کی بیٹیوں کو پڑھایا لکھایا۔ شادیاں کرنے کے لیے بینک سے لون لیے۔ آپ نے

میرا اور میری ماں کا حق بھی کھایا ہے دادی۔ آپ نے فر مائشیں کر کر کے میرے ابو کو قرضوں تلے دبا دیا۔ وہ قرضے تلے ڈوبے ہوئے ہیں، آپ کو پھر بھی کوئی احساس نہیں ہے۔ کیسی ماں ہیں آپ۔'' وہ غصے سے دبے دبے جوش کے ساتھ کہتی وہاں سے ہٹ گئی۔

اماں..... ان کا تو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والا حال ہوا تھا۔ وہ غصے سے پیچ و تاب کھاتے بد دعائیں دینے لگیں۔ اب ان کا کافی دیر تک ثانیہ کے میکے والوں کو گالیاں دینے کا ارادہ تھا اپنی جھینپ اسی طرح مٹانی تھی۔

زونی پاؤں پٹختی سیدھی کچن میں گئی، ثانیہ اپنی سوچوں میں گم کچن میں کھڑی تھی۔ چولہے پر دودھ ابالنے کے لیے رکھا ہوا تھا۔

''کتنی بار کہا ہے کہ اپنی دادی سے بحث مت کیا کرو۔'' ثانیہ ہولے سے بولی

''کیوں نہ کیا کروں۔ وہ ہر وقت ہمیں بے نقط سناتی رہتی ہیں۔'' وہ ابھی بھی غصے میں تھی۔

''کہنے دیا کرو۔ ان کی تو عادت ہے۔'' ثانیہ نے زونی کے چہرے پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''کوئی عادت نہیں ہے۔ جس دن آپ ان کے سامنے تن کر کھڑی ہو جائیں گی نا امی۔ دیکھنا اسی دن سے وہ آپ سے دبنا شروع کر دیں گی۔ وہ صرف آپ کے ساتھ یہ ناروا سلوک اس لیے رکھتی ہیں کیونکہ آپ سہتی ہیں۔'' زونی نے ثانیہ کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''پھر کیا کروں بیٹا۔''

''سہنا چھوڑ دیں امی۔ خود کو مضبوط بنائیں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔ ہم اور کچھ نہیں بھی کر سکتے تب بھی کم از کم اپنے حق کے لیے لڑ تو سکتے ہیں نا۔'' وہ جوان خون تھی اسی گھر کی بیٹی تھی وہ ان ہی کے جیسی تھی۔

''ایسی جنگ کا کیا فائدہ بیٹا جس میں ہار یقینی ہو۔'' وہ بے دلی سے چولہے کی اسپیڈ ہلکی کرنے لگی۔

''یہ کہاں کی عقل مندی ہے امی کہ پسپائی کے ڈر سے لڑنا ہی نہ چاہو۔''

''مجھے اپنے بڑوں سے لڑائی کرنے کی عادت نہیں ہے۔ میری تربیت ان خطوط پر نہیں کی گئی کہ میں اپنے کسی بڑے کو آگے سے منہ توڑ جواب دوں اس لیے میں تمہیں بھی منع کرتی ہوں۔ اس کا کوئی حاصل وصول بھی نہیں بیٹا۔'' ثانیہ بہت مہذب تھی۔ پڑھی لکھی تھی۔

''امی جب دل احساس سے خالی ہو جائیں نا تب کوئی کسی کا اپنا نہیں ہوتا۔ تمیز تہذیب جن کو چھو کر بھی نہ گزری ہو ان کا احترام ہم پر واجب نہیں ہوتا۔ اپنے لیے سر اٹھانا پڑتا ہے ورنہ لوگ سر چڑھ لیتے ہیں۔'' وہ اپنی پڑھی لکھی اس ماں کو سمجھا رہی تھی جس وقت نے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ اور کیا کچھ نہیں سمجھا دیا تھا۔

کبھی وہ بھی تازہ دم ہوتی تھی کالج کی جان ہوا کرتی تھی کالج میں کوئی پروگرام اس کے بنا پایہ تکمیل تک نہیں پہنچتا تھا۔ وہ ہر دل عزیز تھی اپنے اساتذہ کی فیورٹ تھی اپنے کالج کے میگزین کی مدیرہ تھی۔ ان دنوں اسے نثری نظم لکھنے کا کتنا شوق ہوتا تھا، اس کے اردو کے اساتذہ کتنی رہنمائی کیا کرتے تھے۔ ذہین اسٹوڈنٹس ہمیشہ ہی سراہے جاتے ہیں۔ ثانیہ کو تو بولنے کا ہنر بھی خوب آتا تھا۔ پورے کالج میں اتنی روانی سے اردو کسی کو بھی نہیں بولنا آتی تھی جیسے ثانیہ اعتماد سے بولا کرتی تھی۔ یہ سانولی سالونی سی بڑی بڑی پرکشش آنکھوں والی لڑکی دلوں میں اترنے کا فن جانتی تھی۔ جب جب وہ آنکھیں پھیلا کر مدلل انداز میں پورے وزن کے ساتھ اپنی بات کہتی تھی تو مقابل پوری توجہ سے سننے پر مجبور ہو جاتا۔ اس کا کانوں میں رس گھولتا شیریں لب و لہجہ اپنے اندر اثر رکھتا تھا۔ کالج اور یونیورسٹی میں ٹاپر بھی بہت اچھی اچھی تقاریر کیا کرتی تھی۔ عورت کے حق میں بات کیا کرتی تھی۔ ہر سرگرمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتی تھی۔ مظلوموں کے حق میں آواز اٹھایا کرتی تھی۔ اور اب..... وہ خود سر جھکا کر سنتی تھی۔ یہ سب محبت کی کرشمہ سازی تھی۔ محبت تیرا کیا ہو سکتا۔

''امی کیا سوچنے لگ گئیں۔'' زونی چونکی۔

''کچھ نہیں۔ جاؤ، تم بھی جا کر کچھ پڑھ لو۔''

''جتنا بھی پڑھ لوں امی۔ مشکل سے ہی پاس ہونا ہے۔ اور ہوسکتا ہے فیل ہی ہو جاؤں۔'' زونی نے عام سے انداز میں کہا۔

''ابھی مجھے لیکچر دے رہی تھی اور اب خود کیوں محنت سے جی چرانے کی باتیں کر رہی ہو۔ محنت کرو کامیابی ضرور ملے گی۔''

''کوشش کرتی تو ہوں، پر ہوں ہی نالائق۔'' وہ برا سا منہ بنا کے بولی۔

''میری بیٹی بہت اچھی ہے..... لائق ہے۔ ڈگری لینے سے کوئی لائق نہیں ہو جاتا۔ قابلیت ایک الگ چیز ہے اور ڈگری ہولڈر ہونا قطعی ایک الگ بات ہے۔ وہ الگ المیہ ہے کہ ملکی سطح پر کسی بھی جاب کے لیے اپلائی کرنے پر ڈگری پر انحصار کیا جاتا ہے ڈگری کو معیار سمجھا جاتا ہے۔''

ثانیہ نے دودھ کو چولہے سے اتارا۔ اماں کی آواز ابھی بھی سارے صحن میں گونج رہی تھی۔ گو کہ رنجش کی شدت قدرے کم ہوگئی تھی۔

ثانیہ نے زونی کو دیکھا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑے کچن سے نکلی۔ اماں ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر پھر سے شروع ہوگئی تھیں۔

☆☆☆

زونی نے صحن میں اسٹاپو کھیلنے کے لیے چاک سے خانے بنائے اور دروازہ کھول کر گھر سے باہر نکلی رامین اور نوشی کو بلانے میں صرف دس منٹ ہی لگے تھے۔ وہ دونوں زونی کی خفگی کے ڈر سے سب کام چھوڑ چھاڑ اس کے گھر دوڑی چلی آئی تھیں۔ ان کو زونی کی عادت کا پتا تھا بہت جلد روٹھ جاتی تھی مگر من بھی فوراً ہی جاتی تھی۔

زونی نے پالش کی خالی ڈبیا میں مٹی بھر کر اسے اسٹاپو کھیلنے کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ وہ تینوں خوش وخرم کھیل میں مگن تھیں۔ زونی نے جینز کے ساتھ کرتا پہن رکھا تھا۔ ان کی کھلکھلاہٹیں عروج پر تھیں۔ عمارہ اور ثانیہ کچن میں رات کے کھانے کے لیے سبزی کاٹ رہی تھیں۔

اماں کے گھٹنوں کا درد سردی شروع ہوتے ہی بڑھ گیا تھا۔ ثانیہ کی آذر نے ڈیوٹی لگا رکھی تھی کہ دھوپ میں اماں کے ہاتھ پیروں کی مالش کر کے ان کو بٹھانا ہے تاکہ دھوپ ان کو ہڈیوں کو لگے۔ اس وقت بھی وہ سامنے ہی چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ اور زونی کو کڑے تیوروں سے گھور رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا بہانہ ڈھونڈیں اور زونی کی دوستوں کے سامنے اسے بے عزت کریں۔ زونی اپنے دھیان میں تھی اس کے لمبے گھنے بال اتنے چمک دار تھے کہ دیکھنے والا بس دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔ رنگ روپ اتنا خوب صورت کہ بے ساختہ لوگ اسے سراہنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اوپر سے قد کاٹھ اتنا اچھا کہ وہ اپنی سب دوستوں میں نمایاں نظر آتی تھی۔

''کوئی شرم حیا ہے بھی کہ سب گھول گھال کر پی گئی ہو۔'' دادی نے زونی کو کہا تو اس کے خانے عبور کرتا پاؤں وہیں تھم گیا۔ اس نے استفہامیہ دادی کو دیکھا اور پھر سے اپنے کام میں لگ گئی اب وہ جیتنے ہی والی تھی کہ اماں کی پاٹ دار آواز پھر گونجی۔

''اے لڑکیوں۔ چلو جاؤ اپنے اپنے گھروں کو۔ لوٹھا کی لوٹھا ہوگئی ہو۔ کوئی کام کاج نہیں تم لوگوں کو۔''

اب ان کا روئے سخن زونی کی دوستوں کی طرف ہوا۔ اللہ جانے اماں کو ہر چیز اور ہر اس بندے سے خدا واسطے کا بیر کیوں تھا جس کے ساتھ زونی خوش رہتی تھی۔

''دادی۔ آپ میری فرینڈز کی ایسے انسلٹ نہیں کر سکتیں میں ان کو ان کے گھر سے بلا کے لائی ہوں وہ میری خاطر آئی ہیں۔'' وہ روہانسی ہوئی۔ اسے دادی کے اتنے سخت رویہ پر دکھ ہوا تھا۔

''جتنی وہ دونوں پڑھائی میں اچھی ہیں تم بھی ویسی ہی اچھی ہو جاؤ تو چاہے اسٹاپو کھیلنا جو جی چاہے کرنا۔'' اماں کی اپنی منطق تھی۔

''رامین کو زونی جیسی بریانی نہیں بنانی آتی بلکہ ان دونوں کو کچھ بھی نہیں بنانا آتا جبکہ زونی بہت اچھی کوکنگ کرتی ہے۔'' عمارہ میدان میں کودی۔

''بی بی یہاں تمہارا فلسفہ نہیں چلے گا جاؤ اپنے

کام سے کام رکھو۔'' اماں کچی سی ہوگئیں۔

''فلسفہ تو آپ کا بھی نہیں چلے گا اماں۔'' عمارہ نے اک خاص ادا سے کہا۔

''میرے منہ نہ لگو تو بہتر ہے۔ لڑکیوں کو سارے کام آنے چاہئیں۔ مگر تعلیم اپنی جگہ بہت ضروری ہے۔'' اماں کی بات پر عمارہ ہنسی اور تادیر ہنستی رہی۔ اماں بھوچکی سی اپنی اس منہ پھٹ سی بہو کو دیکھ رہی تھیں۔ اب پتا نہیں اس کی پٹاری سے کیا سانپ بچھو نکلنے والے تھے۔

''ثانیہ بھابھی اس خاندان کی پہلی بہو ہیں۔ جو بہت پڑھی لکھی تھیں مگر ہماری ساسو ماں کو ان میں سو سو کیڑے دکھائی دیتے رہے۔ ثانیہ بھابھی کے پڑھے لکھے ہونے پر اتنے طنز کے تیر برسائے کہ ان کو اپنا اعلا تعلیم یافتہ ہونا کوئی عیب لگنے لگا۔ اٹھتے بیٹھتے ہر ہر بات پر طعنہ زنی ہر بات پر اعتراض ہر چیز میں نکتہ چینی۔ اور جب آپ کی اپنی بیٹیاں پڑھنے لگیں تب آپ پڑھے لکھوں کی تعریف کرنے لگیں ہر آئے گئے کے سامنے اپنی بیٹیوں کے گن گانے لگیں۔ بڑھا چڑھا کر ان کے وصف بیان ہونے لگے حالانکہ پھوہڑ تو آپ کی بیٹیاں بھی بہت ہیں اماں..... ہاں وہ الگ بات ہے کہ انہوں نے اپنے شوہر خوب قابو کر رکھے ہیں جو بے چارے بچوں کے پیمپرز تک بدل دیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو..... کھانا بھی بنا لیتے ہیں۔'' عمارہ نے تاک تاک کر چوٹ کی تھی۔

''تم جلتی ہو میری بیٹیوں سے۔ اسی لیے ایسی باتیں کرتی ہو۔'' اماں سے کچھ اور نہ بن پڑا تو یہ کہہ دیا۔

''نہ نہ اماں۔ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ آپ جیسے اپنے بیٹوں کو تابعدار دیکھنا چاہتی ہیں نا۔ بالکل اسی طرح اپنے دامادوں کو بھی سمجھایا کریں کہ اپنی ماؤں کی تابعداری کریں۔ جنت تو بقول آپ کے ماں کی فرماں برداری سے ہی ملتی ہے نا۔'' عمارہ کی ہمت تھی جو اتنے دھڑلے سے یہ سب کہہ گئی تھی ثانیہ اندر کمرے میں کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''وہ ان کا معاملہ ہے تمہیں کیوں مروڑ اٹھ رہے ہیں۔'' اماں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ عمارہ کو کچا چبا جائیں یا اس کا منہ ہی نوچ لیں۔

''بہت بڑی منافق ہیں آپ اماں۔ جیو اماں اور خدا کے لیے جینو دو۔ بس کر دو۔ کسی کی چپ کا اتنا ناجائز فائدہ نا اٹھائیں۔ اللہ سارے حساب اکٹھے کر رہا ہے۔ ڈریں اللہ سے۔'' عمارہ نے بے خوف لہجے میں کہا۔ حق سچ بات کہنے میں بھلا کیسا ڈر۔ اتنی اخلاقی جرات تو بندے میں ہونی چاہیے کہ سچ کہہ سکے اور سچ سن سکے۔ اور سچ کا ساتھ دے سکے۔

''جاؤ بی بی۔ اپنا کام کرو۔ میرے معاملے میں دخل اندازی نہ کیا کرو۔''

''آپ اپنے کام سے کام کیوں نہیں رکھتیں اماں۔'' عمارہ نے چبا چبا کر کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی کچن میں جا کر بولنے لگی۔

دوسری طرف زونی کی شامت آ گئی اماں نے اسے بے نقط سنا ڈالیں۔ نجانے اماں کی ایسی کون سی جلن تھی جو کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جا رہی تھی وہ اپنی جھینپ مٹانے کے لیے بولے جا رہی تھیں پھر بھی ان کے سینے میں ٹھنڈ نہیں پڑ رہی تھی۔ ان ماں بیٹی سے بلاوجہ کا ہی بیر باندھ رکھا تھا۔ ثانیہ صابروں کے قبیلے سے تھی۔ یا پھر اس کا شوہر اس کی ڈھال نہیں بن سکا تھا۔

اللہ جانے کسی دوسرے کو تکلیف دینے اور اسی تکلیف میں رکھنے کا ایسا کون سا نشہ ہے جو قہر برسانے والے اس نشے سے نکلنا ہی نہیں چاہتے۔ اللہ بھی شاید ایسے بے رحم لوگوں کی رسی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے۔ کیونکہ زمین پر صبر کرنے والوں کے حساب تو وہ خود لکھ رہا ہوتا ہے۔ اور ظالموں کے لیے سزا تجویز کرنے والی بھی رب تعالیٰ کی ہی ذات ہے جو بہتر انصاف کرنے والی ہے۔ مکافات عمل کے سارے فیصلے اسی کے ہاتھ میں ہیں۔''

رامین اور نوشی چلی گئی تھیں زونی کا چہرہ اتر گیا۔ وہ اماں کو دکھ سے دیکھ رہی تھی۔

''اللہ آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گا ہمارا صبر پڑے گا۔ دیکھ لینا آپ۔'' زونی کہہ کر رکی نہیں۔

''تیرا بیڑا غرق ہو۔''

''میرا کیوں بیڑا غرق ہوگا۔ ہم نے کون سا کسی کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے کسی کا مال کھایا ہے۔ کسی کے جذبات اور زندگی سے کھیلا ہے جو بیڑا غرق ہوگا۔ آپ کو کیا پتا صبر کے گھونٹ پینا کتنا مشکل کام ہے۔ ہر گھونٹ زہر سے بھرا ہوتا ہے جو لہجے کی مٹھاس ہی نہیں چھینتا بلکہ زندگی کی ساری مٹھاس بھی نگل جاتا ہے۔'' زونی نے بس سوچا تھا کہا نہیں تھا فائدہ بھی کوئی نہیں تھا۔

زونی اپنے کمرے میں گھس گئی تھی دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز عمارہ اور ثانیہ نے بھی سنی تھی۔

''حد کرتی ہیں اماں بھی۔ جہاں چار لوگ اکھٹے ہو کر بیٹھتے ہیں وہیں اماں زونی کی کمزور پوزیشن کو لے کر نہ صرف اسے بلکہ آپ کو بھی بے عزت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں۔'' وہ خوب تپی ہوئی تھی۔

''تم جانتی ہونا کہ زونی پڑھائی میں کمزور ہے اور میٹرک میں......''

''جی جانتی ہوں کہ وہ میٹرک میں فیل ہوگئی تھی مگر یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے کہ جس کو ہر آئے گئے کے سامنے بیان کیا جائے اور آپ کو اور زونی کو تحقیر کا نشانہ بنایا جائے یہ ٹھیک نہیں ہے بھابھی۔ زونی بہت حساس بچی ہے اس میں بے بہا خوبیاں ہیں اماں کو ایسے ٹیکٹو یٹ نہیں شو کرنی چاہیے۔ میرا دل دکھتا ہے تو اس بچی کا کتنا دل خراب ہوتا ہوگا۔'' عمارہ نے تاسف سے سر جھٹکا۔

''میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں جانتی ہوں اماں جان بوجھ کر مجھے تکلیف دیتی ہیں اور اب میری بچی بھی ان کے ستم کی زد میں آرہی ہے۔'' دو آنسو چپکے سے ثانیہ کی آنکھوں سے نکل کر گالوں پر بہہ گئے۔

''آپ آذر بھائی سے بات کریں نا۔''

''تم جانتی تو ہو کہ وہ پردیس کے دھکے کھا رہے ہیں۔ ہماری تو کتنے مہینے گزر جاتے ہیں بات بھی ڈھنگ سے نہیں ہوتی۔ اب میں ان کی تھکن سمیٹنے کے بجائے شکایات کی پٹاری کھول کر بیٹھ جاؤں تو یہ اچھی بات تو نہیں نا عمارہ۔'' ثانیہ رودی اور عمارہ نے اثبات میں سر ہلایا کہہ تو ثانیہ ٹھیک ہی رہی تھی ایسے میں کوئی پرسان حال نہیں تھا۔

اماں کو زونی سے خدا واسطے کا بیر تھا وہ ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے وہ زونی میں کیڑے نکالتی رہتی تھیں۔ زونی اماں کو تو پلٹ کے دو بدو جواب کم ہی دیتی تھی یا اگر دیتی بھی تو ایسے کہ سانپ بھی مر جائے اور اماں بھی نہ خفا ہوں۔ کبھی کبھی اماں کو زونی کی کوئی بات زیادہ ہی چبھ جاتی تھی تو دل ہی دل میں تب تک کھٹکتی رہتی جب تک وہ زونی کی شکایت نہ لگا لیتیں۔ ثانیہ کو تو خون کے گھونٹ بھرنے کی ایسی عادت پڑی تھی کہ مانو زبان تالو سے ہی جا لگی مگر یہ عادت اس کی بیٹی زونی میں نہیں آسکی تھی۔ وہ اماں کی بات پر غصہ کرتی تھی اور کلستے ہوئے آکر ماں سے شکایتیں لگاتی تھی۔ تب ثانیہ اسے بہلاتی تھی اور سمجھاتی تھی مگر اماں کی تو عادت ہی ایسی تھی کہ ہر وقت روک ٹوک ہر وقت بدکلامی۔ مگر صرف ثانیہ اور زونی کے ساتھ ہی وہ ایسا کرتی تھیں چھوٹی بہو عمارہ کے لہجے کا تیکھاپن دو چار دفع دیکھنے کے بعد اماں اب عمارہ پر ہاتھ ہلکا ہی رکھتی تھیں۔ وہ اس سے ڈرتی تھیں۔

''امی جی۔ اماں نے مجھے سب کے سامنے ڈانٹا ہے ایسا بھی کیا کر دیا میں نے۔'' زونی روہانسی ہورہی تھی۔

''کوئی بات نہیں بیٹا دادی ہیں تمہاری اور بڑی ہیں اس گھر کی۔'' ثانیہ نے دھیرے سے سمجھایا۔

''میں نے ایسا کیا غلط کر ڈالا۔ جینز کی پینٹ ہی پہن لی نا۔ بس اتنی سی بات پر اماں نے مجھے کیا کیا نہیں سنایا۔'' وہ رونے والی ہورہی تھی۔

''ان کو پسند نہیں تو تم مت پہنو بیٹا۔ اور ویسے بھی گاؤں کی لڑکیاں ایسا لباس کب پہنتی ہیں۔'' ثانیہ کی اپنی منطق تھی۔

''پھپھو بھی تو پہنتی ہیں نا تب تو اماں کو برا نہیں لگتا۔'' زونی کی بات پر ثانیہ ایک لمحے کے لیے چپ

سی ہوگئی کہہ تو زونی ٹھیک ہی رہی تھی مگر یہ بات اماں کو کون سمجھاتا۔ اس لیے ثانیہ کچھ نہیں بولی ہاں اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔

''امی۔ دادی صرف ہم پر شیر بنی ہوئی ہیں ان کے قول و فعل میں بہت تضاد ہے۔ ہمارے لیے کچھ اور اصول اور اپنی بیٹی کے لیے کچھ اور۔ یہ غلط ہے امی۔ آپ بولیں اپنے حق کے لیے۔ جیسے عمارہ چچی بولتی ہیں، دادی کو دو بدو جواب دیتی ہیں۔ آپ بھی ان کو ایسے ہی آئینہ دکھایا کریں۔ چپ مت رہا کریں آپ کی اس چپ کا کوئی فائدہ نہیں اور انعام میں کسی صلے کی امید نہ رکھیں۔'' زونی دکھ سے کہہ رہی تھی ثانیہ کا اٹھارہ سالہ ازدواجی زندگی کا تجربہ تھا۔ بہت سارے اتار چڑھاؤ اس نے دیکھے تھے اس سے بڑھ کر کون اماں کو جانتا تھا۔

''میرے منہ میں زبان ہے زونی، مگر مجھے اپنے بزرگوں کو آگے سے جواب دینا سکھایا ہی نہیں گیا میرے اندر ایسی دیدہ دلیری نہیں ہے کہ میں ان کو بتا سکوں کہ وہ غلط ہیں..... اور وہ بھلا میرے بتانے سے مان جائیں گی؟'' وہ بات کہہ کر رکی نہیں اپنے کمرے سے چلی گئی۔

زونی کچھ دیر بیٹھی کچھ سوچتی رہی پھر وہ بھی چھت پر تازہ ہوا کھانے چلی گئی بہت گھٹن ہو رہی تھی اور غصہ تھا کہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

☆☆☆

بابا غلام سائیں کا میلا شروع ہو چکا تھا تین دن تک مسلسل میلا رہتا تھا شہر سے لوگ آتے تھے اور بابا سائیں کے میلے پر اسٹال لگاتے تھے۔ لڑکیاں بالیاں پورا سال پیسے جمع کرتی تھیں کہ جب بابا سائیں کا میلا لگے گا وہ اپنے لیے ہار۔ انگوٹھیاں اور بندے خرید کر رکھ لیں گی۔ میلے میں ہر طرح کے اسٹال لگتے تھے کپڑے جوتے کھانے پینے کی چیزیں جیولری اور سب کچھ۔ گاؤں کی زیادہ لڑکیاں شہر پڑھنے ضرور جایا کرتی تھیں مگر ان کو شہر میں گھومنے پھرنے اور شاپنگ کرنے کی اجازت بالکل نہیں تھی۔

دو دن سے ڈھول بجنا شروع ہو چکا تھا اور راجو کے دل کے تار اس ڈھول کے ساز سے بج رہے تھے۔ نوشی سے ملنا تھا اور اس سے بہت ساری باتیں کرنی تھیں۔ اسے بتانا تھا بہت کچھ کہ جب وہ سر جھکا کے ہنستی ہے تو کتنی پیاری لگتی ہے اور جب وہ نگاہ جھکا کے بیٹھتی ہے تو جیسے کائنات تھم جاتی ہے اور یہ کہ وہ بہت میٹھا بولتی ہے۔ اس کی کھڑی ناک میں جھلملاتی لونگ بہت اچھی لگتی ہے میں اسے کہوں گا کہ شادی کے بعد میں تمہیں گولڈ کی لونگ گفٹ کروں گا۔ راجو نے چشم تصور میں دیکھا کہ چمکتی ہوئی سونے کی لونگ نوشی کی ناک میں کیسی سندر لگے گی نا۔

''اوئے پتر۔ میرا حقہ تو گرم کر دے ذرا۔'' کریم دین راجو سے ذرا فاصلے پر بیٹھا راجو کی حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی بات پر بھی راجو کو جیسے کچھ سنائی ہی نہیں دیا تھا۔ وہ مسلسل مسکرا رہا تھا اسے آسمانوں میں جیسے نوشی کا چہرہ نظر آ رہا تھا اور بان کی چارپائی پر چت لیٹا خوابوں خیالوں کی وادی میں گھوم رہا تھا جہاں محبت اس کا ہاتھ تھامے اسے من پسند منظر دکھا رہی تھی۔ نوشی جیسے ایک ماڈل تھی جو مختلف سوانگ رچا کے راجو کی آنکھوں میں اتر رہی تھی اور وہ اس کے ہر روپ پر پہلے سے زیادہ خوش ہو جاتا ہے۔

''کملا تے نئی ہو گیا منڈیا۔'' کریم نے اپنی لاٹھی اٹھا کر راجو کی چارپائی پر زور سے ماری تو وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔

''لگدا اے تیرے تے کوئی چڑیل عاشق ہو گئی اے۔ ہن تیرا علاج کرانا چا ہیدا۔ اے کلاں ہسی جاندا توں تے کلا گلاں کری جاندا۔'' کریم کو تشویش ہو رہی تھی اس لیے ان کو لگا کہ راجو کو کوئی جن بھوت چمٹ گئے ہیں جو وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا ہے۔

''نہیں ابا۔ ایسی کوئی بات نہیں۔'' راجو سنبھل گیا۔ اسے پتا تھا کہ بابا غلام سائیں جن نکالتے ہوئے لوگوں پر کتنا برا تشدد کرتے تھے۔ اس لیے راجو جلدی سے اٹھ کر حقہ گرم کرنے چلا گیا اور وہ دل ہی دل میں ارادہ باندھ رہا تھا کہ دوبارہ کم از کم ابے کے سامنے خوابوں میں نہیں کھونا ورنہ ابا اس کا جن

نکلوانے بابا کے پاس لے جائے گا۔

☆☆☆

پہلا دن میلے کا گزر گیا تھا سب لڑکیوں نے ٹھیلوں سے خوب چیزیں خریدی تھیں۔ رامین نوشی اور زونی بھی ٹھیلوں کے آس پاس گھومتی رہی تھیں مگر ان کو کچھ پسند نہیں آیا تھا پلاسٹک کی گندی سی چیزیں تھیں سستی جیولری۔ وہ ناک بھوں چڑھاتی ایک سے دوسرے ٹھیلے پر جاتی رہیں بھی انہوں نے گولا گنڈا لے کر کھایا اور اس کے بعد میلے میں آئیں مہمان عورتوں اور لڑکیوں سے ملنے لگیں۔ اسپیکر پہ نعت خوانی ہو رہی تھی اس کے بعد اجتماعی دعا مانگی گئی پھر لنگر کھل گیا سب لڑکیاں دری پر بیٹھی تھیں۔ کچھ لڑکے لنگر تقسیم کر رہے تھے۔ راجو بھی ان میں شامل تھا تندوری روٹیاں اور گرما گرم دال گوشت۔ ہر ایک لنگر کھا رہا تھا۔

راجو نوشی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے چین سا چکرا رہا تھا تبھی وہ اسے نظر آ گئی۔ گلابی رنگ نوشی پر کتنا سج رہا تھا وہ ایک ٹک نوشی کو دیکھے گیا۔ دوپٹے کے ہالے میں مقید معصوم سا چہرہ۔ نوشی کو کسی کی نگاہ کی حدت محسوس ہوئی تو وہ نگاہ گھما کر دیکھنے لگی۔ راجو سامنے ہی ٹکٹکی باندھے کھڑا تھا۔ نوشی گھبرا گئی، اس کے ہاتھ کا نوالہ چھوٹ گیا۔ اس کی صبیح پیشانی ٹھنڈ میں بھی پسینے سے عرق آلود ہو گئی۔ نوشی کے ہاتھوں کی لرزش کو دیکھ کر زونی نے نوشی کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تبھی اس نے دیکھا راجو تیزی سے قدم بڑھاتا ان کی طرف آ رہا تھا زونی ادھر لپکی۔

''اپنا وعدہ یاد ہے نا۔'' راجو عجلت میں بولا۔

''آج نہیں راجو بھائی..... کل نا۔''

''کل کیوں؟''

''کل جب ہم سب بابا سائیں کے بزرگوں کے مزار پر چادر چڑھانے جائیں گے تب.....''

''مگر مجھے کیسے پتا چلے گا۔ اتنے لوگ ہوں گے۔'' وہ بے چین تھا۔

''مجھے نہیں پتا۔ یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔ ملاقاتیں کروانا میرا کوئی خاندانی کام نہیں ہے۔''

زونی تنک کر اس پر چڑھ دوڑی۔

''اچھا اچھا۔ ٹھیک ہے کچھ سوچتا ہوں۔'' وہ بھی انجان تھا۔ ''میں ہجوم میں ہوں گا۔ نیلے رنگ کا رومال میرے ہاتھ میں ہوگا۔ اور جب میں رومال فضا میں ہاتھ اونچا کر کے لہراؤں تب تم دونوں ہجوم سے نکل کر چاچا خدا بخش کے کھیت میں لگے پیپل کے درخت کے پاس چلی جانا میں چند لمحوں بعد پہنچ جاؤں گا۔'' وہ دبی زبان میں کہہ کر چلا گیا اور اگلے دن بالکل ایسے ہی ہوا تھا۔ نوشی کو زونی پہلے ہی ملنے کے لیے آمادہ کر چکی تھی زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑی تھی کیونکہ دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔

پورا گاؤں اور مہمان سب بزرگوں کے مزار پر چادر چڑھانے جا رہے تھے تبھی ایک گندمی رنگ کا ہاتھ سب سے اوپر اٹھا اس ہاتھ میں نیلے رنگ کا رومال تھا۔ زونی نے نوشی کا ہاتھ تھاما اور مجمع سے کٹ گئی سب آگے نکل گئے کسی نے دھیان ہی نہیں دیا کہ تین لوگ اس بھیڑ میں سے کہیں غائب ہو چکے ہیں۔

نوشی مارے گھبراہٹ کے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیر رہی تھی دل تھا کہ جیسے حلق میں دھڑک رہا تھا۔ زونی اسے پیپل کے درخت کے نیچے چھوڑ کر خود تھوڑے سے فاصلے پر جا کر بیٹھ گئی۔ راجو بھی آ گیا تھا ڈھول کی آواز لحہ بہ لحہ دور ہوتی جا رہی تھی۔

''چلو نوشی اب ہمیں چلنا چاہیے۔'' زونی نے تھوڑی دیر بعد آ کر نوشی سے کہا۔

راجو کچھ دیر رکنے کے لیے منتیں کرنے لگا۔

''ٹھیک ہے۔ میں تو جا رہی ہوں۔ تم دونوں رہو یہاں مگر ایک بات یاد رکھنا پکڑے جانے پر میں تو صاف مکر جاؤں گی اور تم دونوں کے ساتھ جو ہوگا وہ صدیوں یاد رکھا جائے گا۔ اور ایک مثال کے طور پر آنے والی نسلوں کو سنایا جایا کرے گا۔'' زونی کڑے تیوروں سے انہیں گھورتی چل پڑی تو راجو گڑگڑانے لگا۔ کچھ دیر رکنے کے لیے مسکین سی صورت بنا کے تڑلے کرنے لگا۔ زونی پلٹی۔

''کسی نے دیکھ لیا نا تو یہ خبر پورے پنڈ میں: نکل

کی آگ کی طرح پھیل جائے گی۔ تمہاری اور نوشی کی تو جو رسوائی ہوگی سو ہوگی۔ میں بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ بد سے بدنام زیادہ مشہور ہو جاتا ہے راجو بھائی۔'' زونی سچ میں ڈر گئی تھی۔

''کچھ نہیں ہوتا۔ میں ہوں نا۔'' راجو نے کالر کھڑے کیے۔

''زیادہ شاہ رخ خان بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہوں نا۔'' زونی نے راجو کی نقل اتاری۔ راجو ڈھٹائی سے ڈٹا رہا۔

''کچھ بھی نہیں ہوگا بہادر بنو زونی۔'' اب پتا نہیں راجو کی یہ کیا دلیل تھی جو اسے بہادری کی ترغیب دے رہا تھا۔

''ہوش کے ناخن لو راجو بھائی۔ ایسے کاموں میں بہادری دکھانے والے منہ کی کھاتے ہیں بس بہت ہو گیا۔ نوشی کے بھائیوں کو جانتے ہیں نا۔ ان کو ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی نا تو نوشی کے بھائی تمہاری بوٹی بوٹی کر کے چیل کوؤں کا رزق بنا دیں گے یا پھر تمہارا منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھا کے پورے گاؤں والوں سے پتھر لگوائیں گے آئی سمجھ، سارا محبت کا بخار اتر جائے گا۔'' وہ تنتناتے ہوئے لال بھبوکا چہرہ لیے وہاں سے نکلی تو نوشی بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔ اس کا تیز بھاگنے سے سانس پھولا ہوا تھا۔

''دفع ہو جا۔'' زونی کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔

''چل چھوڑ دے اب غصہ۔ موڈ ٹھیک کر لے۔'' نوشی ڈرتے ڈرتے بولی۔

''چل ٹھیک ہے۔ مگر یاد رکھ دوبارہ اس لنگور سے ملنے آئی نا تو مجھ سے دوستی ختم۔'' زونی نے واضح دھمکی دی۔

''ایسے تو نہ کہہ یار۔'' نوشی جانتی تھی کہ وہ جو کہتی ہے کر گزرتی ہے۔

''کیا کیا باتیں ہوئیں۔'' زونی نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

''تو وہاں اس نے جھک مارنے کے لیے بلوایا تھا باتیں نہیں کیں تو کیا تمہارا منہ دیکھتا رہا۔''

''ہاں۔ بس وہ مجھے تکے جا رہا تھا اتنی محویت سے اتنی محبوبیت سے کہ میری پلکیں جھک گئیں ہم نے ایک لفظ نہیں بولا مگر ہم دونوں کا دل ایک دوسرے کی دھڑکنوں کی آواز سن رہا تھا جو ایک دوسرے کا ہونے پہ بے ہنگم ہو رہی تھیں۔ پتا ہے اس نے میرے پیروں کے نیچے اپنا صافہ اتار کر رکھ دیا، مجھے زمین پر بیٹھنے ہی نہیں دیا۔ راجو نے کچھ بھی نہیں کہا مگر میں نے سن لیا اور سمجھ بھی لیا۔'' نوشی کی آنکھوں میں محبت کی حدت کر وٹیں لے رہی تھی زونی نے تحیر سے نوشی کو دیکھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ محبت کسی کو اتنا بدل دے۔

''چلو جی۔ تم تو گئیں کام سے۔''

''اس کا دل ہی نہیں بھر رہا تھا مجھے دیکھ کے۔ اور میرا بھی۔ میں نے اسے آنکھ اٹھا کے بس ایک بار دیکھا تو دل نے شدت سے خواہش کی کہ کاش ایک لمحے امر ہو جائیں، کائنات کی گردش رک جائے وقت کی رفتار مدھم پڑ جائے۔'' نوشی کا جذب زونی کو گہری حیرت میں مبتلا کر گیا تھا۔

''شکل و صورت کا اتنا خاص نہیں ہے راجو بھائی۔'' پتا نہیں زونی نے یہ کیوں کہہ دیا۔

''محبت ایسی باتیں نہیں سوچا کرتی زونی۔ رنگ نسل ذات پات سے بالاتر ہوتی ہے یہ محبت۔'' شرم سے چہرہ دہک رہا تھا۔

''یہ تم کب سے ایسی باتیں کرنے لگ گئی ہو۔'' زونی دنگ رہ گئی یہ تو انوکھا رنگ تھا جو وہ آج نوشی کا دیکھ رہی تھی۔

''پچھلے ایک سال سے محبت میرے دل پر دستک دے رہی تھی مگر میں انجان بن کر دل کے کواڑ بند کرتی رہی ایک پٹ بند کرتی تو دل کا کوئی اور در کھل جاتا اور ایک ہی چہرہ اس میں سے جھانکتا تھا..... راجو کا چہرہ۔ کب تک میں محبت سے منہ موڑے رکھتی محبت دبے پاؤں میرے اندر پھیل کر مجھے اب بے بس کر چکی ہے میں نے بھی سر جھکا دیا محبت نے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔'' نوشی تیز تیز

بول رہی تھی اس کی سانسیں اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ زونی الجھتی جا رہی تھی۔

''اچھا اب زیادہ رانی مکھر جی بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ جلدی چلو ہمیں مزار پر پہنچنا ہے اس سے پہلے کہ ہماری ڈھنڈیا پڑ جائے۔'' زونی نے اسے لتاڑا تو وہ دونوں تیز قدموں سے چلنے لگیں۔

☆☆☆

کچھ دیر پہلے ہی مغرب کی اذان ہوئی تھی۔ مگر سردیوں میں رات جلدی ہو جایا کرتی ہے۔ آسمان تاروں سے بھرا ہوا تھا زونی چپ چپ سی تھی زونی چھت پر آئی تھی اس کا دل گھبرا رہا تھا ثانیہ اور وہ رات کو اکٹھے لیٹتی تھیں۔ وہ گرمیوں میں چھت پر بستر لگا کے لیٹا کرتی تھیں۔ ثانیہ ابھی نیچے کام نپٹا رہی تھی۔ زونی نے منڈیر سے نیچے جھانکا ثانیہ چولہے میں سلگتی لکڑیوں کو چمٹے سے ادھر ادھر کر رہی تھی اس کی اپنی زندگی بھی تو ایسی ہی تھی۔ سلگتی ہوئی۔ اس کے چہرے پر کتنا کرب پھیلا ہوا تھا۔ دہکتے کوئلوں میں ثانیہ کا چہرہ کیسا لگ رہا تھا۔ گندم کی پکی فصل جیسا۔ سنہرا۔ خوش نما۔ مگر اداسی سے بھرا کھویا کھویا۔ دہکتے کوئلوں کا عکس اس کے سانولے چہرے پر لہرا رہا تھا۔

زونی پوری محویت سے اپنی ماں کو دیکھتی رہی۔ چھت پر سردی تھی مگر نجانے کیوں زونی کو محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ یونہی منڈیر پر کہنیاں ٹکائے اپنے صحن میں جھانکتی رہی۔ دادی جلدی سو جانے کی عادی تھیں عمارہ بھی جا کے لیٹ گئی تھی اس کو مطالعہ کرنے کی عادت تھی یقیناً گرم بستر میں لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی ہوگی۔ یاور کی شہر میں پرچون کی اچھی چلتی ہوئی دکان تھی، رات تک دکان پر رش رہتا تھا اس لیے یاور لیٹ ہو جایا کرتا تھا۔

دور کہیں کوئی دیوانہ اپنی درد بھری آواز میں بلھے شاہ کی کافیاں گا رہا تھا اس کی آواز میں بہت درد اور سوز تھا زونی چونکی تا حد نظر منڈیر کے اس پار آواز کے تعاقب میں دیکھا زونی کی آنکھیں چندھیا گئیں اندھیرا تھا اور کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا اس کا دل بہت سی اداسی سمیٹ لایا۔ اس کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی بانسری کی دھن اس خاموش سناٹے میں ابھری تھی۔

''یہ کون ہے۔'' زونی ورطہ حیرت میں ڈوب گئی۔ اس سے پہلے کبھی یہ آواز نہیں سنی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کوئی بہت قریب بیٹھا گا رہا ہے زونی کا دل عجیب سا ہونے لگا۔ نوشی کی باتیں۔ اس کا تمتماتا ہوا بارونق چہرہ۔ راجو کی بے چینی۔

عشق بلھے نو نچاوے یار تے
سامنے ہووے یا تے نچنا پیندا اے۔
آجا یار۔ دے دیدار۔ دے دیدار۔
وہ بار بار دہرا رہا تھا۔

زونی نے تڑپ کر دیکھا دور تک کچھ بھی نہیں تھا سرسراتا ہوا سا سردی کا احساس تھا۔ یا بیچ میں کہیں کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔

دیوانہ بار بار کہہ رہا تھا۔

آجا یار۔ دے دیدار۔ زونی نے بے خیالی میں نیچے جھانکا۔ ثانیہ ابھی بھی چولہے کے پاس بیٹھی تنکے سے راکھ کرید رہی تھی۔ زونی کو ایسا لگا وہ رو رہی ہے اس کی ماں رو رہی ہے۔ کتنا درد وہ اپنے اندر دل کے نہاں خانوں میں چھپائے بیٹھی تھی کون جانے۔

زونی نے ثانیہ کو آنسو صاف کرتے دیکھا۔ محبوب کی جدائی کا کرب ثانیہ کے چہرے پر درج دکھائی دیا تھا۔ زونی کا دل بھر آیا۔

بہت سارے لوگ شہر سے آیا کرتے تھے۔ وہ رات بھر کسی کھیت میں کچھ وقت سو کر کچھ جاگ کر گزارا کرتے تھے اور فجر کی اذانوں سے پہلے وہ چارا کاٹ کر بڑے بڑے ٹرکوں پر لادا کرتے اور کچھ لوگ گدھا گاڑی پر بھی آتے تھے اور دن چڑھنے سے پہلے ہی وہ سب شہر کی راہ لیا کرتے تھے۔ شہر میں ان کے ٹال تھے۔ شاید ان میں سے کسی کے ساتھ وہ دیوانہ آیا تھا جس کی آواز میں جادو تھا مگر وہ خود نظر نہیں آ رہا تھا۔

زونی منڈیر سے ہٹی اور چھت پر چکر کاٹنے لگی۔ جب وہ گھوم گھوم کر اکتا گئی تب ثانیہ کے فون پر

کچھ گانے سننے کے لیے اس نے ہاتھ میں پکڑے فون پر سرچنگ شروع کی مگر سگنل نہیں تھے۔ گاؤں میں ابھی فون وغیرہ عام نہیں ہوئے تھے۔ آذر چونکہ سعودیہ میں تھا اس لیے گھر بات کرنے کے لیے اس نے کسی آتے جاتے کے ہاتھ فون بھیجا تھا۔ کبھی کبھی آذر فون کرتا تھا سلام دعا ہی ہو پاتی تھی۔

زونی اپنا دھیان بٹانے کے لیے کیا کیا سوچے چلی جارہی تھی۔ مگر وہ بانسری کی درد سے لبریز لے اس کے من میں درد سا جگاتی جارہی تھی۔

اس سے پہلے کہ اس کی بے لگام سوچیں اسے پھر سے بھگانے لگتیں بھی ثانیہ اس کے پیچھے چھت پر چلی آئی۔ اس کے پاس کوئلوں والی انگیٹھی تھی اس نے وہ انگیٹھی زونی کے پاس رکھی۔ زونی کو سکون سا آ گیا۔ سردیوں میں دھکتی آگ پر ہاتھ تاپنے کا بھی ایک اپنا ہی مزا ہوتا ہے۔ ثانیہ نیچے گئی اور ابلے ہوئے انڈے مونگ پھلیاں اور گرم دودھ اوپر ہی لے آئی تھی۔

''امی کتنا اچھا گا رہا ہے نا اس کی آواز دل میں درد کیوں جگا رہی ہے۔''

''ہاں بہت اچھی آواز ہے کانوں کو بہت بھلی معلوم ہو رہی ہے۔''

''یہ کون ہے۔'' زونی نے بے تکا سوال کیا۔

''پتا نہیں۔ کوئی ہوگا پنکھ پکھیرو رستہ بھولا کوئی مسافر۔ رات کاٹے گا چلا جائے گا۔'' ثانیہ نے ٹھنڈا سانس لیا۔

''اس کی بانسری کی لے بے چین کیوں کر رہی ہے امی۔'' وہ بے قراری سے بولی۔

''یہ کیسی فضول باتیں کر رہی ہو۔'' ثانیہ نے اسے ڈپٹا۔ زونی خاموش ہوگئی۔ پھر کافی دیر دونوں کے درمیان خاموشی سرسراتی رہی۔

''کیا ہوا ہے اتنی خاموشی؟''

''امی یہ محبت کیا ہوتی ہے اور کیسے ہوتی ہے۔''

''آج یہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔''

''بتائیں نا امی۔'' زونی نے ثانیہ سے لپٹ کر ضدی لہجے میں پوچھا۔

''محبت ہو جاتی ہے اور محبت کیا ہے کیوں ہے میں کبھی نہیں الجھتی محبت کا ہونا ہی سب کچھ ہوا کرتا ہے۔'' ثانیہ کا ہاتھ زونی کے بالوں میں تھا۔

''آپ کو ابو سے محبت ہو گئی اور ان کو آپ سے۔ ہے نا.....''

''ہاں بیٹا اور ہماری لگن سچی تھی۔ تمہارے ابو اتنے چاہنے والے انسان ہیں کہ انھوں نے مجھے بالآخر پا ہی لیا۔'' ثانیہ نے کہا تو زونی سر اونچا کر کے ماں کا چہرہ دیکھنے لگی اسے شک سا ہوا تھا جیسے ثانیہ کے الفاظ میں نمی سی رچی ہوئی ہے۔

''امی آپ ابو کو پا کر خوش ہیں؟''

''یہ کیسی بات کی ہے احمق لڑکی۔ جس شخص کو میں نے دل و جان سے چاہا اور اس کو پانے کے لیے منتیں مرادیں مانگیں۔ سجدے کیے۔ اس کو پا کے ناخوش ہونے کا تو تصور بھی گناہ ہے۔'' ثانیہ کو ہلکی سی تپ چڑھی۔

''مگر مجھے آپ خوش دکھائی نہیں دیتیں مانا کہ ابو نے آپ کو کسی زمانے میں ٹوٹ کے چاہا ہوگا مگر انہوں نے اب شادی کے بعد اپنے گھر کے ایک کونے میں کسی بے کار شے کی مانند پھینک دیا ہے۔'' زونی کے اندر کا غبار باہر آنے لگا۔

''زونی۔ فضول باتیں مت کرو۔ آذر اتنی محبت کرتے ہیں تم خواہ مخواہ بدگمان ہو رہی ہو بیٹا۔'' ثانیہ وضاحتیں دینے لگی۔

''نہیں امی میں بدگمان نہیں ہو رہی میں سچ بول رہی ہوں محبت کرنا پا لینا اتنی بڑی بات نہیں ہے مگر اس محبت کو بنانا سنوارنا اور روز اسے پالش کرنا ایک الگ بات ہے۔ روز محبت کی آبیاری کرنا پڑتی ہے۔ سوری ٹو سے مگر میں اس محبت پر یقین نہیں رکھتی جس میں کیئر نہ ہو عزت نہ ہو احساس نہ ہو۔ اور ابو نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ کیا وہ آپ کو پورے دن میں پانچ منٹ کی کال بھی نہیں کر سکتے۔ کیا کوئی میسج۔ کچھ بھی نہیں۔ اور رہی بات دن رات محنت کرنے کی تو کیا آپ بتا سکتیں ہیں کہ ابو نے پورے سال میں آپ پر یا مجھ پر کتنے پیسے خرچ

کیے؟ امی زیادہ نقصان اس محبت میں آپ کا ہوا ہے آپ پنجاب یونیورسٹی کی ماسٹرڈگری ہولڈر ہیں اور آپ ابو کی محبت میں شہر چھوڑ کر گاؤں میں چلی آئیں۔ اتنی طاقت تھی آپ کی محبت میں کہ سالوں آپ نے اپلے تھاپے۔ اپلے جلا کے کھانا پکایا۔ شہر کی سہولیات چھوڑ کر اس پسماندہ گاؤں میں رہنے لگیں۔ آپ بہت عظیم ہیں امی۔'' زونی دکھ سے کہنے لگی۔

''تمہارے ابو بھی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔'' ثانیہ کو خود اپنی آواز کانپتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''رہنے دیں امی۔ کسے بہلا رہی ہیں مجھے یا خود کو۔ کیا محبت ایسی ہوتی ہے۔ کوئی ایک محبت سے لبریز جملہ آپ نے کتنے دنوں سے مہینوں یا سالوں سے ابو کے منہ سے نہیں سنا ہوگا۔ لعنت ہے ایسی نام نہاد محبت پہ کہ اپنی محبت حاصل تو کر لی مگر اسے ماں بہنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ وہ جو جی میں آئے سلوک کریں، جیسے چاہیں بے عزت کریں۔ اگر یہ محبت ہے تو ہزار بار لعنت ایسی محبت پر۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ آپ سے شادی کر کے شرمندہ ہیں، پچھتا رہے ہیں۔ ان کے دل پر بوجھ ہے کہ وہ اماں کی نافرمانی آپ کے لیے کر چکے ہیں۔ اور اب اس بوجھ کو کم کرنے کے لیے آپ کو دیوار سے لگا دیا۔ اپنی بہنوں کے لیے بینک سے قرض لے کر دھوم دھام سے شادیاں کیں ان کی تاکہ اماں خوش ہو جائیں مگر ان کو خوش ہونے کی عادت ہی نہیں ہے۔ سدرہ پھپھو کو پرائیویٹ کالج میں پڑھایا اور اپنی اکلوتی بیٹی کو سرکاری کالج میں۔ اسی لیے میرا پڑھائی میں دل نہیں لگتا۔ انہوں نے کبھی نہیں پوچھا کہ زونی تم کیسی ہو، پڑھائی کیسی ہو رہی ہے۔ سالگرہ کبھی نہیں منائی بلکہ ان کو تو یہ بھی علم نہیں ہوگا کہ میری ڈیٹ آف برتھ کیا ہے تو وہ مجھے گفٹ کیا دیں گے۔ میرے اور آپ کے لیے ان کے پاس نہ ٹائم ہے نہ پیسہ اور نہ ہی بچی کھچی محبت۔ ان کا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا ہے مگر دادی پھر بھی خوش نہیں۔ وہ کبھی خوش ہوں گی بھی نہیں۔'' زونی نجانے کب کب کی دبی ہوئی بھڑاس نکال رہی تھی اور ثانیہ کسی مجرم کی مانند دم سادھے سن رہی تھی رات بہتی جا رہی تھی تارے مدھم پڑ گئے زونی بول بول کے تھکی تو سو گئی مگر ثانیہ ساری رات سو نہیں پائی تھی۔

☆☆☆

زونی چھت پر پتنگ اڑا رہی تھی ساتھ والوں کی رامین کے ساتھ اس نے پیچا لگا رکھا تھا اس نے بڑی سی پتنگیں راجو سے شہر سے منگوائی تھیں۔

نوشی اور رامین بھی دادی کی نظر سے بچتے بچاتے ان کی چھت پر آ گئی تھیں۔ اب بہت مزا آنے والا تھا۔

''راجو بھائی تم سے ایویں فلرٹ کر رہے ہیں۔'' زونی نے اس پر چوٹ کر کے گویا نوشی کو تڑپا کے رکھ دیا تھا۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو زونیہ۔'' وحشت زدہ سی آنکھیں پھیل گئیں۔

''ہاں نا مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔'' زونی نے لاپروائی سے کندھے اچکائے گویا وہ اسے اکسا رہی تھی۔

''نہیں زونی۔ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ وہ مجھ سے اتنا پیار کرتا ہے کہتا ہے صرف تم سے شادی کروں گا اور شہر میں بڑا سا گھر لے کر دوں گا۔'' اس کی آنکھوں کی جوت جلنے لگی۔ وہ دور کہیں کسی بیتے پل کے حصار میں مقید بتاتی چلی گئی۔

''اچھا۔'' زونی نے دانستہ اچھا لفظ کو کھینچا تھا۔ نوشی سر جھکائے اپنی انگلیاں مروڑتی رہی، حیا سے اس کی پلکیں جھکی جا رہی تھیں۔

''اور کیا کہتا ہے بتا نا۔'' زونی نے شرارت سے نچلا ہونٹ لبوں تلے دبا کر گوشی کو گدگدایا تو وہ معصوم بچیوں کی طرح دہری ہوتی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتی جا رہی تھی۔ تبھی اس نے اپنے مہندی والے ہاتھ زونی کے آگے کر دیے۔

''راجو میرے لیے مہندی لے کر آیا تھا اور یہ انگوٹھی بھی۔'' نوشی نے ہاتھ آگے کیا۔

''لو یہ کون سی بڑی بات ہے۔ سستی سی ہے۔

کون سی کولڈ کی ہے۔'' زونی نے برا سا منہ بنایا۔

''زونی تم محبت کو پیسوں میں تولنے لگی ہو۔'' نوشی نے کسی فلاسفر کی طرح کہا۔

''تولنا تو دور کی بات ہے۔ میں تو محبت محبت کو سرے سے مانتی ہی نہیں ہوں۔'' زونی کے لہجے میں ہلکی سی تلخی سی در آئی۔

''مگر میں تو مان چکی ہوں سر بھی جھکا چکی اور محبت کے آگے گھٹنے بھی ٹیک چکی ہوں۔'' وہ محبت کی اسیر تھی محبت کا ذائقہ اس نے نیا نیا چکھا تھا اس کے سرور اور خماری کو اپنے تن من میں اتار کر سیرابی پائی تھی۔

''مرد صرف اس وقت تک محبت محبت کا راگ الاپتا ہے جب تک عورت اس کی دسترس میں نہیں ہوتی تب تک اس کی تڑپ برقرار رہتی ہے۔ جیسے ہی وہی مرد اسی عورت تک رسائی حاصل کر کے اسے پا لیتا ہے تب وہی عورت اپنی قدر و منزلت کھو دیتی ہے، بے مول ہو جاتی ہے۔ وہ اسی چاہنے والے کے لیے کچھ نہیں رہتی۔'' زونی ثانیہ کو سوچ کے کہہ رہی تھی۔

''پتا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔'' نوشی ناسمجھی سے بولی۔

''چلو ایسا کرو اسے کہو چاچا کرمو کو تیرے ابا کے پاس رشتہ لینے بھیجے۔ لگ جائے گا پتا۔ کتنا وفادار ہے آزمائش شرط ہے۔''

''وہ یہ بھی کر گزرے گا۔ ہر آزمائش پر پورا اترے گا مجھے یقین ہے۔'' نوشی ایک وثوق سے بولی۔

''اللہ کرے یہ تمہارا یقین قائم رہے مگر میرا دل نہیں مان رہا۔'' وہ نجانے کیوں محبت سے بدگمان تھی

''لگی شرط۔'' نوشی نے ہاتھ آگے بڑھایا تو زونی نے بنا سوچے سمجھے تھام لیا۔

''اگر راجو نے اپنے ابا کو رشتہ لینے بھیج دیا تو سمجھ جانا کہ راجو مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس طرح میں شرط جیت جاؤں گی اور تمہیں مجھے اپنی دادی کا کالے رنگ والا مرغا ذبح کر کے کھانا کھلانا ہو گا۔ منظور۔'' نوشی نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا ایک لمحے کے لیے زونی کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کے ٹھہر گیا۔

اوئی، اگر دادی کو پتا چل گیا تو مجھے مرغے کے ساتھ ہی کاٹ دیں گی مگر دوسری طرف اسے یہ بھی یقین تھا کہ راجو چاچا کرمو کو نہیں منا پائے گا۔ وہ ایک تذبذب کی کیفیت میں چند لمحے اٹکی رہی پھر مسکرا کر اس نے نوشی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ ہی دیا۔ اور پھر اگلے کچھ دن بعد ہی کمال ہو گیا جب نوشی نے اسے آ کر خوش خبری سنائی تھی۔

نوشی نے تو اپنی محبت کا یقین دلایا تھا اور زونی نے نوشی کے سامنے شو بھی ایسے ہی کیا تھا جیسے وہ راجو کی نوشی کے لیے اتنی محبت پر رشک کر رہی ہو۔ واقعی راجو نے تو کمال ہی کر ڈالا تھا۔ بات طے ہونے پر چاچا کرمو نے سارے محلے میں راجو کی بات پکی کرنے پر مٹھائی بانٹی تھی۔

راجو جی دار نکلا تھا اس نے وہ کر دکھایا جو زونی کے وہم و گمان میں نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ راجو یا نوشی میں کوئی کمی تھی جوان کے والدین مانتے نہیں۔ مگر پھر بھی اتنی کم عمری میں اپنے باپ سے اپنی شادی کی بات کرنا اور منوا بھی لینا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ زونی کو یقین تھا کہ راجو کو خوب گالیاں پڑیں گی ہو سکتا ہے مار شار بھی پڑ جاتی مگر اس کے توقع کے خلاف سب اچھا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''بہت بہت مبارک ہو۔'' زونی نے اسے اپنے ساتھ لپٹایا۔ آج بھی وہ تینوں اسی کی چھت پر تھیں اس دن بحث مباحثہ میں پتنگ بازی کا پروگرام ملتوی ہو گیا تھا مگر آج وہ پھر سے سارا سامان پھیلائے بیٹھی تھیں۔

''خیر مبارک مگر اپنا وعدہ یاد ہے نا۔''

نوشی نے اسے کہنی سے ٹہوکا دیا۔

''آہو یاد ہے۔ مل گیا مل گیا۔'' وہ چلانے لگی۔

اس نے فل والیوم میں گانا لگایا۔اور موبائل چھت کی منڈیر پر رکھ دیا۔

''پتنگ باز سجنا سے۔ پتنگ باز بلما سے۔
آنکھوں آنکھوں میں الجھی ڈور
لگا پیچا تو مچ گیا شور
کہ دل ہوا بوکاٹا...... کہ دل ہوا بوکاٹا

زونی کے ساتھ اس کی ساری دوستیں شور کر رہی تھیں وہ سب پتنگ بازی میں اتنی مگن تھیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ موج مستی ہنسی خوشی وہ آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرتی پتنگیں دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہی تھیں۔ سب ہی مسرور تھے تبھی زونی نے رامین کی پتنگ لوٹ لی اور اس کے بعد جو ان سب نے دھما چوکڑی مچائی شور شرابا۔ سب مل کر ڈانس کرنے لگیں۔ نیچے دادی کو ایسا لگ رہا تھا کہ زلزلہ آگیا ہو، چھت ہل کر رہ گئی ہو اور ابھی دھڑام سے چھت ان کے سر پر آن گرے گی اور وہ ملبے تلے دب کر مر جائیں گی۔ دادی نے نیچے سے چلانا شروع کر دیا۔ وہ اپنے گھٹنوں کے درد سے اتنی عاجز تھیں کہ سیڑھیاں چڑھنا ان کے بس کی بات نہیں تھی ورنہ اس سے ان کا دل اتنا کرلا رہا تھا کہ وہ چھت پر جا کر زونی کا جوتے مار مار کر وہ حشر کریں کہ سارا محلہ دیکھے۔ مگر ہائے یہ گھٹنوں کا درد۔ کہیں اور بس نہ چلا تو ثانیہ کے لتے لینے شروع کر دیے۔ ثانیہ کان لپیٹے کام میں لگی رہی۔

''اوہو اماں۔ بس بھی کر دیں۔ بچی ہے ذرا اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہلا گلا کر لینے دیں۔'' عمارہ نے تنک کر کہا تو اماں نے گھوری ڈال کر اسے دیکھا مگر وہ سٹپٹانے والوں میں سے نہیں تھیں۔

''ارے میری بیٹیاں اس عمر میں......؟'' اس سے پہلے کہ اماں کا بیٹیاں نامہ شروع ہوتا عمارہ نے ان کی بات اچک لی۔

''ساری مائیں کو ہی اپنی بیٹیوں میں گن نظر آتے ہیں میری امی بھی اپنی بہوؤں کو میری مثالیں دیتی رہتی ہیں۔ میری عمارہ یہ اور میری عمارہ وہ۔ اور ادھر آپ کو یعنی کہ میری ساس کو مجھ میں سرے سے کوئی خوبی دکھائی ہی نہیں دیتی۔'' عمارہ نے خوب دل کی بھڑاس نکالی مگر صاف دلی کے ساتھ۔ اماں پہلو بدل کر سیدھی ہوئیں۔

''ویسے خدا لگتی کہوں گی تیری ماں نے کچھ اور سکھایا ہو یا نہ ہو مگر زبان چلانی خوب سکھائی ہے بی بی۔ یہ میرا اپنی پوتی کے ساتھ مسئلہ تھا تمہیں کیا پڑی کسی اور کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی۔ مگر ناجی نا۔ بہت شوق ہے بہو رانی کو زبان دانی کے جوہر دکھانے کا۔'' اماں تپ گئیں

اس کے بعد اللہ دے اور بندہ لے کے مصداق ساس بہو کی خاصی منہ ماری ہوئی۔ اور چھت پر زونی نے الگ طوفان اٹھا رکھا تھا۔

☆☆☆

ثانیہ کی آذر سے محبت کی شادی تھی۔ آذر اور ثانیہ اکٹھے یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ آذر اماں کا وہ بیٹا تھا جس سے ان کی بہت سی امیدیں جڑی ہوئی تھیں۔ ہونہار تابعدار اور پڑھا لکھا۔ اماں اس کی کہیں اونچی جگہ بولی لگانا چاہتی تھیں۔ کسی امیر کبیر گھرانے میں اس کی شادی کر کے شریکوں کو جلانا چاہتی تھیں۔ وہ خوابوں ہی میں یہ سوچ سوچ کر خوشی سے سرشار ہوتی رہتیں کہ جب چاند سی دلہن اس کچے آنگن میں اترے گی اور اس کے آگے پیچھے جہیز کے ٹرک بھی آئیں گے تب سب جل بھن کر کوئلہ ہو جائیں گے۔ وہ اونچے خواب سب ملیا میٹ ہو گئے جب آذر نے ثانیہ سے شادی کا کہا۔ ثانیہ غریب گھر سے تھی اوپر سے کم رو بھی۔ مگر بقول اماں کے آذر کو نجانے اس میں ایسا کیا بھا گیا تھا جو وہ ایک ہی بات پکڑ کے بیٹھ گیا تھا۔ خیر آذر کے مجبور کرنے پر اماں نے ثانیہ کو اپنی بہو بنا تو لیا تھا مگر اپنے دل سے وہ یہ بات نکال نہیں سکی تھیں کہ آذر نے اماں پر ثانیہ کو ترجیح دی ہے۔ اب اماں اپنے بیٹے کو تو کچھ کہتی نہیں تھیں مگر ثانیہ کے خلاف ان کے دل میں اتنا بغض اور کینہ بھرا ہوا تھا اسی لیے وہ ثانیہ کی تذلیل کا کوئی موقع

ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں۔

شروع شروع میں ثانیہ نے آذر کو بتانا چاہا گلہ کرنے کی کوشش کی مگر آذر نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ثانیہ کو اہمیت نہیں دیتا تھا یا شادی کے بعد اس کی محبت کم پڑ گئی تھی ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ بس یہ تھا کہ وہ اماں کا دل سے شکر گزار تھا کہ وہ ثانیہ اور آذر کے راستے کی دیوار نہیں بنی تھیں۔ ان کو ملا دیا تھا۔ اگر اماں ان کی محبت کو انا کا مسئلہ بنا لیتیں تو ان کا ملاپ کبھی ممکن نہ ہوتا۔ اس لیے وہ اب اماں کے بارے میں چھوٹی سی بات بھی سننے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔

آذر کی بات کسی حد تک ٹھیک تھی اور ثانیہ کے دل کو بھی لگی تھی۔ وہ آذر کی محبت پا کر اتنی نہال تھی کہ وہ اماں کی تحقیر سے لبریز کڑوی کسیلی با آسانی سہنے لگی تھی ان کی باتیں برداشت کر کے وہ گھر کا ماحول پر سکون رکھ سکتی تھی اس لیے ثانیہ نے ایک گہری چپ کو اپنا اوڑھنا بچھونا ہی بنا لیا صبر بس صبر۔

اماں ذرا ذرا سی بات پر ثانیہ کو ماسٹر ڈگری کا طعنہ مارا کرتی تھیں۔ وہ جان بوجھ کر اس کی توہین کرتی تھیں مگر وہ سر جھکائے گھر کے کام کاج میں لگی رہتی۔ کبھی جہاں برداشت کی حد ختم ہونے لگتی وہاں وہ کسی کونے کھدرے میں چھپ کر آنسوؤں کے راستے اپنی ساری اذیت بہا دیتی۔ زبان کو اس نے اپنا ہتھیار کبھی نہیں بنایا تھا اور نہ ہی ذو معنی جملوں کی آڑ میں کسی کی تحقیر کرنا ثانیہ کی عادت تھی۔ گھما پھرا کے بات کرنے سے بھی اسے چڑ تھی۔ وہ اچھی سلجھی سوچ کی مالک تھی دھیمے لہجے میں بات کرتی تھی۔ دوستانہ طبیعت کی مالک تھی مگر سسرال میں کوئی اسے ڈھنگ سے منہ ہی نہیں لگاتا تھا، اس لیے وہ بھی اپنی ذات میں ہی سمٹ کر رہ گئی تھی۔

ہاں اس کی دیورانی عمارہ بہت اچھی فطرت کی تھی۔ ثانیہ کی بہت عزت بھی کرتی تھی اور اسے بڑا سمجھ کر احساس بھی کرتی تھی مگر وہ ثانیہ جیسی بالکل نہیں تھی۔ نند ہو یا ساس وہ سب کو ایک کی دو سناتی تھی جو بھی اس کے ساتھ تیزی طراری دکھانے کی غلطی کرتا اسے اگلے ہی پل منہ کی کھانا پڑ جاتی تھی۔ اس کے اندر لحاظ مروت تو بہت تھا مگر صرف اچھوں کے لیے۔ جو اسے اپنا ایک ہاتھ دکھاتا تھا وہ اپنے دونوں ہاتھ اسے کم از کم ایک بار ضرور دکھاتی تھی۔ اس کے بعد مقابل خود ہی محتاط ہو جاتا تھا۔ عمارہ ایک کی چار سنا کے بھڑاس نکال لیتی تھی اور ثانیہ کو کبھی برا لگتا تو کبھی کبھی اچھا بھی لگتا تھا۔ کم از کم وہ ہمت والی تو تھی نا۔

جب وہ بیاہ کر آئی تو بھرا پرا سسرالی خاندان تھا آذر نے اپنی دو بہنوں اور ایک بھائی کی شادی خود کما کر کی تھی۔ ثانیہ ساتھ دینے اور ساتھ نبھانے والی بیوی کا کردار پچھلے اٹھارہ سالوں سے نباہ رہی تھی۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی زونیہ آذر۔ اونچی لمبی گوری چٹی زونی کا پڑھائی لکھائی سے دل گھبراتا تھا۔ اس کا دل کوکنگ میں لگتا تھا۔ وہ مختلف ڈشز ٹرائی کرتی رہتی تھی اور شومئی قسمت کے ہر بار اچھی بن بھی جاتی تھی۔ اسے کپڑے سلائی کرنے اور نت نئے ڈیزائن کے ڈریس پہننے کا بھی شوق تھا۔ سترہ سال کی تھی ایک بار میٹرک میں فیل ہو چکی تھی اب بھی بیٹھ کر اپنی اسٹڈی پر دھیان دینے کے بجائے وہ ایسی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی رہتی تھی دل کی بہت اچھی حساس لڑکی تھی۔ اماں کا نشانہ آج کل زونی زیادہ بن رہی تھی۔

سدرہ اماں کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی بلا کی ذہین فطین۔ امتل اور سائرہ پڑھائی میں بس گزارا ہی تھیں مگر سدرہ نے تو سب کا ریکارڈ توڑ ڈالا تھا اس نے کراچی یونیورسٹی سے بائنی میں ایم ایس سی کی تھی اب وہ وہیں وومن ہاسٹل میں رہتی تھی اور کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتی تھی۔ اماں کی بہت چہیتی اور لاڈلی تھی سدرہ۔ واجبی سی شکل وصورت والی سدرہ کی تعلیم پر لاکھوں روپیا آذر نے لگایا تھا۔ بہت دل سے اور محبت کے ساتھ آذر نے سدرہ کا سارا خرچا اٹھایا تھا اس کے ناز نخرے اٹھائے تھے۔ وہ اپنے بہن بھائیوں سے بہت محبت کرتا تھا اور اپنی اماں کی خوشی کا

بہت خیال رکھتا تھا۔ بس اس نے اپنی صرف ایک ہی خوشی پوری کی تھی ساری زندگی میں، ایک ہی بار اماں کے آگے سر اٹھایا تھا اور وہی سب سے بڑا جرم بن گیا تھا وہ سر پھر ایسا جھکا تھا کہ دوبارہ کبھی اٹھ نہیں پایا تھا۔

خیر بات ہو رہی تھی، سدرہ کی تو اب سدرہ اپنے دونوں بھائیوں کے برابر کمار ہی تھی اور اماں اٹھتے بیٹھتے سب کو یہ بات سناتی اور جتاتی رہتی تھیں۔

وہ الگ بات ہے کہ سدرہ اپنے سارے پیسے اپنے اکاؤنٹ میں ہاتھ کے ہاتھ ہی جمع کروا دیتی تھی۔ گھر پر خرچ کرنا تو درکنار وہ تو اپنی اماں کے ہاتھ پر بھی ایک دھیلا تک نہیں رکھتی تھی۔ بڑی پکی ہوگئی تھی خود کو کوئی دانشور سمجھنے لگی تھی۔ کسی کو کچھ گردانتی ہی نہیں تھی۔ خود کو ہی عقل کل سمجھ کر سب پر اپنی فوقیت جمانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ اماں کو آج کل اس کی شادی کی فکر ستاتی رہتی تھی۔ بتیس سال کی ہونے والی تھی۔ مگر اماں ہر کسی کو یہی کہا کرتی تھیں کہ میری سدرہ تو ابھی پچیسویں میں لگی ہے کافی سالوں سے وہ یہی بات کرتی آ رہی تھیں، مجال ہے کبھی اماں نے سدرہ کو چھبیسویں میں قدم رکھنے دیا ہو۔ سب اماں کی یہ بات سنتے اور مسکرا دیتے تھے۔

☆☆☆

بابا غلام سائیں کے میلے میں گھوڑے کا رقص پیش کیا جاتا تھا۔ شہر سے لوگ آ رہے تھے بڑے بڑے رئیس لوگوں کے ایسے شوق ہوتے ہیں غریب لوگ اتنے امیرانہ شوق کہاں پال سکتے ہیں۔ گھوڑوں کے رقص کا مقابلہ تھا۔ پورا سال ان گھوڑوں کو رقص کرنا سکھایا جاتا تھا ان کی خوراک کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا اور گھوڑوں کو رقص سکھانے والے ٹرینر رکھے جاتے تھے ان کو ماہانہ تنخواہ اتنی دی جاتی تھی جتنی گاؤں میں کسی کی سوچ بھی نہیں تھی۔

ایسی کوئی محفل سجانا پنڈ کے لوگوں کے بس کی بات تھی ہی کہاں۔

ملک بشارت سارا انتظام کرواتا تھا۔ وہ ایک سیاسی لیڈر تھا اس کا تعلق تو اسی گاؤں سے ہی تھا مگر رہتا شہر میں تھا اس گاؤں کے اندر اس نے کبھی کوئی کام کروانے کی کوشش نہیں کی تھی کئی بار ایم۔ این۔ اے بن چکا تھا مگر حکومت کی طرف سے ملنے والی گرانٹ ہمیشہ اس کے اپنے گھر پر ہی لگتی تھی۔ سنا تھا ملک شوکت کا بڑا ہی شاندار بنگلا تھا اور اس کا امیرانہ رہن سہن دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا ملک ارباز۔ اکثر گاؤں آتا رہتا تھا۔ پڑھا لکھا تو کوئی اتنا نہیں تھا مگر تھا بہت شاندار شخصیت کا مالک۔

ملک شوکت کی زمینوں پر چار چار ٹریکٹرز کام کر رہے تھے زمین نرم کی جا رہی تھی۔ اور یہیں گھوڑوں کا رقص پیش کیا جانا تھا۔ ملک شوکت کے کارندے آج کل گاؤں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ زمین سیٹ کروا کے دوسرا کام ٹینٹ لگوانے کا تھا۔ شامیانے لگائے جا رہے تھے گاؤں کے لوگ ہمیشہ کی طرح بہت پر جوش تھے۔ ان کو پورا سال اس ایونٹ کا انتظار رہتا تھا۔ دور دور سے لوگ اس منظر کا نظارہ کرنے آتے تھے۔ عورتوں کے لیے الگ سے انتظام ہوتا تھا گو کہ گاؤں میں پردے وغیرہ کا کوئی خاص اہتمام کبھی بھی نہیں کیا جاتا تھا مگر اس طرح کے کاموں میں جس میں شامل ہونے کے لیے لوگ دوسروں شہروں سے بھی آیا کرتے۔ اس لیے گاؤں کی لڑکیوں اور عورتوں کے لیے الگ شامیانے لگتے تھے۔ وہ چھپ چھپ کے دیکھا کرتی تھیں۔

کیسا سماں تھا شہر سے لوگ آنا شروع ہو چکے تھے۔ امراء کے نرالے شوق ہوتے۔ گاڑیوں کے بھاری پہیے چرچرانے کی آوازیں دن چڑھتے ہی آنا شروع ہو چکی تھیں۔ گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں جوان دلوں میں امنگیں جگا رہی تھیں۔ بہت سے لڑکے لڑکیاں گھوڑوں کا رقص دیکھنے کے شیدائی تھے اور بہت سارے ایسے بھی تھے جو اپنی پیاسی آنکھوں کو اپنے اپنے محبوب کے دیدار سے سیراب کرنے کی چاہ میں بے چین ہو رہے تھے۔ سب مہمانوں کو ملک شوکت کی حویلی میں ٹھہرا دیا گیا تھا۔ انواع و اقسام کے کھانوں سے شہری مہمانوں کی تواضع کی جاتی

تھی۔ مچھلی کو دو دن پہلے سے ہی مسالا لگا کے رکھ دیا جاتا تھا۔ کوئلوں پر مچھلی تیار کرنے کے لیے اسپیشل کک شہر سے بلوائے جاتے تھے۔ پنڈ کی ساری لڑکیاں حویلی کام میں مدد کرنے کے لیے لازمی جایا کرتی تھیں۔ ان کی حویلی میں نوکروں کی فوج تھی مگر بڑی بی بی ملکانی اتنی اچھی نیک دل خاتون تھیں کہ ان کی محبت میں سب لڑکیاں ان کے ایک بلاوے پر ان کی حویلی پہنچ جاتی تھیں۔ بڑی بی بی کسی کو کم تر نہیں سمجھتی تھیں۔ سب کے ساتھ محبت سے پیش آتی تھیں۔ ان کا مقصد ہوتا تھا کہ ہنسی خوشی سارا کام بھی مل جل کر ہو جائے گا اور لڑکیاں کھانا بھی کھالیں گی۔ بڑی بی بی واپس آتی ہوئی سب لڑکیوں کو کھانا پیک کر کے بھی دیا کرتی تھیں۔

مگر نجانے کیوں زونی کبھی حویلی نہیں گئی تھی حالانکہ بلاوا اسے بھی ہر سال آتا تھا۔ مگر پتا نہیں زونی کا کبھی دل مانتا ہی نہیں تھا۔ اور لڑکیاں حویلی کی شان و شوکت کے قصے دنوں دہراتیں۔ بڑی بی بی کے پیار اور اخلاق کا ڈھنڈورا پیٹتی رہتیں۔ زونی عدم تو جہی سے ان کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی۔

''سچ میں ان کا بیٹا کیا لگتا ہے زونی۔ تو دیکھتی نا تو فٹ سے اس پر مرمٹتی۔ قسم سے۔'' رامین ملک شوکت کے بیٹے کی تعریف میں رطب اللسان تھی زونی جی بھر کر بدمزا ہوئی۔

''منہ دھو رکھو۔ میں اور کسی ایرے غیرے پر مر مٹوں۔ پاگل ہوں کیا۔'' زونی غصے سے بولی۔

''وہ ایرا غیرہ نہیں ہے۔ ملک شوکت کا اکلوتا بیٹا ہے۔'' نوشی نے جتایا۔

''تو.....؟'' زونی نے ابرو اچکائے۔

''تو یہ کہ.....'' زونی نے اس کی بات کاٹی۔

''میں اس ملک کے بیٹے کے متاثرین میں سے بالکل نہیں ہوں۔ اس لیے یہ اونگی بونگی باتیں چھوڑو۔'' زونی نے اسے جھاڑ کر رکھ دیا۔

''آج تم پہلی بار اسے دیکھو گی اور میرا دعوا ہے کہ دیکھتی ہی رہ جاؤ گی۔'' رامین اسے چیلنج کر رہی تھی۔

''او کے۔ دیکھتے ہیں۔'' زونی اترائی۔

''اسے نظر انداز کرنا آسان نہیں ہے۔'' وہ پتا نہیں اتنی تعریفیں کیوں کر رہی تھی۔

''میرے لیے ہے۔'' زونی نے کندھے اچکا کر کہا۔

رامین اور نوشی نے ایک دوسرے کو دیکھا اور زونی کے خراب موڈ کے پیش نظر وہاں سے ہٹ گئیں۔

☆☆☆

سدرہ گھر آئی تھی چھٹیاں لے کر اور جب آئی تھی خوب لمبی تان کر سو رہی تھی نجانے یہ کیسی تکان تھی جو اترنے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ وہ پچھلی رات کی سوئی ہوئی تھی اور ایسے گدھے گھوڑے بیچ کر سدھ ہوگئی تھی جیسے کوئی نشہ کیا ہوا ہو۔ اور اماں کا کماؤ پوت تھی سدرہ، اس لیے اس کا لاڈلا ہونا تو بنتا تھا نا۔ اماں زعم سے سدرہ کو دیکھتے ہوئے قربان ہوتی رہتیں۔

زونی اکثر سوچا کرتی تھی کہ اگر سدرہ پھوپھو دادی کا کمانے والا بچہ ہے تو پھر ابو کس خوشی میں دیار غیر کی خاک چھانتے پھر رہے ہیں۔ لوٹ کر واپس آ کیوں نہیں جاتے۔ اس کی زہریلی سوچیں اس کے اندر ہی دم توڑتی جاتی تھیں۔

زونی آج کل ایگزامز کے لیے فری تھی کالج والوں نے فارغ کر دیا تھا اور زونی حسب روایت کسی پرسکون کونے میں بیٹھ کر اپنے ایگزام کی تیاری کرنے کے بجائے آج کل کچن میں گھسی رہتی تھی اس کو نت نئی ڈشز بنانے کا جنون اکثر ہو جایا کر مگر ثانیہ اسے کچن میں کم ہی گھسنے دیتی تھی اس کا تھا کہ بس تم دل لگا کے پڑھو اور بس اپنی پڑھا اپنی پوری توجہ مرکوز رکھو تا کہ اچھے مارکس لا سکو گی کو

ہمیشہ کی طرح سوائے پڑھنے لکھنے کے

کام میں دلچسپی تھی ہر کام کرنے کا شوق تھا۔
سدرہ اللہ اللہ کر کے بالآخر اٹھ ہی گئی تھی۔ مگر کسل مندی سے چارپائی پر لیٹی کروٹیں بدلتی رہی۔
''ٹھیک سے نیند آ گئی تھی نا۔'' اماں کمرے میں آ کر ایسے بولیں۔ جیسے سدرہ مہمان ہو۔
''ہاں اماں۔ بس آ ہی گئی۔'' سدرہ نے بے دلی سے کہا۔
''میں صدقے میری دھی۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔'' اماں کا یہ لب ولہجہ اس گھر کے رہنے والوں کے لیے تو پرایا ہی تھا۔ ساری شیرینی تو سدرہ کے لیے ہی اماں کے لہجے سے ٹپکتی تھی۔ مگر سدرہ اتنا ہی بے زار رہتی تھی۔ وہ بھی عجیب سی ہی تھی۔ نک چڑھی۔ نخریلی سی۔
''اماں۔ ناشتا بنوا دو۔ بھوک لگ رہی ہے۔''
''اچھا۔ میں کہتی ہوں اس زونی سے۔'' زونی کا نام لیتے ہی دادی پھر سے کڑوی ہو گئی تھیں۔
''اماں اسے کہنا مولی والا پراٹھا بنا دے۔ سچ مچ دال کرتا ہے۔'' سدرہ لاڈ سے بولی تو اماں فدا ہی ہو گئیں۔
''اچھا کہتی ہوں۔'' اماں نے محبت سے کہا۔
دادی نے قدرے نرمی سے زونی کو ناشتا بنانے کو کہا تھا۔ زونی ٹھٹکی۔ پھر مسکرائی۔ اور کچن کی طرف چلی گئی۔ دادی زونی کو ہمیشہ لکڑیاں جلانے کے لیے کہا کرتی تھیں۔ سلنڈر جب بھی استعمال ہوتا تو دادی بہت غصہ کرتی تھیں مگر آج بات اور تھی۔ زونی نے دھیان ہی نہیں دیا۔
زونی بہت نرم اور خستہ پراٹھا بناتی تھی۔ اس نے مولی کدوکش کی دو پراٹھے بنائے۔ دہی کٹوری میں ڈالا۔ مکھن بھی ایک کٹوری میں ڈالا اور ساری چیزیں ایک ٹرے میں رکھ کر سدرہ کے کمرے میں گئی۔ تب تک وہ بھی فریش ہو چکی تھی۔
''صبح بخیر پھپھو۔ پتا بھی ہے کتنا ٹائم ہو گیا ہے۔'' زونی دوستانہ مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولی۔
''شہر کی روٹین بہت تھکا دینے والی ہوتی ہے بہت تھک جاتی ہوں اور پتا ہے گھر آ کر بھی سارے کام خود ہی کرنے پڑتے ہیں۔'' سدرہ کے موڈ کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا پل میں تولہ اور پل میں ماشہ ہوتی تھی۔ خاص طور پر جب کوئی کام ہوتا تو خاصی اچھی بن جاتی تھی۔
''اسی لیے آپ اتنا سوئی نا۔'' زونی نے سمجھ کر کہا۔
''ہاں۔'' سدرہ نے پراٹھے کا نوالہ لیتے ہوئے کہا۔ زونی بھی چپ سی ہو گئی حالانکہ کے اس کا بڑا دل تھا کہ وہ پھپھو سے بہت ساری باتیں کرے۔ مگر وہ کچھ نہیں بولی۔ کیا پتا کب کیا برا لگ جائے۔
''تیاری کیسی چل رہی ہے ایگزام کی۔'' جس سوال سے وہ کتراتی تھی وہی کر دیا۔
''اچھی۔ اچھی۔'' زونی بوکھلائی۔
''تم اچھے سے ایگزام کی تیاری کرو زونی۔ اب لڑکی کا پڑھا لکھا ہونا بہت ضروری ہو گیا ہے ورنہ.....''
''ورنہ کیا.....'' زونی ادھوری بات کو اپنی مرضی کے معنی نہیں پہنانا چاہتی تھی۔
''ورنہ زندگی نہیں گزرتی۔'' سدرہ کی بات پر زونی افسردہ سی ہو گئی۔
''زندگی تو پڑھے لکھوں کی بھی نہیں گزرتی پھپھو، رک سی جاتی ہے۔'' زونی نے یاسیت سے کہا۔
''محنت کرنا پڑتی ہے۔ آگے بڑھنے کے لیے حوصلے اور ہمت کے ساتھ سچی لگن بھی بہت ضروری ہوتی ہے تبھی منزل ملتی ہے۔'' سدرہ کے لہجے میں تفاخر جھلکا۔ زونی نے توجہ سے اسے دیکھا۔ وہ خود کو سب سے الگ سمجھتی تھی کوئی اعلا وارفع ہستی۔
''کبھی کبھی لوگ قسمت کا لکھا بھی تو کھایا کمایا کرتے ہیں نا پھپھو۔ کوئی گن بھی نہیں ہوتا کوئی خوبی نہیں پھر بھی عیش کرتے ہیں دلوں پر راج کرتے ہیں اور کچھ لوگ ہر فن میں طاق ہونے کے باوجود بھی رل جاتے ہیں۔''

زونی کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش سدرہ کو محسوس ہوئی تھی۔ مگر زونی کو عادت نہیں تھی کسی کے سامنے بھی دل چھوٹا کرنے اور رونے کی۔

''پتا نہیں زونی تم کیا کہہ رہی ہو۔'' وہ چالاک لومڑی سی سدرہ سمجھ کر بھی نہیں سمجھی تھی کہ جس ایک آدمی نے اسے اعتماد اور محبت دے کر اس کی زندگی بنا دی تھی جس کے بل بوتے پر وہ آج اتنی پراعتماد تھی اسی ایک شخص نے۔ دوسری طرف اپنی ہی من چاہی بیوی کی زندگی برباد کر دی تھی۔ ثانیہ جو بلا کی پراعتماد تھی۔ اس گھر میں دھیرے دھیرے اس کا سارا اعتماد ریت کی دیوار ثابت ہو رہا تھا۔

''آپ کو سمجھ میں نہیں آنا۔ میں آپ کے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔'' زونی جاتے جاتے مڑی۔

''پھپھو آج گھوڑوں کا رقص ہوگا۔ آپ چلو گی۔''

''واٹ ربش میں کسی بھی ایسے بے ہودہ پروگرام میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ بگڑی۔

''یہ ثقافت ہے ہماری پھپھو۔ ہماری روایات اور کلچر ان ہی ساری چیزوں سے جڑا ہوا ہے۔ اچھا لگتا ہے۔'' زونی نرمی سے بول رہی تھی۔

''مگر مجھے نہیں پسند یہ لوک میلے۔ اور میلے ٹھیلے۔ ہوتا کیا ہے وہاں۔ گندے سے لوگ۔ ہی ہی کرتی بے وقوف سی لڑکیاں۔ اور انتہائی چھچھورے سے لڑکے جو وہاں ہونے والے کسی بھی تہوار کے بہانے آتے ہیں مگر مقصد ان کا ہوتا کچھ اور ہے۔ لڑکیوں کو تاڑنا۔ فقرے کسنا۔ اف بہت کوفت ہوتی ہے مجھے ایسی واہیات چیزوں سے۔'' زعم تھا جو چیخ رہا تھا شور کر رہا تھا۔ حالانکہ یہی بات وہ آرام سے بھی کہہ سکتی تھی۔ نہیں جانا نہ جانی سہولت سے انکار کر دیتی۔ مگر نہیں اس کو تو کیڑے نکالنے کی عادت تھی اپنے عالم فاضل ہونے کا مان تھا۔

''مگر پھپھو سچ میں بہت اچھا لگتا ہے سب سہیلیاں اکٹھی ہوتی ہیں، بہت ہنسنا کھیلنا۔ گیمیں لگاتے ہیں۔ بہت سارے لوگ جمع ہوتے ہیں نئے نئے چہرے دیکھنا بھی کیسا اچھا لگتا ہے۔ سچی۔''

زونی اپنے انداز میں بات کرتے کرتے رکی سدرہ کتنی ناگواری سے اسے گھور رہی تھی زونی واش سٹپٹائی تھی۔ زونی کو سدرہ آدم بیزار لگتی تھی۔ اسی گاؤں میں پیدا ہو کر اسی گاؤں میں کھیل کود کر جوان ہونے والی کو اپنے ہی وسیب سے اتنی بے زاری۔ حیرت کی بات تھی۔ اور اس کی اس گاؤں میں کوئی سہیلی بھی نہیں تھی۔

''یہ جاہلانہ رسم و رواج مجھے نہیں پسند۔ اور نہ ہی یہ پسماندہ گاؤں اچھا لگتا ہے نہ ہی اس میں بسنے والے بھانت بھانت کے لوگ۔ اوکے۔''

وہ اتنے غصے میں گرجی تھی کہ زونی کو سچ میں دکھ ہوا تھا کہ وہ اتنی مغرور ہے کہ گاؤں کے لوگوں کو کتنا حقیر سمجھ رہی ہے۔ اتنا تکبر۔ توبہ۔

زونی توبہ توبہ کرتی کمرے سے نکلی تھی اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا چائے بنانے کو۔ مگر مارے مروت کے وہ کچن میں چلی ہی گئی۔

☆☆☆

ڈھول کی تھاپ تیز سے تیز ہو رہی تھی۔ لڑکیوں کے دل اسی تھاپ پر دھڑک رہے تھے۔ بہت سے ڈھول والے ایک قطار میں کھڑے تھے۔ وہ اتنے ماہر تھے کہ ان سب کے ڈھول ایک ہی لے پر سر اور تال بکھیر رہے تھے۔ ایک پرکیف سا سماں بندھ گیا تھا۔ دلوں کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ بوڑھے جوان سب ہی تمتماتے چہروں کے ساتھ اس جگہ اکٹھے ہو رہے تھے جہاں پر گھوڑوں کا رقص پیش کیا جانا تھا۔ لائٹنگ کا ایسا انتظام کیا گیا تھا کہ دور دور تک روشنی سے جگمگاہٹ ہو رہی تھی ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی بڑے آدمی کے بیٹے کی شادی ہو ورنہ اس گاؤں کے لوگ اتنے صاحب حیثیت کہاں کہ اتنا خرچا کر سکیں۔ نوشی اور رامین زونی کو لینے آئی تھیں۔ صاف ستھرے سادہ چہرے۔ کسی بھی ملمع کاری سے مبرا۔ کوئی لپ اسٹک نہیں کوئی کاجل کی دھار نہیں۔ کوئی سنگھار نہیں۔ بس ایسی ہی تھیں اس گاؤں کی

لڑکیاں۔ زونی نے ثانیہ کو بتایا اور ان کے ساتھ نکل پڑی۔ وہ کھل کھل ہنستی تھیں وہ دل سے ہنستی تھیں۔ وہ اسٹیٹس کا نشش نہیں تھیں۔ سادہ اور معصوم سی لڑکیاں چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جانے والی۔ پہروں بے تکان بولنے والی۔ یہی ان کی متاع حیات تھی یہی ان کا کل سرمایہ زندگی۔ ان کو دنیا جہان کی ترقی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا ان کی اپنی دنیا تھی۔

وہ عورتوں والی لین میں جا کر بیٹھ گئیں۔ نوشی کی نگاہیں راجو کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

''سنا ہے مہمان خصوصی شہر سے آ رہا ہے کوئی ایم۔این۔اے ہے۔'' رامین نے اپنے طور پر بڑی خبر دی تھی۔

''یہ کون سا بڑی بات ہے ظاہر ہے ملک شوکت کے دوست ہی ہوں گے تو ان ہی کے ہم پلہ بھی ہوں گے۔'' زونی نے اس کی بات کو چٹکیوں میں اڑا دیا۔ وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اب وہ چاچا کرموکو تو مہمان خصوصی نہیں بنائیں گے نا۔

''ہاں یہ بھی ہے۔'' رامین نے اثبات میں سر ہلایا۔ زونی نے نوشی کو ٹہوکا دیا تو وہ گڑبڑائی۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔'' زونی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''کیا کہہ رہی ہو تم۔ میں نے سنا نہیں۔'' وہ ہونق سی بنی اسے دیکھنے لگی۔

زونی نے تاسف سے سر نفی میں ہلایا۔

''میں کہہ رہی ہوں مزا تو تب آتا جب ملک شوکت اپنے پنڈ کے لوگوں کو اسٹیج پر بلا کر عزت سے بٹھاتا۔ اور پنڈ کے ہی کسی بزرگ کو بطور مہمان خصوصی دعوت دیتا۔'' زونی کو اچانک سے ہی یہ احساس ہوا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ ہم کون ہیں۔ کوئی تماش بین یا بن بلائے مہمان۔

''چپ کر جاؤ کوئی سن لے گا۔'' رامین نے اسے ڈرایا۔

''سنتا ہے تو سن لے۔ میں کسی کے باپ سے نہیں ڈرتی۔'' زونی کی ساری توجہ اسی نکتے پر مرکوز ہو چکی تھی یہ بات اس کے دماغ میں اٹک گئی تھی۔ اسے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

''وہ پنڈ کے لوگوں کو کیوں اتنی اہمیت دیں گے بھلا۔ وہ بڑے گھمنڈی ہیں۔ ہاں بڑی بی بی بہت رحم دل ہیں۔ پر ہمارا کیا لینا دینا۔ آم کھاؤ گٹھلیاں گننے مت بیٹھو۔ کچھ نہیں نکلے گا۔'' نوشی کی بات پر زونی نے برا سا منہ بنایا۔

''جب میں گھر سے نکلی تھی ایسا کوئی خیال مجھے چھو کر بھی نہیں گزرا تھا مگر ابھی اچانک مجھے ایسا لگا۔ ہم کون ہیں ہماری کیا عزت ہے۔ ملک شوکت نے اتنا خرچا کیا۔ اپنے دوست بلائے۔ انہی کے لیے سارے انتظامات کیے انہی کے لیے کھانا بنوایا۔ ان ہی کے لیے اسٹیج سجایا گیا۔ اتنی روشنیوں اور قمقموں کا انتظام کیا گیا۔ کیا مقصد تھا۔ اس میں ہماری تو کوئی بھلائی نظر نہیں آ رہی۔'' اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ گاؤں کے سارے بزرگ کھڑے تھے۔ کرسیوں پر شہر کے معززین براجمان تھے۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں۔'' رامین حیران تھی۔

''مل گیا۔'' نوشی نے نعرہ بلند کیا اسے راجو نظر آ گیا تھا۔ رامین نے اسے چٹکی کاٹی مگر زونی نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

گھوڑوں کا رقص شروع ہو چکا تھا۔ مگر زونی چپ سی تھی اسے کچھ کھٹک رہا تھا۔ چاچا دینو کتنی دیر سے کھڑا تھا۔ ملک شوکت اور اس کے دوست ہنس رہے تھے ان کی ہا ہو میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کوئی کمی کمین ہیں۔

زونی کی نگاہیں بار بار اپنے پنڈ کے بزرگوں کو دیکھ رہی تھیں۔ جو کھڑے ہو کر ایسے رقص دیکھ رہے تھے جیسے یہ رقص نہ دیکھا تو کسی گناہ کبیرہ کے مرتکب ٹھہرائے جائیں گے۔ زونی کا دل بہت سی اداسی سمیٹ رہا تھا غصہ بھی بہت آ رہا تھا۔ وہ پہلے بھی ایک دو بار آئی ضرور تھی مگر اس طرح اس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ کم عمر تھی گہرائی سے کب کچھ سوچا کرتی تھی۔

''ہم کیوں آئے ہیں۔ ہمیں نہیں آنا چاہیے تھا۔ جہاں پر عزت نہ ہو وہاں کبھی نہیں جانا چاہیے۔'' زونی کی سوئی اسی ایک جگہ پھنس گئی تھی

''ہر سال آتے ہیں۔ سارا پنڈ آتا ہے۔ سب کچھ پہلے جیسا ہی ہے زونی۔'' نوشی نے ہولے سے کہا۔

''بن بلائے آتے ہیں۔ ہم ہیں کون۔ ہم غلام ہیں کیا ملک شوکت کے۔ جو وہ پنڈ میں یہ سب کرتا ہے اور ہم کسی کٹھ پتلی کی طرح تالیاں بجاتے ہیں ہنستے ہیں۔ ذہنی غلام ہیں سارے۔ وہ کتنی عزت دے رہا اپنے انہی دوستوں کو جن سے وہ روز ملتا ہے۔ اور گاؤں والوں کو کیا تماشا دکھا رہا ہے۔ ہم تماش بین ہیں کیا۔ جا رہی ہوں میں۔'' وہ پتا نہیں اتنے غصے میں کیوں آ گئی تھی۔

نوشی اور رامین اس کے پیچھے لپکیں۔ وہ ہاتھ چھڑا کر تیز قدموں سے چلنے لگی۔ وہ دونوں اس کے پیچھے پیچھے گھیں تبھی وہ گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس کی زد میں آ گئیں۔ وہ چندھیائی آنکھوں سے دیکھنے لگیں تبھی گاڑی کے بھاری ٹائر چرچرائے، پھر گاڑی رک گئی تھی۔ کوئی گاڑی سے نکلا تھا دھاڑ سے فرنٹ ڈور بند ہونے کی آواز آئی تھی۔

''السلام علیکم ارباز بھائی۔'' نوشی اور رامین نے سلام کیا تھا۔ زونی نے نگاہ اٹھائی مگر غصے سے بھرا چہرا پھولا ہوا منہ۔ کڑے تیور۔ ارباز نے بہت توجہ سے اس کو دیکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ان کے پاس آیا۔

''وعلیکم السلام۔ کیا ہو رہا ہے۔ کہاں جا رہے ہو تم لوگ۔'' وہ نرمی سے بولا۔

''وہ زونی گھر جانے کے ضد کر رہی ہے۔'' رامین نے دھیرے سے کہا۔

''کیوں۔ ابھی تو جیتنے والے کو انعام بھی ملے گا۔ پھر.....'' وہ نجانے کیا کہنے جا رہا تھا۔ زونی تڑخ کر قہر بھری نگاہوں سے دیکھتی پھٹ پڑی۔ وہ بس دیکھتا رہا۔ بس دیکھتا ہی رہ گیا۔

''انعام کس کو ملے گا۔ آپ کے والد کے شہری دوستوں میں سے کسی ایک کو نا۔ اور کھانا کون کھائے گا۔ وہی لوگ نا۔ پھر گاؤں میں یہ سب کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ آپ لوگوں کی رحم دلی تو صرف الیکشن کے دنوں میں ہی دکھائی دیا کرتی ہے۔ جب ووٹ چاہیے ہوتے ہیں۔ اور آپ کے ابا اتنے ہی اچھے ہوتے نا تو آج چاول کی چار دیگیں پکا کر گاؤں کے لوگوں میں بانٹ دیتے بہت سو کا بھلا ہو جاتا۔ خیرات کر دیتے غریبوں میں پیسے بانٹ دیتے یہ سب ڈرامے یہ چونچلے امیروں کو ہی زیب دیتے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں ایسے تماشے نہ کیا کریں۔ مجھے لگتا تھا میرے ابا بہت برے ہیں۔ مگر آپ کے ابا تو بہت ہی برے اور ظالم ہیں۔'' رامین اور نوشی کی سانس اٹکی ہوئی تھی اور ملک ارباز بھی دم سادھے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ رامین نے ڈرتے ڈرتے ملک ارباز کو دیکھا مگر اس کے ماتھے پر ایک شکن تک نہیں تھی۔ بلکہ وہ تو زیر لب مسکرا رہا تھا۔ نوشی اور رامین نے اچنبھے سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ زونی جا چکی تھی۔ رامین اور نوشی ملتجی نگاہوں سے ملک ارباز سے سوری سوری کرتے ہوئے زونی کے پیچھے بھاگی تھیں۔

مگر ملک ارباز تا دیر وہیں بت بنا کھڑا رہا تھا۔ یہ لڑکی تین سیالوں سے اس کی نگاہ میں تھی۔ جب بھی دکھائی دیتی تھی دنوں اعصاب پر چھائی رہتی تھی۔ وہ مرجھا سا جاتا تھا دنوں اداس سا گاؤں میں آ کر بیٹھا رہتا مگر اس کی ایک جھلک بھی کبھی بھی دیکھنے کو نہیں ملتی تھی۔

☆☆☆

سدرہ کے کچھ جاننے والے لوگ گاؤں آ رہے تھے۔ کراچی میں رہنے والے اس کے جاننے والوں کو گاؤں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب سے ان کی کال آئی تھی انہوں نے اپنے آنے کی اطلاع دی تھی تب سے سدرہ اتنی خوش تھی کہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔

''اماں۔ایک بات کرنی ہے۔'' سدرہ اماں کی چارپائی پر آ کے بیٹھی تو اماں ایسے خوش ہوگئیں جیسے سدرہ ان کی بیٹی نہیں بلکہ ماں ہو جس کا احترام کرنا اماں پر واجب ہو۔

اماں کی چارپائی بڑے سے برآمدے میں تھی وہ سردیوں میں بھی اسی چارپائی پر سوتی تھی بھلے دو لحاف لینے پڑیں۔اپنے طور پر وہ اس کی گھر کی نگرانی کرتی تھیں۔

اس وقت منظر یہ تھا کہ اماں سرخ پائے والی اونچی سی چارپائی پر تقریباً بیٹھی ہوئی تھی۔لحاف اوڑھ رکھا تھا۔ بڑے سے پتیلے میں کوئلے دھک رہے تھے۔عمارہ اور ثانیہ بھی زمین پر پیڑیاں رکھے ان پر بیٹھے ہوئے آگ سینک رہی تھیں۔زوبی سب کے لیے چائے بنانے گئی ہوئی تھی۔سدرہ کے آنے سے پہلے اماں کے ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے غصے میں گر رہے تھے۔ماحول میں سناٹا سا تھا۔سدرہ کی آمد نے اماں کا موڈ بدل دیا تھا۔

''ہاں ہاں بول میرا بچہ۔تمہیں کیا خوف ہے ابھی تو تیری ماں بیٹھی ہوئی ہے۔'' اماں خواہ مخواہ کی بڑھکیں مارنے لگیں۔

''میں یہ کہنے لگی ہوں کہ میرے کچھ دوست کل شہر سے آ رہے ہیں۔'' سدرہ نے کہا تو اماں نے ایسے سر ہلایا جیسے اس کی کم عقلی پر افسوس کر رہی ہو۔ انداز لاڈ والا تھا۔وہ تو اپنی بہوؤں کو ڈھکی چھپی کچھ اور سنانا چاہتی تھی یہ معاملہ ہی کچھ اور تھا۔

''اچھا اچھا'' اماں نے دوستوں لفظ پر ذرا سا بھی استفسار نہیں کیا تھا کہ وہ دوست لڑکیاں ہیں کہ لڑکے۔ ویسے بھی جس دن سے سدرہ آئی تھی ایک نام اس کی زبان پر اکثر سنائی دیتا رہتا تھا سدرہ کا کلاس فیلو۔رمیز۔ ہر وقت کسی نہ کسی بات میں یہ نام اس کے لبوں سے سنا گیا تھا۔

عمارہ نے ذومعنی نگاہوں سے ثانیہ کو دیکھا مگر ایسی نگاہوں کا تبادلہ کرنا ثانیہ کی عادت میں شامل نہیں تھا۔اس وقت بھی وہ متوجہ نہیں تھی۔عمارہ نے سدرہ اور اماں کو توجہ سے دیکھا۔

''سدرہ کون لوگ ہیں جو آ رہے ہیں۔''

''میرے ساتھ یونیورسٹی میں ہوتا تھا رمیز۔ دوست ہے بھابھی۔وہ اپنی امی اور بہن کے ساتھ آ رہا ہے۔'' سدرہ تھوڑا شرما کر بات کر رہی تھی عمارہ چونکی۔یونیورسٹی فیلو ہونا کوئی ایسی بات تو نہیں جس کا ذکر کرنے پر شرمایا جائے،عمارہ کا ماتھا ٹھنکا۔

''پسند کرتے ہو کیا تم دونوں ایک دوسرے کو۔'' عمارہ نے بھی لگی لپٹی بنا ہی کہہ دیا جب وہ اتنی دیدہ دلیر ہو رہی تھی تو ایسے تو ایسے ہی سہی۔

''جی بھابھی۔رمیز مجھ سے شادی کرنا چاہ رہے ہیں اس لیے اپنی امی کے ساتھ آنا چاہ رہے ہیں۔'' سدرہ کا تو لہجہ ہی بدلا ہوا تھا۔

''واہ جی۔اب تو اماں کی بیٹی بھی محبت کی شادی کرے گی۔'' عمارہ نے خوش بیٹھیں اماں کو دیکھ کر جتایا۔زور سارا لفظ محبت پر تھا۔

اماں دائیں بائیں دیکھنے لگیں۔مگر بولیں کچھ نہیں۔

''بھابھی پلیز۔ایک بات کہنی ہیں آپ لوگوں سے۔'' اس نے بھابیوں کی طرف دیکھا۔

''جی کہیے۔'' عمارہ نے کہا اور ثانیہ نے بس سدرہ کو نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا۔ان دونوں کو ہی اندازہ تھا کہ اب وہ کیا کہنے والی تھی۔

''وہ بھابھی..... میں چاہتی ہوں کہ ان کی خدمت میں کوئی کسر نہ رہے۔'' اس کا انداز آرڈر کرنے والا نہیں تھا۔مگر درخواست والا بھی نہیں تھا۔

''ظاہر ہے،سدرہ جب مہمان گھر آتے ہیں تو ان کا خیال رکھا جاتا ہے اپنی حیثیت کے مطابق ان کی خاطر مدارت کریں گے تم فکر نہ کرو۔'' ثانیہ نے نرم لہجے میں کہا تو عمارہ نے بھی ثانیہ کی تائید میں سر اثبات میں ہلایا سدرہ قدرے مطمئن سی ہوگئی تھی۔

''شکریہ۔آپ دونوں بہت اچھی ہو۔ظرف والی ہو۔'' اب سدرہ تعریف کرنے لگی مگر ان کا خوش ہونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ وہ ساری تعریف

کیوں کررہی تھی وہ جانتی تھیں۔

''اماں۔ان کو ساگ اور مکئی کی روٹی کھانے کا بہت شوق ہے اماں پلیز تم ساگ بنادو نا۔'' سدرہ کتنی اچھی بنی ہوئی تھی۔

''ماں صدقے، میں صبح سویرے ہی جاؤں گی اور تازہ گندلیں توڑ کر لاؤں گی۔ پرونے تو رب کی نعمت ہوتے ہیں اپنے ساتھ رحمتیں لاتے ہیں۔اللہ خوش ہوتا ہے۔پرونوں کے لیے جتنا دل کھلا رکھا جائے اللہ اتنا ہی ثواب دیتا ہے۔'' اماں کا جوش دیدنی تھا۔

''دادی۔اگر مہمان کراچی سے آرہے ہوں تو ثواب دوگنا اور بڑھ جاتا ہے ہے نا۔'' زونی کے شرارتی انداز پر اماں نے کسیلی نگاہ اس پر ڈالی۔مگر بولیں کچھ نہیں۔عمارہ بھی سر جھکا کے ہنسنے لگی البتہ ثانیہ ایسی ہمت نہیں کرسکی تھی۔

''دادی۔اب آپ خود جاؤ گی نا کھیتوں میں گندلیں توڑنے۔'' زونی موڈ میں تھی۔

''ہاں جاؤں گی۔تمہیں کیا تکلیف ہے۔'' دادی نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا۔

''اور آپ کے گھٹنوں کا درد۔اس کا کیا جو آپ کو چار قدم بھی نہیں چلنے دیتا۔''

''تمہیں کیوں درد ہورہا ہے میں جو بھی کروں جیسے بھی کروں۔'' دادی چڑ گئی۔

جلتی آگ راکھ ہو چکی تھی۔ ثانیہ کو راکھ کریدنے کی عادت تھی وہ انگیٹھی اٹھا کر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد عمارہ اور زونی بھی اس کے پیچھے ہی چلی گئی تھیں۔ پیچھے اماں اور سدرہ کافی دیر مذاکرات کرتی رہی تھیں ناک بھوں چڑھاتے ہوئے ثانیہ عمارہ اور زونی بھی زیر بحث رہیں مگر خوشی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اماں اور سدرہ کا اتفاق تھا۔ورنہ تو سدرہ اماں کو بھی کہاں درخور اعتنا سمجھتی تھی۔

آج رات اس گھر کی ساری خواتین سونے سے پہلے سدرہ کے بارے میں ہی سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

اگلا دن بہت حیران کردینے والا تھا۔دیکھتی آنکھوں نے دیکھا کہ اماں جن کا نام تو منظوراں تھا مگر وہ پورے گاؤں کی اماں تھیں اس کا مطلب کہ سب ان کو اماں ہی کہا کرتے تھے۔سالوں گزرے وہ گھر کے تمام کام کاج سے ہاتھ کھینچ چکی تھی۔بظاہر گھر کا سارا نظام عمارہ اور ثانیہ نے سنبھال رکھا تھا۔ گھر کا نظام تھا ہی کتنا۔وہ تو بس گھر کے کام کاج ہی کیا کرتی تھیں۔آذر سدرہ کے اکاؤنٹ میں رقم بھیجا کرتا تھا کبھی کبھی اماں گرمیوں سردیوں کے چند جوڑے ثانیہ اور زونی کو دلا دیا کرتی تھیں اس میں بھی سو سو احسان جتلاتی تھیں۔کفایت شعاری کا مشورہ دیتے ہوئے مثالیں اپنی بیٹیوں کی دیتی تھیں۔ بیٹیاں بھی وہ جو دس دس ہزار کے جوڑے پہننا کرتی تھیں اور اپنی بھابھیوں پر اپنی چوائس کی دھاک بھی بٹھایا کرتی تھیں۔اور اگر بھابھیاں ان کے کپڑوں کی تعریف نہیں کرتی تھیں تو وہ ناک بھوں چڑھا کر ہونہہ کر کے ایک دوسرے کو اسٹار پلس کی نندوں کی طرح کہتی تھیں کہ توبہ ہے کتنا جلتے ہیں لوگ۔

عمارہ تو کھری کھری سنا دیا کرتی تھی اس پر اماں کا واویلہ شروع ہو جاتا تھا کہ میری بیٹیوں کو برداشت نہیں کیا جاتا۔میکے کا مان ختم کیا جارہا ہے وغیرہ وغیرہ۔

خیر بات ہورہی تھی اماں کی چستیوں کی۔اماں علی الصباح ہی گھر سے نکلی تھیں جو جو ملا اس نے سلام کیا۔جس نے پوچھا کہ کہاں جارہی ہو۔وہاں وہاں وہ پوری داستان بیان کرتے ہوئے سرسوں کے کھیت میں گئیں۔کھیت میں پانی لگا ہوا تھا۔ان کے پاؤں چکنی مٹی میں دھنس گئے۔اماں بوکھلا گئیں۔ انہوں نے پورا زور لگا کر پاؤں باہر کی طرف نکالنے چاہے۔پاؤں تو بہت ہمت استعمال کرنے کے بعد نکل ہی آئے مگر ان کے کی دونوں جوتے ٹوٹ کے مٹی کے اندر ہی کہیں دھنس گئے تھے۔اس ساری دھینگا مشتی میں ان کی کی بوڑھی کھانسی بھی اپنے پورے جوش وخروش کے ساتھ وارد ہوئی تھی۔اماں کی

ساری سکت صرف ہوگئی تھی۔ وہ بے دم سی ہو کر کھیت کے کنارے پر بیٹھ گئیں۔ ان کی سانس دھونکنی کی مانند چل رہی تھی۔ آنکھیں پانے سے لبالب بھر گئی تھیں۔ ہلکی دھوپ نکل رہی تھی مگر ساتھ میں سرد ہوا بھی سرسراتی ہوئی پھر رہی تھی۔ اوپر سے اماں کا پانی میں کھپ جانا۔ انہوں کو سردی اپنی ہڈیوں کے اندر تک اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر سلام ہے ان کی محبت پر۔ انہوں نے اپنی تمام ہمتیں مجتمع کیں اور کھیت کے کنارے کنارے گھوم کر گندلیں توڑنا شروع کر دیں۔ کچھ ٹائم لگا مگر وہ گزارے لائق گندلیں توڑ چکی تھی۔ اماں نے ہانپتی سانسوں اور لرزتے ہاتھوں سے کپڑا اچھا کر اس میں گندلیں رکھیں۔ ابھی وہ اس کو باندھنے ہی لگی تھیں کہ راجو آ گیا۔

''اماں۔ تم یہاں کہاں.....''

''پتر۔ دیکھ تو رہے ہو۔'' اماں نے بے بسی سے کہا حالت خراب تھی۔

''اماں۔ کسی اور کو بھیج دینا تھا۔ مجھے کہا ہوتا۔'' اس کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہے کیا۔

''سدرہ کے دوست اور اس کے گھر والے آ رہے ہیں شہر سے۔ ساگ کی فرمائش کی ہے اس لیے۔'' اماں سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ راجو نے ہاتھ تھام کے اماں کو پگڈنڈی سے گزارا۔ پھر ایسے ہی تھامے تھامے ان کے گھر چھوڑ کے گیا تھا۔ اماں بری طرح کانپ رہی تھیں۔

گھر آتے ہی اماں کی کپکپاہٹ بڑھ گئی۔ سردی لگ گئی تھی۔ زونی اور ثانیہ نے جلدی سے اماں کو بٹھایا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھیں کپڑے اور پاؤں چکنی مٹی سے بری طرح لتھڑے ہوئے تھے۔ ان کی ساری تیزی طراری ہوا ہو گئی تھی۔

عمارہ جلدی سے پانی گرم کر کے لے آئی تھی۔ ثانیہ نے جلدی سے اماں کے ہاتھ پاؤں دھوئے تھے۔ زونی دادی کے کپڑے استری کر کے لے آئی۔ اماں کو صاف ستھرا کر کے لحاف میں لٹا دیا تھا۔ مگر وہ پھر بھی کانپے جا رہی تھیں۔ زونی نے ایک اور لحاف اوپر ڈال دیا۔

سدرہ کا فون آیا ہوا تھا۔ وہ فون پر مگن تھی۔ زونی دو بار سدرہ کو جا کر بتا آئی کہ دادی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ مگر سدرہ نے جیسے سنا ہی نہیں۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی۔ سدرہ اپنی مرضی کی مالک تھی کسی کی اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی یا دوسروں لفظوں میں اسے ذمے داری نبھانے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ کچھ وہ فطرتاً بھی بے حس اور لاپرواہ تھی۔

اماں بخار میں بری طرح تپ رہی تھیں۔ زونی نے دادی کو چائے کے ساتھ پیناڈول دے دی تھی۔ عمارہ اور ثانیہ نے ساگ چھیلنا اور کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ عمارہ نے لکڑیاں جلا کر مٹی کی روغنی ہانڈیاں چڑھا دی تھی۔ اب پورا دن ساگ کی نذر ہونے والا تھا۔ رات کو یاور گھر آیا تو اماں کو گاؤں کے حکیم کے پاس لے گیا تھا۔ یاور اور سدرہ آنے والے مہمانوں کی باتیں کرتے ہوئے تادیر اماں کے پاس بیٹھے رہے تھے۔

☆☆☆

اگلی صبح اچھی دھوپ نکلی تھی اماں کی طبیعت بھی بہتر تھی۔ وہ صحن میں بیٹھے ہوئے اپنے حقے سے شغل فرما رہی تھیں۔ سدرہ بھی آج خلاف معمول جلدی اٹھ گئی تھی۔ گھر صاف ستھرا کر دیا گیا تھا۔ ثانیہ اور عمارہ بھی اچھے کپڑے پہن کر مہمانوں کی منتظر تھیں۔ زونی البتہ اسی لباس میں تھی وہ اول جلول حلیے میں بھی بہت اچھی لگا کرتی تھی۔

سدرہ کو کال آئی کہ وہ لوگ اڈے پر آ چکے ہیں۔ پورے گھر میں اس خبر نے پھرتی سی بھر دی تھی۔ سدرہ مسلسل رمیز سے رابطے میں تھی۔ اور ان کو راستہ سمجھا رہی تھی۔ پھر وہ لوگ پہنچ گئے۔

بڑی سی گاڑی منظوراں کے دروازے پر آ کے رکی تھی۔ اونچی لمبی ڈیسنٹ سی ایک خاتون سب سے پہلے گاڑی سے اتریں۔ ان کے پیچھے ان کی کامنی سی بیٹی نے کچی سڑک پر پاؤں دھرے تھے۔ فرنٹ ڈور

کھلا ایک بہت ہینڈسم سا دراز قد کالڑکا اترا۔ ایک نظر اس نے چاروں طرف گھمائی تھی۔ تبھی منظوراں اپنے پورے ٹبر کے ساتھ گلی میں نکلیں۔ سدرہ سب کا وہیں پر ہی تعارف کروانے لگ گئی۔

گاؤں کے بہت سارے لوگ وہیں اکٹھے ہوگئے تھے۔ آنکھوں میں شوق کا ایک جہان بسائے سب شہری مہمانوں کو محبت سے دیکھ رہے تھے۔ رمیز گاؤں کے سب لوگوں سے ملا۔ ثانیہ گلی میں نہیں آئی تھی۔

منظوراں معزز مہمانوں کو ساتھ لیے گھر کے اندر داخل ہوئیں تو سارا منظر ہی بدل گیا۔ اماں جو ایک فخر وانبساط کے ساتھ ترچھی نگاہوں سے گاؤں کے لوگوں کو دیکھتے ہوئے گھر میں داخل ہوئی تھیں۔ نہیں جانتی تھیں کہ اب ان کا سارا فخر کرچی کرچی ہونے والا ہے۔

ثانیہ مہمانوں سے ملنے کے لیے آگے بڑھی تھی اور پھر دنگ ہی رہ گئی۔ وہ دونوں ہی ٹھٹکی تھیں۔ پھر ایک دوسرے کا نام لے کر ایسا گلے مل کر روئی تھیں کہ سب کو چپ کروانا مشکل ہوگیا تھا۔ سب حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔

''یہ میری بیٹی ہے زونیہ۔'' ثانیہ نے کہا۔

''ثانیہ۔ یہ تمہارا بھانجا رمیز اور یہ تمہاری بھانجی نتاشہ۔'' فرح کے الفاظ پر سب اپنی اپنی جگہ ساکت ہوگئے تھے۔

عمارہ نے آگے بڑھ کر ثانیہ کو فرح سے الگ کیا۔ دونوں ہی جیسے اپنے ہوش وحواس میں نہیں تھیں۔

''یہ سب کیا ہے۔'' سدرہ کا سکتہ جیسے تڑخ کر ٹوٹا تھا۔

''یہ میری بہن ہے ثانیہ۔ میری سگی بہن۔'' یہ کہہ کر وہ دونوں پھر سے ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ اماں کے تو مانو ہاتھ پیر ہی پھول گئے تھے سدرہ کے لیے آنے والے مہمان جن کے سواگت کے لیے وہ ہلکان ہوئی جارہی تھیں۔ وقت کیسے کیسے کا ٹا تھا۔ وہ ثانیہ کی بہن ہوسکتی ہے یہ تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ ثانیہ جس کو وہ کوئی اہمیت ہی نہیں دیتی تھیں۔ اس کا تو میکا تھا ہی نہیں۔ کبھی کوئی اس کے پیچھے نہیں آیا تھا سب نے اس کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ اسی بات نے ہی اماں کو شیر کر رکھا تھا۔

''ممی۔ حوصلہ کریں ذرا ریلیکس کریں۔'' رمیز نے اپنے ایک بازو کو فرح کے شانے پر رکھا تو دوسرا بازو ثانیہ کے شانے پر رکھ کر ان کو تسلی دی تھی۔ ثانیہ کا دل خوش ہوگیا۔ ماشاءاللہ کتنا خوبرو جوان نکلا تھا۔ اور نتاشہ بھی کتنی حسین تھی۔ ثانیہ بچوں کو پیار کر رہی تھی فرح زونی کو گلے لگا کے رو رہی تھی۔ زونی کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے آگے سے کیا ردعمل ظاہر کرنا چاہیے۔ اتنے سالوں میں پہلی بار ننھیال سے کوئی ملا تھا ایک جھجک سی تھی۔ شرم بھی آرہی تھی۔

''اچھا آئیں۔ بیٹھیں۔'' عمارہ نے کہا تو جیسے ایک دم سب حرکت میں آئے تھے۔

''آپی۔ سفر کیسا گزرا۔'' عمارہ نے پوچھا تو فرح بتانے لگی۔ ثانیہ ابھی بھی سسک رہی تھی۔

''کیسے ہو رمیز۔'' سدرہ نے اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہا۔ وہ کچھ دیر پہلے کتنی پرجوش تھی اور اب اس ساری غیر متوقع صورت حال نے تو جیسے اس کے سارے جذبات پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو۔'' رمیز نے نارمل سے انداز میں کہا۔ رمیز کی نظروں کے تعاقب میں فرح نے سدرہ کو دیکھا۔

''السلام علیکم آنٹی۔'' سدرہ نے مودب سی ہوکر سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' فرح نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ عام سی شکل وصورت کی لڑکی تھی۔

''بھابھی۔ میں مہمانوں کو اپنے کمرے میں لے کر جاتی ہوں آپ لوگ ناشتے کا انتظام کریں۔'' سدرہ نے ثانیہ کو تیکھی نگاہوں سے دیکھا لہجہ خاصا مؤدب ہی تھا۔ پھر وہ مہمانوں کو لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کا کمرہ سارے گھر سے ذرا ہٹ کر

تھا۔

ثانیہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ زونی بھی پانی پر بلبلے کی مانند گھوم رہی تھی۔ سب نے مل کر ناشتا کیا تھا۔

فرح نے مکئی کی روٹی اور ساگ کی بہت تعریف کی۔ عمارہ اور ثانیہ بھی سدرہ کے کمرے میں ہی آ گئی تھیں۔ زونی سب کے لیے چائے بنا کے لے آئی۔

چائے پیتے ہوئے زونی نے ثانیہ کو دیکھا۔ آج اس کا چہرہ کتنا چمک رہا تھا زونی اپنی امی کو تکے گئی۔

''زونیہ۔ ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو بیٹا۔'' فرح نے کتنی محبت سے کہا تو زونی اٹھ کر ان کے پاس چلی گئی۔

''بیٹا۔ کیا پڑھ رہی ہو۔'' وہ ابھی جواب دینے ہی لگی تھی کہ سدرہ بول پڑی

''اس نے کیا کرنا ہے آنٹی۔ سترہ سال کی ہو گئی ہے ابھی تک فسٹ ائیر میں ہے میٹرک میں فیل ہو چکی ہے۔ سارا دن فضول وقت ضائع کرتی رہتی ہے مجال ہے جو بیٹھ کر پڑھ لے۔'' سدرہ بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی اس بات سے بے خبر کے فرح کو یہ بات کتنی بری لگی ہے۔

''اپنے گھر کی باتیں باہر کے لوگوں کو کبھی نہیں بتاتے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو بچی کو یوں ہرٹ کیا جائے کسی کے سامنے۔ میں بھی اسٹڈی میں ایورج سی تھی جبکہ ثانیہ بہت اچھی اسٹوڈنٹ تھی۔'' فرح نے ثانیہ اور زونی کے اترے چہرے کو دیکھ کر کہا۔

''ثانیہ۔ میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تم مجھے یہاں ملو گی۔'' فرح نے ترستی نگاہوں سے ثانیہ کو دیکھا۔

''آج تک کبھی کوئی اس کے پیچھے آیا ہی نہیں۔ ہم نے کون سا بیٹا کسی کو روکا تھا۔'' اماں نے کہا۔

''خالہ۔ میرے ابو اس شادی کے لیے رضا مند نہیں تھے مگر ثانیہ کی ضد کے سامنے ہارنا پڑا۔ پھر ابو نے ثانیہ کو کہا تھا کہ وہ ساری زندگی اس کا منہ نہیں دیکھیں گے۔'' فرح جیسے ماضی میں کھو گئی تھی۔

''میں بھی نہیں مان رہی تھی مگر اپنے بیٹے کی خوشی کی خاطر ماننا پڑا۔'' اماں کی بات پر فرح کو یاد آیا تھا کہ اس عورت نے ثانیہ کے نکاح پر ان کے باپ کو کتنا ذلیل کیا تھا کتنی بے عزتی کی تھی۔

''ثانیہ۔ ابو کی وصیت تھی کہ ان کا گھر ثانیہ کو دے دیا جائے۔'' فرح کی آنکھوں میں آنسو چمکے۔

''ابو.....''

''تمہارے بعد وہ زیادہ جی نہیں پائے۔'' فرح کہہ کر رو دی پھر ثانیہ بھی رونے لگی۔ پچھتاوا بہت عرصے سے اس کے اندر جمع ہو رہا تھا اب وہی لاوا باہر آ رہا تھا۔ وہ سارے آنسو بہا رہی تھی جو بہت سالوں سے اس کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہے تھے۔

☆☆☆

فرح اور اس کے بچے بہت سارے دن ان کے گھر رہے تھے ان کی بہت خاطر مدارت کی گئی تھی۔ اماں اور سدرہ کی فطرت کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ سدرہ فرح کو ذرا بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ ایک تو شکل وصورت کی واجبی سی اوپر سے فطرت کی بھی اچھی نہیں تھی۔ پھیکے سے رنگ والی سدرہ نے بھی فرح کو متاثر نہیں کیا تھا۔

زونیہ بہت سادہ سی کم عمر اور خوب صورت تھی پھر اس کی بہن کی بیٹی تھی۔ فرح اس کو اتنے دن سے دیکھ رہی تھی زونی کی ہر ہر ادا دلکش تھی۔ زونی اور نتاشہ کی بھی بہت دوستی ہو گئی تھی۔ فرح نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ رمیز بھی دلچسپی سے زونی کو تکتا رہتا ہے۔ ایسا بے ریا حسن۔ دل آویز مسکراہٹ۔ لمبے گھنے بال۔ دراز قامت۔

سدرہ نے ان کو پورا گاؤں گھمایا۔ نوشی اور رامین بھی زونی کے ساتھ ہوتی تھیں۔ فرح اور ثانیہ باتیں کرتی رہتی تھیں۔ ان کی باتیں تھیں کہ ختم ہونے

کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔فرح نے ثانیہ سے آذر کا نمبر لے کر کئی بار آذر سے بھی بات کی تھی۔ گلے شکوے ہوئے تھے۔فرح نے آذر سے زونی کا رشتہ مانگا تھا۔آذر کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔اس نے فوراً ہاں کردی تھی۔

فرح نے جاتے ہوئے اپنے گلے سے گولڈ کا لاکٹ اتار کر زونی کے گلے میں ڈال دیا۔وہ زونی کو گلے لگا کر رو دی۔نجانے کیا کیا یاد آیا تھا۔فرح اور ثانیہ دو ہی بہنیں تھیں۔ماں اس وقت وفات پا گئی تھی جب وہ دونوں چھوٹی تھیں۔فرح کی شادی میٹرک کے بعد ہی ہوگئی تھی اس کا شوہر دبئی میں تھا وہ فرح کو بھی ساتھ ہی لے گیا تھا۔ثانیہ فرح سے کافی چھوٹی تھی۔ جب ثانیہ اور آذر کا سلسلہ ہوا تب فرح نے اسے بہت سمجھایا تھا مگر ثانیہ نہیں مانی۔ان کے ابو سرکاری ملازم تھے سفید پوشی کا بھرم ہی قائم تھا۔ان کے پاس کوئی چیز نہیں تھی سوائے عزت کے۔ثانیہ کے اس فیصلے نے ان کی تو جیسے عزت کا جنازہ ہی نکال دیا تھا۔مرنے سے پہلے انھوں نے وہ مکان ثانیہ کے نام کردیا تھا۔فرح نے اپنے طور پر ثانیہ کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔مگر ثانیہ کا کسی سے بھی کوئی رابطہ نہیں تھا اس لیے فرح نے وہ مکان پچاس لاکھ کا بیچ دیا تھا۔اور ثانیہ کے نام پر وہ پیسے بینک میں رکھوا دیے تھے۔

اور اب وہ معجزہ ہوگیا تھا جس کا فرح نے سوچا ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

آذر کی کال نے اماں اور سدرہ کو جلتے توے پر بٹھا دیا تھا۔آذر نے رمیز اور زونی کے رشتے والی بات اماں کو بتائی تھی۔اماں نے پورا گھر سر پر اٹھایا ہوا تھا۔سدرہ وہ تو غصے سے پاگل ہو چکی تھی۔اس نے رمیز کو کال کی تھی ان کا خوب جھگڑا ہوا تھا رمیز نے بھی سدرہ کی طبیعت صاف کردی تھی۔

''تم نے مجھے اندھیرے میں رکھ کر مجھے دھوکا دیا ہے رمیز۔دس ازناٹ فیئر۔'' سدرہ چیخی۔

''کون سا دھوکا۔کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔کبھی پیار کا اظہار نہیں کیا۔بس دوست ہوا اچھی لگتی ہو۔یہی ممی کو کہا تھا کہ دیکھ لیں۔''

''پھر تمہاری ممی کو کیا تکلیف ہے۔'' وہ بدتمیزی سے بولی۔

''شٹ اپ۔اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔کوئی حور پری نہیں ہو تم جو اتنا کھول رہی ہو۔نہیں اچھی لگیں تم میری ممی کو۔اور اب تو مجھے بھی تم اچھی نہیں لگتی ہو کیونکہ تمہارا اصلی چہرہ میرے سامنے آچکا ہے۔تم جیسی بداخلاق عورت میری بیوی نہیں بن سکتی۔پھر میری خالہ کے ساتھ تمہارے گھر والوں کے ساتھ جو سلوک رہا ہے تو اس کے بعد تو ناممکن ہے۔'' رمیز نے کہہ کر فون بند کردیا۔

سدرہ تڑپ رہی تھی بار بار فون کر رہی تھی مگر رمیز اس کا فون نہیں اٹھا رہا تھا۔سدرہ اس کو میسجز پر گالیاں دینے لگی تو رمیز نے اس کا نمبر ہی بلاک کردیا تھا۔

وہ کمرہ بند کیے روتی رہی، چیختی رہی۔زونی اور ثانیہ کو گالیاں دیتی رہی۔زونی کو ابھی علم بھی نہیں تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔

☆☆☆

سدرہ واپس چلی گئی تھی۔اماں کی زبان پہلے سے بھی زیادہ تلخ ہوگئی تھی۔ہر وقت وہ ثانیہ کے اگلوں پچھلوں کو کوستی رہتی۔

ملک ارباز آج کل گاؤں میں ہی رہنے لگا تھا۔وہ گلیوں کے چکر کاٹتا رہتا تھا۔زونی کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب رہتا تھا۔زونی کے گھر کے پاس مسجد تھی ارباز نماز پڑھنے مسجد میں اسی بہانے آنے لگا تھا کہ شاید وہ دکھائی دے۔

رامین ہانپتی کانپتی ہوئی زونی کے پاس آئی تھی اس کے ہاتھ کی بند مٹھی میں ایک کاغذ دبا ہوا تھا۔اس نے وہ کاغذ زونی کو تھما دیا۔وہ ارباز کا خط تھا جس میں اس نے اپنی بے تابیوں کا حال بیان کیا تھا۔زونی بری طرح ڈر گئی۔اور وہ خط ثانیہ کو دکھا دیا۔

شام میں ثانیہ بڑی سی چادر اوڑھے بڑی بی بی سے ملنے چلی گئی تھی۔ ثانیہ نے مناسب الفاظ میں شکایت کی تھی اور وہ خط بی بی کو دے دیا تھا۔ اس نے زونی کے رشتہ طے ہونے کی بابت بی بی کو بتایا اور لوٹ آئی تھی۔

اس کے بعد ارباز دکھائی نہیں دیا تھا۔

فرح اور نتاشہ گاؤں آئی تھیں زونی کی منگنی کی رسم پر پورا گاؤں مدعو تھا۔ سارا خرچا فرح نے کیا تھا۔ زونی بھی بہت خوش تھی۔ فرح بار بار اسے اپنے ساتھ لگا کر پیار کر رہی تھی اماں کمرے سے ہی نہیں نکلیں، کسی نے پروا بھی نہیں کی تھی۔ فرح گولڈ کا سیٹ اور لہنگا لے کر آئی تھی۔ زونی کو تیار کیا گیا تھا زونی اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ نتاشہ نے اس کے روپ کو اپنے موبائل میں قید کر لیا تھا۔

فرح ثانیہ کے لیے بھی بہت سے سوٹ لے کر آئی تھی۔ عمارہ اور یاور کے لیے بھی ڈریس لے کر آئی تھی جوان کو بہت پسند آئے تھے۔

☆☆☆

نوشی اور زونی کرکٹ کھیل رہی تھیں تبھی زونی کو وہی بانسری کی دھن سنائی دی تھی اس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ دھوپ اجلی سی چمک رہی تھی۔ زونی خود کو روک نہیں پا رہی تھی۔ وہ ننگے پاؤں کھیتوں کی طرف جانے لگی۔ نوشی اسے پکار رہی تھی مگر وہ سن ہی کہاں رہی تھی۔ نوشی سر جھٹک کر اپنے گھر چلی گئی۔

زونی اس سمت تیزی سے جا رہی تھی جہاں سے اس بانسری کی دھن پر کوئی مست ملنگ سا گا رہا تھا۔ زونی کے پاؤں کھیتوں کی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر بار بار پھسل رہے تھے وہ ایک دو بار گری مگر نجانے وہ کون سی غیر مرئی طاقت تھی جو اسے بلا رہی تھی۔ وہ کسی ڈور سے بندھی اسی سمت چلتی جا رہی تھی۔ وہ چلتے چلتے پتا نہیں کتنا دور نکل آئی تھی۔ بانسری کی لے ہوا کے دوش پر بکھرتی زونی کو بے چین کر رہی تھی تبھی اسے سامنے کوئی مرد بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی پشت زونی کی طرف تھی اس کے ہاتھ میں بانسری تھی جسے وہ دونوں ہاتھوں سے تھامے مست سا اپنی دنیا میں مگن تھا اس کا سر اگلی طرف کو جھکا ہوا تھا۔

زونی اس کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی بند آنکھیں کھول کر سر اٹھایا زونی بدک کر پیچھے ہٹی اس کا دل اتنی زور سے دھڑکا جیسے سینہ پھاڑ کر نکل آئے گا وہ متوحش سی اسے تکے گئی۔ وہ کوئی شہزادہ تھا کوئی یونانی دیوتا جیسا۔ اس نے کبھی اسے غور سے دیکھا ہی کب تھا وہ ملک ارباز تھا۔ ارباز کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اس کے لال ہونٹ کرب سے کانپ رہے تھے وہ دونوں ہی یک ٹک ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ پھر ارباز نے اپنی آنکھیں پھر سے بند کر لیں۔ وہ اور بھی شدت سے رونے لگا تھا۔ اتنے شاندار مرد کا رونا وہ بھی زونی کے لیے۔ زونی کانپ گئی وہ اٹھی اور وہاں سے بھاگ گئی۔ اس کا دوپٹا نجانے کہاں گر گیا تھا۔ وہ گھر آ کر ثانیہ کے گلے لگ کر روتی رہی مگر چاہ کر بھی کچھ بتا نہیں سکی تھی۔ وہ جو محبت کی منکر تھی۔ آج محبت کی اسیر ہو گئی تھی۔ وہ محبت کرتا تھا وہ سچا تھا ورنہ وہ کیا نہیں کر سکتا تھا۔

زونی دنوں بخار میں پھنکتی رہی تھی۔ بانسری کی دھن اس کو تڑپا دیتی تھی کسی کا آنسوؤں بھیگا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ مگر اب وہ خود کو روکتی تھی اپنے قدموں میں بیڑیاں ڈال چکی تھی۔

☆☆☆

زونی کی شادی رمیز سے ہو گئی۔ وہ بہت خوش تھی آنٹی اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ رمیز اس پر جان چھڑکتا تھا۔ نتاشہ بہن جیسی تھی۔ بہت سا وقت گزر گیا، وہ دو بچوں کی ماں بن گئی۔ گاؤں کبھی کبھی جانا ہوتا تھا نوشی اور راجو کی بھی شادی ہو چکی تھی۔ رامین بھی بیاہ کر شہر چلی گئی تھی۔ دادی بہت بوڑھی ہو گئی تھیں، اب جھگڑا بھی نہیں کرتی تھیں۔ سدرہ کی بھی شادی ہو گئی تھی۔

فرح ثانیہ کو کراچی آنے کے لیے بہت زور دیتی تھی مگر ثانیہ اب کہیں نہیں جانا چاہتی تھی۔ یاور

چاچو بہت بیمار رہنے لگے تھے۔ عمارہ ثانیہ اور اماں ایک دوسرے کے ساتھ جی رہے تھے۔ زونی کو یہ گھر بہت خاموش اور پر اسرار سا لگتا تھا۔ جہاں چپ کا راج تھا۔

فرح نے گھر کا سارا کنٹرول زونی کو سونپ دیا تھا گھر کے کام کاج کے لیے نوکر چاکر تھے وہ ان سے کام کروا لیتی تھی البتہ کھانا زونی خود ہی بناتی تھی۔ زیادہ وقت بچوں کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ نتاشہ کے لیے بھی رشتہ دیکھا جا رہا تھا بہت جلد اس کی بھی شادی ہو جانا تھی۔

بچے اسکول چلے جاتے تو زونی سے وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ وہ اور آنٹی بیٹھ کر باتیں کیا کرتی تھیں۔ یا پھر ثانیہ کو فون کر لیتی زیادہ بور ہوتی تو شاپنگ کرنے چلی جاتی تھی۔

زونی کی دادی فوت ہو گئی تھیں۔ زونی گاؤں آئی تو کئی لوگوں نے تو پہچانا ہی نہیں۔ وہ تھوڑی سی فربہ ہو گئی تھی۔ مگر خوب صورت پہلے سے بھی کہیں زیادہ ہو چکی تھی اس کی شخصیت گریس فل ہو چکی تھی۔ وہ بڑی سی گاڑی میں آئی تھی۔ اس کی عادت تھی وہ پورے گاؤں کے ایک ایک بندے سے ملا کرتی تھی۔ بس کبھی وہ بی بی سے ملنے نہیں گئی تھی مگر اب کی بار وہ پہلی بار ملک شوکت کی حویلی گئی تھی۔

حویلی میں بہت سناٹا تھا۔ نوکر اس کو بی بی کے کمرے میں بٹھا کر خود وہاں سے چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد بی بی چلی آئیں اس نے کبھی ان کو نہیں دیکھا تھا مگر اب وہ کافی کمزور سی دکھائی دے رہی تھی۔ گزرے وقتوں میں بہت خوب صورت اور وضع دار خاتون رہی ہوں گی۔

''السلام علیکم۔ بی بی۔''

''وعلیکم السلام۔ میری بچی۔ کیسی ہے تو زونیہ۔'' زونی حیران ہوئی۔

''حیران ہو رہی ہے نا کہ میں تمہیں کیسے جانتی ہوں جبکہ ہم پہلی بار ملے ہیں۔''

''جی۔''

''اس نے جتنا تمہارا ذکر میرے ساتھ کیا ہے نا شاید ہی کبھی کسی نے کسی کا کیا ہو۔ ہر وقت تمہاری باتیں۔ بی بی زونی ایسی ہے..... زونی ویسی ہے۔''

''بی بی.....'' وہ کچھ کہنے کی کوشش میں کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔

''بہت دیوانہ ہے..... جھلا پاگل ہے۔ بہت کہتی ہوں شادی کر لے مانتا ہی نہیں۔'' بی بی رو دیں۔

''مجھے معاف کر دیں بی بی۔''

''کس بات کی معافی بچے۔''

''میں محبت کے وجود کی منکر تھی مگر مان گئی کہ محبت ہوتی ہے۔ اور محبت نے میرے دل کو چھوا مجھے بدحواس کیا مگر تب وقت گزر گیا تھا۔ مگر یہ سچ ہے وہ مرد آپ کا بیٹا ہی ہے جس نے میرے دل کو یقین دلایا کہ محبت ہوتی ہے جو دل کی دنیا تہ و بالا کر دیتی ہے۔'' زونی رو دی۔

پھر وہ سب کچھ بتاتی چلی گئی ثانیہ کی محبت کی کہانی۔ جس نے اسے محبت سے منکر کیا تھا۔ ایک ایک بات کہتی چلی گئی، دادی کی باتیں۔ اس بات سے بے خبر کہ باہر ارباز کب سے کھڑا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ زونی نے ایک ایک بات بی بی کو بتا دی تو وہ ہلکی ہو گئی تھی۔ ارباز کا دل سکون پا گیا کہ وہ بھی محبت کا ذائقہ چکھ چکی ہے اس کا دل بھی ارباز کے لیے تڑپ چکا ہے۔

''چلتی ہوں بی بی۔ اسے کہنا کہ محبت میں سچا اور کھرا ثابت ہونا چاہتا ہے تو شادی کر لے ورنہ میں سمجھوں گی وہ جھوٹا تھا۔''

''میں نے اپنی ماں کو خوش کر دیا اسے کہنا وہ اپنی ماں کو خوش کر دے۔ حساب برابر۔'' کہہ کر وہ رکی نہیں تھی۔ اس حویلی سے نکلتے ہوئے وہ جانتی تھی وہ اسے دیکھ رہا ہے مگر وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

☆☆

اُمِّ اقصیٰ

غیر ضروری سچ

فینسی جوڑوں اور لائٹوں کی چمک دمک عروج پر تھی۔ سب ایک دوسرے پر خوب تبصرے کر چکے تھے۔ ایک دوسرے سے بیر رکھنے والیاں سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ بھی کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو سارے میں پھیلی گئی۔ ینگ اور پرجوش ویٹریس بلیک پینٹ سفید کوٹ میں ہاتھوں میں فروٹ چاٹ کے تھال لیے ماہرانہ انداز میں بھاگتے ہوئے تھال گھماتے اپنے فرائض سرانجام دے رہیں تھی۔ اسریٰ نے ایک نظر ہال میں دوڑائی۔ اور اپنی سسرالی رشتہ داروں پر مشتمل میز کی جانب بڑھی اور اپنی نند بشریٰ کے ساتھ والی نشست سنبھالی۔ سامنے ہی اس کی جیٹھانی عارفہ بھابھی حسب عادت ناک چڑھائے بیٹھی تھیں۔

''یہ رنگ کیسا ہے فروٹ چاٹ کا جیسے خوب سارا زرد رنگ انڈیلا گیا ہو۔'' عارفہ بھابھی پلیٹ میں فروٹ چاٹ نکالتے ہوئے تبصرہ کر رہی تھیں۔

اسریٰ کی نگاہیں دلہن کی والدہ شازیہ باجی پر تھیں۔ کس قدر کٹھن مرحلہ ہوتا ہے ناں بیٹی کو رخصتی کرنا بھی..... وہ شازیہ باجی کی نم آنکھوں کو دیکھتے سوچ رہی تھی۔

چند لمحوں میں میز انواع اقسام کے کھانوں سے بھر گئی۔ اسریٰ نے ذرا سا سلاد اپنی پلیٹ میں نکالا ذرا سا قورمہ ایک طرف ڈالا..... نان کے پیکٹ میں سے ایک ٹکڑا نکالا انتہائی خستہ نان تھے۔

''قورمے میں نمک کم ہے۔'' عارفہ بھابھی با آواز بلند بولیں۔

سبھی خاموشی سے کھانے میں مصروف تھے۔ تبھی اسریٰ کی نظر سامنے اٹھی۔ انتہائی لاابالی اور کھلنڈرا سا ریان بڑا ذمہ دار بنا ایک ایک میز پر جا کر سب سے کھانے کی بابت پوچھ رہا تھا۔

''باجیوں بھابھیوں کچھ اور چاہیے۔'' ریان نے ایک ایک چیز کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''ریان آؤ تم بھی کچھ کھالو۔'' اسریٰ نے پلیٹ بڑھائی نجانے ناشتا بھی کیا تھا یا نہیں۔

''نہیں بھابھی۔ آپ کھائیں..... میں بعد میں

کھاؤں گا۔''

''قورمے میں نمک کم ہے ناں.....'' عارفہ بھابھی نے اسریٰ سے تصدیق چاہی تھی۔

''مجھے نہیں لگ رہا کم ..... شادی بیاہ کے کھانوں میں اتنا ہی نمک ڈالا جاتا ہے ہر طرح کے لوگ آئے ہوئے ہیں مطلب بی پی کے مریض وغیرہ۔'' اسریٰ نے تفصیلی وضاحت کی۔

''اچھا ہی نہیں لگ رہا۔'' عارفہ بھابھی دوسری مرتبہ پلیٹ بھرتے ہوئے بولیں۔

اسریٰ نے تاسف سے سر ہلایا۔ تبھی اس کی نظر سامنے انکل جمیل پر پڑی۔ نم آنکھوں اور مسکراتے لبوں سے وہ مہمانوں کو مل رہے تھے۔ باپ کے لیے تو سب سے مشکل ہوتا ہوگا۔ اپنی لاڈو رانی اپنی گھر کی چہکار کو کسی اور کو سونپنا اور ایسی عزت سے سونپنا کہ لوگ دنوں ذکر کرتے رہیں۔

''یہ گاجر کا حلوہ ویسا نہیں جیسا کہ ہم لوگ گھر بناتے ہیں۔'' عارفہ بھابھی نزاکت سے پلیٹ حلوے سے سجاتے ہوئے بولیں۔

''ظاہر ہے بھابھی ..... یہ زیادہ مقدار میں بننا ہوتا ہے سو.....'' عادت سے مجبور اسریٰ گویا ہوئی۔

''یہ دیکھو۔ گاجریں صحیح پکائی بھی نہیں ہوئیں۔ کچا پن صاف ظاہر ہے۔'' انہوں نے پلیٹ اسریٰ کے آگے کھسکائی۔

بظاہر اعتماد سے بیٹھی دلہن کی اندرونی کشمکش سے نظر ہٹا کے اسریٰ نے اک نظر پلیٹ کی جانب کی۔

''بیٹی کی رخصتی کے کھانے میں عیب نہیں نکالنے چاہئیں بھابھی؟'' یہ باپ کی عمر بھر کی کمائی۔ بھائی کی محنت، ماں کی دعاؤں اور دلہن کی امیدوں پر مشتمل ہوتا ہے۔'' اسریٰ کا لہجہ نرم تھا۔

''عیب کہاں نکالے جو سچ ہے وہ سچ ہے۔'' وہ بے حد برا مانتے بولیں۔

''سچ کڑوا تو سنا ہی ہے مگر اکثر یہ تلوار کی کاٹ لیے ہوتا ہے۔ تبھی تو غیر ضروری سچ بھی منع ہے۔''

''لو۔ اک ذرا سی بات کیا کہہ دی تم تو فلسفے جھاڑنے لگیں۔'' اپنے آگے سے پلیٹ کھسکاتے وہ منہ دوسری طرف کرتے ہوئے بولیں۔ اسریٰ ازلی نرم تاثرات لیے دلہن کے جذبات پڑھنے لگی۔

☆☆☆

اسریٰ چیئرز اور نہ لگوالیں۔ عظیم سے کہو مجھے یہ بہت کم لگ رہی ہیں۔'' اسٹیج پر کھڑے ہال کا ایک نظر جائزہ لیتی اسریٰ سے بھابھی بولیں۔

''ارے نہیں بھابھی۔ ٹھیک ہیں اتنی۔ میری ابھی آمنہ سے بات ہوئی ہے خواتین کم ہیں بارات میں.....تو پھر ایویں ہال میں رش ڈالنے کا فائدہ۔''

''دیکھ لو پوری تو آجائیں گی ناں..... عجیب سا لگتا ہے بارات آجائے اور کھڑی رہے انتظامیہ کرسیاں لگوانے میں مگن ہو۔'' وہ پھر پریشانی سے بولیں۔

''آپ فکر نہ کریں بھابھی..... ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' اسریٰ نے تسلی دی۔

''یہ پلر کے ساتھ والی لائٹس کیوں آن نہیں۔ عظیم سے کہہ کے آن کرواؤ۔ اندھیرا سا لگ رہا ہے ہال میں۔'' اسٹیج کی سیڑھیاں اترتے انہیں ایک اور مسئلہ نظر آیا۔

''لائٹ نہیں ہے۔ جنریٹر آن ہے۔ دس منٹ رہتے ہیں لائٹ آنے میں۔'' لائٹ کے آتے سب لائٹس آن ہو جائیں گی۔''

''ارے ہاں اسریٰ۔ زونا کا پتا کرواؤ پارلر میں اور کتنی دیر لگے گی بارات تو بس پہنچنے ہی والی ہے ناں۔'' جاتے جاتے وہ پھر سے پلٹیں۔

''وہ ریڈی ہے بھابھی۔ عظیم کا ابھی کچھ ہی دیر پہلے پیغام آیا تھا۔ وہ لینے جا رہے ہیں زونا کو۔''

اسریٰ کو بھابھی پر باقاعدہ ترس آیا جب سے زونا کی شادی کی تاریخ طے ہوئی تھی وہ یونہی پریشان پھرکی کی مانند گھومتی تھیں۔ حالانکہ زونا کے سسرال والے بہت پڑھے لکھے اور سلجھے لوگ تھے۔ دو تین دن سے تو ان کا زیادہ ہی برا حال تھا۔ سو فکریں اندیشے پالے بیٹھی تھیں۔

تین دن پہلے اسریٰ جب زونا کے گفٹس دینے آئی اور بھابھی کا یہ حال دیکھا تو انہی کی طرف رک گئی۔ اگلے دن دو تین گھنٹے لگا کے گھر سے پیکنگ کرالائی اور بھابھی کو تسلی دینے کی خاطر سب کاموں کا ذمہ لے لیا۔ عظیم باہر کے معاملات نپٹا رہا تھا مگر پھر بھی بھابھی کبھی آنسو بہانے بیٹھ جاتیں۔ کبھی بیٹی کی جدائی پہ رونے لگتیں تو کبھی بیٹی کے مستقبل کا سوچ کے پریشان ہو بیٹھتیں۔ کبھی فنکشن کی ذمہ داریوں پر ہولنے لگتیں۔ رات سے کچھ کھایا بھی نہ تھا۔ صبح ناشتا بھی نہ کیا۔ ہال میں آتے اسریٰ نے زبردستی جوس کا گلاس تھمایا۔

''گھونٹ نیچے اترتا ہی نہیں ہے اسریٰ۔ اللہ کرے سب معاملات ٹھیک سے طے ہو جائیں۔''

''ان شاء اللہ..... بھابھی.....''

''عدیم بھی صبح سے بھوکے پھرتے ہیں..... شوگر کے مریض ہیں طبیعت نہ بگڑ جائے۔'' انہیں ایک اور پریشانی نے ستایا۔

''عظیم سنبھال لیں گے۔ اس طرف سے مطمئن رہیں.....''

''بارات آئی..... بیٹھ گئی..... نکاح ہو گیا مگر بھابھی کو ایک پل کو چین نہ آیا۔ زونا کو اسٹیج پر دیکھتیں تو آنکھیں بھر آتیں۔ لوگوں کا ہجوم دیکھتیں تو سب ٹھیک ہو جانے کی فکر پال بیٹھیں۔

''ابھی کل کی بات لگتی ہے۔ جب اس کے ہاتھ پر میں نے پہلا بوسہ دیا تھا۔ میرا پلو تھامے پھرتی تھی۔ ہر چیز میچنگ چاہیے ہوتی تھی۔ سبز رنگ کے جوتے کے لیے پورا بازار کھنگال ڈالا تھا۔''

اسریٰ نے تسلی کے انداز میں اپنا ہاتھ ان کے کندھے رکھا۔

''بھابھی۔ کھانا لگ گیا ہے آپ ذرا سب ٹیبلز کا ایک نظر جائزہ لیں میں اسٹیج پر زونا کے سسرالیوں کو پوچھ کے آئی ہوں۔''

''سب کچھ بنا لیتی ہے پر روٹی نہیں بناتی۔ ڈرتی بہت ہے بہت چھوٹی تھی جب سے ضد پکڑ لی تھی روٹی نہیں بناؤں گی۔ ماں تو سب کو رکر لیتی ہے پر.....'' اسریٰ اسٹیج سے آئی ہی تھی کہ بھابھی پھر سے شروع ہو گئیں۔

''سب ٹھیک ہو گا بھابھی..... آپ ٹینشن نہ لیں..... بیٹھ جائیں آپ اور کچھ کھا لیں۔'' اسریٰ نے کندھوں سے پکڑ کے انہیں خالی کرسی پر بٹھایا۔ اور خود بھی قریب ہی بیٹھ گئی۔

''میرے گلے سے نوالہ اترے گا ہی نہیں اسریٰ!'' اس نے کھانا لانا چاہا تو بھابھی نے منع کر دیا اور یک ٹک اسٹیج کی جانب دیکھے گئیں۔

''اول ذرا ڈھیلے رہ گئے ہیں..... مزا ہی نہیں آ رہا ہے۔'' پیچھے کہیں سے آواز آئی۔

بھابھی نے مڑ کے پیچھے دیکھنا چاہا تو اسریٰ نے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''میری بیٹی کے مستقبل کا فیصلہ ہو رہا ہے۔ میری گودوں میں پلی بڑی ہے اور یہ چاولوں کے ذرا ڈھیلا رہ جانے پر باتیں بنا رہی ہیں۔'' آن واحد میں بھابھی کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

''چھوڑیں بھابھی لوگ ہیں۔ اور لوگوں کا تو کام ہی باتیں بنانا ہے۔''

''کسی کی بیٹی کی شادی پر تو لوگ بن کے نہ آیا کریں۔ کسی کی بیٹی کی شادی پر تو بیٹی والے بن کر جایا کریں۔'' کسی کی عام سی بات بھابھی کو تلوار کی طرح چبھی تھی۔ بھولی بسری ایک یاد ان دونوں کے درمیان آ ٹھہری۔ عارفہ بھابھی نے نگاہیں جھکا لیں ایسی کتنی ہی باتیں قد آدم بھوتوں کی صورت ان کے سامنے تھیں۔ مگر سچ ہے کہ احساس اپنی باری پر ہوتا ہے۔

''آئیں بھابھی۔ زونا کی رخصتی کا وقت ہے۔'' اسریٰ نے انہیں پچھتاوے سے نکالا۔ پچھتاوے کا فائدہ بھی کیا۔ تلافی کرنا تھی اور اسریٰ کو یقین تھا یہ وہ اب عمر بھر کریں گی۔

☆☆

نگہت عبداللہ

ہوائیں رخ بدل گئیں

حیدر علی اور احمد علی دو بھائی تھے۔ حیدر علی بڑے تھے، چھوٹے بھائی احمد علی کے لیے وہ مشفق باپ تھے۔ احمد علی کا انتقال ہو چکا تھا اور حیدر علی جس حد تک ممکن ہوتا بھاوج اور بچوں کی مدد کرتے ہیں۔

حیدر علی کو ان کے مزاج کے برعکس بیوی ملی تھیں۔ وہ جتنے نرم خو تھے حمیدہ بیگم اسی قدر تیز و طرار اور کسی حد تک بدزبان بھی۔ احمد علی کی بیوی فاخرہ ان ہی کی طرح نرم مزاج اور درگزر کرنے والی تھیں۔

حیدر علی کی تین بیٹیاں سبینہ، خزینہ اور شہرینہ تھیں جبکہ احمد علی کے دو بچے حمزہ اور بیلا تھے۔

سبینہ کی شادی ہو چکی ہے۔ خزینہ اپنے باس تیمور غزنی کو پسند کرتی ہے جبکہ خزینہ کا خالہ زاد شرجیل اس کو چاہتا ہے۔ حمزہ اور شہرینہ کا رشتہ، حیدر علی نے حمیدہ بیگم کی مرضی کے خلاف بھائی کی زندگی ہی میں ان کی کم عمری ہی میں کر دیا تھا جو وقت کے ساتھ ان کے دلوں میں بھی مضبوط ہو چکا ہے۔

حیدر صاحب کا آفس میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو جاتا ہے۔ حمزہ کو جاب مل جاتی ہے لیکن اس کے باس حسان صاحب کی بیٹی ربیکا اس کو پسند کرنے لگتی ہے جو وقتاً فوقتاً حمزہ کو اپنی باتوں سے پریشان کرتی ہے۔

تیمور غزنی اور سارہ کی کوئی اولاد نہیں ہے، سارہ مس کیرج ہونے کی وجہ سے وہ اب کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ سارہ، تیمور سے اپنی دوست زوبی کا بے بی لینے کا کہتی ہے لیکن تیمور اس بات پر دل سے رضامند نہیں ہے۔

سونیا کے مشورے پر تیمور دوسری شادی کے لیے سوچنے لگتا ہے اور خزینہ اسے بالکل موزوں نظر آتی ہے لیکن وہ خزینہ سے جھوٹی محبت کا اظہار کرتا ہے اور اسے سارہ کے بارے میں نہیں بتاتا اور کہتا ہے کہ فی الحال گھر والے راضی نہیں ہیں اس لیے وہ خزینہ سے چھپ کر شادی کرے گا اور بعد میں انہیں منالے گا۔ خزینہ تیمور کی محبت میں رضامند ہو جاتی ہے اور حمیدہ بیگم کو بھی اس شادی پر راضی کر لیتی ہے۔ تیمور خزینہ کو ایک الگ فلیٹ میں بیاہ کر لے جاتا ہے۔

ربیکا بیلا کو اغوا کر کے حمزہ کو بلیک میل کرتی ہے اور مجبوراً حمزہ کو ربیکا سے شادی کرنی پڑتی ہے۔ شہرینہ حالات سے

سمجھوتا کر کے اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے۔

خزینہ تیمور کے ساتھ خوش گوار زندگی گزار رہی ہے۔اس کا پہلا بچہ پیدا ہوتا ہے۔تیمور بچے کو سارہ کی پاس لے جاتا ہے اور خزینہ سے کہہ دیتا ہے کہ بچہ مرا ہوا پیدا ہوا تھا۔اللہ تعالیٰ خزینہ کو کچھ عرصے بعد دوسرے بیٹے سے نواز دیتا ہے تو تیمور کے دل پر سے خزینہ سے اولاد چھین لینے کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔

جہانداد کی ماں نفسیاتی مریضہ ہیں۔ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق جہانداد ماں کو خوش رکھنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ جہانداد کے اسکول میں شہرینہ ٹیچر ہے۔شہرینہ کو دیکھ کر جہانداد کے دل میں انجانی خواہشات جنم لینے لگی ہیں۔جہانداد کی ماں بیمار ہوتی ہیں تو اسکول کی ٹیچرز عیادت کے لیے ان کے گھر جاتی ہیں وہاں شہرینہ کو دیکھ کر جہانداد کی ماں اندازہ لگا کر کہتی ہیں اس لڑکی کے دل میں بہت درد ہے اور پھر شہرینہ کے آنسو سارے بند توڑ کے بہنے لگتے ہیں۔

اکتیسویں قسط

شہرینہ کی آنکھوں میں جہانداد کا تاریک ہوتا چہرہ ٹھہر گیا تھا کہ پھر اسے کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔وہ کمرے میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔پھر آنکھوں کو مسل ڈالا۔

”شاید جہانداد کو برا لگا ہے۔“اس نے سوچا پھر فوراً سر جھٹکا۔

”تو میں کیا کروں۔اتنا قیمتی کنگن میں کیسے لے لیتی اور ان کی اماں مجھے کیوں دے رہی تھیں۔وہ سوچے چلی گئی۔شاید جہانداد نے انہیں کہا ہوگا کہ ان کی خدمت کا میں نے کوئی معاوضہ نہیں لیا تھا تو اس کے بدلے وہ کنگن دے رہی ہوں گی۔اف کتنی غلط حرکت ہے۔میں نے تو انسانیت کے ناتے......“

اس کی سوچوں کو بریک لگ گئے کیونکہ حمیدہ بیگم کی آواز آنے لگی تھی۔شاید وہ لوگ جا رہے تھے۔اس نے اپنا دھیان باہر کی طرف منتقل کیا اور جیسے ہی گیٹ بند ہونے کی آواز آئی وہ بھاگ کر کچن میں آ گئی اور سنک میں رکھے برتن دھونے میں خود کو مصروف کر لیا۔اصل میں اب وہ خائف ہو گئی تھی کہ اب حمیدہ بیگم کی باتیں سننی پڑیں گی۔لیکن کتنی دیر ہو گئی اسے اپنے عقب میں کوئی آواز سنائی نہیں دی تو وہ جو برتنوں کو رگڑے جا رہی تھی جلدی سے انہیں دھو کر کچن سے نکل آئی۔

حمیدہ بیگم بنا کچھ کہے اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں جس پر اسے حیرت ہوئی اور قدرے تشویش بھی کہ کہیں وہ ناراض تو نہیں ہو گئیں۔کچھ دیر لاؤنج میں کھڑی وہ ان کے پاس جانے کا سوچتی رہی لیکن ہمت نہیں ہوئی تو پھر سر جھٹک کر وہ رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔لیکن آخر کب تک وہ چھپ سکتی تھی۔

حمیدہ بیگم مغرب کی نماز کے بعد کھانا کھاتی تھیں اور اس وقت اسے کھانا لے کر ان کے کمرے میں جانا پڑا۔ان کے سامنے دستر خوان بچھایا پھر کھانا رکھ کر جانے لگی تو حمیدہ بیگم نے پوچھ لیا۔

”تم نہیں کھاؤ گی......؟“

”ابھی بھوک نہیں ہے۔“

”تو پھر لے جاؤ۔جب تمہیں بھوک لگے تب لے آنا۔مجھ سے اکیلے نہیں کھایا جاتا۔“حمیدہ بیگم نے کہا تو وہ جز بز ہوتی ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

”مجھے پتا ہے بعد میں آپ نہیں کھائیں گی۔چلیں شروع کریں۔“اس نے پہلے ان کی پلیٹ میں سالن نکالا پھر اپنی پلیٹ نکال کر کھانا شروع کر دیا۔کچھ دیر بعد اسے احساس ہوا کہ حمیدہ بیگم کچھ بول نہیں رہیں تو قدرے اچنبھے میں گھر کر وہ پہلے کن انکھیوں پھر براہ راست انہیں دیکھنے لگی۔

حمیدہ بیگم بظاہر بہت سکون سے کھانا کھا رہی تھیں۔لیکن ان کے چہرے پر کسی سوچ کا عکس اس نے کھوج

لیا تھا۔ جانے کیا سوچ رہی تھیں۔ اس نے قیاس نہیں کیا اور خود ہی کہنے لگی۔
''امی آپ کو پتا ہے جہانداد کی ماں مجھے کنگن کیوں دے رہی تھیں؟''
حمیدہ بیگم نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے لگیں، بولیں کچھ نہیں۔
''میں سمجھ گئی ہوں۔ اصل میں جب میں ان کے ہاں جا رہی تھی تو جہانداد نے مجھے سیلری دینی چاہی تھی جو میں نے لینے سے منع کر دیا تھا۔ کیونکہ میں وہاں جاب پر تو نہیں جا رہی تھی ہمدردی میں چلی گئی تھی۔ تو میرا خیال ہے انہوں نے احسان سمجھ کر اس طرح بدلہ اتارنا چاہا ہے۔ کتنی غلط حرکت کی ہے انہوں نے، مجھے بہت افسوس ہوا۔ ہے ناں افسوس کی بات؟''
آخر میں اس نے حمیدہ بیگم سے تائید چاہی تو وہ بس ''ہوں.....'' کر کے رہ گئیں۔
''آپ سے کیا کہا انہوں نے؟'' وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔
''کچھ نہیں اور تم بھی خواہ مخواہ فضول باتیں مت سوچو۔ چلو برتن اٹھاؤ۔'' حمیدہ بیگم نے ٹوک دیا تو وہ دسترخوان سمیٹنے لگی۔
''کل خزینہ آئے گی تو سوچ رہی ہوں اسے کچھ دنوں کے لیے روک لوں۔'' حمیدہ بیگم اپنے آپ بولیں۔
''جی میں بھی یہی چاہ رہی ہوں اسی لیے میں نے اس سے کہا تھا کہ ہنی کو لیتی ہوئی آئے۔'' اس کی بات پر حمیدہ بیگم نے کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنی ہی کسی سوچ میں گم ہو گئی تھیں، تب وہ کھانے کے برتن لے کر ان کے کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

''وہ کیا نام ہے اس لڑکی کا؟'' ماں نے جانے کیا سوچتے ہوئے پوچھا تو جہانداد چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔
''وہی آج جس کے گھر گئے تھے۔'' ماں جانے اب کیا چاہتی تھیں۔ وہ اندر ہی اندر جز بز ہو کر بولے۔
''شہرینہ۔''
''ہاں شہرینہ، پتا نہیں کیسے اتنا پیارا نام میرے ذہن سے نکل گیا۔ بہرحال میں یہ پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ شہرینہ کی ماں نے سوچ کر جواب دینے کو کہا تھا ناں تو تمہارے خیال میں وہ سوچنے میں کتنا وقت لیں گی؟''
''مم..... میں کیا کہہ سکتا ہوں ماں۔'' وہ فوراً ہی تنگ پڑ گئے تھے۔
''کیوں تمہاری شہرینہ کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہے میرا مطلب ہے تم اس سے معلوم کرو۔'' ماں اپنی جگہ ٹھیک سمجھ رہی تھیں کہ جہانداد نے شہرینہ کا نام یونہی تو نہیں لیا ہو گا یقیناً دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں گے۔
''اف ماں، آپ کیا سمجھ رہی ہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ میرا شہرینہ کے ساتھ ایسا کوئی تعلق نہیں۔'' جہانداد کسی طرح خود پر قابو نہیں پا سکے تھے۔
''تعلق نہیں تو پھر، تم نے اسے کہاں دیکھا اور پسند کیا؟'' ماں کا یہ روپ ان کے لیے نیا نہیں تھا۔ بیماری سے پہلے وہ ایسے ہی ہر بات کی تہ تک جاتی تھیں۔ جہانداد واقعی سٹپٹا گئے۔
''مجھے ٹھیک سے کچھ یاد نہیں ماں، شاید آپ کے اسکول میں وہ جاب کرتی تھی۔''
''میرے اسکول میں.....'' ماں اسکول کی ایک ایک ٹیچر کا نام لینے لگیں پھر انہیں دیکھ کر بولیں۔ ''شہرینہ تو میرے اسکول میں نہیں تھی۔''
''اچھا آپ اسکول کب جوائن کر رہی ہیں۔ میرا خیال ہے اب آپ کو اپنی سیٹ سنبھال لینی چاہیے۔ یوں

آپ کا وقت بھی اچھا گزرے گا۔'' جہانداد نے ان کا دھیان بٹانے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہو گئے۔

''ہاں، رات میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ میرے اتنے دنوں کی غیر حاضری سے کہیں وہاں کا نظام نہ بگڑ گیا ہو۔ اس دوران تم نے بھی اسکول کا چکر نہیں لگایا؟'' ماں نے اچانک شاکی ہو کر پوچھا تو وہ فوراً کہنے لگے۔

''نہیں، میں تو جاتا رہا ہوں روزانہ گو کہ زیادہ ٹائم نہیں دے سکا لیکن ناغہ نہیں کیا اور آپ بے فکر رہیں نظام میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔''

''اچھی بات ہے۔ میں کل سے ہی جانا شروع کر دوں گی۔'' ماں نے کہا تو وہ خوش ہو گئے۔

''پھر تو آپ کو جلدی سو جانا چاہیے۔ میں بھی تھک گیا ہوں لیٹوں گا۔'' وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور جب ماں لیٹ گئیں تب وہ لائٹ آف کر کے ان کے کمرے سے نکل آئے۔

شام میں موسم نے جو انگڑائی لی تھی اس کے باعث اب فضا خاصی خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن ان کے اندر کا موسم اسی قدر خزاں رسیدہ تھا کہ شہر بینہ نے ان کی ماں کا تحفہ قبول نہیں کیا تھا اور انہیں رنج صرف اس بات کا نہیں تھا اس سے زیادہ پشیمانی اپنے آپ پر تھی کہ وہ یوں اچانک کیوں چلے گئے اور انہیں ماں کے سامنے بھی ابھی شہر بینہ کا نام نہیں لینا چاہیے تھا۔ پہلے انہیں خود شہر بینہ سے بات کرنی چاہیے تھی۔ پتا نہیں اس کے دل میں کیا تھا۔ وہ انہیں پسند کرتی بھی تھی یا نہیں۔ وہ کسی نے خوب گایا ہے۔

کسی سے پیار کرو تو پھر اظہار کرو
کہیں نہ پھر دیر ہو جائے

ان کی سماعتوں میں گائیک کی آواز دھیرے دھیرے سرگھیرنے لگی تھی کہ انہوں نے ایک دم سر جھٹک دیا پھر تیز قدموں سے اپنے کمرے میں آتے ہوئے خوش فہمی نے چپکے سے دل کا دامن تھام لیا۔

''شہر بینہ کی مدر نے سوچنے کو وقت مانگا ہے۔ جب ماں نے میرا پروپوزل دیا تو انہوں نے صاف انکار نہیں کیا تھا۔ سوچنے کا مطلب ہے وہ پہلے شہر بینہ سے پوچھیں گی اور اس سے پہلے مجھے شہر بینہ سے بات کر لینی چاہیے ہاں مجھے شہر بینہ سے بات کر لینی چاہیے۔''

انہوں نے اپنی سوچ پر ارادے کی مہر لگائی پھر اپنا سیل فون اٹھایا اور ٹائم دیکھے بغیر شہر بینہ کو کال ملا دی۔ دوسری طرف بیل جاتی رہی پھر ناٹ رسپانڈنگ کا ٹیپ بجنے لگا۔ تب انہوں نے ٹائم دیکھا۔ ابھی تو رات کے دس بجے تھے اور خصوصاً کراچی شہر میں اتنی جلدی تو شاید ہی کوئی سوتا ہوگا۔ انہوں نے چند لمحے سوچا پھر اس کا نمبر پش کر دیا اور یہ سلسلہ انہوں نے اپنے سونے تک جاری رکھا تھا۔ جب ہی نیند میں بھی ان کے دماغ میں ناٹ رسپانڈنگ کی گھنٹی بجتی رہی تھی۔

صبح جب وہ تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آئے تو ماں بھی اسکول جانے کے لیے تیار تھیں۔ جس پر انہیں حیرت ہوئی۔ شاید بھول گئے تھے کہ ماں جو بات منہ سے نکالتی ہیں اس پر فوری عمل بھی ان کی سرشت میں شامل تھا۔ بہر حال انہوں نے خود کو کچھ بھی کہنے سے باز رکھا کیونکہ یہ مشورہ انہوں نے ہی تو دیا تھا اور اب یہ ڈیوٹی انہیں نبھانی تھی کہ فی الحال وہ ماں کو اکیلے نہیں بھیج سکتے تھے۔

☆☆☆

خزینہ نے بیلا کے لیے آرٹی فیشل جیولری پسند کی۔ پھر اسے سوٹ کے ساتھ میچ کرنے کے لیے سیلز مین کو دے دی۔ اس کام میں کچھ وقت لگتا تھا۔ خزینہ نے ادھر ادھر دیکھا پھر شہر بینہ اور بیلا سے کہنے لگی۔

''اور کچھ تو لینا نہیں ہے۔ میرا خیال ہے ہم یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔''

''تم لوگ بیٹھو میں ہنی کو مال کی سیر کرا لاتی ہوں۔'' شہرینہ کہنے کے ساتھ ہنی کی پرام دھکیلتے ہوئے چل پڑی۔ اس رو کے اختتام پر اس نے پلٹ کر خزینہ کو ہاتھ ہلایا پھر بائیں سمت مڑ گئی۔ شاپنگ مال کی چکا چوند سے ہنی بہت خوش ہو رہا تھا۔ وہ بار بار جھک کر اسے گدگداتی پھر سیدھی ہو کر ادھر ادھر کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھنے لگتی۔

اور اس بار جب وہ ہنی کو گدگدا کر سیدھی ہوئی تو پرام کی ہینڈل پر اس کے ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہو گئی اور پیشانی پر ہلکی سی ناگواری کی لکیر بھی ابھر آئی تھی کیونکہ جانے کدھر سے نکل کر جہانداد سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔

''کیسی ہیں آپ.....'' جہانداد اس کی ناگواری محسوس کرنے کے باوجود پوچھ رہے تھے۔

''اچھی ہوں۔'' وہ کہہ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

''رات میں نے آپ کو اتنی کالز کیں آپ شاید سو گئی تھیں۔'' انہوں نے کہا تو وہ نروٹھے پن سے بولی۔

''پلیز آپ، یہاں بات نہ کریں۔ میں اپنی فیملی کے ساتھ ہوں۔''

''صرف ایک بات، میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ ایک بار ضرور بتائیں کہاں ملیں گی۔'' وہ اس انداز میں جلدی سے بولے کہ جیسے ہی وہ ہامی بھرے گی سامنے سے ہٹ جائیں گے۔

''سوری۔ میں کہیں نہیں مل سکتی۔'' اس کے انکار کا انہوں نے نوٹس نہیں لیا۔ جھک کر پرام میں سے ہنی کو اٹھا کر اسے پیار کرنے لگے۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ لائیے اسے مجھے دیں اور آپ ہٹ جائیں ہمارے راستے سے۔'' وہ غصہ ضبط نہیں کر پائی۔ ہنی کو لینے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو وہ پیچھے ہٹ کر کہنے لگے۔

''ایسے نہیں جب تک آپ ملنے کا وعدہ نہیں کریں گی میں آپ کو یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔ آپ چاہیں تو شور مچا کر لوگوں کو اکٹھا کر سکتی ہیں۔''

''یا اللہ یہ شخص ایسا تو نہیں تھا۔'' وہ حیرت میں گھری خشمگیں نظروں سے انہیں دیکھے گئی۔

''صرف ایک بار پھر جیسا آپ چاہیں گی۔'' وہ ملتجی نہیں تھے زبردستی اپنی بات بنوانا چاہ رہے تھے۔ وہ بھی پبلک پلیس پر۔

شہرینہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ لوگ متوجہ ہونے لگے تھے۔ تب وہ جلدی سے بولی۔

''ٹھیک ہے۔ لیکن وعدہ نہیں کرتی۔''

''وعدہ.....'' وہ اڑ گئے۔

''وعدہ پکا وعدہ۔'' شہرینہ نے سلگ کر دانت پیسے تو وہ ہنی کو پرام میں بٹھا کر بولے۔

''تھینک یو، آپ کو جب سہولت ہو مجھے میسج کر دیجیے گا۔ لیکن پلیز زیادہ انتظار مت کروائیے گا۔'' اس کے ساتھ ہی وہ پلٹ کر تیز قدموں سے چلتے ہوئے دائیں سمت مڑ گئے۔

شہرینہ بلا ارادہ ان کے پیچھے دیکھے جا رہی تھی جب ہنی نے رونا شروع کیا تب چونکنے کے ساتھ ہی اس نے پرام واپس موڑی اور تقریباً بھاگتے قدموں سے خزینہ کے پاس آ کر پوچھنے لگی۔

''ہو گیا تمہارا کام؟''

''ہاں بس وہ پیک کر رہا ہے۔ اچھا ہوا تم آ گئیں ورنہ تمہیں ڈھونڈنا پڑتا۔ خزینہ کہتے ہوئے اٹھ کر کاؤنٹر پر چلی گئی تو وہ اس کی جگہ بیٹھ کر پسینہ صاف کرنے لگی۔ اچھا ہوا جو بیلا بھی ہنی کے ساتھ مصروف ہو گئی تھی۔ اسے سنبھلنے کا موقع مل گیا لیکن بے سود دل قابو میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ بڑی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سمجھ میں نہ آنے

والی کیفیت تھی اور اس وقت تو نہیں واپسی کے راستے میں خزینہ نے اسے ٹوک دیا۔
''تمہیں کیا ہوا ہے شہری پریشان لگ رہی ہو؟''
''ہاں وہ.....'' اس نے نہیں تو کہہ کر ٹالنے کی سعی نہیں کی فوری بات بنادی۔ ''میں ہنی کو لے کر گئی تو وہاں میرا پاؤں سلپ ہوگیا تھا گر گئی۔ اف اتنے لوگ جمع ہوگئے تھے۔ میں پریشان ہوگئی۔ ابھی بھی سوچ سوچ کر عجیب سا لگ رہا ہے۔''
''تو کیوں سوچ رہی ہو۔ مت سوچو۔'' خزینہ نے لاپروائی سے کہا تو وہ چڑ کر بولی۔
''تمہارے ساتھ ایسا ہوتا تو پتا چلتا.....''
''کیا پتا چلتا میں تو بہت انجوائے کرتی۔ ویسے تم خود اٹھی تھیں یا کسی نے اٹھایا تھا۔'' خزینہ مذاق کے موڈ میں آ گئی۔ مزید بیلا کی بے ساختہ ہنسی نے اسے سلگا دیا تھا۔
''میں تم نہیں ہوں خزی جو کسی کے اٹھانے کا انتظار کرتی۔''
''چہ چہ..... سدا کی بے وقوف ہو خود ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ارے ذرا انتظار کرتیں ہوسکتا جو ہاتھ پکڑ کر اٹھاتا وہ ہمیشہ کے لیے ہاتھ تھامنے کی بات بھی کرلیتا۔''
''تم.....'' وہ غصے سے اسی قدر کہہ کر دوسری طرف منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔
خزینہ نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا پھر مزید کچھ کہنے کا ارادہ ملتوی کر دیا کیونکہ وہ سچ مچ غصے میں آ گئی تھی۔

☆☆☆

ثمرہ کتنے دنوں سے خود کو ربیکا کے متعلق بات کرنے کے لیے تیار کر رہی تھیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں طلاق کا سنتے ہی حسان صاحب بھڑک اٹھیں گے۔ اس وقت وہ اسی سلسلے میں ان کے آس پاس منڈلا رہی تھیں۔
حسان صاحب اپنے آفیشل پیپرز میں مصروف تھے۔ اس کے باوجود وہ ثمرہ کی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ پھر جب اپنے کام سے فارغ ہوگئے تب انہیں دیکھ کر پوچھنے لگے۔
''کوئی پرابلم ہے تمہارے ساتھ یا کچھ کہنا چاہتی ہو۔''
''ہاں وہ.....''
''بیٹھ جاؤ آرام سے بیٹھ کر بات کرو۔'' انہوں نے کہا تو ثمرہ ان کے قریب صوفے پر ڈھے سی گئیں۔
''اب کیسا آرام، مجھے تو کسی پل آرام نہیں آ رہا۔''
''کیوں ایسا کیا ہوا ہے جو تم.....''
''حمزہ نے ربیکا کو طلاق دے دی ہے۔'' ثمرہ کا ڈیپریشن ایک دم ظاہر ہوگیا اور حسان صاحب جو گردن موڑ کر انہیں دیکھ رہے تھے بغیر کوئی تاثر دیے واپس اپنے بریف کیس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ جس سے ثمرہ یہی سمجھیں کہ ان تک یہ بات پہلے ہی پہنچ چکی ہے جبھی پوچھنے لگیں۔
''آپ کو پتا تھا؟''
''نہیں ابھی تم بتا رہی ہو اور یہ تو کوئی ایسی بات نہیں جس کے لیے تم اتنی پریشان ہو رہی ہو۔'' حسان صاحب کے نارمل انداز پر وہ اچھل پڑیں۔
''پریشان کیسے نہ ہوں حسان ہماری بیٹی.....!''
''ایک منٹ.....'' حسان صاحب انہیں ٹوک کر کہنے لگے۔ ''ٹھیک ہے، ربیکا ہماری بیٹی ہے لیکن وہ اپنے ہر معاملے میں خود مختار بھی ہے اور واضح طور پر اس نے کہہ بھی دیا تھا کہ حمزہ اور اس کے معاملے میں ہمیں بولنے کا

کوئی حق نہیں تو جب اس نے ہمیں بے دخل کر دیا تو پھر ہم کیوں ماتم کریں۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا حسان کہ آپ اتنے بے حس ہو گئے ہیں۔'' ثمرہ شاکڈ ہو کر بولیں۔

''شکر ہے تم نے یہ نہیں کہا کہ میں ہمیشہ سے بے حس تھا۔ مجھے بے حس تمہاری بیٹی نے کیا ہے۔ میری، تمہاری ہر بات کی نفی کر کے اور سنو، یہ میں یقین سے کہوں گا کہ اس نے خود حمزہ کو طلاق دینے پر مجبور کیا ہوگا۔ اگر حمزہ اپنے طور پر یہ قدم اٹھاتا تو پہلے مجھے ضرور انفارم کرتا اور وجہ بھی بتاتا۔''

''آپ ہمیشہ اپنی بیٹی کو الزام دیتے ہیں۔ آخر کیوں؟'' ثمرہ کے لہجے میں تاسف سمٹ آیا تھا۔ حسان صاحب نے ہونٹ بھینچ کر خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا کیونکہ وہ بار بار گزری باتیں دہرانا نہیں چاہتے تھے۔ ثمرہ سمجھ کر پوچھنے لگیں۔

''یہ بتائیں اب ہم کیا کریں؟''

''ہمیں کیا کرنا ہے؟'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

''میرا مطلب ہے ربیکا وہاں اپنے بنگلے میں اکیلی ہے۔''

''میں نے اپنے گھر کے دروازے اس پر بند تو نہیں کیے۔'' انہوں نے کہا تو ثمرہ فوراً پوچھنے لگیں۔

''میں اسے یہاں لے آؤں۔''

''اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے اس کا گھر ہے جب چاہے آئے۔ لیکن اسے سمجھا دینا کہ میں اس کی حد سے بڑھی ہوئی آزادی پسند نہیں کروں گا۔ کاش وہ اس گھر سے کچھ سیکھ لیتی۔''

آخر میں انہوں نے خود کلامی کی تھی پھر بھی ثمرہ سن کر بری طرح سلگ گئیں۔ لیکن وہ اس وقت کوئی بحث نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ ان کے لیے یہی بہت تھا کہ ربیکا کے معاملے میں حسان صاحب نے انہیں الزام نہیں دیا تھا۔

''ٹھیک ہے میں جاتی ہوں ربیکا کے پاس۔'' وہ کہہ کر فوراً اٹھ گئیں۔ کیونکہ مزید کچھ سننا نہیں چاہتی تھیں اور حسان صاحب نے انہیں نہیں روکا۔ آخر باپ تھے بیٹی کے لیے دل میں درد تو اٹھا تھا۔ لیکن اب وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اور کچھ نہیں تو ربیکا کو اپنی غلطی کا احساس ضرور ہونا چاہیے تاکہ آئندہ وہ اپنی انا اور ضد میں اپنے ساتھ کسی اور کی بھی زندگی خراب نہ کرے۔

بہرحال جب ثمرہ ربیکا کے پاس پہنچیں تو وہ کہیں جانے کے لیے تیار تھی جبھی اچانک اور اس کے خیال سے بے وقت ثمرہ کو دیکھ کر جھنجلا گئی۔

''افوہ ممی، آپ کو آنے سے پہلے فون کرنا چاہیے تھا۔''

''ہاں، جلدی میں مجھے خیال نہیں آیا۔'' ثمرہ اس کی تیاری قصداً نظرانداز کر کے بولیں تو ربیکا نے اسی جھنجلاہٹ میں پوچھا۔

''کس بات کی جلدی؟''

''گھر جانے کی..... آئی مین تمہیں اپنے ساتھ گھر لے جانے کی جلدی۔ چلو میرے ساتھ تمہارے ڈیڈی بھی خفا ہو رہے ہیں کہ تم اکیلی یہاں کیا کر رہی ہو گھر آؤ۔'' ثمرہ نے اپنی طرف سے حسان کا نام بھی لے دیا تو وہ چڑ کر بولی۔

''میں گھر میں ہی ہوں ممی۔ آپ کو اور ڈیڈی کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کی بات پر ثمرہ ایک دم آپے سے باہر ہو گئیں۔

''یہ تم کیا بکواس کرنے لگی ہو ہر بات میں ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ کیوں ضرورت نہیں ہے۔ اولاد ہو تم ہماری..... بیاہ دیا تھا تب ٹھیک ہے ہم تمہارے معاملے میں نہیں بولے۔ لیکن اب پھر تم ہمارے در پر آ گئی ہو یہ بنگلا جسے تم اپنا گھر کہہ رہی ہو تمہارے ڈیڈی نے تمہیں دیا ہے اور تم ان ہی کی نفی کر رہی ہو۔''

''نفی میں یونہی نہیں کرتی آپ لوگ مجھے مجبور کرتے ہیں۔ اور جب میں نے قسم کھالی کہ ڈیڈی کے گھر نہیں جاؤں گی تو نہیں جاؤں گی۔'' ربیکا کی ہٹ دھرمی میں ہلکی سی دراڑ بھی نہیں پڑی تھی۔

''تمہاری قسم کی ایسی تیسی۔ بہت من مانی کرلی تم نے اب اور نہیں، چلو..... ابھی چلو میرے ساتھ۔'' ثمرہ بھی اس کی ماں تھیں زبردستی اسے کھینچتے ہوئی لے جارہی تھیں۔

☆☆☆

حمیدہ بیگم نے مقصد سے ہی خزینہ کو روکا تھا۔ رات میں جب شہرینہ ہنی کو سلانے اپنے کمرے میں لے گئی تب حمیدہ بیگم خزینہ کو پاس بٹھا کر کہنے لگیں۔

''تمہیں جہانداد تو یاد ہوگا ناں۔ وہ جس کی ماں کو دیکھنے شہرینہ جاتی تھی۔ تم بھی تو ایک بار اس کے ساتھ گئی تھیں۔''

''جی جی مجھے یاد ہے۔ کیا ہوا ہے انہیں مطلب ان کی ماں کو؟''

''وہ ماشاءاللہ بالکل ٹھیک ہوگئی ہیں اور ابھی دو چار دن پہلے شہرینہ کو اپنے بیٹے جہانداد کے لیے پسند کر گئی ہیں۔ بلکہ رشتہ بھی دے گئی ہیں۔'' حمیدہ بیگم نے بتایا تو خزینہ یکدم مشتاق ہوگئی۔

''اچھا، آپ نے کیا کہا؟''

''کیا کہتی سوچنے کو وقت مانگا ہے۔ اب تم پہلے شہرینہ سے پوچھ لو وہ اگر ہامی بھرتی ہے تو پھر میں انہیں بلالوں گی۔''

''ہمم.....'' خزینہ کی نظروں میں جہانداد اور ان کا عالی شان بنگلا گھوم گیا۔

''میں نے تمہیں اسی لیے روکا ہے کہ تم شہرینہ سے بات کرو بلکہ اسے سمجھاؤ بھی، میری تو وہ سنتی ہی نہیں۔ اس روز سبینہ آئی تھی اس نے شادی کی بات کی تب بھی شہرینہ پٹھے سے اکھڑ گئی تھی۔ کہنے لگی جب تک میرا دل نہیں مانے گا شادی نہیں کروں گی۔'' حمیدہ بیگم فکرمندی سے بول رہی تھیں۔

''مان جائے گا اس کا دل آپ فکر نہ کریں۔'' خزینہ انہیں تسلی دے کر کہنے لگی۔ ''رشتہ تو اچھا ہے امی اور ایسے رشتے بار بار تھوڑی آتے ہیں۔ پھر ہوسکتا ہے.....'' خزینہ کچھ کہتے کہتے ایک دم چپ ہوگئی۔

''کیا ہوسکتا ہے؟'' حمیدہ بیگم نے ٹوکا تو وہ سنبھل کر بات بنا گئی۔

''ہوسکتا ہے شہرینہ ایسے ہی رشتے کے انتظار میں ہو۔''

''اور یہ بھی ہوسکتا ہے دونوں ایک دوسرے کو پسند کر چکے ہوں۔'' جو بات خزینہ نے نہیں کی وہ حمیدہ بیگم نے کہہ دی۔

''اگر ایسا ہوا تو پھر شہرینہ منع نہیں کرے گی۔ اسے پتا ہے کہ وہ آنٹی اس کے رشتے کے لیے آئی تھیں؟''

''نہیں وہ تو عجیب عجیب باتیں کرتی ہے۔ اس لیے میں نے اسے نہیں بتایا۔'' حمیدہ بیگم کی بات سن کر وہ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلیں آپ سوئیں۔ میں بات کرتی ہوں اس سے۔ لائٹ آف کردوں۔''

''ہاں.....''

''شب بخیر..... وہ لائٹ آف کر کے ان کے کمرے سے نکل کر شہرینہ کے کمرے میں آئی تو وہ ہنی کو سلا

کراب اپنا بستر جھاڑ رہی تھی۔''

''ابھی سونے کی کوشش مت کرنا مجھے تمہارے ساتھ باتیں کرنی ہیں۔'' خزینہ نے کہا تو وہ اپنی مصروفیت ترک کیے بغیر بولی۔

''میں فضول گوئی پسند نہیں کرتی۔''

''فضول گوئی!'' یہ فضول گوئی ہے کہ اس روز جہانداد کی اماں اس کے لیے نہ صرف تمہیں پسند کر گئی ہیں بلکہ پروپوزل بھی دے گئی ہیں۔'' خزینہ ترنگ میں بول رہی تھی وہ ایک دم تکیہ پھینک کر اس کی طرف گھوم گئی۔

''کیا؟''

خزینہ مسکرانے لگی۔ معنی خیز مسکراہٹ تھی جس نے شہرینہ کو سلگا دیا۔

''دماغ صحیح ہے تمہارا بلکہ ان لوگوں کا۔ انہیں اپنے لوگوں میں کوئی لڑکی نظر نہیں آئی جو یہاں چلے آئے۔''

''میرا خیال ہے جولڑکی نظر کے سامنے تھی انہیں وہی بھا گئی ہے۔'' خزینہ نے کہا تو وہ فوراً بولی۔

''لیکن میری نظر کو کوئی نہیں بھایا۔''

''تم خواہ مخواہ جذباتی ہو رہی ہو شہرینہ۔ اب اتنا اچھا رشتہ آیا ہے تو تمہیں سوچنا تو چاہیے یوں فوراً نہ نہ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔'' خزینہ سنجیدہ ہو گئی۔

''ٹھیک ہے یا غلط مجھے نہیں سوچنا۔'' وہ کہہ کر بیڈ کی طرف گھوم گئی۔

''ایسے مت کرو شہری۔'' خزینہ آ کر اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی اور اپنے ساتھ ہاتھ مار کر کہنے لگی۔ ''آؤ یہاں بیٹھو میں تمہیں فورس نہیں کر رہی نہ کروں گی۔ تمہیں اختیار ہے ہاں ناں کا۔ لیکن یوں بے سوچے سمجھے کچھ مت کہو۔ آؤ بیٹھو ہم آرام سے بات کرتے ہیں۔''

''بنا بات کیے یہ بات ختم نہیں ہو گی شاید۔'' شہرینہ نے سوچا پھر اس کے پیچھے تکیہ رکھ کر خود بھی اس کے ساتھ کمر ٹیک کر بیٹھ گئی۔

''ہاں تو کہاں سے بات شروع کریں۔'' خزینہ نے کہا تو اب وہ آرام سے پوچھنے لگی۔

''کہیں سے نہیں۔ پہلے تم بتاؤ کہ تم نے اور امی نے کیا سوچا ہے اس رشتے کے بارے میں؟''

''مجھے تو خیر سوچنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ ابھی امی نے بتایا ہے اور جہاں تک امی کی بات ہے تو ان کا خیال ہے کہ تم وہاں جاتی رہی ہو تو شاید تمہاری جہانداد کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ ہو چکی ہو گی جبھی ماں کے ٹھیک ہوتے ہی وہ ان کے ساتھ رشتہ لے کر آ گئے۔ کیا واقعی ایسا ہے؟''

خزینہ نے بتانے کے ساتھ پوچھا لیکن وہ امی کا خیال سن کر سناٹے میں تھی کہ دنیا تو باتیں بناتی سو بناتی پہلے تو وہ اپنی ہی ماں کی نظروں میں مشتبہ ہو گئی تھی۔

''کیا سوچنے لگیں۔'' خزینہ نے اس کا بازو ہلایا تو وہ چونک کر بولی۔

''کچھ نہیں۔''

''پھر بتاؤ ناں..... کیا امی کا خیال ٹھیک ہے؟'' خزینہ نے اپنا سوال دہرایا تو وہ بامشکل خود پر قابو پا کر کہنے لگی۔

''نہیں میں وہاں جہانداد کے لیے نہیں جاتی تھی۔ بلکہ ان سے تو میرا سامنا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا چند لمحوں کے لیے۔ جب انہیں ماں سے متعلق کوئی ضروری بات کرنی ہوتی۔ ان سے ہٹ کر انہوں نے کبھی مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ پھر کیسے میری ان کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ ہو سکتی ہے۔'' اس کے دل میں لہر سی اٹھی تھی۔ جسے دبانے کی خاطر نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔

''ہمم.....'' خزینہ اس کا یقین کر کے کہنے لگی۔ ''چلو چھوڑو ان باتوں کو اور میری ایک بات مان لو بلکہ میں ریکویسٹ کرتی ہوں کہ یوں فوری فیصلہ مت کرو۔ سوچ لو اچھی طرح ہر پہلو سے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم کہتی ہو تو سوچوں گی۔ اب پلیز تم اپنی جگہ پر جاؤ۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔'' اس کا دل بھر آ رہا تھا۔ لیکن خزینہ کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی اور آنسو تھے کہ کسی بھی پل بند توڑ سکتے تھے اس لیے اس نے سوچنے کی ہامی بھر کر خزینہ کو اپنے پاس سے ہٹا دیا۔

☆☆☆

حمزہ ان دنوں جانے کن کاموں میں مصروف ہو گیا تھا کہ فاخرہ اور بیلا کو ٹائم ہی نہیں دے رہا تھا۔ آفس سے گھر آتا تو لیب ٹاپ میں مصروف ہو جاتا۔ اس دوران فاخرہ یا بیلا آ کر کوئی بات کرتیں تو وہ بس ہوں ہاں میں جواب دیتا۔

اس وقت بھی فاخرہ کچھ کہہ رہی تھیں لیکن عدم توجہی کے باعث وہ سمجھ نہیں پایا اور بس ہوں کر دی تو فاخرہ بگڑ گئیں۔

''کیا ہوں ہوں لگا رکھی ہے۔ بند کرو اسے اور بتاؤ میں کیا کہہ رہی ہوں۔''

وہ ہڑبڑا کر انہیں دیکھنے لگا۔

''جی کیا کہہ رہی ہیں.....''

''اسے رکھو گے تو پتا چلے گا۔'' فاخرہ نے لیب ٹاپ پر ہاتھ مارا تو اس نے فوراً بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے بٹھا کر کہنے لگا۔

''اصل میں اماں کچھ ضروری کام ہیں جو میں چاہتا ہوں بیلا کی شادی سے پہلے نپٹ جائیں۔''

''بس رہنے دو ضروری کام ادھر وہ لوگ تاریخ مانگ رہے ہیں اور وہ شائمان کی ماں میری نہیں سن رہیں کہہ رہی ہیں بس اس اتوار کو ہم مایوں کی رسم کرنے آ جائیں گے۔'' فاخرہ نے ٹوک کر بتایا تو وہ پوچھنے لگا۔

''مایوں مطلب مہندی.....؟''

''نہیں مایوں پہلے ہو گی۔ ہفتہ دس دن مایوں بیٹھے گی پھر مہندی شادی.....'' فاخرہ نے کہا تو وہ دنوں کا حساب لگانے لگا۔

ہفتہ دس دن اور ابھی اتوار میں بھی کچھ دن ہیں۔ ٹھیک ہے اماں جیسا وہ کہہ رہے ہیں ویسے ہی کر لیں۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ بس آپ مجھے ٹینشن نہ دیا کریں۔ صرف اتنا بتایا کریں کہ مجھے کیا انتظام کرنا ہے۔'' اس نے کہا تو فاخرہ کچھ حیرت اور خفگی سے اسے دیکھنے لگیں۔

''کیا ہوا میں نے کچھ غلط کہہ دیا۔ اس نے فوراً پوچھا تو جواب میں فاخرہ تاسف سے سانس کھینچ کر بولیں۔''

''لگتا ہے تمہیں بہن کی شادی میں کوئی دلچسپی نہیں۔''

''کیا بات کرتی ہیں اماں۔ سب اسی کے لیے تو کر رہا ہوں۔ آپ کیا چاہتی ہیں میں ہر وقت آپ کے پاس بیٹھا اس کی شادی کی باتیں کرتا رہوں۔ سوری اماں میں لڑکی نہیں ہوں۔ شادی بیاہ کی باتیں لڑکیاں ہی کرتی ہیں۔ کتنے جوڑے بنائے زیور دکھاؤ۔ میک اپ کے لیے کون سے پارلر جاؤ گی۔ ہائے اللہ، وہ تو بہت مہنگا ہے۔'' آخر میں وہ لڑکیوں کی آواز اور انداز میں بولے چلا جا رہا تھا۔

فاخرہ کو ہنسی آ گئی۔ اس کے سر پر چپت لگائی۔

''شریر.....'' پھر کہنے لگیں۔ ''مایوں میں یہاں تو صرف گھر کے لوگ ہوں گے اور ادھر سے پتا نہیں کتنے

لوگ آئیں۔

''ہماری طرف سے صرف گھر کے کیوں، تائی جان کو نہیں بلائیں گی؟'' حمزہ نے ان کی بات پوری ہونے سے پہلے پوچھا۔

''کیوں نہیں بھابھی، خزینہ، شہرینہ انہیں ملا کر ہی میں گھر کے لوگ کہہ رہی ہوں۔''

''پھر ٹھیک ہے اور ادھر آپ صبح فون کر کے معلوم کر لیجیے گا۔ پھر اسی حساب سے میں انتظام کر دوں گا۔'' وہ جلدی جلدی بول کر غالباً فاخرہ کو اپنے پاس سے اٹھانا چاہتا تھا۔

''ہاں میں بھی تمہیں یہی کہنے آئی تھی۔''

''چلیں اب آپ جا کر آرام سے سوئیں۔ میں بھی کچھ کام کر لوں۔ اس نے کہہ کر لیپ ٹاپ اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو فاخرہ پوچھنے لگیں۔''

''آفس کا کام گھر لے آتے ہو؟''

''نہیں اماں، یہ اور کام ہے بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی مجھے کام کرنے دیں۔'' اس نے لیپ ٹاپ اٹھایا تو فاخرہ اٹھ کر چلی گئیں۔

☆☆☆

شہرینہ نے جہانداد سے وعدہ تو کر لیا تھا لیکن پھر یہ بھی سوچ لیا تھا کہ وہ ان سے کبھی نہیں ملے گی اور یہ تب کی بات ہے جب اسے پتا نہیں تھا کہ وہ ایں کے گھر اپنی ماں کو لے کر کسی مقصد سے آئے تھے اور اب جبکہ خزینہ کی زبانی اسے پتا چل گیا تھا تو وہ سوچ رہی تھی اس سے پہلے کہ جہانداد کی ماں دوبارہ آئیں اسے جہانداد سے مل لینا چاہیے اور کیوں ملنا چاہیے یہ وہ خود بھی نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ کچھ دیر وہ اسی نہج پر سوچتی اور الجھتی رہی آخر سر جھٹک کر میسج لکھا اور جہانداد کو سینڈ کر دیا۔

''کہاں ملنا ہے جلدی بتائیں میں آ رہی ہوں۔''

اور جہانداد تو پچھلے تین دنوں سے بے تابی سے انتظار کر رہے تھے فوراً جواب دیا۔ وہ ان کا جواب دیکھ کر فوراً چینج کرنے اٹھ گئی۔ حمیدہ بیگم سے وہ صبح ہی کہہ چکی تھی کہ اسے آج ایک جگہ انٹرویو کے لیے جانا ہے اور انہوں نے اسے منع تو نہیں کیا تھا لیکن یہ ضرور کہا تھا کہ بیلا کی شادی تک رک جاؤ۔ اس پر وہ بولی۔

''ابھی تو انٹرویو ہے کون سا جاب پر ہی جا رہی ہوں۔ جاب ہو بھی گئی تو جوائن بیلا کی شادی کے بعد ہی کروں گی۔'' اس پر حمیدہ بیگم خاموش ہو گئی تھیں۔

بہر حال وہ نارملی تیار ہو کر نکلی اور تقریباً پون گھنٹے بعد جہانداد کی بتائی جگہ پر پہنچی تو اسے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور سر کے اشارے سے سلام کر کے سامنے بیٹھنے کا اشارہ بھی کر دیا۔

اس نے بیٹھتے ہی پہلے ادھر ادھر کا جائزہ لیا پھر انہیں دیکھا تو وہ بے اختیار بولے۔

''کیسی ہیں آپ؟''

''کیوں ملنا چاہتے تھے آپ؟'' جواباً اس نے سوال کر دیا۔

''شناسائی کے لیے۔'' فوراً جواب آیا۔

''مطلب.....؟'' وہ سوالیہ نشان بن گئی۔

''مطلب جو لڑکی کچھ عرصہ ہمارے آس پاس رہ کر بھی نا آشنا رہی تو میں اس سے شناسائی چاہتا ہوں کیونکہ نا آشنائی کے باوجود میں اسے اپنے دل کے قریب محسوس کرتا ہوں اور ہر پل تو نہیں کہوں گا لیکن ہر دن اور ہر رات کے کسی پہر میں اسے سوچتا ضرور ہوں۔''

شہرینہ کی پلکیں آپ ہی آپ جھک گئیں۔ انہوں نے جھکی پلکوں کو بغور دیکھ کر جاننا چاہا کہ ان کے اندر چھپی آنکھوں میں کس جذبے کا عکس لہرایا ہوگا۔ کچھ سمجھ نہیں پائے تب گویا ہوئے۔

''اور میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ آپ کی سوچوں کی رہ گزر پر میرا کتنا آنا جانا ہے..... ہے بھی یا نہیں؟''

شہرینہ نے ایک دم پلکیں اٹھائیں لیکن پھر فوراً گردن موڑ کر دوسری سمت دیکھنے لگی۔ جس طرح وہ سلجھے انداز میں بات کر رہے تھے انہیں جواب بھی اسی انداز میں ملنا چاہیے تھا۔ جب ہی وہ دوسری طرف متوجہ ہوگئی کہ خود کو تیار اور آمادہ کر سکے۔

''سوری۔ میں نے آپ سے چائے وغیرہ کا تو پوچھا نہیں۔ کیا پسند کریں گی آپ؟'' جہانداد نے اچانک خیال آنے پر پوچھا تھا۔

''صرف کولڈ ڈرنک۔'' اس کے خشک حلق کا تقاضا تھا۔ جہانداد نے اشارے سے ویٹر کو بلا کر سوفٹ ڈرنک منگوائی اور جب اسے گھونٹ گھونٹ پیتے دیکھا تب بولے۔

''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

''اگر ایک لفظ میں جواب دوں تو آپ کی تشفی ہو جائے گی۔'' شہرینہ نے اسٹرا ہونٹوں سے نکال کر پوچھا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔

''نہیں ہوگی۔'' وہ ذرا سا ہنسی پھر کہنے لگی۔ ''دیکھیں جہانداد میں آپ کے گھر صرف آپ کی والدہ کے لیے جاتی آتی رہی ہوں اور اس دوران ان سے ہٹ کر میں نے کبھی کچھ نہیں سوچا۔ اور میں یہ کہوں گی کہ نا آشنا کو نا آشنا ہی رہنے دیں۔ اور جو بات آپ اب مجھ سے پوچھ رہے ہیں وہ اپنی والدہ کو میرے گھر لانے سے پہلے پوچھنی چاہیے تھی۔''

''یہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ وہ فوراً بولے۔ اصل میں مجھے اندازہ نہیں تھا۔ ماں نے مجھ سے میری پسند پوچھی میں نے آپ کا نام لیا تو ماں اسی وقت چلنے کو تیار ہوگئیں میں نے بہت ٹالنے کی کوشش کی لیکن.....''

''بہر حال.....'' اس نے جیسے انہیں مزید بولنے سے روکا تھا اور وہ سمجھ کر کہنے لگے۔

''نہیں مجھے کہنے دیں۔ یہ اس وقت کی بات نہیں ہے جب آپ ماں کے لیے گھر آنے لگیں۔ اس سے بھی پہلے جس دن آپ نے اسکول جوائن کیا تھا اسی دن آپ میری نظروں میں سما گئی تھیں اور اگر درمیان میں یہ سب نہ ہوتا تو میں اسی وقت نہ صرف اظہار کرتا بلکہ آپ کو پرپوز بھی کرتا۔ لیکن ستم ظریفی کہ آپ کو میرے گھر آنا پڑا۔ جس سے میں محتاط ہوگیا۔ کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں ماں کی خاطر آپ کو اپنانا چاہتا ہوں۔ نہیں میری چاہت میں کوئی غرض نہیں، دل سے اپنانا چاہتا ہوں آپ کو..... میں یہ نہیں کہوں گا کہ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔ لیکن یہ طے ہے کہ ہر موڑ پر دل میں کچھ کھو دینے کی ٹیس ضرور اٹھے گی۔''

شہرینہ کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں چلتی ہوں۔''

''ایک منٹ.....'' وہ اسے روک کر بولے۔ ماں ہر روز آپ کے گھر چلنے پر اصرار کرتی ہیں۔ کیونکہ آپ کی والدہ نے سوچ کر جواب دینے کو کہا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔ سوچنے کے بعد جب امی کسی نتیجے پر پہنچیں گی تو خود آپ کو فون کریں گی۔'' اس نے دامن بچایا تھا۔ لیکن انہوں نے چھوڑا نہیں۔

''وہ آپ سے بھی تو پوچھیں گی آپ کا کیا جواب ہوگا۔''

''پتا نہیں.....'' اس کے ساتھ ہی وہ کرسی دھکیل کر تیز قدموں سے نکلتی چلی گئی۔ اور جب تک جہانداد پیچھے

آتے وہ آٹو میں بیٹھ چکی تھی۔

☆☆☆

دروازہ نجمہ خالہ نے کھولا تھا۔ وہ انہیں سلام کرتے ہوئے اندر آئی تو خزینہ جو فون پر بات کر رہی تھی اسے دیکھ کر بولی۔

''لیجیے شہرینہ آ بھی گئی۔''

''امی ہیں؟'' اس نے فوراً پوچھا تو خزینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا اور حمیدہ بیگم کی بات سن کر بولی۔

''ٹھیک ہے میں بات کرلوں گی۔''

''نہیں شہرینہ کو میں خود چھوڑ جاؤں گی۔''

''اچھی بات ہے اللہ حافظ۔'' خزینہ فون رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''کیسا رہا تمہارا انٹرویو؟''

''سوسو.....'' اس کے لہجے میں مایوسی نہیں تھی کچھ اور تھا خزینہ بغور اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں تھک گئی ہوں۔'' آزردگی نے تھکن کا لبادہ اوڑھ لیا۔

''شاور لے لو۔ فریش ہو جاؤ گی۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' وہ غالباً چھپنا چاہ رہی تھی دوسری بات ہی نہیں سنی اٹھ کر خزینہ کے کمرے میں آئی پھر واش روم میں بند ہو کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔

''ناآشنا'' اس کی سماعتوں پر پہلی دستک ہوئی تھی اور چہرے پر اسی لفظ کا عکس جھلملایا تھا کہ دوسری دستک ہوئی۔

''شناسائی چاہتا ہوں۔''

''نہیں۔'' اس نے پلٹ کر شاور کھول دیا تو شور مچ گیا۔

''کیوں نہیں، کیوں نہیں.....''

''امی کے خیال کی تصدیق ہو جائے گی اور میں مشتبہ ٹھہروں گی۔ پھر خزینہ کی معنی خیز نظریں۔ نہیں کوئی بات ہو اور فسانے بن جائیں تو برداشت نہیں ہوتا۔ میں صفائیاں دیتے دیتے تھک جاؤں گی لیکن بات وہی رہے گی کہ ماں کو دیکھنے کا تو بہانا تھا۔''

شاور کی تیز دھاروں کی ساتھ اس کی سوچیں بھی بہتی چلی جا رہی تھیں اور اسے پتا ہی نہیں چلا آنکھیں بھی برس رہی تھیں۔

کتنی دیر ہوگئی وہ شاید سب کچھ یہیں بہا دینا چاہتی تھی۔ خیال ہی نہیں رہا کہ وہ کہاں کھڑی ہے۔ جب واش روم کے دروازے پر زوردار دستک کے ساتھ خزینہ نے پکارا تب شاور بند کرتے ہی وہ پریشان ہوگئی۔

''اف! خزینہ کیا سوچتی ہوگی۔'' وہ جلدی جلدی کپڑے پہننے کے ساتھ خود کو نارمل ظاہر کرنے کی سعی بھی کرنے لگی۔ پھر واش روم سے نکلتے ہی اس سعی میں بولے چلی گئی۔

''اتنا مزا آ رہا تھا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی۔ ہمارے ہاں تو اس وقت شاور سے کھولتا ہوا پانی نکلتا ہے کہ بندہ نہانے کا سوچتا ہی رہ جائے۔''

''پتا ہے۔ میں اسی گھر سے آئی ہوں۔'' خزینہ نے کہا تو وہ سٹپٹا گئی۔

''ہاں لیکن میں سمجھی شاید تم بھول گئی ہوگی۔''

''بندے کو اپنی وفات کبھی نہیں بھولنی چاہیے۔'' خزینہ کہہ کر خود ہی ہنسی لیکن وہ سنجیدہ ہوگئی تھی۔
''ٹھیک کہہ رہی ہو۔''
''اچھا چلو پہلے کھانا کھالیں پھر آرام سے لیٹیں گے۔'' خزینہ کہتے ہوئے پلٹی تو وہ بھی اس کے پیچھے ہولی۔
کھانے کی میز پر ہنی پہلے سے موجود تھا اور پلیٹ میں چمچہ مار مار کر گویا احتجاج کر رہا تھا۔
''ارے، میرے بیٹے کو بھوک لگی ہے۔'' خزینہ نے اسے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا اور اسے کھلانے کے ساتھ ساتھ خود بھی کھانے لگی۔
''غزنی بھائی نہیں آئے؟'' شہرینہ نے اچانک خیال آنے پر پوچھا تھا۔
''نہیں آج کل ان کے آفس میں آڈٹ چل رہا ہے۔ صبح آفس جانے سے پہلے آجاتے ہیں۔'' خزینہ بتا کر نجمہ خالہ سے کچھ پوچھنے لگی تو وہ کھانے میں مصروف ہوگئی۔
کھانے کے بعد وہ ہنی کو لے کر خزینہ کے بیڈ پر آلیٹی کچھ دیر بعد جب خزینہ آئی تو ہنی کے برابر لیٹتے ہی اس سے پوچھنے لگی۔
''ہاں تو پھر کیا سوچا تم نے؟''
''میں نے.....!'' وہ ہنی سے نظریں ہٹا کر ناسمجھی کے عالم میں خزینہ کو دیکھنے لگی۔
''وہی جہانداد کے بارے میں.....'' خزینہ نے کہا تو اس کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔
''ناآشنا کو ناآشنا ہی رہنے دو۔''
''مطلب؟'' خزینہ تکیہ سیدھا کر کے اونچی ہوگئی۔ تو اب وہ اپنے ذہن کو حاضر رکھ کر کہنے لگی۔
''مطلب وہ شخص میرے لیے بالکل اجنبی ہے اس کے باوجود تمہارے کہنے پر میں نے سوچنا شروع کیا تو سچ بتاؤں خزینہ مجھے ان کی کسی بات نے اٹریکٹ نہیں کیا۔ ان کی پرسنالٹی، ان کا اسٹیٹس، نہ ان کا عالیشان بنگلا بلکہ مجھے سوچ کر وحشت ہونے لگی۔ یقین کرو میں ان کے گھر جا کر بھی یہی سوچتی تھی کہ پتا نہیں لوگ اتنے بڑے گھروں میں کیسے رہتے ہیں۔ کم از کم میں تو نہیں رہ سکتی۔ اب پلیز یہ مت کہہ دینا کہ وہ مجھے کوئی چھوٹا گھر لے دیں گے۔''
''اس سے کیا ہوگا؟'' خزینہ نے بنا جرح کے پوچھا۔
''اس سے تو زندگی اور مشکل ہو جائے گی۔ حمزہ کو نہیں دیکھا وہ بڑے گھر میں نہیں جانا چاہتا اور ربیکا چھوٹے گھر میں نہیں رہ سکتی یوں ایک دوسرے کی ضد میں دونوں اپنی زندگی خراب کر رہے ہیں ہے ناں؟''
اس نے خزینہ سے تائید چاہی تو اس نے ذرا سا اثبات میں سر ہلا دیا۔
''تو خزینہ میں اس طرح اپنی زندگی خراب نہیں کر سکتی۔ امی سے کہہ دو مجھے یہ بے جوڑ رشتہ منظور نہیں۔ وہ خواہ مخواہ انہیں آس میں نہ رکھیں۔ انکار کر دیں۔'' اس نے اپنی ساری توانائیاں صرف کر کے اپنی زبان کو لڑکھڑانے سے بچایا تھا۔
''یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟''
''ہاں، میں مزید سوچوں گی نہ اس موضوع پر بات کروں گی۔ تم بھی سن لو پھر اس رشتے کا ذکر نہیں ہونا چاہیے۔'' اس کے حتمی انداز پر خزینہ سانس کھینچ کر بولی۔
''اچھی بات ہے۔''

☆☆☆

شام میں جب وہ خزینہ کے ساتھ گھر آئی تو آگے حمیدہ بیگم کے پاس حمزہ موجود تھا۔ وہ سلام کر کے حمیدہ بیگم

کے پاس بیٹھ گئی۔ جبکہ خزینہ حمزہ کو دیکھتے ہی کہنے لگی۔

''سوری حمزہ، جب تمہارا فون آیا میں سو رہی تھی۔ پھر یہاں آنے کے چکر میں میں کال بیک کرنا بھول ہی گئی۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں خود آتا ابھی تمہاری طرف لیکن تائی جان نے بتایا تم شہرینہ کو چھوڑنی آنے والی ہو۔ اس لیے میں بیٹھ گیا۔'' حمزہ نے کہا تو خزینہ پوچھنے لگی۔

''کوئی خاص بات ہے کیا.....؟''

''بیلا کی مایوں کا بلاوا دینے آیا ہے۔'' حمزہ سے پہلے حمیدہ بیگم بول پڑیں۔

''زبردست..... کب ہے؟'' خزینہ ایکسائیٹڈ جبکہ شہرینہ متوجہ ہوگئی تھی۔

''اسی اتوار کو اور میں تائی جان سے کہہ رہا ہوں کہ مایوں میں آئیں تو پھر شادی تک وہیں ہمارے ہاں ہی رکیں۔'' حمزہ نے اس انداز سے کہا کہ خزینہ اس کی تائید کرے گی لیکن وہ پوچھنے لگی۔

''اور شہرینہ.....؟''

''شہرینہ کی مرضی یہ خوشی سے ہمارے ہاں رہے یا تم اپنے ساتھ لے جانا۔'' حمزہ کی بات پر شہرینہ تنک کر بولی۔

''کیوں میں اس کے ساتھ کیوں جاؤں گی۔ امی کے ساتھ شادی گھر میں رہوں گی۔''

''ہاں بالکل میں بھی آتی جاتی رہوں گی۔ چچی جان اکیلی کیا کیا کریں گی۔''

''میں بھی اسی خیال سے کہہ رہی ہوں۔'' شہرینہ اور خزینہ آپس میں ہی بولنے لگیں گویا وہاں کوئی تیسرا موجود ہی نہ ہو۔

حمزہ نے اطمینان سے ہو کر ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی جبکہ حمیدہ بیگم باری باری دونوں کو دیکھے جا رہی تھیں۔ جب سارے پروگرام سیٹ کر کے دونوں خاموش ہوئیں تو حمیدہ بیگم کہنے لگیں۔

''توبہ ہے تم لڑکیوں سے یہیں بیٹھے بیٹھے سارے کام سنبھال لیے۔ ارے پہلے حمزہ کی بیوی سے تو پوچھو وہ تمہیں کسی چیز کو ہاتھ لگانے بھی دے گی کہ نہیں۔''

آ ھم..... حمزہ نے مصنوعی کھانسی کا سہارا لیتے ہوئے خزینہ کو دیکھا کہ وہی سنبھالے اور وہ قصداً چڑے ہوئے انداز میں کہنے لگی۔

''حمزہ کی بیوی اول درجے کی نکمی وہ کیا کرے گی۔ الٹا خوش ہی ہوگی کہ اس کی جان چھوٹی۔''

''ہیں، یہ تم حمزہ کے سامنے۔'' حمیدہ بیگم نے خزینہ کو آنکھیں دکھائیں تو حمزہ کو کہنا پڑا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے تائی جان میری بیوی کسی کام کی نہیں۔''

''پھر بھی بیٹا اس کا گھر ہے اور اپنے گھر میں مداخلت کوئی برداشت نہیں کرتا۔'' حمیدہ بیگم ٹھیک کہہ رہی تھیں لیکن اب ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا جبھی حمزہ لاپروائی سے بولا۔

''چھوڑیں تائی جان ان باتوں کو۔ خزینہ تم بتاؤ انویٹیشن دینے تمہارے گھر آؤں یا.....''

''نہیں، میں نے سن لیا ہے۔ تم نہ بھی بلاؤ تب بھی میں ضرور آؤں گی۔'' خزینہ فوراً بولی۔

''گڈ.....'' وہ اٹھ کھڑا ہوا ''ٹھیک ہے تائی جان میں چلتا ہوں۔''

''بائے بائے۔'' خزینہ نے شرارت سے ہاتھ ہلایا تو وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔

''شکر ہلا گلا میں کچھ دن اچھے گزر جائیں گے۔''

شہرینہ کہتے ہوئے اٹھی اور خزینہ کو اپنا آخری فیصلہ سنانے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنے کمری میں آ گئی تو پھر

اس نے نہ اس وقت خزینہ اور حمیدہ بیگم کی باتیں سننے کی کوشش کی نہ ہی بعد میں جاننے کی ضرورت سمجھی۔ اپنی طرف سے آخری فیصلہ سنا کر اس نے گویا کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔

بہر حال اسے اور حمیدہ بیگم کو اب بیلا کی شادی تک حمزہ کے گھر رہنا تھا تو اسی حساب سے اسے اپنا اور حمیدہ بیگم کا بیگ تیار کرنا تھا اور اس تیاری میں اگلے تین دن پلک جھپکتے گزر گئے۔

اتوار کی صبح ناشتے کے بعد اس نے جلدی جلدی جھاڑ پونچھ کی پھر نہا کر تیار ہو گئی اور اس سے پہلے کہ حمیدہ بیگم کسی کو بھیج کر رکشا منگواتیں حمزہ انہیں لینے آ گیا۔ وہ گاڑی میں آیا تھا۔ حمیدہ بیگم بیٹھتے ہی پوچھنے لگیں۔

''کس کی گاڑی ہے.....؟''

''اپنی ہے تائی جان۔''

''اچھا مبارک ہو۔''

''شکریہ.....اس نے دیومرر میں شہرینہ کو دیکھا وہ بے نیاز نظر آ رہی تھی۔'' مختصر راستہ تھا منٹوں میں گھر آ گیا۔

شہرینہ دونوں بیگ سنبھالتی اندر آئی اور فاخرہ کو دیکھ کر دونوں ہاتھوں سے بیگ چھوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔

''جیو.....خوش رہو۔'' فاخرہ نے اس کی بلائیں لیں تو وہ انہیں چوم کر بیلا کے پاس بھاگی۔

اتنے عرصے بعد گھر میں خوشی آئی تھی۔ سب خوش تھے۔ شام سے کچھ پہلے خزینہ بھی آ گئی تھی۔ اسے غزنی چھوڑنے آئے تھے لیکن رکے نہیں۔ کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے کہ خالص زنانہ تقریب ہے اور تھا بھی ایسا ہی۔ ادھر صرف حمزہ تھا اور ادھر سے بھی دو تین مرد ہی آئے تھے غالباً ڈرائیور بن کر پھر بھی حمزہ نے صحن میں بیٹھنے کا اچھا خاصا انتظام کر ڈالا اور مہمانداری کے فرائض خزینہ اور شہرینہ نے خوب نبھائے۔

بہر حال اس ساری تقریب کے دوران شہرینہ کو ایک بات کھٹکتی رہی کہ آخر ربیکا کیوں نہیں آئی اور ایک بار اس نے پوچھا بھی خزینہ سے۔ ''پتا نہیں'' کہہ کر ٹال گئی۔

بہر حال رات دس بجے تک خاصی افراتفری رہی پھر مہمان رخصت ہوئے تو خزینہ کو بھی غزنی لینے آ گئے۔ وہ بہت عجلت میں تھے جب ہی کسی نے بیٹھنے پر زیادہ اصرار نہیں کیا تھا۔ سب کے چلے جانے سے گھر ایک دم خالی خالی لگنے لگا تھا۔ شہرینہ نے پہلے حمیدہ بیگم کا بستر لگا کر انہیں لٹایا کیونکہ وہ جلدی سونے کی عادی تھیں۔ پھر اپنی جگہ بناتے ہوئے اس کی نظر کھڑکی سے باہر صحن میں پڑی۔ جہاں حمزہ کرسیاں اٹھا اٹھا کر ایک طرف رکھ رہا تھا۔ شہرینہ نے ایک پل کو کچھ سوچا پھر تکیہ پھینک کر صحن میں نکل آئی۔

''اگر تھکی نہیں ہو تو پلیز اس کام میں میرا ہاتھ بٹا دو۔'' حمزہ نے اسے دیکھ کر کہا تو بلا چون و چرا اس نے کرسی اٹھالی اس کونے میں رکھ کر واپس آئی تو دوسری کرسی پر دونوں ہاتھ جما کر حمزہ کو دیکھنے لگی۔ جو کرسی پر کرسی رکھ رہا تھا اسے اپنی جانب دیکھتے پا کر پوچھنے لگا۔

''کیا ہوا.....؟''

''تمہاری بیوی کیوں نہیں آئی؟'' اس نے پوچھا تو وہ حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''میری بیوی.....! میری تو کوئی بیوی نہیں۔ ہوتی تو ضرور آتی۔''

''میں ربیکا کی بات کر رہی ہوں۔'' شہرینہ نے دانتوں پر دانت جمائے تھے۔

''اسے میں طلاق دے چکا ہوں۔'' لاپروائی سے جواب آیا اور شہرینہ کی چیخ نکل گئی۔

''کیا.....؟''

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

تابندہ حیات

کہاں پہ آکر لٹے ہم

نگو نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ سب کی زبان سے خود کو نگو نگو پکارتے سنا تھا۔

وہ تو جب سکول میں ایڈمٹ ہوئی تب پتا چلا کہ اس کا پورا نام ''نگہت رحیم'' ہے۔

معصوم اور سادہ فطرت ''نگو'' وقت سے ہمیشہ دو قدم پیچھے رہی۔ جس عمر میں لڑکیاں ستاروں پر کمندیں ڈالنے کے بارے میں سوچتی ہیں اور محلے بھر کے لڑکوں کو دیوانہ بنانے کا ہر گر سیکھ چکی ہوتی ہیں۔ اس عمر میں نگو یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوتی تھی، کہ رات کو ابا اور اماں میں ہونے والی خونریز جنگ، صبح اچانک پیار بھری صلح میں کیسے بدل چکی ہوتی ہے۔

خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے وہ گھر میں تین بھائیوں کی بڑی بہن تھی اور بڑی بہن تو ویسے بھی آدھی ماں ہوتی ہے۔ بھائی تقریباً اسی نے پالے تھے۔ جس کی وجہ سے خود اس کا بچپن نا آسودہ اور ادھورا سا رہ گیا تھا۔ اسے کسی بھی تقریب میں نہیں لے جایا جاتا تھا۔ ہمیشہ اماں اپنے پیدا کیے ہوئے نونہالوں کو اس کے سپرد کر کے جاتے ہوئے یہ تلقین کرنا نہ بھولتیں۔

''نگو بھائیوں کا خوب خیال رکھنا، دیکھو یہ مٹی نہ کھانے پائیں۔''

بھائیوں کو پتا نہیں کیسے مٹی کھانے کی لت لگ گئی تھی اور ان کا مٹی کھانا نگو کی زندگی کو کھا گیا۔

وہ گھر ہوتی یا اسکول، یا اماں کے ساتھ کسی فیملی فنکشن میں۔ اس کی زندگی کا ایک ہی نصب العین ہوتا تھا، کہ بھائیوں کو مٹی کھانے سے روکنا ہے۔

اماں کی یہ پکار ہر وقت کانوں میں اودھم مچائے رکھتی۔

''نگو ان کا خیال رکھنا مٹی نہ کھائیں۔'' اس بے چاری کے خواب بھی بھائیوں کو مٹی کھانے سے روکنے کی جدوجہد میں ہی ٹوٹتے۔

جوان ہوئی تو اس جھنجٹ سے بمشکل جان چھوٹی۔

بچپن میں مٹی کھانے والے بھائی اب اس کا دماغ کھانے لگے۔ ان کے نزدیک ان کی آپی دنیا کی بیوقوف ترین مخلوق تھی۔

واجبی شکل وصورت کے ساتھ اس کا بھولپن اور سادگی اس کے لیے ایک بہت بڑی خامی بن گئے۔ جب بیس سال کی عمر تک بھی کوئی رشتہ نہ آیا تو اماں بابا فکرمند ہوگئے۔ اشاروں کنایوں میں خود لوگوں سے رشتے کے لیے کہنے لگے۔

خدا خدا کر کے ایک رشتہ دہلیز عبور کر آیا۔ جو فٹ سے قبول کرلیا گیا۔ غضنفر بابا کے مسجد کے ساتھی کا بیٹا تھا۔

کافی مذہبی فیملی تھی۔ صوم وصلوۃ کے پابند لوگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں نگہت کی سادگی اور معصومیت خامی کے بجائے خوبیاں دکھائی دیں۔ منگنی کے ساتھ ہی شادی کی ڈیٹ فکس کردی گئی۔

شادی کے دن قریب آئے، تو گھر میں گویا ایک ہنگامہ سا مچ گیا۔ اس کی دونوں پھوپھیاں جو ان کے گھر کے پاس ہی رہتی تھیں۔ شادی کی شاپنگ کے دوران وہ دونوں پھوپھیاں، شاپنگ کے نام پر مٹرگشت کرنے نکل جاتیں، اور اپنے بچے اس کے حوالے کرجاتیں۔

ساتھ وہی آرڈر دیتیں، جسے سنتے سنتے نگو کی زندگی سوکھ گئی تھی۔

''نگوان کا خیال رکھنا مٹی شٹی نہ کھائیں۔''

خدا خدا کر کے شادی کی تقریبات مکمل ہوئیں اور وہ شکر کا کلمہ پڑھتے ہوئے پیا گھر سدھار گئی۔

شکر اس بات کا کہ بھائیوں سے جان چھوٹی۔ اب چار دن اپنی نیند سوئے گی، اور اپنی جاگ جاگے گی۔

☆☆☆

وہ گھنٹے بھر سے سکڑی سمٹی حجلہ عروسی میں خوف زدہ ہرنی کی طرح بیٹھی تھی۔

اپنے دولہا کا انتظار کررہی تھی کہ کب وہ یہاں قدم رنجہ فرمائیں، اور گھونگٹ کشائی کا مرحلہ بھی بخیر و عافیت گزرے اور وہ رسومات کی چکی سے نکل جائے۔ آخر کار شوہر صاحب تشریف لائے، نہ سلام نہ کلام۔ آتے ہی زمین پر مصلیٰ بچھایا اور نفل شروع کردیے۔

وہ گھونگٹ کی اوٹ سے حیران بیٹھی دیکھتی رہی۔ نفل پڑھ کر فارغ ہوئے تو دعا شروع کی۔ دعا بھی اتنی لمبی، جیسے گڑگڑا کر کسی مصیبت سے بچنے کی سعی فرمارہے ہوں۔

جل تو جلال تو۔ آئی بلا ٹال تو۔ آخر پلنگ کی طرف متوجہ ہوئے کہ وہاں بھی کوئی مخلوق بٹھا رکھی ہے۔

وہ جو گھونگٹ اٹھنے کا انتظار کررہی تھی۔ جب دلہا میاں نے ہاتھ بڑھا کر گھونگٹ الٹنے کے بجائے، اس کے عروسی دوپٹے کے نیچے سے اس کے بال پکڑ کر ہاتھوں میں لیے تو وہ ڈر گئی۔

وہ گھونگھٹ کی اوٹ سے آنکھیں پٹ پٹا کر اپنے مجازی خدا کی طرف دیکھ رہی تھی، جو اس کے سامنے دوزانو بیٹھا اس کی نقلی زلفوں (وگ) پر کچھ پڑھتے ہوئے پھونک رہا تھا۔ پانچ، دس منٹ اسی طرح گذر گئے۔ آخر انہوں نے ایک لمبی پھونک مار کر دم کا اختتام کیا۔ اور گویا ہوئے۔

''نگہت! مجھے یقین ہے کہ تم بہت اچھی اور خدمت گزار بیوی ثابت ہوگی۔ مگر مجھ سے زیادہ تمہیں میرے ماں باپ کا خیال رکھنا ہوگا۔''

یہ جادوئی جملہ سنتے ہی دلہن کا تراہ نکل گیا۔ اور کمرہ اپنی چھت سمیت گھوم گیا۔

اس کے سارے خواب چھن سے چکنا چور ہوگئے۔ ذہن میں جو پہلا خیال آیا وہ یہ تھا۔ ''بچوں کی نسبت بڑوں کو سنبھالنا کتنا کچھ مشکل ہوتا ہوگا۔''

اس نے ساری رسمی کارروائی اٹھا کر ایک طرف رکھ دی، اور خود ہی گھونگٹ اٹھا کر بے ساختہ پوچھنے لگی۔

''کیوں..... تیرے ماں پیو دی مٹی کھاندے نے؟''

☆☆

شعاع عمیر

کرن کرن خوشبو

القرآن

تسبیح کرتی ہے اللہ کی جو چیز آسمانوں میں ہے اور جو چیز زمین میں ہے، اسی کی ہے بادشاہی اور اسی کے لیے ہے حمد اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی ہے جس نے پیدا کیا تم کو پھر کوئی تم میں کافر ہے اور کوئی تم میں مومن اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو، دیکھ رہا ہے۔ پیدا کیا اسی نے آسمانوں اور زمین کو حق پر اور اسی نے تمہاری صورتیں بنائیں تو بڑی عمدہ تمہاری صورتیں اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

(سورۃ التغابن 1-3)

نظر بد کا اثر حق ہے

صحابہ کرامؓ میں سہل بن حنیفؓ کا واقعہ معروف ہے کہ انہوں نے ایک موقع پر غسل کرنے کے لیے کپڑے اتارے تو ان کے سفید رنگ تندرست بدن پر عامر بن ربیعہؓ کی نظر پڑ گئی اور ان کی زبان سے نکلا کہ میں نے آج تک اتنا حسین بدن کسی کا نہیں دیکھا۔ یہ کہنا تھا کہ فوراً سہل بن حنیفؓ کو سخت بخار چڑھ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے علاج تجویز کیا کہ عامر بن ربیعہؓ کو حکم دیا کہ وہ وضو کریں اور وضو کا پانی کسی برتن میں جمع کریں۔ یہ پانی سہل بن حنیفؓ کے بدن پر ڈالا جائے۔ ایسا ہی کیا گیا تو فوراً بخار اتر گیا اور بالکل تندرست ہو کر جس مہم پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے تھے۔ اس پر روانہ ہو گئے، اس واقعہ میں آپؐ نے عامر بن ربیعہؓ کو یہ تنبیہ بھی فرمائی۔

علام یقتل احد کم اخاہ الا برکت ان العین حق

”کوئی شخص اپنے بھائی کو کیوں قتل کرتا ہے۔ تم نے ایسا کیوں نہ کیا، جب ان کا بدن تمہیں خوب نظر آیا تو برکت کی دعا کر لیتے۔ نظر کا اثر ہو جانا حق ہے۔“

(معارف القرآن جلد 5 صفحہ)

احادیث نبوی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

☆ جو شخص (کسی کی) زمین سے بدوں حق کے ذرا سی بھی لے لے (احمد کی ایک حدیث میں ایک بالشت آیا ہے) اس کو قیامت کے روز ساتویں زمین میں دھنسا دیا جائے گا (بخاری)۔

☆ بڑے بڑے گناہ یہ ہیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا اور ماں باپ (کی نافرمانی کر کے ان) کو تکلیف دینا اور بے خطا جان کو قتل کرنا اور جھوٹی قسم کھانا اور جھوٹی گواہی دینا ہے (بخاری)۔

علم کے قدردان

⌘ ابن رشد اپنی شعوری زندگی میں صرف دو راتوں کو مطالعہ نہیں کر سکے۔

⌘ اسماعیل بن اسحاق القاضی کے گھر جب بھی کوئی جاتا تو انہیں پڑھنے میں مصروف پاتا۔

⌘ امام ابن جریر طبری ہر روز چودہ ورقے لکھ لیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی عمر عزیز کا ایک لمحہ بھی فائدے اور استفادے کے بغیر نہیں گزارا۔

⌘ فتح بن خاقان خلیفہ عباسی المتوکل کے وزیر تھے۔ وہ اپنی آستین میں کوئی نہ کوئی کتاب رکھتے تھے اور جب انہیں سرکاری کاموں سے ذرا فرصت ملتی تو وہ کتاب آستین سے نکال کر پڑھنے لگ جاتے تھے۔

⌘ سارٹن نے تاریخ العلوم میں البیرونی کو دنیا کے بہت بڑے عالموں میں شمار کیا ہے۔ اس کے شوق علم کا یہ حال تھا کہ حالت مرض میں مرنے سے چند منٹ پیشتر ایک فقہ سے جوان کی مزاج پرسی کے لیے آیا ہوا تھا ”علم الفرائض“ کا ایک مسئلہ پوچھ رہے تھے۔

ادیبہ ظفر...... فیصل آباد

شہزادے اور شہزادی کا عقد

ایران فتح ہوا تو ایران کے آخری بادشاہ یزدگرد کی بیٹی شہر بانو جنگی قیدی بن کر مال غنیمت میں آئیں۔ جب مال غنیمت تقسیم ہونے لگا تو اسلامی لشکر سوچنے لگا۔ دیکھیے

یہ شہزادی کس کے حصے میں آتی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مال غنیمت تقسیم کرتے ہوئے فرمایا۔ ''یہ یزدگرد کی بیٹی شہزادی ہے، اسے میں جس کی زوجیت میں دوں گا وہ بھی شہزادہ ہوگا۔'' لوگ سوچنے لگے کہ حضرت عمرؓ کی نظر میں شہزادہ کون ہے؟ حضرت عمرؓ کھڑے ہوگئے اور فرمایا۔

''اے حسین! ہمارے ہاں شہزادے آپ ہیں۔''

شہر بانو کو حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زوجیت میں دے دیا۔ حضرت عمر کے اپنے صاحبزادے عبداللہؓ بھی موجود تھے لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے پر حضرت حسینؓ کو ترجیح دی کیونکہ سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نہیں اہل بیت بھی دل و جان سے عزیز تھے۔

زرینہ خانم لغاری.....مظفر گڑھ

بے بسی

خودکشی تک حرام ہے، یعنی
یہ بھی ممکن نہیں کہ مرجاؤ
(جون ایلیا)

شہد کا برتن

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو آپ رضی اللہ عنہ کے لیے شہد کھانا تجویز کیا۔ بیت المال میں شہد کا ایک چھوٹا سا پیالہ تھا۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ لاٹھی کا سہارا لے کر چلے اور منبر پر جلوہ افروز ہوکر لوگوں سے مخاطب ہوئے۔

''لوگو! اگر تمہاری اجازت ہو تو میں شہد کا وہ پیالہ لے لوں، اگر اجازت نہیں ہے تو پھر میرے لیے حرام ہے۔''

لوگوں نے حضرت عمر فاروق کو بطیب خاطر اجازت دی۔ (منتخب کنز العمال 418/4)

فضہ نور.....روہڑی

تبدیلی

شادی کے ایک سال بعد۔ ''میں کہا جی، کھانا کھالیجیے۔ آپ نے کافی دیر سے کچھ نہیں کھایا۔''

دو سال بعد۔ ''جی، کھانا لگادوں۔''

تین سال بعد۔ ''کھانا بن چکا ہے، جب کھانا ہو تو بتادینا۔''

چار سال بعد۔ ''کھانا بنا کر رکھ دیا ہے، میں ذرا پڑوسن کے ہاں جارہی ہوں، خود ہی نکال کر کھالینا۔''

پانچ سال بعد۔ ''میں کہتی ہوں مجھ سے کھانا نہیں بنے گا، میں بہت تھک گئی ہوں۔ ہوٹل سے لے آؤ۔''

چھ سال بعد۔ ''جب دیکھو! کھانا..... کھانا..... ابھی صبح تو کھانا کھایا تھا۔''

سات سال بعد سے تاعمر۔ ''میں کتنی دیر سے پوچھ رہی ہوں کھانا تیار ہوا کہ نہیں۔''

سحر وقاص راجپوت.....لاہور

نفسیات کہتی ہے.....

1۔ اگر آپ بہت ہنستے ہیں وہ بھی بہت فضول سی باتوں پہ بھی تو ''آپ اندر سے خالی ہیں۔''

2۔ اگر آپ بہت زیادہ سوتے ہیں تو ''آپ اداس ہیں۔''

3۔ اگر آپ کم بولتے ہیں مگر تیز رفتاری سے بولتے ہیں تو ''آپ بہت گہری ہیں۔''

4۔ اگر آپ کو رونا نہیں آتا تو ''آپ کمزور ہیں۔''

5۔ اگر آپ بے تحاشا کھاتے ہیں تو ''آپ پریشان ہیں۔''

6۔ اگر آپ بات بات پہ رو پڑتے ہیں تو ''آپ نرم دل اور معصوم ہیں۔''

7۔ اگر آپ چھوٹی چھوٹی باتوں پہ غصہ کر جاتے ہیں تو ''آپ توجہ چاہتے ہیں۔''

حریم سلمان.....کراچی

کچھ کھٹی کچھ میٹھی باتیں

☆ ہمارا اچھا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لوگ اپنے حساب سے ہی چلتے ہیں۔

☆ نصیحت ضرور کریں مگر شرمندہ نہیں۔ مقصد

دستک دینا ہوتا ہے، دروازہ توڑنا نہیں۔

☆ ہر انسان اپنی زبان کے پیچھے چھپا ہوتا ہے۔ اگر اسے سمجھنا ہو تو اسے بولنے دو۔

☆ غلطی پر پردہ تو صرف اللہ کی ذات ڈال سکتی ہے۔ انسان کی ذات تو بس عیب اچھالنا جانتی ہے۔

☆ ان لوگوں سے محتاط رہیں جو باتوں میں مٹھاس اور دل میں کینہ اور زہر رکھتے ہیں۔

☆ دل بڑا کیجیے..... باتیں تو ہر کوئی بڑی بڑی کر لیتا ہے۔''

☆ اختلاف، تذلیل اور تنقید میں بہت فرق ہوتا ہے۔

اختلاف کا حق ہر کسی کو ہوتا ہے۔
تنقید کا حق ہر کسی کو نہیں ہوتا۔
تذلیل کا حق کسی کو بھی نہیں ہوتا۔

☆ ایک دوسرے کے رزق پر نظر مت رکھو، کیونکہ اللہ سے بہتر تقسیم کرنے والا کوئی نہیں۔

منزہ بھٹی.....لانڈھی کراچی

آپ کے مسائل اور ان کا حل

سوال: میری شادی کچھ سال پہلے گوجرانوالہ کی ایک لڑکی سے ہوئی تھی۔ جب بھی بیوی سے میرا کوئی جھگڑا ہوتا ہے، وہ اپنے تین بھائیوں کو بلا لیتی ہے۔ وہ آ کر مجھے پھینٹی لگاتے اور واپس چلے جاتے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ وہ آنے جانے کا کرایہ اور سفری اخراجات بھی مجھ سے وصول کرتے ہیں۔ برائے مہربانی میرے مسئلے کا کوئی حل بتا دیں؟

ایک مظلوم شوہر.....لاہور

جواب: محترم مظلوم شوہر صاحب!

آپ کی حالت زار کا سن کر ہمیں بہت افسوس ہوا۔ ہمارا مشورہ ہے کہ بے جا اخراجات سے بچنے کے لیے اپنے گھر کو گوجرانوالہ میں لے لیں۔

صبا قاضی.....اٹک

شادی کا تجربہ

موسیقار کلیان جی سے جب پوچھا گیا کہ اپنی شادی کے تجربے کو کیسا پایا تو بولے۔

''شادی کو ایک چیونگم کی طرح پایا۔ خوش ذائقہ میٹھا، جلد ہی منہ میں گھل جاتا ہے اور بعد میں ساری زندگی ربڑ کو چباتے رہو، چباتے رہو..... چباتے رہو.....اور بس۔''

شگوفے

☆ چینی بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کی ماں اس کے سرہانے پڑی کوئی بھی چیز اٹھا کر زمین پر پھینک دیتی ہے۔ اس چیز سے جس قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے وہ بچے کا نام رکھ دیا جاتا ہے (گل نوخیز اختر)

☆ جس نے عشق نہیں کیا، گویا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ ہر صحت مند شخص عشق کرتا ہے اور ہر ناکام عاشق شادی کرتا ہے (شبنم رومانی)

☆ مجھ میں اور میری بیوی میں عجیب سا اتفاق ہے نیند کی گولیاں وہ کھاتی ہے اور سکون مجھے ملتا ہے (ابن انشاء)

☆ عورتیں پیدائشی محنتی ہیں اس کا اندازہ اس سے لگا لیں کہ صرف بارہ فیصد خواتین خوب صورت پیدا ہوتی ہیں باقی اپنی محنت سے (مشتاق احمد یوسفی)

☆ دنیا کی وہ عورت جسے آپ ساری زندگی متاثر نہیں کر سکتے وہ بیوی ہے اور وہ عورت جسے آپ چند منٹوں میں متاثر کرتے ہیں وہ بھی بیوی ہے مگر دوسرے کی (ڈاکٹر یونس بٹ)

ثمینہ اکرم.....لیاری

بہت دنوں بعد

بہت دنوں بعد
میں نے سوچا تو یاد آیا
کہ میرے اندر کی راکھ کے ڈھیر پر ابھی تک
ترے زمانے لکھے ہوئے ہیں
سبھی فسانے لکھے ہوئے ہیں

(محسن نقوی)

☆☆

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے

حور العین اقبال، کی ڈائری میں تحریر

ممتاز کنول کی نظم

نہ مکاں رہا نہ مکیں رہے
نہ وہ چہرے دلنشیں رہے
جنہیں تھی اذان کی جستجو
پس مرگ زیر زمین رہے
تیری الفتیں سدا ساتھ ہوں
میرا کنبہ جہاں کہیں رہے
وہ سخاوتیں، وہ شہادتیں قبول ہوں
دل مضطرب کو یقیں رہے
جو دعائیں کرتے تھے روز و شب
میرے وہ عزیز اب نہیں رہے

شہلا انجم، کی ڈائری میں تحریر

اظہر عنایتی کی نظم

جب تک سفید آندھی کے جھونکے چلے نہ تھے
اتنے ہمارے پیڑوں کے پتے گرے نہ تھے

اظہار پر تو پہلے بھی پابندیاں نہ تھیں
لیکن بڑوں کے سامنے ہم بولتے نہ تھے

پہلے بھی لوگ ملتے تھے لیکن تعلقات
انگڑائی کی طرح کبھی ٹوٹتے نہ تھے

ان کے بھی اپنے خواب تھے، اپنی ضرورتیں
ہمسائے کا مگر وہ گلا کاٹتے نہ تھے

رہتے تھے داستانوں کے ماحول میں مگر
کیا لوگ تھے کہ جھوٹ کبھی بولتے نہ تھے

اظہر میرے بزرگ اٹھاتے تھے جب ہاتھ
اپنے لیے ہی صرف دعا مانگتے نہ تھے

ادیبہ ظفر، کی ڈائری میں تحریر

فانی بدایونی کی غزل

جانتا ہوں کہ مرا دل مرے پہلو میں نہیں
پھر کہاں ہے جو ترے حلقہ گیسو میں نہیں

ایک تم ہو کہ تمہارے ہیں پرائے دل بھی
ایک میں ہوں کہ مرا دل مرے قابو میں نہیں

دور صیاد، چمن پاس، قفس سے باہر
ہائے وہ طاقت پرواز کہ بازو میں نہیں

دیکھتے ہیں تمہیں جلتے ہوئے اور جیتے ہیں
تم بھی قابو میں نہیں، موت بھی قابو میں نہیں

حیف جس کے لیے پہلو میں نہ رکھا دل کو
کیا قیامت ہے کہ فانی وہی پہلو میں نہیں

ارم کمال، کی ڈائری میں تحریر

دل روتا ہے، آنکھوں سے سمندر نہیں روتے
ہم موسم باراں میں کھل کر نہیں روتے

دل درد بلاخیز کا مرکز ہے دل اپنا
مدت سے ہیں اس درد کے خوگر نہیں روتے

جو فرش نشیں، عرش نشیں ہو گئے روتے
ہم اوج ثریا سے بھی گر کر نہیں روتے

کہسار ولی کے دل پگھلے تو دریا ہوئے جاری
اور لوگ یہ کہتے ہیں کہ پتھر نہیں ہوتے

بے وقت تو آنکھوں سے ٹپک پڑتے ہیں آنسو
ہو رونے کا ہنگام تو اکثر نہیں روتے

ہم زخموں کے اشکوں کو بھی بہنے نہیں دیتے
خاطر جو ہیں زخموں کے رفوگر، نہیں ہوتے

ماریہ نذیر، کی ڈائری میں تحریر
امجد اسلام امجد کی نظم

اگر کبھی میری یاد آئے
تو چاند راتوں کی نرم دل گیر روشنی میں
کسی ستارے کو دیکھ لینا
اگر وہ نخل فلک سے اڑ کر تمہارے قدموں میں
آگرے تو
یہ جان لینا وہ استعارہ تھا دل میرے کا
اگر نہ آئے.....
مگر یہ ممکن ہی کس طرح ہے کہ تم کسی پہ نگاہ ڈالو
تو اس کی دیوار جاں نہ ٹوٹے
وہ اپنی ہستی نہ بھول جائے
اگر کبھی میری یاد آئے
گریز کرتی ہوا کی لہروں پہ ہاتھ رکھنا
میں خوشبوؤں میں تمہیں ملوں گا
مجھے گلابوں کی پتیوں میں تلاش کرنا
میں اوس قطروں کے آئینوں میں تمہیں ملوں گا
اگر ستاروں میں، اوس قطروں میں، خوشبوؤں میں نہ
پاؤ مجھ کو
تو اپنے قدموں میں دیکھ لینا
میں گرد ہوتی مسافتوں میں تمہیں ملوں گا
کسی نہ کسی جزیرے پہ رک کے تم کو صدا دوں گا
سمندروں کے سفر پہ نکلو تو اس جزیرے پہ بھی اترنا

سندس بخاری، کی ڈائری میں تحریر
اثر لکھنوی کی غزل

دل کا رونا ٹھیک نہیں ہے، منہ کو کلیجہ آنے دو
تھمتے تھمتے اشک تھمیں گے، ناصح کو سمجھانے دو

کہتے ہی کہتے حال کہیں گے، ایسی تمہیں کیا جلدی ہے
دل کو ٹھکانے ہونے دو اور آپ میں ہم کو آنے دو

بزم طرب میں دیکھ کے مجھ کو پھیر لیں آنکھیں ساقی نے
میرے لیے تھے زہر ہلاہل، اس کے بھرے پیمانے دو

تھے وہ گریباں پھٹتے تھے اکثر، چاک ہوا میں اڑتے تھے
اب کے جنوں کا جوش نہیں ہے، آئی بہار تو آنے دو

یاد دل گم گشتہ میں ٹھنڈی آہیں بھرتا تھا
ہنس کے ستم گر کہتا کیا ہے، بات ہی کیا ہے جانے دو

دل کے اثر کو لوٹ لیا ہے شوق نگاہ اک کافر نے
کوئی نہ اس کو رونے سے روکو، آگ لگی ہے بجھ جانے دو

اقصیٰ ناصر، کی ڈائری میں تحریر
سلیم فوزی کی نظم

ابھی کچھ دیر پہلے رات نے پلکیں جھپکائی ہیں
مری مٹھی میں اب تک
رات کی پلکوں سے ٹوٹے ستارے ہیں
دکھوں کے استعارے ہیں
میں ان کو دیکھتا ہوں تو
میری آنکھوں میں ڈھیروں خواب
تعبیروں کے دکھ میں کوئی چہرہ سوچتے ہیں
اور وہ چہرے
شناسا شناسا سے
کئی چہروں میں تبدیل ہوتے ہیں
سفر تحلیل ہوتا ہے

کچھ موتی چنے ہیں..... ادارہ

وقت

کسی کے لیے دو پل بھی صدیوں جیسے اور کسی کی صدی بھی پل بھر میں کٹ جاتی ہے۔ گویا ہر انسان کی گھڑی اس کے اندر نسب ہے۔ جس کا تعلق اس پر بیتنے والی کیفیت سے منسلک ہے۔ ایک ہی شہر میں چلتے پھرتے ہزاروں لوگ الگ الگ وقت میں جیتے ہیں۔

یہ باہر لگی گھڑیاں بھلا وقت کب بتاتی ہیں۔ یہ تو صرف گزرنے والے سیکنڈ، منٹ اور گھنٹے کا حساب رکھتی ہیں۔ جو ہمارے اندر بیتے بس وہی ہمارا وقت ہوتا ہے۔

(ہاشم ندیم.....عبداللہ)

منزہ بھٹی.....لانڈھی، کراچی

راگ رنگ

صاحب! موسیقی روح کی غذا ہے۔ جب ہمیں بے خوابی کی شکایت تھی، تب ہم ٹی وی پروگرام ''راگ رنگ'' دیکھتے۔ یہ پروگرام جب ٹی وی چلاتا ہے تو دیکھنے والا بھی چلاتا ہے۔ یہ پروگرام تب چلایا جاتا ہے، جب بڑے سو جائیں اور بچے جاگ اٹھیں۔ ہم نے ایک گلوکارہ سے کہا۔ ''آپ ریاض کے بغیر بڑی گلوکارہ نہیں بن سکتیں۔'' انہوں نے فوراً ریاض علی سے شادی کرلی۔

میوزک بڑے کمال کی چیز ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو ہمارے جدید و شدید گلوکار مائیک پکڑ کر جو کچھ کرتے ہیں، انہیں اس پر پاگل خانے کی ہوا کھانی پڑتی۔ لوگ ان کے گانے بھی پسند کرتے ہیں۔ ظاہر ہے بندہ اچھے گانے سن سن کر کبھی اکتا بھی جاتا ہے۔ یہ نوجوان گلوکار گاتے گاتے کھو جاتے ہیں۔ پھر کہیں سے ڈھونڈ کر انہیں لانا پڑتا ہے۔

نوجوان گروپ کی صورت میں مل کر اس لیے گاتے ہیں تاکہ پتا نہ چل سکے کہ سب سے بے سرا کون ہے۔ یہ بھاگتے ہوئے گاتے ہیں، واقعی ایسا گانا سنانے والے کو بھاگنا ہی چاہیے۔

(ڈاکٹر بونس بٹ.....کلاہ بازیاں)

ادیبہ ظفر.....فیصل آباد

دلدل

آزمائش بالکل دلدل کی طرح ہوتی ہے۔ اس میں سے انسان صرف اپنے بل بوتے پر نہیں نکل سکتا، کوئی رسّی چاہیے ہوتی ہے، کسی کا ہاتھ درکار ہوتا ہے اور اس وقت وہ رسّی اور ہاتھ مذہب کا ہوتا ہے۔ رسّی اور ہاتھ نہیں ہوگا تو آپ دلدل میں جتنے ہاتھ پاؤں ماریں گے اتنا ہی جلد ڈوبیں گے۔ پانی میں ڈوبنے والا شخص زندہ نہیں تو مرنے کے بعد اوپر آجاتا ہے۔ مگر دلدل جس شخص کو نگل لینے میں کامیاب ہوجاتی ہے، اسے دوبارہ ظاہر نہیں کرتی۔ لیکن جو شخص رسّی اور ہاتھ کے ذریعے دلدل سے نکلنے میں کامیاب ہوجائے، وہ اگلی کسی دلدل سے نہیں ڈرتا۔

عمیرہ احمد.....ایمان امید اور محبت)

ماریہ نذیر.....بھاگتا نوالہ

پھر سے شروع کریں

جس گلٹ کو دیوار بنا کر ہم اپنے اور اللہ کے درمیان لے آتے ہیں، وہ تو ہمیشہ ساتھ رہے گا۔ آج اس پہ شرمندہ ہیں کل کسی اور پہ نادم تھے۔ ہم پرفیکٹ نہیں ہوسکتے تو پھر اللہ سے بات کرنے سے جھجکتے کیوں ہیں؟ غلطی ہوئی ہے تو نئے سرے سے اللہ کے بندے بن جاؤ۔ یہ اتنا آسان ہے کیونکہ کچھ لوگوں کو اللہ نے اپنے دین کے لیے چن لیا ہوتا ہے۔ ان کو قرآن پہ تدبر کرتے رہنا چاہیے، اپنے لیے نہ سہی تو دوسروں کے لیے۔ خوشی سے نہیں کرو گے تو قدرت آپ کو کھینچ کر، گھسیٹ کر اس طرف لے آئے گی مگر یہ آپ کو کرنا ہے۔ آپ Chose One ہیں۔ پرفیکٹ نہیں ہیں تو اپنی خامیاں اور گناہ دیکھ کر پریشان نہ ہوں۔ توبہ کریں اور پھر سے شروع کریں کیونکہ صرف اللہ ہی کے ساتھ تو انسان ہمیشہ ہر چیز نئے سرے سے شروع کر دیتا ہے۔

(نمل.....نمرہ احمد)

تبسم بشیر حسین.....ڈنگہ

مُدیرہ کرن

نامے میرے نام

مریم خان...... پھلر وان، سرگودھا

میرا کرن میں یہ پہلا خط ہے۔ مجھے کہانیاں پڑھنے کا بچپن سے ہی شوق ہے۔ تو اب مجھے کہانی پڑھنے کے ساتھ ساتھ کہانی لکھنے کا بھی جنون ہے۔ اسلم راہی، نسیم حجازی، عمیرہ احمد اور باقی سب کو بھی بہت پڑھا۔

اب آتے ہیں رسالے کی طرف۔ کرن میں سب سے پہلے اداریہ پڑھا۔ بات دل کو لگی۔ اگر پاکستان نہ ہوتا تو اسلام کے مطابق زندگی گزارنا خوب وخیال تھا۔

آگے آئے تو ''حمد ونعت'' نے دل ودماغ کو معطر کیا۔ جمان خان اور محمد علی جوش سے ملاقات اچھی رہی۔

''میرے ہم نفس، میرے ہم نوا'' میں آسیہ مرزا کہانی کو اچھے سے لے کر چل رہی ہیں۔ ''چابی کی گڑیا'' میں عمارہ جہاں نے ہماری گھریلو زندگی کی حقیقت کو واضح کیا۔ واقعی ہمیں سب کو اپنے احساسات وجذبات کا خیال رہتا ہے، بہو کے نہیں۔ بس اس کو تو حکم کی پاسداری کرنے کے لیے لایا جاتا ہے۔ ہم سب ہی ''چابی کی گڑیا'' ہیں۔ گل ارباب نے ''پریت بدلے ریت'' میں واقعی اچھی مثال پیش کی۔ بھابی ایسی بھی ہوسکتی ہے، یقیناً...... ''عہد رفتہ'' شمائلہ دلعباد کی لکھی ہوئی نہیں لگی، کچھ ادھوری ادھوری سی لگی۔ مصباح علی سید کی ''کانچ سے سائبان'' کے بارے میں رائے ابھی محفوظ ہے۔

''مٹن'' میں عطیہ خالد ایک دل خراش حقیقت لے کر آئیں۔ مٹاپا جتنی تیزی سے بڑھ رہا ہے، ساتھ ساتھ نقصانات بھی روز افزوں بڑھ رہے ہیں۔ اب آتے ہیں اس کہانی کی طرف، اس رسالے کی جان ''بالوشے'' کی طرف منعم ملک، زبردست، فنٹاسٹک۔ ویل ڈن۔ بہت پسند آئی۔ واقعی پاکستان کی جڑوں میں۔ ''شہیدوں کا لہو، بیواؤں کی آہیں، عورتوں کے سہاگ، کنواریوں کی عزت و آبرو کے ساتھ بوڑھوں اور بچوں کی انتھک آزمائشیں شامل ہیں۔ آج کل جس طرح کے حالات ہیں۔ ہمیں اپنے بڑوں کی قربانیوں کو یاد رکھنا چاہیے۔

''تیری دید، میری عید'' میں زارا انجر انے صحیح لکھا۔ کسی کا موبائل اس کی اجازت کے بغیر استعمال نہیں کرنا چاہیے اور سیاق وسباق کے جانے بغیر بات کو آگے نہیں پہنچانا چاہیے۔ اسی لیے بدگمانی ہمارے دین میں منع ہے۔

''ڈگڈگی کا بندر'' میں فہمیدہ خان نے عورت کے احساسات کی صحیح ترجمانی کی۔ اولاد کے جوان ہونے کے بعد بھی اسلام نے ماں باپ کی فرماں برداری اور دل جوئی کا جو سبق دیا ہے وہ ہمیں اپنی اولاد کو بچپن سے سکھانا چاہیے۔

''تیری راہ ہے میری منزل'' مسکان احزم نے اچھی لکھی مگر پلاٹ پرانا تھا۔ ''زندگی کے روپ'' حوریہ بتول نے بھی ساس، نند اور بھابھی کے تعلقات کے بارے میں لکھا۔ شوہر شادی کے شروع میں حمایت نہیں کرتا حالانکہ شادی کے شروع میں لڑکی اپنا سب کچھ چھوڑ کر آتی ہے، اس وقت اس کو زیادہ مورل سپورٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ''کرن کرن خوشبو، کچھ موتی چنے ہیں، نامے ہمارے نام'' اور ''کرن کتاب'' میں بھی سب سلسلے اچھے تھے۔

☆ مریم خان جی! خوش آمدید۔ کرن میں آپ اپنی نگارشات ضرور بھیجیں، قابل اشاعت ہوں تو ضرور شائع کی جائیں گی۔

بشریٰ یاسین ملک۔ عاصمہ یاسین ملک......
دریا خان، ضلع بھکر

ٹائٹل پسند نہیں آیا۔ ''میری بھی سنیے'' محمد علی جوش کا انٹرویو اچھا تھا۔ ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' ناول اچھا ہے لیکن مجھے آبص کے رویے کی سمجھ نہیں آئی۔ جب وہ ارسلہ کو اپنی بیوی کی جگہ تسلیم نہیں کرتا تو دبئی جانے کی خبر ارسلہ کی زبانی سنتے ہی اس کی نیند اڑ جاتی ہے، کیوں؟ ''کنار خواب جو'' فنٹاسٹک اسٹوری ہے جو مجھے بہت امپریس کر رہی ہے۔ ''بالوشے'' منعم ملک آپ بہت زبردست لکھتی ہیں۔ ہمیشہ لکھتی رہیں۔ ''پریت بدلے ریت'' کہانی کا نام پسند آیا لیکن ناولٹ کچھ خاص نہیں تھا۔ ''کانچ سے سائبان'' مصباح علی سید کہانی کی

شروعات بہت اچھی لگی بلکہ پوری کہانی بہت اچھی تھی۔ "تیری راہ ہے میری منزل" مسکان احزم، آپ کو پہلی بار پڑھا اور آپ کا لکھا ایک ایک لفظ دل میں اتر گیا۔ "عہد رفتہ" مزاحیہ افسانہ بہت اچھا لگا۔ "کرن کرن خوشبو" میں حریم سلمان کے "میاں بیوی" نے ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیا۔ افشاں سمیع کا چنا ہوا موتی پسند آیا۔ "نامے میرے نام" اچھا سلسلہ ہے۔ "مقابل ہے آئینہ" اقراء سرور کے جواب اچھے لگے۔ آپ بھی میری طرح ہاہاہا سے بات شروع کرتی ہیں، مطلب کھلکھلاتی ہیں۔ "کچن اور آپ" ساجدہ جاوید سندیلو کے جوابات اچھے تھے۔ اس ماہ خوبانی کے بارے میں پڑھا، معلومات میں اضافہ ہوا۔ (اب عاصمہ (بڑی بہن) کا تبصرہ بھی لکھ دوں) مسکان احزم کا ناول بے انتہا پسند آیا۔ منعم ملک کا ناولٹ بہت زبردست تھا۔ تعریف کے لیے الفاظ نہیں سوجھ رہے۔ (برامت ماننا عاصمہ کی اردو کمزور ہے)۔ جیسے کسی انمول چیز کے لیے گھر کا ہر کونا غیر محفوظ لگتا ہے، ویسے اس کی تعریف ممکن نہیں۔

☆ بشریٰ جی اور عاصمہ جی! بہت شکریہ اور معذرت کہ آپ کو کچھ کہانیاں پسند نہیں آئیں۔

نورین مشتاق، سدرہ سجل، اقصیٰ مشتاق...... تلہ گنگ

اگست کا شمارہ 15 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل بہت پسند آیا۔ "حمد و نعت" سے دل و روح کو منور کرنے کے بعد اپنے پسندیدہ ناول "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" کو پڑھا۔ ارسلہ کی شوخیوں اور دکھاوا پسندی کی عادت پر بہت غصہ آیا لیکن اس کا انجام کچھ اچھا نہ ہوگا۔ ارسلہ کے ساتھ کچھ برا ہوگا۔ افسانے سب ہی بہترین تھے۔ گل ارباب کا ناولٹ "پریت بدلے ریت" کچھ عجیب سا اور حقیقت سے کوسوں دور لگا (معذرت کے ساتھ)۔ مصباح علی سید میری فیورٹ ہیں۔ ناولٹ "کانچ سے سائبان" بھی ان کی منفرد تحریر ہوگی۔ مسکان احزم کا ناولٹ "تیری راہ ہے میری منزل" پسند آیا۔ "میری بھی سنیے" میں محمد علی جوش کو پڑھ کر اچھا لگا۔ "کرن کتاب" کی حسب معمول بہت اچھی۔

☆ نورین جی! کہانیوں میں کچھ حقیقت ہوتی ہے، کچھ فسانہ اس کہانی میں بھی لڑکے لڑکیاں دونوں کے لیے نصیحت تھی کہ گھر والوں سے چھپ کر کوئی کام نہ کریں اور کچھ بھابھیوں کے لیے بھی ایک اچھی بھابھی کا نمونہ پیش کیا گیا تھا کہ اگر ایسی بھابھیاں ہوں تو ہر قسم کے مسائل سے مل کر نبٹا جا سکتا ہے۔ بہر حال آپ کو کہانی پسند نہیں آئی اس کے لیے معذرت۔ اپنی کہانی کے بارے میں "کرن" کے آفس فون کر کے معلوم کیجیے۔

اقصیٰ شہزاد...... ڈھوک اعوان

ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ "حمد و نعت" کے بعد بڑھے اک ذرا فرصت ملی، ہنگام زندگی سے۔ کورونا کی وجہ سے آرام تو کر لیا۔ "میری بھی سنیے" میں آئمہ بیگ میری فیورٹ سنگر ہیں، ان سے مل کے خوشی ہوئی۔ ارم کمال مقابل ہے آئینہ میں ارم کے جوابات اچھے لگے۔ "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" مجھے اتنا زیادہ پسند نہیں ہے پھر بھی پڑھ لیتی ہوں جب کچھ اور نہ ہو پڑھنے کے لیے، ہاہاہا۔ "ہوائیں رخ بدل گئیں" ہم نے تو پڑھی ہی نہیں۔ "کنار خواب جو" یقیناً اچھا ہوگا کہ فرح بخاری کا جو ہے لیکن جب تک اپریل، مئی، جون کا نہیں پڑھیں گے سمجھ میں نہیں آئے گا۔ "شناسائی" معذرت کے ساتھ اچھی نہیں لگی۔ "اے مسیحا دل کے" مکمل ناول اچھا تھا لیکن موضوع وہی پرانا۔ ناولٹ میں "اسی کلے نئیں خراب" ہاہاہا۔ ہنس ہنس کے پیٹ میں درد ہو گیا۔ آپا جی کا وہ جملہ "جتنے بچے اتنے اچھے" قہقہہ لگانے پر مجبور کر گیا۔ دادا کو پڑھ کے تو مومن کا دادا یاد آ گیا۔ منعم ملک ویل ڈن۔ آپ کی کہانیاں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ "کرن کتاب" اس بار بیسٹ تھی۔ "مسکراتی کرنیں" ہڈی کا آلو، ہاہاہا۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" تبسم بشیر اور اقراء سرور کے شعر اچھے لگے اور ایسا لگا کہ یہ ایک ہی تھا۔ "نامے میرے نام" سب کے تبصرے اچھے ہوتے ہیں۔ ماریہ نذیر آپ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ یقین کریں ڈائجسٹ ہاتھ میں لیتے ہی میں سب سے پہلے آپ کا خط پڑھتی ہوں۔ اللہ آپ کو ایسے ہی خوش رکھے، آمین۔

☆ "مقابل ہے آئینہ" اور "کچن اور آپ" جلد ہی

کرن کے شمارے میں شامل ہوگا، ان شاء اللہ۔

خوشی.....سرانوالی

بہنوں کو خوشبوؤں کی طرح مہکتا سلام پہنچے۔ کئی ماہ کی غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر اس بزم کو رونق بخشنے آ پہنچی، جنہوں نے مجھ ناچیز کو یاد رکھا، ان کا خاص شکریہ۔ کرن کا اگست کا شمارہ ہمیشہ کی طرح اے ون رہا۔ سب سے پہلے آسیہ مرزا کا ناول ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' پڑھا، ویل ڈن آسیہ جی۔ پلیز آبص اور نادیہ شاہ کی جوڑی ضرور ملایئے گا۔ ارسلہ کو لالچ کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔ اریبہ اور سکندر کی شادی ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ دوسرا سلسلہ وار ناول ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' پڑھا۔ نگہت عبداللہ بہت احسن انداز سے کہانی کو آگے لے کر بڑھ رہی ہیں۔ ربیکا اور حمزہ کی علیحدہ ہوگئی، شکر ہے۔ اب شہرینہ کو حمزہ کا نصیب بنا دیجیے۔ غزنی اور خزینہ کا کوئی سین نہیں تھا۔ سارا اور جاذب کو بھی ہر قسط میں ہونا چاہیے۔ فرح بخاری نے ''کنار خواب جو'' میں سوار بے چارے کو دو ہیروئنوں کے درمیان پھنسا دیا۔ سوار کے بیک گراؤنڈ سے بھی پردہ اٹھا دیجیے۔ شازمہ کا شوہر اسے دھوکے میں رکھ رہا ہے۔ میاں جی کا کردار بہت پسند ہے۔ لگتا ہے اب عمران کی شامت آنے لگی ہے اور کنعان سے اس کی وابستگی لوگوں میں سرعام ہونے کو ہے۔ عنبرین ابدال نے بھی خوب لکھا۔ عطیہ خالد نے موٹاپے کو روگ دکھایا ہے۔ اتنی خوب صورت اور گھڑلڑکی موٹاپے کی وجہ سے قابل تحقیر ٹھہری لیکن اللہ نے اسے سرخرو کر دیا۔ ''تیری راہ ہے میری منزل'' بہت خوب لکھا۔ مسکان احزم میرا خیال ہے نیا نام ہے لیکن بہت جلد اپنا آپ منوائیں گی، ان شاء اللہ۔ زارا انجر انے بھی ''تیری دید میری عید'' اچھا لکھا۔ منعم ملک نے ''بالوشے'' خوب لکھا۔ الغرض سارا کرن پڑھ ڈالا، اس ماہ کا پھل افادیت سے بھرپور سلسلہ ہے۔ مستقل سلسلے تو کرن کی شان بڑھاتے ہیں۔ ہر سلسلہ ایک سے بڑھ کر ایک ہوتا ہے۔

☆ خوشی جی! ہمیں اندازہ ہے کہ ہماری قارئین بہنیں ''کرن'' کو بہت پسند کرتی ہیں۔ ہم انہیں کبھی مایوس نہیں کریں گے۔ آپ کا خط اگر دیر سے بھی موصول ہوا تو اگلے ماہ شائع کر دیا جائے گا۔

فائزہ بھٹی.....پتوکی

ڈائجسٹ لیٹ ملنے کی وجہ سے میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگست کے شمارے پر نہیں تو جون جولائی کے شماروں پر روشنی ڈال لیں گے۔ جون کے شمارے کا ٹائٹل مجھے اچھا لگا۔ ''یہ رنگ خوشیوں کے'' ڈیئر دشمن جب سے تم بلال صاحب کی ہوئی ہو، ہمیں ٹائم دینا چھوڑ چکی ہو۔ سنو..... کوئی ایک آدھ تو علی اسید جیسا اور ہیرو ہمیں بخش دو۔ مہربانی ہوگی۔ ''مقابل ہے آئینہ'' صفیہ مہر تعلیم کے امبر کا مجھے پتا نہیں مگر ''کرن'' کے امبر کا روشن ستارہ ضرور ہوا۔ اللہ اس ستارے کی تاب ناکی میں اضافہ کرے، آمین۔ ارم کمال تو پھر کب آ رہی ہیں مجھ سے ملنے، کیونکہ جس مزاج کے لوگ آپ کو پسند ہیں۔ میں ویسی تو ہوں۔ ''جنت ساز'' نیل گروں کے تو ہم عادی ہوتے جا رہے ہیں، شجاع اور مہرین۔ ابھی صفیہ مہر کہہ رہی تھی کہ محبت اک آگ کا دریا ہے۔ تو پھر مجھے بتاؤ، اس آگ کے دریا کو پار کرنا کیا اتنا مسحور کن ہوتا ہے کہ اختتام پر پاؤں کے چھالے ٹھنڈے میٹھے جھرنوں میں تبدیل ہو جائیں گے جو وجود پر چھائی ساری کثافت دھو ڈالتے ہوں۔ ''اے دل بے خبر'' تابعہ۔ قدرت ہمیں احتشم جیسے خوب صورت، باوقار، بالکل ہمارے اندر اترے احساس جیسی چیزیں دینے کی خواہاں ہوتی ہے مگر ہم کبھی اپنے اندر جھانک کر دیکھتے ہی نہیں۔ ہمیں کیا سوٹ کرتا ہے، کیا نہیں..... مگر وقت ہماری نادانی کو نظر انداز کر کے پھر بھی ہماری جھولی بھر جاتا ہے۔ ''کنار خواب جو'' سوار حسین جون، جولائی تمہاری سنگت میں کیا گزرا..... اگست کا پورا مہینہ یاد آتے رہے ہو، بس ایویں خواہ مخواہ۔ کنعان ذرا دھیان سے مارگلہ کی پہاڑیوں پر شہزادے کے ساتھ کچھ چڑیلیں بھی اتری ہوئی ہیں۔ یہ نہ ہو شہزادے کو پری سے جدا کر دیں۔ ''پھول تھلنے لگے ہیں راہوں میں'' اسفند تم سے اور مصباح سے مل کر اچھا لگا۔ کیا تم لوگوں کو بھی مجھ سے مل کر اچھا لگا؟ ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' ارسلہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے، مجھے جلد ہی تمہارے لیے دعا کرنا پڑے گی۔ سکندر صاحب' راحتیں اور بھی ہیں، وصل کی راحت کے سوا۔ اریبہ اپنی جان عذاب میں مت ڈالو۔ آبص محبت کا احترام ہم سب پر واجب ہے، مگر خیال رکھنا

اس احترام کو نباہتے کس کا دل نہ دکھا بیٹھنا۔ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' شہر ینہ اب حمزہ کی جانب کبھی نہ دیکھنا، جو ایک بار مجبور ہو جائے وہ کبھی بھی..... کہیں بھی مجبور ہو سکتا ہے اور محبت کی دنیا میں مجبوریاں نہیں چلتیں۔ خزینہ تم نے تیمور خزنی کو معاف کر کے میرا دل جیتنے کی پوری کوشش کی ہے اور میں کسی کی کوشش کو رائگاں نہیں جانے دیتی۔ ''شناسائی'' بند کتاب کا گم شدہ حصہ معلوم ہوئی۔ ''اسی کلے نئیں خراب'' اس کہانی کا سارا مزا اس کے نام میں تھا۔ اتنے مزے کا نام تھا کہ میں نے کچھ اور ہی سوچ لیا تھا۔ بس پھر وہ مزا نہیں آیا جو نام میں تھا۔ ''اے مسیحا دل کے'' مسٹر اذلان یہ جو تم لڑکے لڑکیوں پر شرط لگاتے ہو نا..... دل کرتا ہے الٹے ہاتھ کا دوں تم لوگوں کو۔ صنف نازک جیسی اللہ کی حسین و جمیل تخلیق شرط لگانے کے لیے تو نہیں ہے یہ تو عزت و احترام کے قابل ہوتی ہے۔ میرا خود کا قول ہے کہ..... ''اچھی لڑکیاں شب قدر کی طرح ہوتی ہیں، ہزاروں رات کی عبادت پر بھاری۔ ہر کسی کو نہ ملنے والیں۔'' شکر کرو تمہاری کوئی نیکی کام کر گئی اور اچھی لڑکی تمہارا مقدر ٹھہری۔ ''نامے میرے نام'' گڑیا راجپوت بہت شکریہ، جیتی رہو۔ شکیلہ سہیل، ساجدہ جاوید، علیزے راجپوت، فضہ نور، تبسم بشیر، سحر وقاص بہت شکریہ آپ لوگوں نے میری کمی محسوس کی۔ میں نے بھی کرن اور اس کی قارئین کو بہت یاد کیا۔ مسکان نور جو کرن میں آ گیا، وہ میرا دوست ہوا۔ ماریہ نذیر، ثناء شہزاد کب ملنے آ رہی ہیں مجھ سے۔ شہلا گل کیسی ہو، فوزیہ ثمر اقراء ممتاز، صائمہ مشتاق، اقراء سرور تم لوگ کہاں غائب ہو، جلدی آؤ۔ ''یادوں کے دریچے'' کلیم عاجز مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے۔ خلیل الرحمن قمر صاحب ایسے کیسے بھول جاتا اور یاد نہ آتا۔ بھئی ہم تو وہ لوگ ہیں، جو یاد آئیں گے بھی، کریں گے بھی۔ آپ ہمیں الٹی پٹیاں مت پڑھاؤ۔ ''مجھے یہ شعر پسند ہے'' اور ہاں ایک درخواست کرنی تھی، کرن کی شادی کا احوال بھیج رہی ہوں۔ پلیز پرچے میں جگہ نکال کر لگا دیجیے۔ سعدیہ کی شادی کا احوال آپ نے لگایا نہیں کیونکہ ہم بہت سی کرنز پڑھتی ہیں۔ لکھتی صرف میں ہوں۔ پلیز کوشش کیجیے گا، یہ نہ ہو میری کرنز بھی پوچھ پوچھ کر میرا دماغ چاٹ جائیں۔

☆ فائزہ جی! اصل میں ہماری قاری بہنوں نے اس سلسلے میں زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا، اس لیے ہم نے یہ سلسلہ بند کر دیا تھا لیکن اب آپ کی خواہش پر آپ کی کرن کی شادی کا احوال لگا دیں گے۔

ساجدہ جاوید..... ٹنڈو محمد خان

پا لیا میں نے ساری دنیا کو
کوئی خواہش نہیں تیرے ہوتے

سب سے پہلے میری طرف سے سب چاہنے والوں کو میری طرف سے جشن آزادی مبارک۔ اس بار جب کرن کا شمارہ آیا ہم نے چھلانگ لگائی فہرست لسٹ پر ''کچن اور آپ'' میں اپنا نام چمکتا دیکھ کر لاسٹ پیجز کی طرف گئے مگر یہ کیا ''کچھ موتی چنے ہیں، مسکراتی کرنیں، مجھے یہ شعر پسند ہے'' غائب ہیں۔ کیا آپی! مسکراتی کرنیں پڑھ کر تو ہمارا خون سیر سے سوا سیر ہوا ہے اور پھر اسے گھٹا رہے ہو۔ مانا کہ لائف میں کچھ چینج لازمی ہے اور یہ دیکھ کر اچھا بھی لگا کہ کرن اس بار نیا آیا ہے پر پلیز مسکراتی کرنیں ضرور شائع کریں باقی شعر و شاعری تو ''یادوں کے دریچے سے'' آتی رہے گی۔ کرن تو اب پکا پکا ہمارا ہو گیا ہے جہاں نظر دوڑاؤ وہاں پر ہمارا نام جگمگاتا ہوا نظر آتا ہے بقول اس شعر کے۔

مجھ سے اکثر کہتی تھی میری بس اتنی خواہش ہے
تجھ سے پہچانی جاؤں آپ کے نام سے جانی جاؤں

انٹرویو میں محمد علی جوش کی بھی سن لیا اچھی لگی ان سے ملاقات اب ویسے پچاس سوالوں کے جوابات میں ہمایوں سعید کو بھی دعوت دیں ان کا انٹرویو کریں پلیز۔ اتنے دنوں سے غائب اقرا آخر کار ''مقابل ہے آئینہ'' میں چھا گئیں ویلڈن اقرا اللہ تعالیٰ آپ کی ہر خواہش پوری کرے۔ (آمین)

ناولز کی طرف آتے ہیں سب سے پہلے جو دل لے گئی وہ تھی ''پریت بدلے ریت'' گل ارباب جی اتنا شاندار ناولٹ لکھنے پر بہت بہت مبارک باد قبول کریں ہمیں تو وہ اتنا اچھا ناول لگا کہ اینڈ پر ہم نے آپ کے نام کو ہی چوم لیا۔ ایسی ہی کہانیاں سالوں سال ذہن میں یاد رہتی ہیں۔ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' کے پیجز بہت کم تھے اس بار آخری قسط کا بے صبری سے انتظار ہے۔

''کنارِ خواب جو'' فرح آپی سوار اور کنعان کو ملا نایہ ثمامہ بیچ میں کہاں سے ٹپک پڑی۔ ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' میں ارسلہ کو دبئی بھی گھوم آئی خود تو وہاں پر ڈھیروں شاپنگ کی مگر گھر والوں کے لیے کراچی کی سوغاتیں..... ہنس ہنس کے ہمارا تو برا حال ہوگیا۔ مصباح علی سید کی ''کانچ سے سائباں'' بھی کافی اچھی لو اسٹوری تھی۔ افسانے سب ایک سے بڑھ کے تھے۔ (بالوشے) کو ابھی اسٹارٹ کیا ہے وہ بھی اچھا لگ رہا ہے۔ مطلب سارا کرن ہی بیسٹ ہے۔ ہمارے ''کچن اور آپ'' سمیت (ہاہاہا)۔ ''کرن کرن خوشبو'' میں سب کے نگارشات پسند آئیں۔

''نامے میرے نام'' میں اس بار ماریہ نظیر فائزہ بھٹی، فوزیہ تربت، صائمہ مشتاق، شناء شہزاد ارم کمال غائب تھیں۔ شناء شہزاد ہم نے آپ سے دو ناولز کے نام پوچھے تھے لگتا ہے آپ اس کھوج میں لگے ہو۔ بھئی 2002ء کے کتابوں کو ڈھونڈ رہی ہو کیا۔ شازیہ ہم کو بھی سب کرن پڑھنے والوں سے ملنے کا بڑا شوق ہے۔ مگر یہ تو ناممکن ہے کوئی دوست کہاں ہے تو کوئی کہاں..... اگر ایسا ہو کہ کرن کی آفس جو کراچی میں ہے اور ہر کوئی وہاں آ بھی سکتا ہے۔ ہم سب کی وہاں پارٹی ہو تو کیا ہی بات ہے۔

ج: ساجدہ جی! کہانیاں پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی فطرت کچھ ایسی بنائی ہے کہ وہ یکسانیت سے اکتا جاتا ہے۔ اس لیے ہم نے ''کرن'' میں کچھ تبدیلیاں لائے ہیں۔ اگر ہمارے قارئین اس تبدیلی کو پسند نہیں کریں گے تو ہم آپ کے مشورے پر غور کریں گے۔

حمیرا گل..... ملتان

سب سے پہلے عارہ جہاں کی ''چابی کی گڑیا'' پڑھی سبھی چابی کی گڑیا نہیں ہوتیں کئی ایسی بھی ہیں جو سارے سسرال والوں کو ہی چابی والے گڈے گڈیاں بنا کر رکھ دیتی ہیں۔ خیر موضوع اچھا تھا۔ گل ارباب کا ناولٹ ''پریت بدلے ریت'' پڑھ کر دل اداس ہوگیا انسان کیا سوچتا ہے اور کیا ہو جاتا ہے۔ ہانیہ نے ایک غلطی کی اور سزا عمر بھر کی مل گئی۔ عفرہ نے بہت مشکل فیصلے کیے اگر ہر گھر میں ایک ایسی بہو آجائے تو گھر جنت بن جائیں۔ ''یادوں کے دریچے سے'' میں اقراء سرور، مریم سلمان، نمرہ اقرا اور صدف سمیع کی پسند خاص طور پر پسند آئی۔ ''مسکراتی کرنیں'' اور دوسرے سلسلے بھی بہت اچھے رہے۔ باقی ماہنامہ زیر مطالعہ ہے۔ ان شاء اللہ اگلی بار تفصیل سے تبصرہ لکھوں گی۔ ابھی جلدی ہے ڈاک بھیجنے کی۔ اجازت چاہوں گی۔

ج: حمیرا جی! کہانی کے بارے میں فون کر کے معلوم کیجیے۔

حور العین اقبال..... کراچی

اگست کا شمارہ غیر متوقع طور پر 8 تاریخ کو مل گیا اور ہم نے آدھے سے زیادہ کرن دو دن میں چاٹ بھی لیا۔ منعم ملک کی ''بالوشے'' نے بہت متاثر کیا حاجرہ کا کردار زبردست تھا اس کے صبر واستقامت نے کئی بار آنکھوں میں آنسو بھر دیے۔ گل ارباب کا ناولٹ ''پریت بدلے ریت'' بھی بہترین کہانی ہے۔ عفرہ جیسی بھابھیاں بھی کسی نعمت سے کم نہیں ہوتیں شمائلہ دلعباد بہت اچھا لکھتی ہیں ان کی تحریریں بہت جاندار ہوتی ہیں۔ مسکان احزم کی کہانی گو خاص نہیں تھی مگر اپنے لکھنے کے اسٹائل کی وجہ سے اچھی لگی۔ اب بات ہو جائے اگست کے مہینے کی کہ اس ماہ ہماری آزادی کا دن بھی آتا ہے۔ ہماری حنا آنٹی گزشتہ سات سال سے اس دن کو انتہائی جوش سے مناتی تھیں اور میرے ماموں فرخ عثمان جو کہ فیڈرل اردو یونیورسٹی میں لیکچرار تھے ہم سب کو گاڑی میں بھر کر بڑا سارا جھنڈا پکڑائے اور زور وشور سے نعرے لگائے حبیب بینک لے جاتے تھے یہ دونوں ہی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ہمارے لیے ہر تہوار بے رنگ ہوگیا ہے۔ دونوں سے میری دوستی بے انتہا تھی میری حنا آپی شادی کے ڈھائی سال بعد بیوہ ہو کر دو چھوٹے بچوں کے ساتھ نانی اماں کے گھر آ گئی تھیں۔ وہ کیا تھیں لفظوں میں بیان کرنا چاہوں تو نہیں کر سکتی۔ میری اور عدیلہ کی دوست، غم گسار، تہجد میں اٹھ کر دعائیں کرنے والی، بیوہ ہونے کے باوجود کتنے گھروں کے چولہے جلانے کی کوشش کرتی تھیں اور فرخ ماموں جب میں نے ان کی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تو خاصے جز بز ہوئے بلا ناغہ مجھ سے کہتے حور العین آپ کسی کو نہیں بتائیں گی کہ میں آپ کا ماموں ہوں کلاس میں آتے تو میری طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہم دونوں کے لیے اپنی مسکراہٹ چھپانا مشکل ہو جاتا۔ کبھی کبھار

واپسی پر کسی اچھی سی جگہ بیٹھ کر بریانی کھانے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو چڑاتے رہتے میں ہمیشہ ان سے کہتی ''اگر آپ کے اسٹوڈنٹ دیکھ لیں تو بس کیا سوچیں گے''

اور وہ خوب ہی ہنستے یہ میرے پیارے رشتے جو میرے لیے سب کچھ تھے میری نانی، دو ماموں ان کے تین بچے، حنا آپی کی بیٹی مریم پانچ مارچ کو بلڈر مافیا کے ظلم کا شکار ہوگئے غیر قانونی طور پر بنائی گئی پانچ منزلہ عمارت ہماری نانی کے گھر پر آگری اور ہماری دنیا ہی اندھیر کرگئی، جیسے جیسے وقت گزرتا ہے ویسے ویسے زیاں کا احساس بڑھتا جاتا ہے۔ آپ سب قارئین سے درخواست ہے کہ ہمارے لیے سکون قلب اور صبر جمیل کی دعا کریں اور مرحومین کے لیے دعائے مغفرت بھی کریں۔ (شکریہ)۔

ج: حور العین جی! اللہ آپ کے خاندان کے لوگوں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ اللہ کی حکمت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

فہمیدہ جاوید.....ملتان

کرن ڈائجسٹ پڑھنے والوں کو سلام! تبصرہ اور تعریف ہر قاری کرتی ہے مگر میری کوشش رہی ہے میں ہر رسالے میں کچھ منفرد نظر آؤں۔ کرن کا معیار شروع سے اچھا رہا ہے مگر اب میری نظر میں ہر شمارہ یکسانیت کا شکار ہے کوئی تبدیلی نہیں ہے ہر سلسلہ یکسانیت کا شکار ہے۔ ''مقابل ہے آئینہ'' یہ سلسلہ بھی کب سے چل رہا ہے اسے ختم کردیں کوئی اور شروع کریں جو دلچسپ اور سبق آموز ہو یا ایسا سلسلہ جس میں سوالات۔ اس نوعیت کے ہوں جیسے قاری بہنوں کا انٹرویو ہو رہا ہو۔ پلیز اس رائے پر نظر ثانی کریں۔ کہانیوں کے بارے میں کوئی تجویز نہیں کہ میری طرف سے 100% ٹھیک چل رہی ہیں کرن کی تمام کہانیاں۔ وہی ایک بات کے ہم قاری رائٹرز سے بہت زیادہ انسیت رکھتی ہیں تو جس طرح ''آواز کی دنیا'' کا سلسلہ ہے اسی طرح رائٹرز کے انٹرویوز کو فروغ دیا جائے۔ ہر ماہ کرن کی کسی رائٹر کا 5 سے 7 صفحات پر مبنی انٹرویو شائع کیا جائے اب نگہت عبداللہ اور آسیہ مرزا کے ناول کے اختتام پر فوراً انٹرویو کریں اور خدارا طویل کریں۔ شاہین رشید سے کہیں کہ کیا ان کے پاس دلچسپ اور مختلف موضوعات پر سوالات نہیں ہیں اور کیا ہزاروں میں سے کوئی کرن یا دوسرے رسالے کی کوئی بھی رائٹر انٹرویو دینا پسند نہیں کرتی؟ میں نہیں مانتی یہ بات۔ سالگرہ اور سال نو نمبر میں کرن اور اس کے متعلق دلچسپ سوالات پر طویل سروے کیا جائے جس میں رائٹرز اور قاری شرکت کریں اور سالگرہ نمبر میں کچھ رسالے میں تبدیلی ہو۔ کبھی کرن کی پرانی یا مرحومین مصنفات کے نام اور انٹرویو یا سروے کی لگا دیا کریں اس سے رسالے کا معیار اچھا ہوگا کہ مرحومین کی بھی اہمیت ہے۔ کرن کی پورے مہینے کی ابتداء سے تکمیل تک کے کام کی کارکردگی اور معاونین کی کارکردگی پر مبنی مضمون شائع کیا جائے۔ کرن کے سرورق پر بھی کرن کی بڑی مصنفات کے ناول یا انٹرویو کی خبر لکھی جائے۔ جیسے خواتین میں سائرہ رضا، نمرہ احمد اور عمیرہ اور سمیرا حمید کے پیچھے پاگل ہوا جاتا ہے ہم ہم ہم..... پتا نہیں کیوں کیا اور رائٹرز کی ویلیو نہیں پلیز ہر ایک کو یکساں اہمیت دی جائے چاہے رائٹر ہو یا میری جیسی قاری بہن۔ ان باتوں پر لازمی عمل کریں تاکہ مزید کرن کا معیار زیادہ ہو اور ہم شوق سے رسالہ خریدیں پلیز خط مکمل شائع کریں۔ شکریہ!

ج: فہمیدہ! سب سے پہلے کہ جب آپ کو کہانیوں سے اختلاف نہیں تو تبدیلی کس چیز میں لائیں کیونکہ سلسلے تو زیادہ تر قارئین کے لیے ہیں ''مقابل ہے آئینہ'' میں بے شمار قارئین شریک ہونا چاہتے ہیں جن میں بہت سے قارئین کے ہمارے پاس موجود ہیں اور بہت سے ہمیں ہر ماہ بھیج رہے ہیں تو ہم اس سلسلے کو بند کر کے انہیں کیسے مایوس کریں۔ دوسرے میرے خیال سے آپ نے محسوس نہیں کیا کہ ''آواز کی دنیا'' دو ماہ سے ختم کردیا گیا ہے۔ ''مجھے یہ شعر پسند ہیں'' اور ''مسکراتی کرنیں'' سلسلے میں ختم ہوگئے ہیں اور جو کچھ تجاویز آپ نے ''خواتین ڈائجسٹ'' کے حوالے سے دی ہیں تو وہ ہمارے ادارے کا ہی ہے تو ہمیں کچھ انفرادیت رکھنی ہے ''کرن'' کی۔ رائٹرز کے انٹرویو کی فرمائش ہمارے بہت سے قارئین نے کی ہے اس سلسلے کو ہم جلد ہی شروع کریں گے۔ ہمارے لیے ہر رائٹر کی یکساں اہمیت اسی لیے ہے۔

اقراء ممتاز.....سرگودھا

اس دفعہ کرن 16 کو مل گیا۔ شکر ہے کوئی تو ڈائجسٹ

ٹائم پر ملا۔ ٹائٹل گرل بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ محمد علی جوش سے ملاقات کی۔ ان سے آگے بھی اتنی دفعہ ملاقات ہوچکی ہے آنی شاہین رشید۔ علیزے شاہ "عہد وفا" کی دعا اس کا انٹرویو ضرور لے لیں۔ "مقابل ہے آئینہ" اقراء سرور کو جاننے کا موقع ملا۔ "ہوائیں رخ بدل گئیں۔" آخر یہ ناول اپنے اختتام کو پہنچ ہی گیا۔ حمزہ اب تمہیں شہرینہ نہیں ملنے والی۔ ربیکا کو چاہیے تم طلاق دیتے یا نہ دیتے۔ شہرینہ تمہیں نہیں ملنے والی۔ شہرینہ اتنی بے مول نہیں پہلے اسے ٹھکرا کر ربیکا سے شادی کرلی۔ نگہت آنی جی آپ نے شہرینہ کو جہانداد سے ملانا ہے۔ کیا سارہ خزینہ کو قبول کرلے گی ایک بہت بڑا سوالیہ نشان؟ آپی اس اسٹوری کے اتنے کم صفحات کیوں ہوتے ہیں۔ کہانی شروع کرتے نہیں کہ صفحات کا اختتام بھی ہوجاتا ہے۔ بات ہوجائے اپنی فیورٹ رائٹر کی فرح بخاری جب بھی آتی ہیں چھا جاتی ہیں۔ اس وقت فرح بخاری کا ناول "کنار خواب جو" کرن کی بیسٹ اسٹوری ہے۔ ہم تو ابھی تک گل کہسار ناول کو بھی نہیں بھول پائے۔ سوار کی زندگی میں ثماشہ جیسی بلا آنے والی ہے۔ اس سے پہلے کہ ثمامہ سوار کی زندگی میں آئے کنعان اور ثمامہ کو ایک کردیجیے۔

"بالوشے" منعم ملک کی اچھی کاوش تھی۔ "پریت بدلے ریت" اس کہانی نے آنکھیں نم کردی۔ کیا کوئی عفرہ جیسی بھابھی ہوگی۔ جس نے مشکل وقت میں اس کا اتنا ساتھ دیا اسفند کو نہیں مرنا چاہیے تھا ہانیہ تم خوش نصیب تھیں کہ تمہیں صارم جیسا بھائی اور ماں جیسی بھابھی ملے۔ ایسا مثالی پیار دیکھ کر آنکھیں نم ہوگئیں۔

"کانچ سے سائبان" مصباح علی سید کا نام ہی کافی ہے۔ بڑے مہینوں بعد ان کی کوئی تحریر پڑھی ہے۔ تبصرہ اگلے ماہ۔ "تیری راہ ہے میری منزل" اس تحریر نے ہنسنے پر مجبور کردیا۔ زوناشے اور ریان کی نوک جھوک سے خاص لطف اندوز ہوئے۔ زوناشے تم ہر دفعہ اس ہی شخص سے کیوں ٹکراتی تھیں۔ نائس نام زوناشے ایسی تحریر ہر ماہ ہونی چاہیے۔ ہنسی مذاق نوک جھوک والی کچھ از کم کچھ ٹائم کے لیے انسان ریلیکس تو محسوس کرتا ہے۔ افسانے سارے بیسٹ ہیں۔ اس دفعہ مسکراتی کرنیں اور مجھے یہ شعر پسند ہے۔ دونوں سلسلے غائب تھے۔ "نامے میرے نام" میں بہت سے نئے چہرے نظر آئے۔ فائزہ بھٹی، ماریہ نذیر فضہ نور، ثناء شہزادی فوزیہ ثمر بٹ ساری غائب تھی۔ فضہ نور میں تمہاری وجہ سے اس ماہ شرکت کررہی ہوں تم ہر طرف مجھے اتنے پیار سے یاد کرتی ہو۔ تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے مجھ جیسی ناچیز کو یاد رکھا۔ یہ میرا آخری لیٹر ہوگا۔ فوزیہ ثمر بٹ 10 اکتوبر کو تمہاری سالگرہ ہے۔ ایڈوانس ہیپی برتھ ڈے ٹو یو، جہاں رہیں خوش رہیں۔ مجھے ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھا۔ فائزہ بھٹی اور ماریہ نذیر ہمیشہ اسی طرح بیسٹ لکھتے رہنا۔

☆ اقراء ممتاز جی: ہم اپنے قارئین کو نہیں بھولتے اور ہمارے قارئین بھی اپنی ساتھی بہنوں کو نہیں بھولتیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ آخری خط ہے، سمجھ میں نہیں آیا۔ ہمارے بہت سے قارئین کی شکایت آرہی ہے کہ ڈائجسٹ نہیں مل رہے۔ ان تمام قارئین سے گزارش ہے کہ واٹس ایپ نمبر 03172266944 پر میسج کرکے ڈائجسٹ منگوا سکتی ہیں۔

فوزیہ ثمر بٹ ہانیہ عمران آمنہ رئیس حریم فاطمہ......

گجرات

ٹائٹل پرفیکٹ لگا۔ اتنے مہینوں کے بعد دیکھا اعتراض کی تو گنجائش ہی نہیں۔

سب سے پہلے اداریہ پڑھا ہماری طرف سے آپ کو بھی جشن آزادی مبارک۔ "حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبول ﷺ" پڑھ کر دلی سکون ملا۔ صوفیاء کلام بہت پسند ہیں اس حوالے سے شاہین جی نے اچھی شخصیت سے ملاقات کروائی۔ کیا ہی اچھا ہو۔ آپ ایک سلسلہ صوفیا کلام کی شاعری کا بھی رکھ لیں۔ "میری بھی سنیے" محمد علی جوش نے خوب ہنسایا۔ کیا بات ہے لاہوری شہزادے کی۔ محنت بھی کی تو اک فرائی انڈے پہ۔ بلے کا شاباشیاں تیری محنت نوں۔ "مقابل ہے آئینہ" اقرا سرور شہزادی تو ساں تے محفل لوٹ لی۔ اور تبصرہ بھی لاجواب رہا۔ تمہیں پتا تو ہے بٹر (مکھن) ناں میں کھاتی ہوں اور ناں لگاتی ہیں۔ ہاہاہا۔ ساڈے وڈے ویڑے کہہ گئے ساں۔ اسے نومی منایاں نان پائے کپڑے نوں سی ناں تے ٹوٹی جوتی کھٹیاں ناں اور بندہ کردے سکھ نہیں پاتا۔ اج توں اک

تینوں کامے شروع کرلے۔ دوست منانا وی آجائے گا۔ تے زندگی سوکھی دی لکھ جائے گی۔

پہلے ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا کو پڑھا'' ارسلہ فطرتاً ایسی ہے۔ اس کی سوچ صرف اپنی ذات تک محدود ہیں۔ اس لیے مجھے تو کوئی حیرانی نہیں ہوئی کہ اس کا شوہر معذور ہے۔ اسی معذوری کو تو اس نے کیش کروا کے اپنے ارمان پورے کرنے ہیں۔

''ہوائیں رخ بدل گئیں'' ہیپی اینڈ کرنا بریکا بلا سے حمزہ کی جان چھوٹی تو اب شہر بینہ اور حمزہ کی جوڑی ہی رکھنا میں تو کسی جہانداد کو نہیں مانتی۔ خزینہ نے آخر حمزہ کی بات مان لی اور غزنی کو معاف کردیا۔ تھوڑا سا اس کی پہلی بیوی کا بھی تو بتائیں لاسٹ لمحات میں تھوڑا ٹوئسٹ کا ٹچ چلے کسی اچھی تحریر کی امید ابھی سے لگائی ہے ہم نے تو نگہت جی۔

مکمل ناول ''کنار خواب جو'' بھی اچھا لگ رہا ہے۔ ہیرو بیچارا ایک اور ہیروئن دو، دو۔ کنعان ہی سجتی ہے سوار کے ساتھ۔

بیسٹ آف ملتھ منعم ملک ''بالوشے'' کو ملنا چاہیے۔ ہر سطر میں خون کے آنسو روئے۔ حلیمہ کی بے ایمانی حاجرہ کی زندگی خوشیوں سے بھردی۔ گھڑے کچے ہوں یا بھائی کا نوں کے کچے۔ ہیرو یا بہن بے بسی زندگی ان کی مقدار بن جاتی ہیں اور جس کے ظلم کو خود رب نے ڈھیل دی ہو۔ اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ خیر ''بالوشے'' دل میں نقش رہے گا۔ ''پربت بدلے ریت'' سیڈ اسٹوری اچھے لوگوں کو اللہ پاک زیادہ آزماتا ہے۔ شاید عفرہ بھابھی کا کردار پسند آیا۔ ویسے بھی حالیہ زندگی نے اچھا خاصا سمجھا دیا ہے اضافی معاشرے میں رشتہ کوئی بھی ہو۔ بہن بھائی نند بھابھی، ممانی چچی، الغرض جو بھی رشتہ ہے۔ جو فطرت کا برا ہے۔ وہ ہمیشہ برا ہی رہے گا اس سے کتنی مرضی اچھائی کرلو۔ وہ فطرت نہیں بدلتا۔ اور حکم الٰہی ہے۔ جو جیسی فطرت پر پیدا ہوا ہے ویسا ہی جائے گا۔

ناولٹ ''کانچ سے سائبان'' بیسٹ تحریر تھی۔ شروع میں ہاشم اور ردا کی نوک جھوک اچھی تھی۔ موصوفہ ڈھیٹ واقع ہوئیں۔ اور یونگیوں کا تو عالمی ریکارڈ توڑا ہے۔ محترمہ نے۔ آرٹ گیلری کا منظر ہنس ہنس کر برا حال۔ مزے کے جھولے میں ابھی جھول ہی رہے تھے چھوٹے سی لائن نے جھولے سے گرا دیا۔ باقی آئندہ ماہ۔ لو دسو ہے ناں رنگ وچ بھنگ والی گل۔ تحریر کو طویل نہیں کرنا۔ بس دو یا تین مہینے میں مک مکا کرلینا۔ ''تیری راہ میں میری منزل'' مسکان جی تو سی گریٹ ہو۔ ایک منفرد موضوع۔ اچھے مزاج میں پیش کیا۔ اس تحریر میں بھی ہیروئن تیکھی بلکہ ہری مرچ لگی، ویل ڈن رائٹر جی۔ اتنے ٹینس حالات میں اچھا مزاح لکھ لیا۔

افسانے سبھی اے ون لگے۔ ''مٹن'' ہمارے معاشرے کی عکاسی تھا۔ ''عہد رفتہ'' پھوپھو نے خوب ہنسایا، لو لیٹر کا قصہ، غموں کی ٹوکری اتار کر خوب قہقہے لگائے۔ میرے روم کے در و دیوار حیرانی سے تکنے لگے کہ ابھی تو محترمہ آنسوؤں کا ایک تالاب بنا رہی تھیں۔ اور ابھی ہنسی کے فوارے۔ شائلہ دلعباد۔ اللہ پاک تمہارا دل آباد، شاد رکھتے کہ خوشی کے کچھ لمحات میسر ہوئے ہمیں بھی ''چابی کی گڑیا'' بھی اچھا لگا۔ خود کے ماں باپ یاد آگئے ہنوں کے مٹی کی گڑیا بن گئے۔ کرن کرن خوشبو اسلامی معلومات اچھا لگا۔ ''یادوں کے دریچے'' ماریہ نذیر بیسٹ رہیں۔ حریم سلطان کی ڈائری پسند آئی۔ اب پلیز یہ سلسلہ نا بند کردینا آپ ''کچھ موتی چنے ہیں'' اسے بھی رہنے دیں اچھا ہے یہ بھی۔ ''نامے میرے نام'' خوب محفل سجی رہی۔ افسوس میں کہیں نہیں تھی مجھے کرن انتالیٹ ملتا ہے رہا ہے کہ خط لکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ مجھے میری بہنوں نے یاد رکھا۔ بہت شکریہ۔ ماریہ نذیر۔ ارم، شہزاد، تبسم بشر کوثر جی اور سب بہنوں کو سلام جہاں بھی ہیں خوش رہیں آباد رہیں۔

☆ فوزیہ جی: آپ کی کمی ہمیں اور آپ کی ساتھی بہنوں کو بہت محسوس ہوئی۔ شکر ہے آپ نظر آئیں۔ تین سلسلے ہم نے ختم کیے ہیں۔ ''آواز کی دنیا''، ''مجھے یہ شعر پسند ہیں'' اور ''مسکراتی کرنیں''، ہمیں اس بارے میں اپنے قارئین کی رائے چاہیے کہ ''کرن'' کا یہ انداز انہیں کیسا لگا۔

ادیبہ ظفر.....فیصل آباد

ہم نے 2018 سے پڑھنا شروع کیا ہے۔ ماڈل بے حد خوب صورت ہے۔ ویری گڈ! ''اداریہ'' ٹھیک کہا۔ بحران اس سال ہی نہیں، پاکستان ہر سال کسی نہ کسی بحران میں مبتلا ضرور ہوا ہے لیکن پھر بھی بہادر ہے ہماری پاکستانی قوم جنہوں نے بروقت ان مشکلات کا ڈٹ کر سامنا

کیا ہے۔اس کے بعد ''حمد ونعت'' پڑھی۔دل کو سکون ملا۔ سبحان اللہ! ''انٹرویو'' سب ہی کمال کے تھے۔''میری بھی سنیے'' اچھا لگا آئمہ نور لعین بیگ کو جان کر۔''مقابل ہے آئینہ'' ارم کمال۔واہ کیا بات ہے۔اب آتے ہیں جناب ''ناول'' کی طرف۔''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' آسیہ مرزا اس ماہ کی قسط پڑھی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ ساتویں قسط پر تبصرہ یوں ہے کہ بیا سکندر کی طرف راغب ہونا اور سکندر کے لیے بیا کا ایسا روپ دیکھنا ایک جھٹکا تھا۔ اف! بیا ڈیئر۔سکندر کو بھائی کہتے ہوئے یہ کیا کر بیٹھیں پر قصور تمہارا بھی نہیں ایسا تو ہوتا ہے ایسے کاموں میں دل ہے ہی عجیب کب کس پر آجائے پتا ہی نہیں چلتا۔

دوسری طرف نیلوفر آپی اور احمر کا ساتھ، واہ مزا آگیا۔ احمر صاحب اچھے جا رہے ہیں۔ارسلہ اور آبص.....ارسلہ جو تم چاہتی تھیں وہ تمہیں مل گیا۔غربت سے نکلنا چاہتی تھیں وہ تم نکل گئیں اب کاہے کی ٹینشن۔

''ہوائیں رخ بدل گئیں'' نگہت جی بے صبری سے انتظار ہے آخری قسط کا۔حمزہ اور شہر یہ پھر سے مل جائیں یہ دعا ہے میری۔نگہت جی جب بھی لکھتی ہیں کمال کا لکھتی ہیں۔مکمل ناول میں معذرت ''کنار خواب جو'' فرح بخاری کی دوسری قسط ہمارے پاس نہیں ہے اسی لیے سمجھ میں نہیں آرہا۔''شناسائی'' سورۃ المنتہیٰ اعلا ناول۔منصورہ، فیصل مل گئے ہمیں بہت اچھا لگا۔''اے مسیحا دل کے'' فرح جی کمال کا ناول تھا۔اپسرا اذلان مل گئے۔''اسی کلے نئیں خراب'' منعم ملک اعلا ناولٹ، کمال کی تحریر پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔منعم ملک گڈ لک! اسی طرح لکھتی رہیں۔افسانے سبھی اچھے تھے۔''کچن اور آپ'' ایمن خان، ویل ڈن۔ کرن کا دستر خوان، مستقل سلسلے۔سب عمدہ اور خوب صورت ''نامے میرے نام'' ماریہ، تبسم فضہ، ثناء، بخاری سسٹرز، سبھی کے خطوط پڑھنا اچھا لگتا ہے۔

☆اریبہ جی! آپ ہمیں خط لکھا کریں ٹائم پر نہیں ملا تو اگلے ماہ شامل کر دیا جائے گا۔

زاہدہ محمد خان.....شادیوال ضلع گجرات

صحت میں ''موسم برسات رحمت کہیں زحمت نہ بن جائے'' بہت پسند آیا ہے۔خوبانی پسند ہے اس ماہ کا پھل بس ٹھیک تھا ''کیری'' مجھے نہیں پسند ہے البتہ آم بہت پسند ہے پھلوں کا بادشاہ۔پت سارے جسم پر نکلی ہوئی ہے پھر بھی کھاتی ہوں۔معاشرتی اور نفسیاتی مسائل میں ''بھلانا سیکھیں'' مجھے پسند نہیں آیا سوری ''انصاف عدل'' اسلامی معاشرے کا اہم جزو ہے اچھے اخلاق کا بھی حصہ ہے سوری برے لوگوں کو توجہ دلانی چاہیے۔''ہوائیں رخ بدل گئیں'' نگہت عبداللہ آخری قسط میں جس طرح چاہے اینڈ کریں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔وہ انڈیا کے مکیش کمار کا گانا ہے صحیح یاد نہیں آرہا کہ تم دن کو رات کہو ہم رات کہیں گے۔

سدرۃ المنتہیٰ کا ناول ''شناسائی'' اچھا تھا۔

چھوڑ دے تو یہ دنیا اک آدمی کے لیے
یہ مناسب نہیں انساں کے لیے

''اسی کلے نئیں خراب'' ناولٹ میں منعم ملک نے متوسط طبقے کے لوگوں کے ماحول رہن سہن کی صحیح عکاسی کی ہے، ویری گڈ منعم ملک۔سمیرا غزل صدیقی کا افسانہ ''ندامت'' بھی سبق آموز تھا۔جیسی کرنی ویسی بھرنی کا ترجمان تھا۔ہمیں ہر کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے تب ہی دوسرے بھی آپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں گے۔ہمیں ہر وقت خلوت میں بھی جلوت میں بھی، یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے اور ہمیں دیکھ رہا ہے۔مختصر یہ کہ ہمیں اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے ''آپو'' برے لوگوں کو (کے لیے) اک تنقیدی افسانہ تھا واقعی اس دنیا میں آپو کی طرح بھی لوگ رہتے ہیں جو اپنوں ہی کی زندگی اجیرن تلخ اور دشوار کر دیتے ہیں معصوم اور نوخیز بچوں کے ذہنوں میں ماں اور باپ کے لیے نفرت پیدا کر کے اپنے آپ سے محبت کرواتے ہیں جب مطلب نکل جاتا ہے تو پھر بچوں کو دھتکار دیتے ہیں۔اور ان کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں مطلب نکل گیا تو آخر میں ہمارا بھائی بھی نہیں ہے والدین فوت ہو چکے ہیں۔ہم تین بہنیں ہیں میری شادی کو گیارہ سال ہو چکے ہیں میری کوئی اولاد نہیں ہے۔دعا کیجیے گا۔

☆زاہدہ جی! کرن میں خوش آمدید ہماری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو نیک اور صالح اولاد عطا فرمائے (آمین)

زرینہ خانم.....مظفر گڑھ

جولائی کا شمارہ ملا ٹائٹل گرل تو اچھی تھی لیکن اس کا میک اپ اناڑی ہاتھوں کا لگتا تھا۔''حمد، نعت'' سے مستفیض

ہوئے۔ آگے لاک ڈاؤن کے مزے تھے اس فرصت کو سب نے انجائے کیا۔ آئمہ نور العین بیگ کی سنی۔ ارم کمال کا ''مقابلہ ہے آئینہ'' کمال کا تھا۔ سب کو چھوڑ چھاڑ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' پر بھاگے۔ نئی بات یہ ملی خزینہ کی غزنی سے صلح ہوگئی حمزہ ربیکا کا بکھیڑا ویسے ہی چل رہا ہے۔ ''میرے ہم نفس ہم نوا'' اب ارسلہ صاحبہ فارم میں رہی ہیں۔ اتنی نیک نہیں تھی کہ خاموش رہتی اب سسرالیوں کو ناکوں چنے چبوائے گی۔ ''پند کتاب'' سمجھ سے بالاتر تھی۔ ستاسائی'' بورترین کہانی تھی حیران ہوں سدرۃ المنتہیٰ کو کیا ہوگیا اتنی پیاری کہانیاں لکھنے والی ہیں۔ ''موازنہ'' ساس صاحبہ بہت اچھی تھیں بیٹے کو موازنے کرنے پر خوب سنائیں۔ شکر ہے وہ راہ راست پر آگیا۔ بہت غصہ آتا ہے جب شوہر دوسری عورت کے کھانے پکانے کی تعریف کرکے بیوی کو ڈس ہارٹ کرے۔ اف ''اسی کلے ٹیئں خراب'' نے ساری بوریت دور کردی، ہنس ہنس کر کہانی پڑھی مزا آگیا۔ صف دوستاں وہی مرد کی بدگمانیاں۔ ''بھرم'' مرد کے ظلم اور عورت کے صبر کی داستاں تھی آخر کار فرح جان سے گئی۔ ''ندامت'' ایک عبرت انگیز کہانی تھی بدعائیں ضرور اثر کرتی ہیں۔ ''اے مسیحا دل کے'' خوب صورت کہانی تھی۔ شکر ہے ہیرو ہیروئن کو ملا دیا لیکن اس کہانی کے ساتھ اسپیچ اتنا برا تھا لگتا تھا کسی ڈائن کی تصویر بنائی۔ ''آپو'' اتنی ظالم تھی خدا بچائے ایسی آپوؤں سے۔

☆ زرینہ خانم جی! آپ کو کچھ کہانیاں پسند نہیں آئیں اس کے لیے معذرت۔

دعا مصطفیٰ ورسندس بخاری..... خیر پور میرس

کوئی یقین کرسکتا ہے کہ میں (یعنی دعا مصطفیٰ) کاہلی کے سارے ریکارڈ توڑ سکتی ہوں ٹیچر کی فرمانبردار اسٹوڈنٹ (بقول ٹیچر کے) جب بھی خط لکھنے کا سوچتی تھکاوٹ آڑے آجاتی۔ امی کہتی ہیں کوئی کام نہیں کرتی، بہت موٹی ہوگئی ہو پوری کاہل ہو، فلاں ویسے ماشاء اللہ سے ہم چار بہنیں ہیں۔ میرا نمبر تیسرا ہے۔ تو میں امی کو جواب دیتی ہوں کہ بھئی جب بڑیوں کی شادی ہوجائے گی تو کام بھی دیکھ لیں گے۔ ویسے میں شام کی چائے کے برتن اور رات کا دودھ بوائل کرتی ہوں اب اتنی چھوٹی سی ہوں۔ ویسے میرے بابا نے مجھے ایک خوب صورت سا سیل فون لے کر دیا ہے پہلے اس پر امی نے بہت مخالفت کی کہ جو تھوڑا بہت کام کرتی ہے اس سے بھی جائے گی لیکن میں نے ثابت کردیا کہ میں عون جیسی نکمی نہیں ہوں (عون میرا چھوٹا بھائی) میرے بابا بہت لبرل خیالات کے مالک ہیں ماشاء اللہ سے ان کو مجھ پر اعتماد ہے اور یہی اعتماد مجھے سرشار کردیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے آمین ثم آمین۔ والدین کو چاہیے کہ اپنے بچوں پر بھروسا اعتماد کریں اور بچوں کو بھی چاہیے کہ اپنے والدین کا مان قائم رکھیں اور ان پر بھروسا بھی۔ لیکن ایک بات میں واضح کروں کہ جو بات آپ کے ادارے کے رسالوں میں ہے ناولیں تو کسی دنیا کی ٹیکنالوجی میں نہیں۔ بہت باتیں ہوگئیں اب آتے ہیں تبصرے کی طرف۔ اگلے شمارے کی بات ہوجائے تو بھئی قسط وار کہانیوں میں سے ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' غائب تھا۔ اور ''کنار خواب جو'' بہت اچھی جارہی ہے اور ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' بھی بہت پسند ہے اس کے بعد مائی موسٹ فیورٹ ''جفت ساز'' کیا کرتی ہیں' آپ نگہت سیما باجی رلا دیتی ہیں۔ ویسے پہلے آپ میری کزن عروج کی فیورٹ رائٹر تھیں پر اب میری بھی ہیں۔ آپ کی تحریر وہ کا انداز ماشاء اللہ۔ ویسے میں بہت جذباتی ہوجاتی ہوں ایسی تحریروں پر جلدی رو پڑتی ہوں۔ اب نئے شمارے کی طرف آتے ہیں۔ اچھا تو جی جولائی 2020 کے شمارے کی تعریف سنیں۔ مطلب تبصرے کی تعریف ''میرے ہم نفس'' میں بہت روانی آگئی ہے میں سمجھی شاید آہستہ گھسیٹتی چلے گی۔ لیکن یہاں تو بہت اچھی جارہی ہے۔ مجھے تو ارسلہ کو پڑھ کر بڑی شرم آتی ہے۔ بھئی سکندر کے سامنے اپنی امیری کا ایسے ذکر کررہی ہے کہ لگتا ہے وہ کوہ قاف سے آئی ہے یا سکندر۔ بھئی ارسلہ تھوڑا شرم کرو اس کے سامنے پلی بڑھی ہو کوئی عقل نام کی چیز ہے تمہارے دماغ میں۔ ''ندیدی کہیں کی'' ویسے اریبہ اور سکندر کی جوڑی بھی بہت اچھی لگے گی۔ اور ''کنار خواب جو'' بہت اچھی جارہی ہے فرح آپی اس کا اینڈ میرے خیال میں اچھا رہے گا۔ میں نے اپنی کزن جیا سے جو اسلام آباد جارہی تھی۔ کہا بھئی جب کوہ مری جاؤ تو میری نئی فرینڈ کنعان اور دیا سے ملنا تو کونین تو سمجھ گئی کہ میں

مذاق کررہی ہوں۔ باقی جیا نے میرا وہ حشر کیا کہ اللہ کی پناہ پھر غصے سے فون بند کرگئی۔ میں نے اس منحوس گھڑی کو کوسا جب یہ جھوٹ بولا میں سمجھی کہ وہ تجسس سے پوچھے گی کہ بھئی دوسرے صوبے والی لڑکی تمہاری دوست کیسے بن گئی لیکن یہاں تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ ہاہاہا..... اس کے بعد جس تحریر نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ ہے۔ ''اسی گلے نہیں خراب'' یہ تحریر مجھے زیادہ اچھی لگی مزاح سے بھرپور ہلکی پھلکی تحریر۔ اس کے بعد ''اے مسیحا دل کے'' بھی بہت زبردست لگی۔ افسانوں میں سب ہی اچھے لگے خاص کر ''موازنہ'' اور ''آپو''۔ آپو تو حقیقی ہمارے معاشرے کی کہانی ہے اور موازنہ اس لیے کہ ساس اور نادان بہو کا پیار اچھا خاصا تخلص لگا۔ انٹرویو بھی اچھے لگے ''مقابل ہے آئینہ'' میں باجی ارم کے جواب پسند آئے۔ ویسے لگتا ہے باجی ارم کمال جب بھی کچھ لکھتی ہیں نا بہت اچھا اور خالص لکھتی ہیں۔ پتا نہیں کیوں یہ مجھے بن دیکھے ہی بہت اچھی لگتی ہیں۔ سچی۔ ''کرن کتاب'' میں ''کچن اور آپ'' میں ایمن خان کو پڑھا۔ بہت اچھا لگا۔ پھر ''مجھے یہ شعر پسند ہے'' میں ثنا شہزاد، دعا مصطفیٰ، اقرا سرور، فائزہ بھٹی، عابش جنجوعہ، سندس بخاری، ام مریم اسد، ان کے شعر لاجواب تھے۔ سنیے۔ میں اپنی ڈائری میں لکھوں کیا؟ ''مسکراتی کرنیں'' میں گڑیا راجپوت، ارم کمال جی، زرینہ خانم اور مشی خان کے اچھے لگے۔ بہت زیادہ ''کچھ موتی چنے ہیں'' یہ میرا بہت زیادہ من پسند سلسلہ ہے۔ ''نامے میرے نام'' میں سب کے خط پسند آئے۔ اس دفعہ خوشی، فائزہ جی، ماریہ نذیر جی۔ اور بھی بہت ساری غائب تھیں ان کی کمی محسوس ہوئی۔

☆ سندس بخاری اور دعا مصطفیٰ جی۔ ہم آپ کو ''کرن'' کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ امید ہے کہ اگلی بار کہانیوں پر زیادہ اچھے طریقے سے تبصرہ کریں گی۔ ڈائری میں کوئی اچھی غزل یا نظم ہی لکھ سکتی ہیں۔

شہلا انجم بھوپالی..... نامعلوم

ادارہ خواتین کے زیر ادارت جرائد کی عرصہ دراز سے ایک خاموش قاری ہیں۔ گو کہ دونوں بیٹیاں ماہ نور انجم، طوبہ کامران اور اب تو میٹرک کی طالبہ ہماری نواسی عفیفہ بھی شعاع میں شرکت کرچکی ہیں۔ لہٰذا ہم نے بھی کمر کس لی کہ ہم کیوں پیچھے رہیں چار سال سے بیماریوں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ حال ہی میں بیٹی کے چیلنج نے مجبور کیا۔ وہ بس ڈاک خانے جاتی ہیں خط حوالہ ڈاک کرنے جبکہ ہم اپنی مجبوری کی بنا پر واٹس ایپ پر بھیجنے کی بات کررہے تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہماری ایک عدد نظم اور خط شائع ہوتا ہے یا ہماری بیٹی چیلنج جیت جاتی ہیں۔ ایک نئی بات بتاتے چلیں ہمارے بھانجے کو سیکنڈ ایئر کے طالب علم میں ہم سے ان ڈائجسٹوں کی کہانیاں اور افسانے سن کر آج پوچھ رہے تھے کہ خالہ امی ہم کون سا ڈائجسٹ منگائیں ہمیں نگہت سیما، آسیہ رزاقی جیسی رائٹرز پسند ہیں ہاہاہا۔ یہ عالم ہے اس وائرس کا پھیلتا ہی جارہا ہے۔ سلسلے تمام ہی بہترین ہوتے ہیں ابھی زیادہ پڑھا نہیں آنکھ کی تکلیف کے باعث، بہ شرط زندگی آئندہ مکمل تبصرے کے ساتھ بھرپور طریقے سے شرکت کریں گے۔

☆ شہلا انجم جی: خوش آمدید اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے آمین۔ امید ہیں کہ آپ آئندہ خاموش قاری نہیں رہیں گی بلکہ ہر ماہ شرکت کریں گی۔

حمیرا عثمانی..... جھانور یا

اگست کا شمارہ جیسے ہی آیا لسٹ دیکھی، دل باغ باغ و بہار بن گیا۔ سچ تو یہ ہے اتنی عمر کی عورت ہوں میں، بڑا بیٹا کالج جانے والا ہے پھر بھی منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ارے واہ۔ مصباح علی سید، یہ اتنے گیپ کے بعد کہاں سے آئیں۔ سچ میں ان کی آمد کی بے انتہا خوش ہوئی۔ نہ صرف مجھے بلکہ میری بہنوں اور بھابیوں کو بھی۔

خیر اب چلیں رسالے کی جانب تو سب سے پہلے جن کی سرپرائز آمد تھی، انہیں ہی پڑھا یعنی مصباح علی سید کا ناولٹ ''کانچ سے سائبان'' نام ہی سے چھن سے ٹوٹ جانے والی چیز کا تاثر آرہا ہے اور جیسے جیسے پڑھتی گئی جہاں ہائم کی مثبت شخصیت اور محبت کا دیوانہ پن محسوس ہوا، وہاں ردابہ بہت مضبوط سی لڑکی لگی۔ لیکن کہانی ابھی الجھی ہوئی ہے، بہت سے کردار ہیں۔ دیکھو کون کس کو توڑے گا۔ ویسے گڈ۔ ''کنار خواب جو'' فرح بخاری کا کسی بہتی ندی کا جھرنا لگتا ہے مجھے۔ ایک بات طے ہے، فرح میں سماں

باندھنے کی بہت صلاحیت ہے اور میں ان کی تحریر پڑھتی اسی لیے ہوں، دلکش مناظر ان کی ہر تحریر میں ملتے ہیں۔ اگر ہم جانہیں سکتے، پڑھ تو سکتے ہیں۔ دوسرا مکمل ناول ''بالوشے'' اس کی تو خاص سمجھ میں نہیں آئی، رائٹر کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ آخر تک صفحے چھوڑ چھوڑ کر مگر پڑھا شاید اسی لیے سمجھ میں نہیں آئی۔ پہلے صفحے میں باندھنے کی صلاحیت نہیں تھی، باقی افسانے سارے مزے کے تھے۔ خاص طور پر میری بہت فیورٹ عطیہ آپا کا ''مٹن'' آیا۔ اس بقرعید کے ڈائجسٹ میں تو آپا بہت لطف دیا آپ کے ''مٹن'' نے۔ سلسلہ وار ابھی نہیں پڑھے، جیسے ہی پڑھتی ہوں تو پھر تو مجھے لمبا سا کچھ لکھنا ہے۔ معذرت کے ساتھ، دونوں کہانی کو الاسٹک بنانے میں مشہور ہیں۔

☆ حمیرا عثمانی جی! معذرت کہ آپ کو کچھ کہانیاں پسند نہیں آئیں۔ کرن کی بے شمار قارئین ہیں اور ہمیں سب کی پسند کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

انوش.....سلانوالی

کرن منگوانے کی اتنی جلدی ہوتی ہے کہ بار بار بھائی کو لانے کی یاد دہانی دن میں کئی کئی بار کروانی پڑتی ہے۔ جب آ گیا تو سکھ کا سانس لیتے ہیں، میں بھی اور بھائی بھی اور اس بار تو کرن دیکھتے ہی خوشی سے چیخیں نکل گئیں۔ مصباح علی سید کا ناولٹ دیکھ کر۔ مصباح جی لکھتی رہا کریں اور ہمیں اتنے لمبے ٹائم میں لطف دیتی رہا کریں۔ رسالہ ابھی پڑھا نہیں۔ بس اپنی موسٹ فیورٹ رائٹر کو دیکھ کر قابو نہیں رہا، فٹ سے اپنی رائے دینے اور ان کا شکریہ ادا کرنے کو دل چاہا۔ ٹائٹل اچھا ہے۔ باقی ان شاءاللہ پڑھ کر تبصرہ کروں گی۔

☆ انوش جی! مصباح علی سید کا شمار بہترین رائٹر میں ہوتا ہے اور کرن کی تقریباً تمام قارئین ان کی کہانیوں کو پڑھنا چاہتے ہیں، اسی لیے جب ان کو وقت ملتا ہے تو ہم ان سے ضرور لکھواتے ہیں۔

امن علی.....ڈجکوٹ (فیصل آباد)

آپ کے پرچوں کی تعریف سورج کو ٹیوب لائٹ دکھانے کے برابر ہے ہمارے گھر والے تو مان گئے ہیں آپ کے پرچوں کی اچھائی کو، کیونکہ ہم نے آپ کی بتائی ہوئی باتوں کو خود پہ اپلائی کیا ہے۔ میں جو پہلے کم گو، بدسلیقہ، میٹرک پاس، سست الوجود اور اچھائی برائی میں تمیز نہ کرنے والی تھی (پندرہ سال پہلے) اب حاضر جواب سگھڑ، بی اے، بی ایڈ، چست اور اچھائیوں پر عمل کرنے والی خاتون بن چکی ہوں۔

میں آپ سے دو باتیں کہنا چاہتی ہوں جبکہ خیالوں میں ہزاروں بار فرمائش کر چکی ہوں۔ علی چاچو (فلم اسٹار محمد علی صاحب) کی سالگرہ 10 نومبر اور برسی 19 مارچ کو ہوتی ہے ان مواقع پر آپ زیبا آپی کا انٹرویو تصاویر کے ساتھ ضرور دیں ان کے ساتھی فنکاروں کے خوش گوار واقعات شائع کریں۔ دوسری خواہش نمیرہ احمد یا عمیرہ احمد سے پوری کروادیں۔ ایک ایسی لڑکی کی کہانی لکھوائیں جو بے حد بہادر، ذہین، مارشل آرٹ کی ماہر اور ماہر نشانے باز ہو جو خفیہ پولیس میں ہو۔ مارشل آرٹ اور جوڈو کراٹے کے بارے میں ایسی ایسی ٹپس دیں جن کی پریکٹس کر کے لڑکیاں مہارت حاصل کر کے فائدہ اٹھائیں یعنی گھر بیٹھے ہی ماہر ہو جائیں میں 2000 سے آپ کی خاموش قاری ہوں لیکن اب صرف اپنی خواہش کے لیے خاموشی توڑی ہے آپ کی کہانیوں میں کبھی کبھار چھپی ایک لائن کہ ''میں بلیک بیلٹ ہوں'' میں نے مارشل آرٹ سیکھا ہوا۔ ہزاروں بار پڑھ کر خوش ہوتی رہتی ہوں۔ ادارے کے سب افراد اور سب لکھاریوں کو سیلوٹ جو معاشرے میں سدھار کا باعث ہیں جب مجھ پر مثبت اثرات ہو سکتے ہیں تو یقیناً بہت لوگوں نے بہت کچھ سیکھا ہوگا۔ اس لیے تو میں بچوں کو ضرور پڑھاتی ہوں ڈائجسٹ منع بالکل نہیں کرتی۔ بلکہ خود اصرار کر کے پڑھواتی ہوں۔

امن جی: آپ کی فرمائش اداکارہ زیبا سے انٹرویو کی ہم ضرور پوری کریں گے بشرطیکہ وہ انٹرویو کے لیے راضی ہوں۔ دوسرے جو ڈو کراٹے کی ٹپس کے لیے آپ نے فرمائش کی ہے یہ ایک ایسا فن ہے جس میں خطرہ بھی ہے۔ اس لیے ہم یہ مناسب نہیں سمجھیں گے کہ کوئی بھی کسی ماہر فن سے سیکھے بغیر صرف پڑھ کر اس فن کو سیکھنے کی کوشش کرے یہ اس کے لیے بھی خطرناک ہوگا اور دوسروں کے لیے بھی۔

☆☆

کرن کتاب

تلسی.....!!

سائنسی خصوصیات کے مطابق تلسی یا تخم بالنگا بہت کارگر ہوتی ہے۔ آیورویدمیں اسے دوائیوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے ان دنوں اس کے فوائد کی مقبولیت کی وجہ سے بین الاقوامی طور پر کاسمیٹکس میں بھی شامل کیا جا چکا ہے۔

داغ دھبوں سے مبرا جلد حاصل کرنے کے لیے لگایے تلسی فیس پیک:

کھانے میں، ادویات میں، درد وغیرہ میں تلسی کے فائدہ مند خصوصیات کے بارے میں سب جانتے ہیں لیکن کیا آپ تلسی کی خوب صورتی کے خصوصیات کے بارے میں جانتے ہیں؟ جی ہاں، چونک گئے؟ دلکشی کے لیے تلسی بہت کارگر اور فائدہ مند ہوتی ہے جو جلد کو خوب صورت بنا دیتی ہے اور آپ کی جلد میں نکھار لا دیتی ہے۔

انفیکشن دور کریں:

تلسی میں ایسی خصوصیات بھی ہیں جو جلد سے انفیکشن دور کر دیتے ہیں اور اسے کیل مہاسے، دانوں سے مبرا بنا دیتی ہے کیونکہ یہ جلد کے سارے بیکٹیریا کو مار دیتی ہے بس تلسی کی پانچ پتیاں لیں، اس کا پیسٹ بنا کر اس میں لیموں کی بوندیں ملالیں اور چہرے پر مساج کریں، چہرا چمک اٹھے گا۔

گوری جلدی حاصل کرنے کے لیے:

اگر آپ کا کلر ہلکا ڈل ہے تو آپ تلسی لگا کر رنگ کو فیئر کر سکتی ہیں۔ تلسی پیسٹ، دودھ پاؤڈر اور دلیا پیسٹ ملانا ہوگا اور اسے عرق گلاب میں گھول کر پندرہ منٹ کے لیے چہرے پر لگانا ہے۔ سوکھ جانے کے بعد چہرا دھولیں، کچھ ہی ہفتوں میں نیچرل نکھار آئے گا۔

بڑھتی عمر کی جلد کے لیے:

اگر آپ کے چہرے کی جلد بڑھتی عمر کی وجہ سے لٹک گئی ہے تو آپ کو تلسی سے راحت ملے گی۔ تلسی کے پتوں کو پیس کر اس میں انڈے کا سفید والا حصہ ملا کر چہرے پر لگائیں، خشک ہو جانے پر چہرہ سادہ پانی سے دھولیں، جلد میں اچھی طرح کساؤ آجائے گا۔

چمکتے دانتوں کے لیے:

آپ باقاعدگی سے برش کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود اگر آپ کے دانتوں میں چمک نہیں آتی ہے تو آپ کو تلسی کی مدد سے دانتوں کو چمک دار بنانا چاہیے۔ اس کے لیے خشک تلسی کی پتیوں کو دانتوں پر گھسیں اور ایسا ایک نہیں بلکہ دو ہفتے تک روزانہ سونے سے پہلے کریں، آپ کے دانت قدرتی طور پر چمک اٹھیں گے۔

روکھے بال:

اگر آپ اتنا زیادہ باہر رہتی ہیں کہ آپ کے بالوں میں ڈرائی نیس اور روکھا پن آجاتا ہے جس کی وجہ سے خشکی بھی کافی زیادہ ہو جاتی ہے۔ بالوں سے خشکی دور کرنے کے لیے آنولا اور تلسی کی پتیوں کا پیسٹ بنالیں اور اسے نصف گھنٹے کے لیے بالوں پر لگائیں، سوکھ جانے پر گرم پانی سے دھولیں۔ دو تین بار کے نفاذ کے بعد ہی آپ کو نمایاں فرق نظر آئے گا۔

افغان جیولری.....

زیورات کا نیا اسٹائل

گزشتہ کچھ عرصے سے افغان جیولری کا بہت چرچا ہے۔ دلہنیں اپنی مہندی کی تقریب میں افغانستان کی

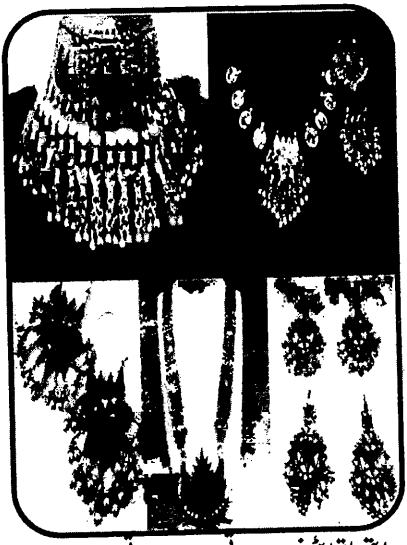

روایتی ماتھا پٹی خوب صورتی سے سر پر سجاتی ہیں۔

افغان جیولری میں ورائٹی بہت ہے، اس میں مختلف دھاتوں کا استعمال کر کے جیولری بنائی جاتی ہے۔ خاص طور پر اس کے لیے جرمن سلور کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر یہ جیولری سلور ہوتی ہے۔

پاکستان میں افغان جیولری دو طرح کی ملتی ہے، جو اصل افغان جیولری ہے وہ بہت مہنگی ہوتی ہے۔ اس کی ایک انگوٹھی کم سے کم چار سے پانچ ہزار کی ملتی ہے جب کہ افغان جیولری کی نقل وزن میں ہلکی ہوتی ہے ساتھ ہی اس میں قیمتی یا نیم قیمتی پتھروں کا استعمال نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس جگہ پر پلاسٹک سے یا ہلکے شیشے سے بنائے جانے والے نگینے استعمال کیے جاتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی قیمت بھی کم ہوتی ہے۔

روزمرہ استعمال کے لیے جو افغان جیولری بنائی جاتی ہے اسے **Cotton Stung Mora** کہا جاتا ہے۔ اس روایتی افغان جیولری کو بنانے کے لیے مختلف رنگوں کے موتیوں، سکے و دیگر اشیاء کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس جیولری کے درمیان میں لگایا جانے والا ایک پیس سلور کا ہوتا ہے۔ باقی آگے پیچھے موتیوں کا استعمال کر کے اسے مالا کی صورت میں تیار کیا جاتا ہے۔

افغان جیولری کے مختلف آئٹمز ہوتے ہیں جن کے بارے میں تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

چاند بالیاں: یہ بالیاں سب سے زیادہ پسند کی جارہی ہیں۔ یہ چاند بالیاں سہاروں کے ساتھ بنائی جاتی ہیں، جنہیں کانوں کے پیچھے پاپن کی مدد سے سیٹ کیا جاتا ہے۔

ماتھا پٹی اور ہیئر کلپ: یہاں افغان جیولری میں سب سے زیادہ مشہور ہونے والی چیز ماتھا پٹی ہے۔ اپنی مہندی یا کسی بھی دوسرے فنکشن میں لڑکیاں سر پر ماتھا پٹی سجاتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔ مختلف طرح

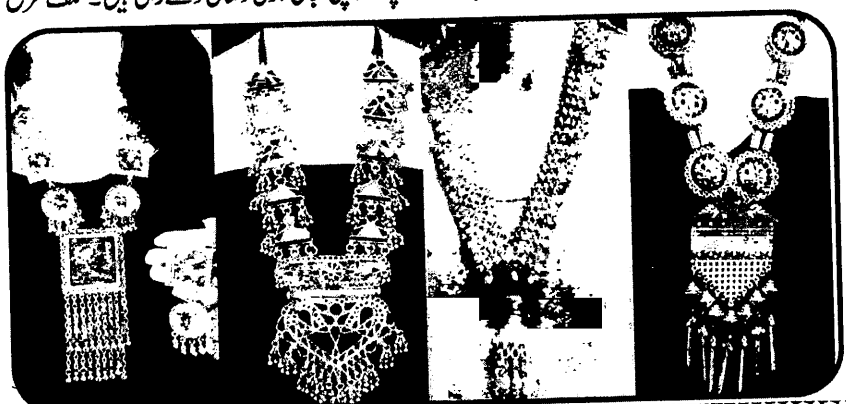

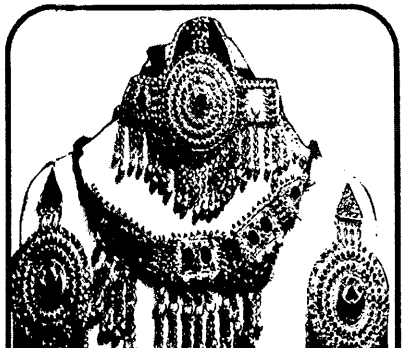

کی ماتھا پٹیاں ان دنوں مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔ کسی میں نیچے کی جانب گھنگھرو لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ کسی میں سکے، کسی ماتھا پٹی کو کلر فل بنانے کے لیے اس کے درمیان میں ہرے، نیلے اور دیگر رنگوں کا اینیمل ڈالا جاتا ہے۔ ماتھا پٹی کے علاوہ افغانی ہیئر کلپ بھی لڑکیاں لگانا بہت پسند کرتی ہیں۔

ٹیکا، جھومر: ٹیکا اور جھومر دونوں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں تاہم ان دنوں دلہن کی بہنیں یا دوستیں دونوں میں سے ایک چیز لگاتی ہیں یا تو وہ ایک طرف سے بالوں کو آگے کی جانب نکال کر دوسری طرف افغان جھومر لگاتی ہیں، یا پھر بڑا سا ٹیکا درمیان کی مانگ نکال کر پہنتی ہیں۔

کمر بند: افغان روایات میں کمر بند (Waist Chain) بھی جیولری آئٹمز میں شامل ہے۔ کئی لڑکیاں اس روایتی کمر بند کو پہنتی ہیں تاکہ وہ منفرد نظر آئیں، خاص طور پر وہ لڑکیاں جو ساڑھی، شرارہ یا گھاگھرا چولی پہنتی ہیں، وہ افغانی کمر بند کا استعمال کرسکتی ہیں۔

نیکلس: وہ خواتین جنہیں اسٹیٹمنٹ نیکلس پہننے کا بہت شوق ہے۔ ایسی خواتین کے لیے افغانی نیکلس بہترین چوائس ثابت ہوتے ہیں۔ افغان جیولری کے لیے مختلف انداز کے نیکلس بنائے جاتے ہیں۔ گلے میں پہنے جانے والے سادہ سے نیکلس کے علاوہ کئی لڑیوں پر مشتمل ہار بھی اس جیولری کا اہم حصہ ہیں۔

کڑے اور ہاتھ پھول: افغان جیولری میں چوڑیاں نہیں ہوتیں، زیادہ تر کف والے کڑے بنائے جاتے ہیں۔ کڑے کے درمیان میں مختلف رنگوں کے پتھر لگائے جاتے ہیں۔ ایک کف والا کڑا اگر ہاتھوں میں پہن لیا جائے تو اس کے بعد ہاتھ میں کوئی دوسری چیز نہیں پہنی جاسکتی کیونکہ یہ سائز میں بڑا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک چیز جو افغان جیولری کا اہم حصہ تصور کی جاتی ہے وہ ہے ہاتھ میں پہنا جانے والا ''پنجہ'' (اسے کچھ لوگ ہاتھ پھول کے نام سے بھی جانتے ہیں)۔ اس میں پانچوں انگلیوں کی انگوٹھیاں ایک ساتھ موجود ہوتی ہیں اور یہ اگر پہن لیا جائے تو ہاتھوں کی خوب صورتی بڑھ جاتی ہے۔

ناک کی لونگ، بالی: ناک میں پہننے کی لونگ نہایت منفرد ہوتی ہے، اس میں بھی سہارا موجود ہوتا ہے جسے بالوں میں اٹکایا جاتا ہے۔ یہ بڑے سائز کی ہوتی ہے اور زیادہ تر گول ہوتی ہے۔ کچھ ناک کی لونگ سلور ہوتی ہیں جبکہ کچھ میں دھات کے علاوہ موتیوں اور پوم پوم (اون سے بنائی گئی بالز) کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔

انگوٹھیاں اور پازیب: افغانی انگوٹھیوں کی ڈیمانڈ ان دونوں بہت زیادہ ہے۔ یہ بڑے سائز کی ہوتی ہیں، ان کے درمیان میں ایک بڑا نگینہ موجود ہوتا ہے۔ ان دنوں جیولری ڈیزائنرز نے افغان طرز کی انگوٹھیاں مارکیٹ میں متعارف کروا کر اس جیولری کو مزید مشہور کردیا ہے۔ افغانی پازیب میں بھی گھنگھرو، مختلف رنگوں کے موتی وغیرہ لگا کر اسے خوب صورت بنایا جاتا ہے، لڑکیوں میں افغان پازیب بھی بہت مشہور ہے۔

مہکتے شیریں، خوشبو دار "گرمے"

گرما ایک خوش ذائقہ صحت بخش اور سردے سے قدرے شیریں پھل ہے اور متعدد امراض کا قدرتی علاج بھی ہے۔ یہ کمزور اصحاب کے لیے ایک عمدہ قسم کی غذا ہے۔ غذائیت کا قدرتی خزانہ ہے۔ صالح خون پیدا کرتا ہے اور جسم موٹا۔ خوشبو اور ذائقے سے بھرپور پھل گرما کھانے کے بے شمار طبی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

ماہرین غذائیت کے مطابق گرمیوں کے لحاظ سے گرما ایک صحت بخش غذا ہے۔ گرما کے سو گرام میں 34 کیلوریز، 0.2 گرام ویٹ، 16 ملی گرام پروٹین پائی جاتی ہے جبکہ 67 فیصد وٹامن اے، 61 فیصد وٹامن سی، 5 فیصد وٹامن بی، 6 اور 3 فیصد فیصد میلشیم پایا جاتا ہے۔

☆ گرما 90 فیصد پانی پر مشتمل پھل ہے۔ اس کے استعمال سے گرمیوں میں پائیڈریٹڈ رہنے میں مدد ملتی ہے۔ گرما منرلز اور وٹامنز حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

☆ گرما میں فیٹ اور کاربوہائیڈریٹس نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں، اسی لیے وزن میں کمی لانے کا سبب بنتا ہے۔ اگر آپ ڈائٹ پلان کے ذریعے وزن کم کرنا چاہتے ہیں تو گرمیوں میں دوسری غذاؤں اور پھلوں کی نسبت اس کا استعمال زیادہ کریں۔

☆ گرما میں پوٹاشیم کی بھاری مقدار پائے جانے کے سبب اس کے استعمال سے پٹھوں کو مضبوطی ملتی ہے۔ متاثرہ پٹھوں کو بننے میں مدد ملتی ہے اور بلڈ پریشر بھی متوازن رہتا ہے۔

☆ گرما کے استعمال سے بلڈ شوگر لیول کنٹرول ہوتا ہے، اس کے استعمال سے ذیابطیس کے مریضوں میں شوگر لیول متوازن رہتا ہے۔

☆ گرما میں وٹامن سی پائے جانے کے سبب اس کے استعمال سے قوت مدافعت مضبوط ہوتا ہے اور موسمی انفیکشن سے لڑنے میں مدد ملتی ہے۔

☆ گرما ایک فرحت بخش غذا ہے۔ گرمیوں میں اس کے استعمال سے گرمی کا احساس کم ہوتا ہے۔ پیٹ کی متعدد بیماریوں سمیت قبض کی شکایت دور ہوتی ہے۔

☆ جن اشخاص کو پیشاب کم اور جل کر آتا ہو۔ انہیں گرما شوق سے کھانا چاہیے۔ جن مریضوں کے جگر پر ورم ہو، پیٹ بڑا ہو جائے اور پیشاب کھل کر نہ آئے۔ کمر میں گردہ کے مقام پر ایک طرف یا دونوں طرف درد رہتا ہو، ایسے مرض میں گرما انتہائی فائدہ مند ہے۔

☆ گردوں اور مثانے میں پتھری پیدا ہونے لگے یا جوڑوں میں یورک ایسڈ کی قلمیں جمنے سے درد اور ورم ہو کر سختی آ جائے تو اس کے استعمال سے پتھری کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اور یورک ایسڈ نکل جاتا ہے اور جوڑوں کی لچک بحال ہو جاتی ہے۔

☆ ماہرین غذائیت کے مطابق خواتین کی صحت کے لیے یہ پھل آئیڈیل خصوصاً حاملہ خواتین کو اس پھل کا استعمال لازمی کرنا چاہیے۔

کچن کو صاف رکھیں

مگر کیسے.....؟

کسی بھی گھر میں باورچی خانہ کو صاف ستھرا رکھنا دیکھنے والے پہ اچھا اثر ڈالنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس سے نہ صرف باورچی خانہ آنے والوں پہ اچھا تاثر دیتا ہے بلکہ آپ کے اہل خانہ کی صحت کے لیے بھی ضروری ہے۔ اس ماہ ہم آپ کے باورچی خانے کی صفائی کے لیے چند مفید آئیڈیاز لائے ہیں جو کہ آپ کی حوصلہ افزائی کریں گے۔ خاص طور پر ایسی جگہیں جن کا صاف ہونا ضروری ہے۔

☆ عام طور پر ہم سوچتے ہیں کہ صاف کرنے

والے مواد یعنی کپڑا یا اسپنج کی صفائی ستھرائی زیادہ ضروری نہیں لیکن ایسا کرنا ٹھیک نہیں کیونکہ ایسی چیزوں پہ بیکٹیریا جراثیم بہت جلدی اثر کرتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک بار ضرور ان کو جراثیم کش ادویات سے دھولیں۔

☆ باورچی خانے کی دراز کو خالی کرنے کے بعد برش سے گرد وغبار کو صاف کر لیجیے۔ اسپرے بوتل میں سرکہ بھر کر اسپرے کیجیے اور چوبیس گھنٹے بعد خشک تولیے سے صاف کرلیں اور سامان واپس رکھ کر چند تیز پات کے پتے رکھ دیں۔

☆ ایک پانی سے بھرے ڈونگے میں لیموں کا عرق ملا کر اوون میں رکھ دیں اور پانچ منٹ کے لیے چلا دیں، پھر اوون کو کپڑے سے صاف کریں۔

☆ کیڑے مکوڑے بھگانے کے لیے پانی میں فنائل ڈال کر فرش کو دھوئیں۔

☆ سرکہ اور میٹھے سوڈے کا مرکب ڈرین میں پھنسے کچرے کو ہٹانے کے موثر ترین طریقوں میں سے ایک ہے۔ پہلے آدھا کپ میٹھا سوڈا پھر ایک کپ سرکہ کو سنک میں ڈالیں، جب ان کے جھاگ بن کر بیٹھنے لگیں تو اسے گرم پانی سے بہادیں۔

☆ چولہوں یا کچن کاؤنٹر پر اکثر گھی جم جاتا ہے۔ اسے صاف کرنے کے لیے پانی اور سرکہ یکساں مقدار سے محلول تیار کریں۔ اس میں کپڑے کو بھگو کر ان داغ دھبوں پر رگڑیں۔

☆ کچن کی دیواریں اور کھڑکی کے شیشے صاف کرنے کے لیے نیم گرم پانی میں بیکنگ سوڈا شامل کریں اور مکس کرلیں۔ اس مکسچر کو کسی بھی برش کی مدد سے دیواروں پر لگائیں اور رگڑیں۔ اس کے بعد صاف پانی سے کسی کپڑے کی مدد سے صاف کرلیں۔

☆ چولہوں کو صاف ستھرا اور چمکتا دمکتا رکھنے کے لیے ہفتے میں ایک بار سرکہ سے صاف کریں۔

ہمیشہ ساس ہی کیوں غلط ہوتی ہے؟

وقت گزر گیا، زمانے بدل گئے۔ ترقیاں ہوئیں، لوگ اپ ٹو ڈیٹ ہوئے لیکن کسی نا کسی معاملے میں ہم آج بھی اتنے ہی بیک ورڈ ہیں۔ جتنے کہ ہم تیس پینتیس سال پہلے تھے۔ آج بھی کہیں نا کہیں کچھ رشتوں میں ہم کم ظرفی کا مظاہرہ کر جاتے ہیں۔ اتنی ترقی کے باوجود آج بھی ہمارے درمیان کچے رشتے ایسے موجود ہیں۔ جنہیں ہم قبولتے تو ہیں لیکن انہیں برداشت کرنے میں تھوڑی کم ظرفی دکھا جاتے ہیں اور کم ظرفی والے رشتوں میں ساس اور بہو کا رشتہ سرفہرست ہے۔

ساس اور بہو کا رشتہ کہنے میں جتنا خوب صورت ہے، اتنی ہی اس رشتے میں کڑواہٹ بھی موجود ہے۔ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا ہے کہ ساس ہی ہر معاملے میں ہر جگہ غلط ہو۔ وہی ظالم ہو، کبھی بہو بھی غلط ہو سکتی ہے۔ بلکہ کئی دفعہ وہ غلط ہوتی بھی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ لڑکی کو نئے گھر اور نئے ماحول میں خود کو ڈھالنے کے لیے کچھ وقت چاہیے ہوتا ہے۔ اور اس کٹھن وقت میں اسے شوہر کی ساتھ ساتھ سب سے زیادہ ضرورت ساس کی ہوتی ہے لیکن اس سمجھنے سمجھانے کے وقت میں ہی دونوں رشتے اپنی اپنی ذات میں سمٹ کر ایک ہونے کے بجائے الگ الگ محاذ بنا لیتے ہیں۔ اک سرد جنگ کا آغاز اس وقت ہوتا ہے، جب بہو اپنا لائحہ عمل گھر کے نظام پر مسلط کرتی ہے اور ساس اپنے انداز و اطوار کو زندہ رکھنا چاہتی ہے لیکن بہو اپنا مقام بھول کر ساس کے بارے میں غلط قیاس آرائیاں کر لیتی ہے اور ساس بہو کو بدتہذیب اور ڈھیٹ کا خطاب دے دیتی ہے۔ پھر ایسے میں ہمیشہ ساس کو ہی کیوں غلط سمجھا جاتا ہے؟ سارے قصور اس کے حساب میں کیوں لکھ دیے جاتے ہیں؟ بہو کو کیوں ''بے چاری'' کا لقب دے دیا جاتا ہے؟

ہم لڑکیوں کا ایک المیہ ہے کہ جب کوئی بات خواہ وہ اچھی ہو یا بری اگر ہمیں ساس کہے گی تو ہم برا منائیں گی۔ اس کی بات کی نفی کریں گے۔ لیکن اگر ہمیں وہی بات ہماری ماں کہے گی تو اسے ہم دل سے قبول کریں گی۔ چاہے ماں کا طریقہ کار ساس سے بھی زیادہ برا ہو لیکن چونکہ وہ بات اپنی ماں نے کہی ہے اس لیے وہ اچھی لگے گی۔ گھر میں بہنیں آئیں گی تو سارا دن کچن میں رہ کر بھی تھکاوٹ نہیں ہوگی لیکن اگر نندیں دو سے تین گھنٹے کے لیے بھی آئیں گی تو بجٹ خراب ہو جاتا ہے، تھک جاتی ہیں۔ جبکہ ساس شکایت کرے تو وہ غلط اور ظالم بن جاتی ہے۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حقیقتاً یہ لڑائی ساس سے بہو کی نہیں یا بہو سے ساس کی نہیں بلکہ یہ ایک عورت کی عورت سے لڑائی ہے کیونکہ یہ عورت کے ہی مختلف روپ ہیں جسے کبھی وہ بناتی اور کبھی بگاڑتی ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ کل کی نوجوان لڑکی اتنی سیانی کیسے ہو جاتی ہے کہ وہ صرف اپنے مفاد کے فیصلے کرنے لگتی ہے۔ ایک شفاف سلیٹ پر اتنی زیادہ نفرتیں کیسے لکھی جاتی ہیں۔ سسرالی رشتے داروں کے خلاف اتنی کڑواہٹیں کہاں سے آ جاتی ہیں۔ رشتے تو رشتے ہوتے ہیں چاہے شوہر کے ہوں یا بہو کے، پھر ان کے درمیان نہ ختم ہونے والا فرق کہاں سے آ جاتا ہے؟ وہ رشتے جو ماں کے گھر ایک بیٹی کے لیے پیارے ہوتے ہیں، سسرال میں آ کے ویسے ہی رشتے بہو بن کے ناپسندیدہ کیوں ہو جاتے ہیں؟

ان تفرقات سے گھر تو خراب ہو ہی جاتے ہیں، پھر چاہے اس کی ذمہ دار اس کی بہو ہو یا ساس لیکن حقیقت یہی ہے۔ عموماً ساس ہی مطعون کی جاتی ہے، کیا بہو بھی غلط نہیں ہوتی؟

یہ زندگی مختصر سی ہے، اس میں نفرتیں بھریں گے تو بھی ہم نے گزارنی ہے۔ محبتیں اور سکون ہوگا تو بھی ہم نے ہی گزارنی ہے، تو پھر کیا یہ ضروری ہے کہ خود سے وابستہ رشتوں کو دکھ دیے جائیں۔ اپنے دل کے سکون کی خاطر کو بے سکون کر دیا جائے۔

خود کو رشتوں کی نظر سے دیکھنے کے بجائے صرف ایک بار خود ایک پیار بانٹنے والی عورت کی نظر سے دیکھیں تو سب ہی رشتے اپنے اپنے دائروں میں فٹ ہو جائیں گے۔ ساس کوئی غلط بات کہے تو بہو کا فرض ہے کہ اسے ماں سمجھ کے اس کی غلط بات کو بھلا دے۔ جب کوئی بہو اپنے فرائض سے چشم پوشی کرے تو یہ ساس کا فرض ہے کہ ایک بیٹی جان کے اسے معاف کر دے، اس کی غلطیوں کی پردہ پوشی کرے۔ بات صرف سمجھنے کی ہے ورنہ یہ رشتے اتنے کڑوے نہیں جتنا انہیں سماج نے بنا دیا ہے۔ سمجھو تو یہ رشتے دل کے بہت قریب ہیں، نظر انداز کرو تو فاصلے بہت۔

زرتاشیہ نعمان

س: ''آپ کیا سمجھتی ہیں کہ کھانے کے لیے جیا جاتا ہے یا جینے کے لیے کھایا جاتا ہے؟''

ج: ''باشعور افراد جینے کے لیے کھاتے ہیں تو میں بھی جینے کے لیے کھاتی ہوں۔''

س: ''گھر کے کام کاج میں خصوصاً کچن میں آپ کی دلچسپی کس حد تک ہے یا پڑھنے پڑھانے کا شوق آپ کو ان بکھیڑوں سے دور رکھتا ہے؟''

ج: ''گھر اور گھر داری تو عورت کا زیور ہوتی ہے۔ مجھے بھی کچن سے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی ایک گھریلو خاتون خانہ کو ہوتی ہے۔ پڑھنے اور لکھنے کا بھی شغف رکھتی ہوں مگر یہ شوق کبھی امور خانہ داری میں حائل نہیں ہوا۔''

س: ''ہمیشہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ کھانا مزے دار بنے، کبھی کبھی نتائج برعکس بھی ہوتے ہیں۔ ایسے میں کھانے والے کیا تبصرہ کرتے ہیں؟''

ج: ''جی ہاں، سو فیصد درست سوال ہے۔ جب کھانا اچھا نہ بنے تو اس میں کافی سارے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ اگر مجھ سے کبھی کوئی ڈش کسی بھی کمی، بیشی کے ساتھ بنے تو میرے بچے اور میاں فوراً کمنٹس پاس کرتے ہیں کہ..... آج ہیڈ ڈش ویسی نہیں بنی جیسے آپ نے پچھلی بار بنائی تھی۔''

س: ''کون سی رائٹر کو پڑھتے ہوئے کھانا دھواں ہوا؟''

ج: ''جناب کسی رائٹر کو پڑھتے ہوئے تو نہیں، ہاں مگر اپنی ایک تحریر لکھتے ہوئے دو بار پلاؤ نیچے سے لگ گیا۔ صد شکر کہ دھواں نہیں ہوا تھا، کھانے لائق تھا۔''

س: ''عام طور پر کہا جاتا ہے ''ان'' کے دل کا راستہ معدہ سے ہوکر گزرتا ہے۔ آپ اس خیال سے کس حد تک اتفاق کرتی ہیں؟''

ج: ''جی ہوسکتا ہے کہ یہ مثل کچھ لوگوں پہ فٹ آتی ہو۔ مگر میرا اور میرے میاں کا رشتہ ڈائریکٹ دل سے جڑا ہے، الحمدللہ۔ تو مجھے معدے کے لیے زیادہ تگ و دو کی ضرورت نہیں پڑتی لیکن پھر بھی انہیں اچھا اور بہترین کھانا دینے کے لیے دل سے محنت کرتی ہوں۔''

س: ''لوگ آپ سے زیادہ تر کس چیز کی فرمائش کرتے ہیں؟ آپ ہمیں اس ڈش کی ترکیب بتائیں۔''

ج: ''اکثر بریانی کی فرمائش ہوتی ہے، وہی حاضر خدمت ہے۔

اشیاء: چاول، چار کپ (دھوکر پندرہ منٹ کے لیے بھگو دیں)۔ چکن، ایک کلو۔ پیاز ایک عدد بڑا کوئلز براؤن کرکے الگ رکھ لیں۔ ٹماٹر دو عدد بڑے سلائس کرلیں۔ ہری مرچیں چار عدد۔ ادرک، لہسن۔ پسا ہوا ایک کھانے کا چمچہ۔ دہی ایک کپ، پانی ہاف کپ (دونوں کو مکس کرلیں) ہاف کپ، دہی جس میں پیلا زردے کا رنگ شامل کرلیں۔ ہرا دھنیا، پودینہ، چوپڑ۔ (حسب ضرورت)۔ لیموں ایک یا دو سلائس کیا ہوا۔ خشک آلو بخارے۔ آٹھ دس پانی میں بھیگے ہوئے۔ لال مرچ، دو چائے کے چمچے۔ پسا دھنیا ایک چائے کا چمچہ۔ نمک دو چائے کے چمچے۔

ترکیب:۔ چاولوں کو نمک کے پانی میں ہاف بوائل کرلیں۔

اب اسی پتیلی میں جس میں سے چاول نتھار لیے گئے ہیں، تیل یا گھی ڈالیں۔ اس میں ادرک لہسن ڈال کر ہلکا سا بھون کر دہی اور پانی والا مکسچر ڈالیں۔ اب چکن ڈال دیں، بھون لیں۔ ٹماٹر اور ہری مرچیں شامل کریں، مسالا جات اور آلو بخارے پانی سے نکال کر ڈالیں، ساتھ ہی سارے مسالا جات ڈال دیں۔ ہلکا سا بھون کر پتیلی ڈھک دیں، آنچ ہلکی کردیں تاکہ گوشت بھی گل جائے اور قورمہ کی گریوی بن جائے۔

اب آتے ہیں تہ کی طرف۔ اسی پتیلی میں قورمہ نکال کر چاول کی تہ لگائیں۔ قورمہ، پیلا رنگ ملی دہی، براؤن پیاز، لیموں کے سلائس، ہرا دھنیا، پودینہ، پھر چاول۔ اب آخر میں چاولوں پہ دو کھانے کے چمچے تیل یا گھی ڈال دیں۔ کپڑے سے پتیلی کا ڈھکن کور کرکے پتیلی پر رکھیں اور گندھے ہوئے آٹے سے پتیلی پوری گولائی سے کور کردیں تاکہ بھاپ اندر ہی رہے (بھاپ کے بغیر بریانی کسی کام کی نہیں ہوتی) ایک منٹ تیز آنچ رکھیں پھر ہلکی آنچ کردیں پندرہ منٹ کے لیے۔ مزے دار بریانی تیار ہے۔

س: ''آپ کے ہاتھ کی پہلی ڈش کھا کر گھر والوں نے کیا تبصرہ کیا؟''

ج: ''شادی سے پہلے کیک بیک کیا تھا، تو میرے ابو اتنے خوش ہوئے تھے، سب کو دکھا رہے تھے کہ دیکھو آج میری بیٹی نے کیک بنایا ہے۔ اللہ انہیں جنت میں اعلا مقام عطا کرے، آمین۔ آج بھی جب بھی ان کی یہ معصوم سی حرکت یاد آتی ہے تو آنکھیں اور دل دونوں بھر آتے ہیں۔

س: ''ایسے مہمان جن کی آمد ناگوار گزری ہے، پھر ان کی تواضع کیسے کرتی ہیں؟''

ج: ''ہاہاہا۔ میرے میاں کے کولیگ جب بن بتائے آتے ہیں تو موڈ تو آف ہوتا ہے مگر پھر جب میاں پیار بھرے انداز میں کہتے ہیں ''یار ایک کپ چائے تو بنا دیں اور ساتھ میں کچھ رکھ دیں'' تو یقین جانیے اچھے سے ٹرے سجا کر باہر بھیجتی ہوں کہ آخر میاں کی ریپوٹیشن کا بھی دھیان کرنا ہوتا ہے نا۔

س: ''گھر والوں کی پسندیدہ ڈش جسے پکانا ناگوار گزرتا ہے؟''

ج: ''اف۔ کیا سوال کردیا۔ میری چھوٹی بیٹی اسپیگھٹی کی دیوانی ہے۔ ہر وقت ایک ہی رٹ ہوتی ہے کہ مما! اسپیگھٹی بنا دیں اور میں ہوں ہاں کرکے ٹال دیتی ہوں مگر پھر بنا دیتی ہوں۔ آخر ماں ہوں بنا کے دینا ہی پڑتی ہے۔

کرن کا دستر خوان

شنواری مٹن کڑھی

اجزاء:۔

بکرے کا گوشت	ایک کلو
ٹماٹر	چار عدد
ہری مرچیں	چھ عدد
نمک	حسب ذائقہ
کٹا ہوا زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
کالی مرچ کٹی ہوئی	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	ایک کپ
ادرک لہسن کٹا ہوا	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب:۔

ایک پین میں پانی گرم کر کے اس میں ایک منٹ کے لیے ٹماٹر ڈال دیں۔ پھر ٹماٹر کا چھلکا اتار لیں۔ پھر ایک کڑاہی میں کھانے کا تیل، گوشت ڈال کر بھونیں۔ اب اس میں ادرک لہسن اور ٹماٹر ڈال کر ڈھانپ دیں اور دو سے تین منٹ پکائیں۔ پھر اس میں نمک، کٹی کالی مرچ، زیرہ، ہری مرچیں ڈال کر اچھی طرح بھونیں۔ پھر اس میں تھوڑا پانی ڈال کر گوشت گلنے تک پکائیں۔

بوہری کباب

اجزاء:۔

ڈبل روٹی کے سلائس	دو عدد
دودھ	ایک کپ
چکن قیمہ	آدھا کلو
فرائی کی ہوئی پیاز	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
ابلے ہوئے آلو (درمیانے)	دو عدد
سویا ساس	ایک کھانے کا چمچہ
پسی کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ادرک لہسن پسا ہوا	ایک چائے کا چمچہ
کٹی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
انڈا	ایک عدد
پیاز (چوپ کی ہوئی)	دو عدد
پودینہ	آدھی گڈی
کھانے کا تیل	حسب ضرورت

ترکیب:۔

ایک برتن میں بریڈ سلائس اور دودھ ڈال کر تھوڑی دیر کے لیے بھگو دیں۔ اب گرائنڈر میں چکن قیمہ، نمک، فرائی کی ہوئی پیاز، بھیگی ہوئی بریڈ ڈال کر اچھی طرح گرائنڈ کرلیں۔ پھر اس میں ابلے ہوئے آلو، سویا ساس، کالی مرچ، ادرک لہسن، لال مرچ کٹی ہوئی، انڈا ڈال کر اچھی طرح گرائنڈ کریں۔ اب اس میں پیاز اور پودینہ شامل کریں اور گرائنڈ کرلیں۔ اس کے ہاتھوں پر ہلکا سا تیل لگا کر تیار کیے ہوئے مکسچر کے کباب بنالیں۔ ایک پین میں کھانے کا تیل ڈال کر کباب کو شیلو فرائی کریں۔

اروی کی سبزی

اجزاء:۔

اروی بڑے سائز کی	آدھا کلو
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
لال مرچ کٹی ہوئی	آدھا کھانے کا چمچہ
میتھی دانہ	چھ عدد
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
اجوائن	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
ہری مرچ	چار عدد ثابت
کڑی پتا	چند پتے
لیموں	تین عدد
تیل	آدھی پیالی

ترکیب:۔

اروی کو ابال کر چھلکا اتار لیں۔ ثابت رہنے دیں۔ سارا مسالا اچھی طرح ملا کر تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔ پھر کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ کڑی پتا ڈال کر سیاہ کر لیں اور مسالا ملی ہوئی اروی ڈال کر ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔ اوپر سے لیموں چھڑک دیں اور ڈھانپ دیں، جب مسالے کا پانی اور اروی کا پانی خشک ہو جائے تو ہلکا سا بھون کر اتار لیں۔ گرم گرم پوری کے ساتھ پیش کریں۔

کھویا پڈنگ

اجزاء:۔

انڈے	چار عدد
ڈبل روٹی کے سلائس	دو عدد (کنارے کاٹ لیں)
دودھ	تین کپ
چینی	آدھا کپ
کھویا	آدھا کپ
سبز الائچی پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
بادام باریک کٹے ہوئے	حسب ضرورت

ترکیب:۔

سلائسز کے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر مکھن میں فرائی کر لیں۔ ایک برتن میں دودھ، چینی اور کھویا ڈال کر پکائیں۔ کھویا نرم ہو جائے تو اس میں سلائسز کے ٹکڑے ڈال کر پکائیں۔ تھوڑی دیر بعد اس میں زعفران اور الائچی شامل کر دیں۔ جب گاڑھا ہو جائے تو چولہے سے اتار کر رکھ لیں۔ اب انڈے کو پھینٹ کر اس میں شامل کر دیں۔ اوون پروف ڈش میں مکھن لگائیں۔ یہ آمیزہ ڈش میں ڈال کر سیٹ ہونے تک اوون میں بیک کر لیں۔ اوون سے نکال کر ٹھنڈا کر لیں۔ بادام چھڑک کر پیش کریں۔

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com